میں کہ مری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
علامہ اقبالؒ

کھوئے ہوؤں کی جستجو

تالیف: حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ

ترتیب: مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی

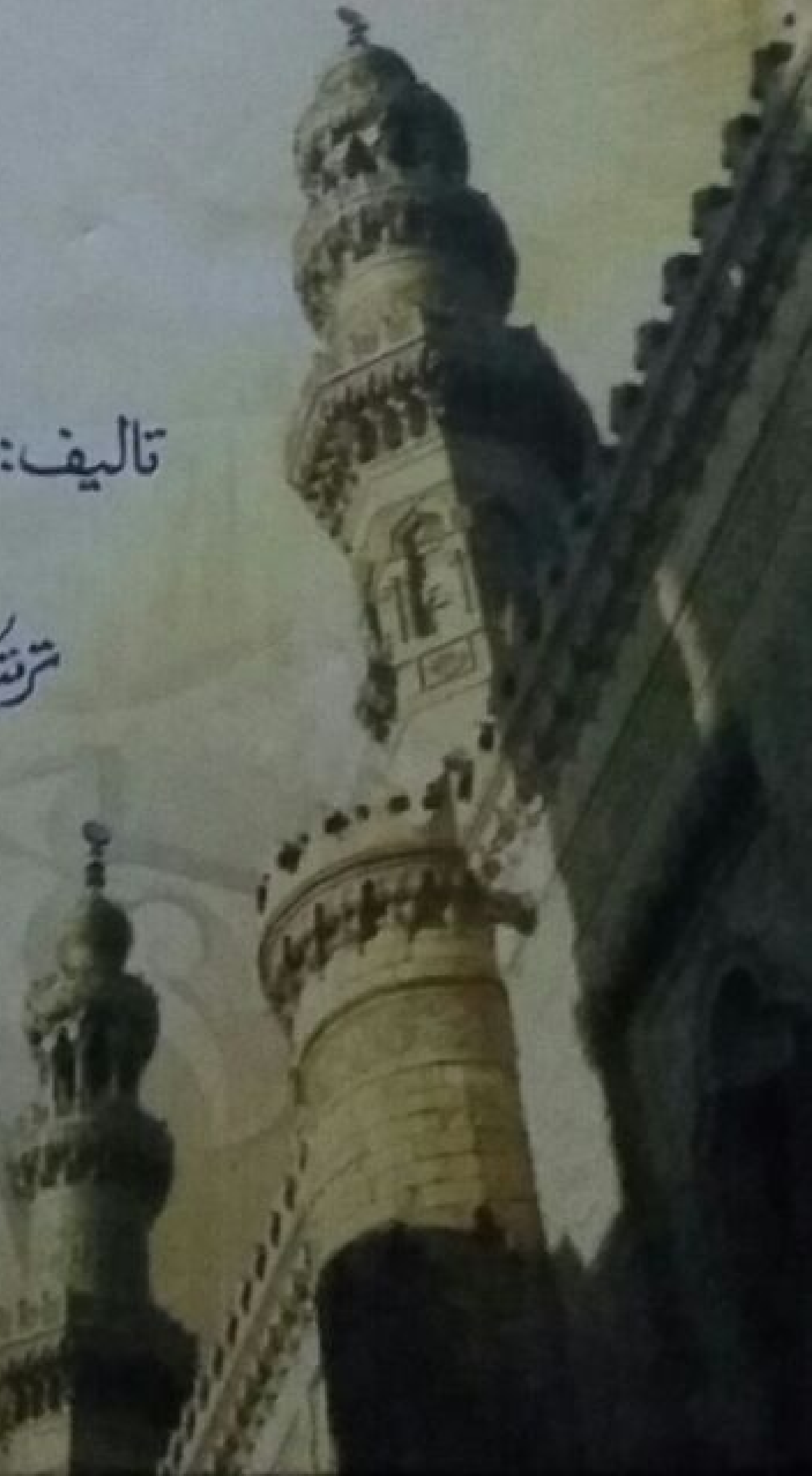

میں کہ مری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
(علامہ اقبالؒ)

کھوئے ہوؤں کی جستجو

(مختلف شخصیات کی وفات پر لکھے گئے تاثراتی مضامین کا مجموعہ)

مولف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ

ترتیب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
پن کوڈ: 276403 موبائل: 9235327576

تفصیلات

نام کتاب : کھوئے ہوؤں کی جستجو
مؤلف : حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ
مرتب : مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
صفحات : 616
طبع اول : جنوری ۲۰۰۷ء
ناشر : مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
قیمت : 200/=

ای میل: **zeyaulhaquekbd@gmail.com**

ملنے کے پتے

☆ فرید بک ڈپو پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲
☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئو ناتھ بھنجن 9236761926
☆ مولانا محمد خالد قاسمی مکتبہ دارارقم، اسلام آباد (ڈکہا) جون پور 9554983430

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

مقدمہ	مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی	۷
عرض مؤلف	حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی	۱۶

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱	حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ	۲۰
۲	حضرت مولانا محمد صابر صاحب مئویؒ	۲۸
۳	حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسولپوریؒ	۳۶
۴	مولوی کمال الدین صاحبؒ	۴۷
۵	حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوریؒ	۶۱
۶	حاجی محمد ایوب صاحب کلکتہ	۷۶
۷	جمیل بھائی (الہ آباد)	۹۴
۸	مولانا نذیر احمد صاحب خیرآبادیؒ	۱۰۱
۹	مولانا شکر اللہ صاحب ولید پوریؒ	۱۱۷
۱۰	**نسخۂ آدمیت** (حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتا بگڈھیؒ)	۱۳۱
۱۱	قربت میں تری ہم نے جو لطف اٹھائے ہیں (مولانا محمد احمد صاحب پرتا بگڈھیؒ)	۱۴۹
۱۲	مکاتیب محبت (مکاتیب مولانا محمد احمد صاحب پرتا بگڈھیؒ)	۱۶۸
۱۳	انیس بھائی مرحوم (ندوہ سرائے)	۱۸۳
۱۴	حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ	۱۹۰
۱۵	حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمھوریؒ	۲۰۵
۱۶	حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب فاروقی کاکورویؒ	۲۲۵
۱۷	حضرت مولانا محمد عمر صاحب مبارکپوریؒ	۲۲۹

۱۸	حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ	۲۳۲
۱۹	حضرت جی (مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلویؒ)	۲۴۳
۲۰	مولانا اشتیاق احمد ابن مولانا محمد احمد صاحب پرتا بگڈھیؒ	۲۴۵
۲۱	مولانا سید محمد مرتضٰی صاحب بستویؒ	۲۴۷
۲۲	مولوی ڈاکٹر سلطان الدین صاحب	۲۴۸
۲۳	مولانا حکیم وصی احمد صاحب گورکھپوریؒ	۲۵۰
۲۴	مولانا امانت اللہ صاحب معروفیؒ	۲۶۶
۲۵	مولانا محمد حنیف صاحب دیوبندی	۲۸۶
۲۶	مولوی مولیٰ بخش انصاری	۲۹۵
۲۷	حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ	۳۱۴
۲۸	حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ	۳۳۶
۲۹	شیخ عبد الفتاح ابو غُدہ	۳۳۸
۳۰	پیکر صدق وصفا (حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ)	۳۴۶
۳۱	نمونۂ اسلاف (حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ)	۳۸۳
۳۲	حافظ محمد فاروق صاحب معروفیؒ	۳۹۱
۳۳	مولانا عبد الحمید صاحب اعظمیؒ	۴۰۵
۳۴	حضرت مولانا عبد الحلیم صاحبؒ جونپوری	۴۰۷
۳۵	حاجی عبد الرحمٰن صاحب خیرآبادیؒ	۴۲۴
۳۶	حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں ندویؒ	۴۴۱
۳۷	حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ	۴۴۳
۳۸	مولانا محمد فاروق صاحب الہ آبادی	۴۴۶
۳۹	مولانا سید احمد صاحب ہاشمی	۴۶۲
۴۰	مولانا مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری	۴۶۲
۴۱	مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری	۴۶۲

۴۲	مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ	۴۶۸
۴۳	مولانا قاری حبیب احمد صاحب الہ آبادی	۴۶۹
۴۴	ڈاکٹر محمد سلیم صاحب	۴۸۶
۴۵	مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ	۴۹۰
۴۶	اہلیہ قاری محمد مبین صاحب (الہ آباد)	۴۹۷
۴۷	حافظ محمد ابراہیم صاحب (کلکتہ)	۵۰۱
۴۸	بابو عزیز الرحمٰن صاحب (اعظم گڈھ)	۵۰۵
۴۹	مفتی نسیم احمد صاحب دربھنگویؒ	۵۱۲
۵۰	صوفی عبد القدوس صاحبؒ	۵۱۷
۵۱	ظہیر بھائی	۵۲۵
۵۲	حاجی نعیم الدین صاحب (کٹیہار)	۵۲۸
۵۳	ڈاکٹر ساغر اعظمی	۵۲۹
۵۴	مولانا عبد الستار صاحب بھیروی	۵۳۴
۵۵	مولانا عبد اللہ صاحب مہاجر مدنی	۵۴۲
۵۶	حکیم محمد ایوب صاحب بلریا گنج	۵۵۲
۵۷	حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ	۵۵۸
۵۸	فدائے ملت حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ	۵۶۳

☆☆☆☆☆☆☆

☆	**ضمیمہ** ﴿تم سلامت رہو ہزار برس﴾	۵۶۸
۱	حضرت مولانا عبد الواحد صاحب دامت برکاتہم	۵۶۹
۲	مولانا حافظ قمر الدین صاحب نوناروی	۵۸۶
۳	انیس احمد صاحب انیسؔ الہ آبادی	۶۰۰

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میں کہ مری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
(علامہ اقبالؒ)

مُقَدِّمَۃ

یہ کتاب استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ کے قلم سے نکلے ہوئے ان تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے، جو ملک کی مختلف شخصیات پر ان کی وفات کے بعد لکھے گئے، اور مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ اب ان کی افادیت واہمیت کے پیش نظر ان کو یکجا کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

اس میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھیؒ، حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ، حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ، حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوریؒ جیسے اکابر ومشائخ بھی ہیں جن کی جلالت قدر وعظمت شان کے آگے ہر کہ ومہ کی گردنیں جھکی رہتی تھیں، حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ، حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ، مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ قاسمی اور حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوریؒ جیسے دیدہ ور ونکتہ رس فقیہ بھی ہیں، جن کی ذہانت وذکاوت اور علمی وفقہی بصیرت مسلمات میں سے ہے، اور حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی، مولانا محمد یحییٰ صاحب رسولپوریؒ، مولانا محمد مسلم صاحب بمھوریؒ، مولانا شکراللہ صاحب ولید پوری، جیسے مردم ساز اصحاب تدریس بھی ہیں، جو اپنے اپنے فن کے کاملین میں شمار کئے گئے، یہ سب وہ بزرگ اور اصحاب کمال ہیں جن سے مولف کے قریبی روابط وتعلقات رہے، اور ان میں سے اکثر کی شفقت ومحبت اور نظر عنایت حاصل رہی، جیسا کہ مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

لیکن اس میں بیشتر وہ گمنام مخلصین ہیں جن کو مولف کے قلم نے زندۂ جاوید بنادیا، یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے مولف سے محض دین کی نسبت سے محبت کی، اور انھیں ٹوٹ کر چاہا، ان حضرات کے تذکرے میں ان کی زندگی کے ان گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے جو حیات انسانی کے لئے مشعل راہ ہیں، مولف کے سحر طراز وشگفتہ نگار قلم کی ادبیت وچاشنی نے اس میں اس قدر دلکشی اور جاذبیت پیدا کردی ہے کہ وہ کہا کریں اور سنا کرے کوئی کا سماں پیدا ہوجاتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی انھیں شخصیات کے ساتھ چل پھر رہے ہیں، اور ان سے بات چیت کررہے ہیں، یہ کسی لکھنے والے کا انتہائی کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنے قاری کو بھی وہیں پہونچادے جس ماحول کی وہ تصویر کشی کررہا ہے، میں نے کئی لوگوں کو...... جنھوں نے مولف کے لکھے ہوئے ان تذکروں کو پڑھا...... یہ کہتے سنا کہ آپ کے ان تذکروں کو پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ ہم بھی آپ کی زندگی میں ہی مرجائیں تاکہ آپ ہمارا ذکر بھی اپنے قلم سے کردیں۔

یہ جتنے بھی تذکرے ہیں، سب فی البدیہہ اور برجستہ لکھے گئے ہیں، اس میں کسی قسم کی آورد اور تکلف وتصنع کا دخل نہیں ہے، اور نہ ہی کسی شخصیت کو اس کے مقام ومرتبہ سے گھٹا بڑھا پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے، بلکہ مؤلف نے جیسا انھیں محسوس کیا بے کم وکاست حوالۂ قلم کردیا، یہ اور بات ہے کہ الفاظ وعبارات کے حسن ترتیب، ترکیب کلام کی بندش وچستی اور زبان وبیان کی شگفتگی وبرجستگی کی نتیجہ میں تحریر ”سحر حلال“ کا نمونہ بن جائے، اور اس کی بے پناہ جاذبیت اور اثر آفرینی کی وجہ سے مبالغہ کا دھوکا ہونے لگے، مگر جو لوگ ان شخصیات سے قریبی واقفیت رکھتے ہوں گے، اور ان کی معلومات وقوت مشاہدہ درست ہو، وہ اس کی حرف بحرف تصدیق کریں گے، جیسا کہ ملک کے ایک مشہور ادیب نے ایک صاحب کے تذکرہ کو پڑھ کر کہا کہ

آپ نے تو فلاں صاحب کو بہت بڑھا دیا ہے، تو مؤلف نے پوچھا کہ آپ بتایئے کہ اس میں کوئی بات خلاف واقعہ بھی ہے؟ وہ تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر کہا کہ نہیں، جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کی صرف عمدہ تصویر کشی ہے جس میں مبالغہ کا گزر نہیں ہے۔

اس طرح کے تذکروں کے لکھنے کا مقصد و منشاء کیا ہے؟ اسے مؤلف کی زبانی سنئے، جو انھوں نے ایک عالم ربانی کے تذکرے کی تمہید میں لکھا:

”بعد والوں کا یہ بھی فریضہ ہے کہ اگلوں کے محاسن اعمال، مکارم اخلاق اور معالی احوال کو یاد رکھیں، ان کا مذاکرہ کریں، انھیں بعد والی نسل تک منتقل کریں، تا کہ بعد والوں کو یاد رہے کہ ان کے اسلاف کیسے تھے؟ ان میں اتباع سنت کی کیا شان تھی؟ ان کے احوالِ باطنی کیا کیا تھے؟ پھر ان کے دل میں حوصلہ اور ولولہ جاگے، کہ ہمارے بزرگ بھی خاک کے پُتلے ہی تھے، گوشت و پوست کے ڈھانچے ہی تھے، انھیں امراض و عوارض میں وہ بھی گھرے رہتے تھے جن میں آج کا انسان مبتلا ہے، مگر اس کے باوجود وہ بندگی کا حق کس طرح ادا کرتے رہے۔ انھوں نے اللہ کو راضی کرنے کے کیا کیا جتن کئے، انھوں نے دنیوی مال و دولت کو کس طرح اپنی ٹھوکر میں رکھا۔ کیا یہ سب کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص تھا، ان کے بعد جو خاک کے پُتلے تیار ہوئے، اور ہڈیوں کے جو ڈھانچے گوشت و پوست کا لباس پہن کر وجود میں آئے، کیا وہ اس صلاحیت سے محروم ہیں؟ جب انھیں یہ خیال آئے گا تو ان کے اندر کی سوئی ہوئی عبدیت جاگے گی، چھپا ہوا جذبۂ کمال ابھرے گا، خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑ سکتا ہے، ایک چراغ سے دوسرا چراغ جل سکتا ہے، ایک طوطی کی آواز سن کر دوسرا طوطی ترنم ریز ہوسکتا ہے۔ تو کیا معنیٰ کہ ایک انسان، دوسرے انسان کو دیکھ کر اسی راہ پر نہ چل پڑے۔

سیرت نویسی اور سوانح نگاری کی اصل منشاء یہی ہونی چاہئے، اور پڑھنے والوں کو بھی اسی نظر سے پڑھنا چاہئے، واقعات و حکایات کا بیان، شہور و سنین کا اہتمام، تاریخ و یوم کی تقدیم و تاخیر پر گہری نظر، مؤرخ کا فریضہ ہو تو ہو، سوانح نگار کو اس کا مکلّف نہیں بنایا جاسکتا، اس سلسلے میں اس کے تسامحات قابل عفو ہیں۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے، اسے مؤرخ کی نگاہ سے مت پڑھئے، بلکہ تذکیر و اعتبار کی نگاہ سے پڑھئے۔ انشاءاللہ آپ فائدے میں رہیں گے۔“

مولف کے قلم کی شگفتگی، ادبیت اور چاشنی محتاج دلیل نہیں، پڑھنے والے خود اس کا مشاہدہ کرلیں گے، نمونہ کے طور پر اس کتاب کے چند اقتباس پیش کر رہا ہوں، حضرت مولانا محمد احمد صاحب کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

”آہ! کہ زمانے کا نور، عہدِ حاضر کی برکت، ہادیٔ راہ شریعت، امام جادۂ طریقت، رہبر سالکان، رہنمائے گمرہان، نسخۂ آدمیت، پیکر لطف و محبت، ابر گہر بار رحمت، قدوۂ اصحاب شریعت، کاشف اسرار حقیقت، جانشینِ فضل رحمٰں، صاحب روح البیاں، عارف باللہ الصمد الشاہ **مولانا محمد احمد** قدس سرہٗ الاحد، نے اس دنیائے فانی کو باذن رب جلیل تقریباً تین چوتھائی صدی تک اپنے نور ایمانی اور شمع عرفانی سے جگمگا کر عالم آخرت کی راہ لی۔ کائنات اندھیری ہوئی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**

وہ جس نے آخری دور میں جنید و شبلی کی یاد تازہ کردی، جس کے انفاس طیبہ سے مشائخ پیشیں کی، خوشبو محسوس ہوتی تھی، جس کی نگاہوں میں ایمان و ایقان کی بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ جس کی گفتگو سے احسان و عرفان کے گلشن مہک اٹھتے تھے، جس کی شفقت و عنایت انبیاء کرام **علیہم السلام** کے لطف و کرم کی یادگار تھی، جس کی مبارک صحبت میں دلوں کو روشنی اور ایمان کو تازگی ملتی تھی، جس کی مجلس میں وساوس و خطرات کا صفایا ہو جاتا تھا، جس کی مسیحائی سے مردہ قلوب زندگی پاتے تھے،

آہ! کہ وہ پیکر محبوبیت تھا، وہ سراپا محبت تھا، وہ خالص اللہ والا تھا، اس کا ہر لمحہ، اس کی ہر ساعت، اس کی ہر ہر رگ، ہر ہر ریشہ وقف للہ تھا، وہ اپنا کچھ نہ تھا، وہ سب کچھ اللہ کا تھا، اللہ

کے لئے اس نے سب کچھ فنا کر دیا تھا، اپنے کو مٹا دیا تھا، اس کے بعد وہ کن درجات تک پہونچا اللہ ہی جانتا ہے۔"

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی علیہ الرحمہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"اگر آج کسی سے پوچھا جائے کہ تم نے جنید وشبلی کو دیکھا ہے؟ بایزید بُسطانی وابوالحسن خرقانی سے ملاقات کی ہے؟ شیخ عبدالقادر جیلانی وخواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کی ہے؟ خواجہ نظام الدین اولیاء وخواجہ نصیرالدین چراغ دہلی سے ملے ہو؟ میاں جی نور محمد وحاجی امداداللہ مہاجر مکی کی خدمت میں حاضر ہوئے ہو؟ تو اس کا جواب یقیناً یہی ہوگا کہ نہیں! پھر اس سے پوچھئے کہ تم نے باندہ والے حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب کو دیکھا ہے؟ اگر وہ کہے کہ ہاں انھیں دیکھا ہے، انھیں سنا ہے، ان سے مصافحہ کیا ہے، ان کا مہمان رہا ہوں، اگر وہ یہ کہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم نے پچھلے بزرگوں کا جلوہ دیکھا ہے، جنید وشبلی کا علم وعرفان، بایزید بسطامی وابوالحسن خرقانی کے مجاہدات وریاضات، شیخ عبد القادر جیلانی وخواجہ معین الدین چشتی کا فیضان عام، خواجہ نظام الدین وخواجہ نصیرالدین کی محبوبیت واتباعِ سنت، میاں جی نور محمد وحاجی امداداللہ کی روحانیت، سب کا نمونہ تم نے دیکھ لیا۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب اس دور ظلمت میں ایک ماہتاب ہدایت تھے، اللہ کی قدرت کاملہ کی حجت بالغہ تھے، اسلام کی حقانیت کی دلیل وبرہان تھے، وہ اس بات کے نشان تھے کہ آدمی خواہ کتنا ہی بے نوا ہو، ظاہری اسباب ووسائل سے تہی دامن ہو، دور افتادہ اور گمنام علاقہ میں ہو، جہل وضلالت کے ماحول میں ہو، لیکن اگر اس کے پاس ایمان کی طاقت، توکل کا سرمایہ، یقین کی پختگی، محبت کی سرشاری، اللہ کے لئے اخلاص سنت پر شیفتگی اور دین کا سچا درد ہو، نیز خدمتِ خلق کا جذبہ ہو، تو بے نوائی کی تہوں سے اس کیلئے بال وپر پیدا ہوں گے، اسباب ووسائل سے تہی دامنی، کامیابی کا زینہ بن جائے گی، علاقہ کی گمنامی اس کی شہرت کا دروازہ ثابت ہوگی، جہل وضلالت کی چٹانوں سے علم ومعرفت کا سرچشمے اُبل پڑیں گے۔"

حاجی محمد ایوب صاحب کلکتوی کے متعلق مضمون کی تمہید میں رقم طراز ہیں:

"انسان کی زندگی میں بعض شخصیتیں اتنی آہستگی اور لطافت کے ساتھ داخل ہوتی ہیں کہ بروقت احساس نہیں ہوتا کہ شب وروز کی گردش میں کسی نئی چیز کا اضافہ ہو رہا ہے، جیسے بادِ نسیم، صبح دم پھولوں کے درمیان آتی ہے، اور انھیں مس کرتی ہوئی گزر جاتی ہے، مگر ان میں زندگی کی نئی لہر دوڑ جاتی ہے، پنکھڑیاں کھلکھلا اٹھتی ہیں، اسی طرح کسی کسی شخصیت سے ابتداءً سابقہ پڑتا ہے تو کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوتی، بس جیسے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا جسم سے مس ہوا ہو، مگر کچھ مدت کے بعد ایسا لگتا ہے، جیسے وہ ہلکا سا جھونکا رگ رگ میں سرایت کر گیا ہو، اس سے روح شاداب ہو جاتی ہے، قلب میں ٹھنڈک اور جگر میں طراوت محسوس ہونے لگتی ہے، یہ شخصیتیں بے وہم وگمان مل جاتی ہیں، بغیر آرزو وتمنا کے دستیاب ہو جاتی ہیں، مگر دیر نہیں لگتی کہ وہی سراپا دل کی آرزو وتمنا بن جاتی ہیں، زندگی ان کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے، ان کا تصور انسان کے لئے فرحت ومسرت کا پیغام بن جاتا ہے، یہ واقعہ اکثر انسانوں کو پیش آتا ہے، کچھ لوگ اسے محسوس کر کے رہ جاتے ہیں، کسی کو دکھا اور بتا نہیں پاتے، اور کچھ لوگ اس کو زبان عطا کر دیتے ہیں، تو دنیا بھی اسے جان جاتی ہے، پھر وہ بہت سے لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن جاتا ہے، لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ تو خود ان پر بیتی ہوئی سرگزشت ہے، آج میں اسی طرح کی ایک سرگزشت کو الفاظ وعبارت عطا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، ایک شخصیت جو میری زندگی میں اس طرح داخل ہوئی کہ ابتداءً مجھے نہ کچھ التفات ہوا، نہ خیال، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد دیکھتا ہوں کہ جان ودل کا ریشہ ریشہ اس کی محبت میں بھیگ گیا ہے، اس نے مجھ سے محبت کی، مگر اس طرح کہ اس پر محبت کا گمان نہیں ہوتا۔"

میرے والد حاجی عبدالرحمٰن صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

"جمعہ کا دن تھا، جمعہ کی نماز کے بعد مدرسہ منبع العلوم خیرآباد کے وسیع صحن میں جنازہ کی نماز ادا کرنی تھی، بڑی مشکلوں سے ضبط کر کے جنازہ کی نماز اس حقیر نے پڑھائی اور اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا، پھر یہ محبّ ومحبوب رفیق خاکی چادر اوڑھ کر صبح قیامت کے لئے سو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ بنائے۔ مغفرت کی دلنواز ادائیں ہمدم ودم ساز رہیں، نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسُ کی صدائے روح پروران کو لوریاں

دے، عفو ودرگذر کا آب زلال تمام خطاؤں اور غلطیوں سے دھوکر پاک وصاف کردے۔“

حضرت مولانا علی میاں ندوی کے سانحہ ارتحال پر لکھتے ہیں:

”تکیہ رائے بریلی کا فقیر منش عالم، صاحب دل درویش، اسلام کا منادی، انسانیت کا نقیب، اللہ کا مخلص بندہ، نبی کا سچا امتی، دنیا کے ہر گوشے میں صدائے حق بلند کرتا ہوا، بارگاہ حق میں حاضر ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو۔ وہ اللہ سے خوش ہو۔

مرنا تو ہر ایک کو ہے۔ مگر کتنی خوش نصیبی ہے۔ ایسی موت، جس پر زندگی کو رشک آئے۔ رمضان شریف کی موت، وہ بھی اخیر عشرہ میں، جمعہ کا مبارک دن، قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے، اور تلاوت بھی اس سورہ کی جسے جمعہ کے روز پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ایک خاص نور حضرت حق کی بارگاہ سے عطا ہوتا ہے، یعنی سورہ کہف پڑھتے ہوئے حالت اعتکاف میں، اللہ کے صالح بندوں کے جھرمٹ میں، فرشتے قید زندگی سے رہائی کا پروانہ لے کر آئے۔ اور رمضان کی ۲۳؍تیئیسویں شب میں تدفین ہوئی، جس کے شب قدر ہونے کا احتمال تھا۔ اور تدفین ایسی سرزمین میں ہوئی، جو عرصۂ دراز سے انوار ولایت سے جگمگا رہی ہے۔ مسلسل اور بلا انقطاع اس کی آبادی سے لے کر اب تک نور ولایت وہاں چمک رہا ہے۔ اتنی سعادتوں کے بعد کس کا جی نہ چاہے گا کہ کاش ساری زندگی لے لی جاتی اور یہی موت نصیب ہوتی۔ خیر وسعادت کے تمام اسباب اس مسبب الاسباب نے جمع کردئے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے یہی امید ہے کہ حضرت مولانا گزشتہ بزرگوں کے درمیان رضاء الٰہی وخوشنودی انبیاء وصالحین سے نوازے گئے ہوں گے۔

أللّٰهم نور مرقده وبرد مضجعهٗ وأدخله الجنة وأرض عنه وأرضهٖ عنک یا أرحم الراحمین

یہ چند نمونے بغیر کسی استقصا اور تلاش کے دئے گئے ہیں، ورنہ اس طرح کے نمونے جا بجا ملیں گے، اس سلسلے میں ایک نمونہ اور پیش کرنا چاہتا ہوں جو اس کتاب کی تحریر تو نہیں ہے، بلکہ وہ میری کتاب ”اندلس میں اسلام“ کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئی:

”اندلس! اسلامی عظمت کا گہوارہ! تہذیبی وتمدنی جلووں کا نظر فروز نظارہ! علم وحکمت کا

زرخیز چمن زار! علماء وحکماء کا بہترین مطلع انوار! اسلامی عدالت وصداقت کا عظیم شاہکار! یورپ کی تاریک فضاؤں میں روشنی کا ایک بلند مینار! لیکن آہ کہ عبرتوں اور المناکیوں کی پُر درد داستان بھی! مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا دلدوز نوحۂ وماتم بھی! لکھئے تو قلم کا جگر شق ہو! پڑھئے تو دل بیٹھے بولئے تو درد کا طوفان اٹھے! سنئے تو آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب جائیں! اسلامی اندلس کی تباہی کے پانچ سو برس کے بعد کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو نگاہوں پر اشکوں کا پردہ پڑا جارہا ہے، جب یہ پردہ ہٹتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اندلس کی نہیں بلکہ اپنے ملک ہندوستان کی داستان لکھ رہا ہوں، ایک داستان گزر چکی ہے، اور ایک داستان تیار ہو رہی ہے جس کا میں خود ایک فرد ہوں“

ان اقتباسات سے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا کسی قدر اندازہ ہو گیا ہوگا، کتاب کی ترتیب سنینِ وفات کے اعتبار سے رکھی گئی ہے، یہ ترتیب نسبتاً اور دوسری ترتیبوں کے سہل تھی، اسی لئے اسی کو اختیار کیا گیا، جن کی وفات پہلے ہوئی ان کا تذکرہ پہلے رکھا گیا۔ ورنہ دوسری کسی اور ترتیب میں یہ دشواری تھی کہ کس کو مقدم اور کسے مؤخر کیا جائے۔

یہ کتاب کی جلد اول ہے، مؤلف دامت برکاتہم ابھی چند اہم شخصیات پر لکھنا چاہ رہے تھے، جیسے محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ، حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ (حضرت مفتی صاحب پر ایک مختصر سا مضمون شامل کتاب ہے) اور اپنے بعض اساتذہ اور بزرگوں پر، مگر مشیئت الٰہی انسان کے پختہ سے پختہ ارادوں کو بھی تار تار کردیتی ہے، کتاب، کتابت وترتیب کے مرحلے میں تھی کہ ۱۴؍ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ جمعہ کو مؤلف مدظلہٗ کے جسم کے دائیں حصہ پر فالج کا شدید حملہ ہوا، جس کی وجہ سے داہنا حصہ بالکل مفلوج ہوگیا، لکھنا پڑھنا تو دور کی بات ہے، کھانے پینے اور دوسرے حوائج ضروریہ تک میں معذوری ہوگئی، اور آج تقریباً دوڈھائی ماہ کے بعد جب کچھ لکھنے پڑھنے کے لائق صحت ہوئی تو میرے کہنے پر ایک

مختصر سا پیش لفظ بڑی مشکل سے تحریر فرمایا، اس پیش لفظ کے اخیر میں اسی فالج سے پیدا شدہ مجبوری ومعذوری کی طرف اشارہ ہے، حالانکہ مؤلف کا ارادہ اس پر ایک طویل مقدمہ لکھنے کا تھا، مگر وہ ارادہ نذرِ علالت، اور سردست جو ممکن ہوسکا پیش کیا جارہا ہے، اگر حضرات اہل علم اس میں کسی قسم کی خامی یا کوتاہی محسوس کریں تو مرتب کو مطلع کریں، مرتب ان کا شکر گزار ہوگا۔

اس مجموعے کا کیا نام رکھا جائے، یہ سوال جب سامنے آیا تو استاذ محترم مدظلہٗ نے اقبال کا یہ شعر سنایا

میں کہ مری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت ہے کھوئے ہوؤں کی جستجو

یہ شعر اس کے حسب حال ہے۔ اس لئے نام اسی سے اخذ کیا گیا۔

مؤلف نے اور بھی بہت سے کھوئے ہوؤں کا سراغ لگایا ہے، جن کو انشاء اللہ آئندہ پیش کیا جائے گا۔ خصوصاً حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی علیہ الرحمہ اور ان کے سلسلے کے تمام مشائخ کا تذکرہ حضرت مؤلف دامت برکاتہم کے قلم سے رسالہ ضیاء الاسلام میں آچکا ہے، ارادہ ہے کہ اسے بھی جلد ہی کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔

باری تعالیٰ ہمیں ان سچے نمونوں کی اتباع وپیروی کی توفیق عطا فرمائے، اور حضرت مولف دام ظلہٗ کو صحت کاملہ عاجلہ مستمرہ نصیب فرمائے، اور ان کے فیض کو عام وتام فرمائے اور ان سے زیادہ سے زیادہ استفادے کی توفیق بخشے۔ آمین

ضیاء الحق خیرآبادی

ایڈیٹر ماہنامہ ضیاء الاسلام
واستاذ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ
یکم؍ربیع الاول ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۲؍اپریل ۲۰۰۴ء پنجشنبہ

عرضِ مؤلف

مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہ علیہ الرحمہ کی طرف ایک قول منسوب ہے، جس کو بہت سے بزرگوں نے حدیث سمجھ کر نقل کیا ہے، لیکن علامہ سخاویؒ نے ’’**المقاصد الحسنة**‘‘ میں تحقیق کی ہے کہ وہ حدیث مرفوع نہیں ہے، بلکہ حضرت سفیان بن عیینہ علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے۔ فرماتے ہیں کہ **عند ذكر الصالحين تتنزل الرحمة**، جب صالحین کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔

کسی محدث سے ان کے شاگرد نے پوچھا کہ حدیث کس نیت سے لکھا کروں؟ فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ صالحین کے تذکرے سے رحمت اترتی ہے، عرض کیا کیوں نہیں؟ فرمایا رسول اللہ ﷺ سرتاج صالحین ہیں، آپ کے ذکر مبارک سے کتنی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں گی۔ اس طرح انھوں نے ایک بہترین نیت کی تعلیم دی۔ (’’**المقاصد الحسنة**‘‘ ص: ۲۹۸)

یہ کتاب جو قارئین کے ہاتھوں میں ہے، صالحین کے تذکروں پر مشتمل ہے، لکھنے والے نے ان تذکروں کو اسی نیت سے لکھا ہے کہ شاید رحمت الٰہی کا کوئی جھونکا اس کی طرف متوجہ ہوجائے۔ اور پھر جہاں جہاں تک یہ تذکرے پھیلیں گے، رحمت الٰہی کا جھونکا پھیلتا جائے گا۔ اور اگر صحبت صالحین میسر نہ ہو تو یہ ذکر صالحین کچھ اس کا قائم مقام بن جائے۔ ہوسکتا ہے کہ رحمت الٰہی کی یہ چشم التفات لکھنے اور پڑھنے والوں کی سیرت میں روشنی اور نکھار پیدا کردے۔

مجھے بچپن سے بزرگوں کے تذکروں اور سوانح عمریوں سے شغف ہے، بلکہ

عشق ہے۔ اس موضوع پر لکھا ہوا ایک ایک حرف پڑھتا ہوں، مجھے یاد ہے کہ مکتب کے دوسرے یا تیسرے درجہ میں تھا، تو میرے استاذ حضرت مولوی محمد یوسف صاحب علیہ الرحمہ نے ''سیرۃ الصدیق'' نامی ایک چھوٹا سا رسالہ پڑھایا تھا۔ اس سے مجھے اتنی دلچسپی ہوئی، کہ بار بار پڑھ کر بھی سیری نہیں ہوتی تھی، پھر اس کے بعد سلسلہ چل پڑا۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھ ڈالیں، اسی وقت میں نے علامہ شبلی کی ''الفاروق'' اتنی مرتبہ پڑھی کہ اس کے مضامین اور اس کے جملے حفظ ہو گئے پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ اس وقت سے اب تک کتنے تذکرے، سوانح عمریاں پڑھ چکا ہوں۔ اس راستے سے بزرگوں سے محبت پیدا ہوئی، قلب میں اس محبت کا رسوخ ہوا۔ پھر گفتگو میں، وعظ و تقریر میں، درس و تدریس میں، بکثرت ان حضرات کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے، اس کثرت سے ہوتا ہے کہ میرے خاص احباب نے ایک زمانہ میں میرا لقب ''تذکرۃ الاولیاء'' رکھ دیا تھا، پڑھنا اور زبانی دہراتے رہنا تو بہت ہوا، مگر کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ انھیں لکھا بھی کروں۔

مجھے پڑھنے کا ذوق بہت ہے، ذوق نہ کہئے شوق کہئے، بلکہ جنون کہئے، مگر لکھنے سے اتنی ہی بیزاری عرصہ تک رہی۔ اسی لئے اپنے علمی سفر میں مطالعہ تو بہت کیا، مگر قلم بہت کم اٹھایا۔

پہلا تذکرہ جو لکھا، وہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا تذکرہ ہے، جو بنام ''مصلح الامت'' سن ۱۴۰۶ھ میں شائع ہوا، پھر قلم پر سکوت طاری ہو گیا، چند چھوٹے چھوٹے کتابچے اور بعض مختصر مضامین لکھنے کی نوبت آئی، مگر دلچسپی نہ ہوئی۔

۱۴۱۳ھ سے ''مجلّہ المآثر'' مئو، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ کی یادگار میں، صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہٗ نے

آغاز کیا، اور اس خاکسار کو اس کا مدیر تحریر متعین کیا، تو مجبوراً قلم اٹھانے کی نوبت آئی، پھر میرے ذوق اور پسندیدگی کے اس موضوع پر حسب ضرورت قلم نے سفر شروع کیا اس سے چند سال پہلے مشہور صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی نور اللہ مرقدہٗ کا وصال ہوا تھا۔ ان کے ذکر پر دو مضمون لکھے۔

ان دونوں مضامین کی تحریر کے بعد خیال سمایا کہ جن بزرگوں کو میں نے دیکھا ہے، انھیں برتا ہے، اان کے معمولات کو جانتا ہوں ...... جو کچھ بھی جانتا ہوں ...... اور وہ دنیا سے جا چکے ہیں انھیں قلمبند کر دوں۔ چنانچہ یہ سلسلہ اب تک چلا جا رہا ہے،

اس مجموعہ میں جو مضامین اور تذکرے ہیں، سب ''مجلّہ المآثر'' کے آغاز کے بعد لکھے گئے ہیں، اس سے پہلے کا صرف ایک تذکرہ ہے جو دہلی کے ایک مرحوم رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اور وہ ہے ''جمیل بھائی'' کا تذکرہ۔ اس کے علاوہ سب تذکرے المآثر کے اجراء کے بعد لکھے گئے ہیں۔ جو لے دے کے تین چار رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ زیادہ تر تو مجلّہ المآثر میں۔ کچھ مرحوم انوار العلوم جہانا گنج میں اور کچھ ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور میں۔

ان اصحاب رشد و صلاح میں چند ہی حضرات وہ ہیں، جن سے میری ملاقات نہیں ہے، باقی سب حضرات سے میرے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ مجھے ان سے محبت تھی، میں نے انھیں محبت کی نظر سے دیکھا، مجھے ان میں خوبیاں دکھائی دیں، انھیں کو میں نے کاغذ پر نقش کر دیا، میں مؤرخ نہیں ہوں، ان مضامین میں ماہ و سال کی تعیین زیادہ نہیں ملے گی، بس ذوق و مزاج کی قابل تقلید خصوصیتیں ملیں گی۔ حسن سیرت اور حسن عمل کی تصویریں ملیں گی۔ محبت الٰہی اور عشق نبوی کی حلاوتیں ملیں گی۔ اور یہ سب وہ باتیں ہیں، جو جنھیں لکھنے والے نے اپنے قصور نظر اور کوتاہی علم و عقل کے باوجود محسوس کیا ہے، اسی لئے ان صالحین کے پہلو بہ پہلو ہر جگہ یہ حقیر وجود بھی

پڑھنے والوں کو نظر آئے گا، لیکن ظاہر ہے کہ مشاہدہ کو بیان کرنے کیلئے اس شخص کا وجود بھی ناگزیر ہے، جس نے مشاہدہ کیا ہے، تو لکھنے والے کی حیثیت شریک تذکرہ کی نہیں ہے، صرف مشاہد کی ہے، اس نے جو کچھ دیکھا، برتا اور محسوس کیا، اسے بے تکلف لکھتا چلا گیا۔ خودنمائی نہ مقصود ہے، اور نہ اس کی نیت ہے، لیکن اسے یہ خوب محسوس ہوا کہ جیسے وہ ان صالحین کی محبت میں سرشار ہے، یہ حضرات بھی اس پر کرم وعنایت کی نگاہ رکھتے ہیں، یہ ان کی عالی ظرفی اور بلند ہمتی تھی کہ ایک مشت خاک کو نوازتے رہے۔ اس تصور اور احساس سے محبت کی سرشاری اور بڑھتی تھی، پھر جب یہ سرشاری قلم کے راستے دل سے ٹپکنے لگی، تو میں نے اسے روکا نہیں، بلکہ برسنے دیا، جو کچھ برس رہا تھا۔ اب ان ترشحات میں اگر کسی کو خودنمائی یا خودستائی کی جھلک دکھائی دے تو بجز اس کے اور کیا عرض کیا جائے کہ

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد　　ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

میرے عزیز مولانا حافظ ضیاء الحق خیرآبادی سلّمہٗ نے ان بکھرے ہوئے مضامین کو بڑی محنت سے یکجا کیا، اس پر مقدمہ لکھا، اور وہی میری مجبوری کے باوجود مجھ سے یہ سطریں لکھوا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کے علم وعمل اور ذہن وقلم میں برکت عطا فرمائیں۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ

یکم/ربیع الاول ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۲/اپریل ۲۰۰۴ء پنجشنبہ

☆☆☆☆☆☆☆

نوٹ: یہ کتاب پونے تین سال قبل ناشر کے حوالہ کردی گئی تھی، مگر سوئے اتفاق کہ اس کا کتابت شدہ مسودہ اور سی ڈی دونوں گم ہوگئے، اب اسے دوبارہ اشاعت کیلئے بھیجا جارہا ہے، اللہ اس کی اشاعت کو آسان فرمائے، اور قبولیت سے نوازے۔

حضرت مولانا شاہ محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی

وفات: ۱۱/مارچ ۱۹۴۴ء

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی درس گاہِ تربیت و ارشاد سے جو ذرے ماہِ تاباں بن کر چمکے اور جن کی روشنی نمایاں طور پر محسوس کی گئی ان میں ایک روشن تر نام حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

> سلوک وطریقت، مسلک ومشرب، صورت وسیرت حتیٰ کہ نشست وبرکاست اور خط وکتابت اور گفتگو میں اپنے مرشد کامل سے اس درجہ مشابہت حاصل کرلی تھی کہ ان کو دیکھ کر کہنا پڑتا تھا، ع
>
> تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
>
> (یعنی اس کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں اور تم الگ الگ ہیں)

مولانا کا وطن ضلع الہ آباد میں ایک گاؤں محی الدین پور تھا، نسباً سادات کرام میں سے تھے، گھر کے خوشحال زمیندار تھے، مولانا کی ولادت ۱۳۰۰ھ میں ہوئی، طبیعت میں دینداری ابتدا ہی سے تھی، والد صاحب نے انگریزی تعلیم میں لگایا لیکن دینی کتابیں بھی مطالعہ میں رہا کرتی تھیں، بالخصوص حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے مواعظ جن کا اس دور میں خاص شہرہ تھا اور شائع ہوکر مقبول خاص وعام ہورہے تھے، ان کا مطالعہ بہت شوق سے کرتے تھے اور اس کی وجہ سے حضرت تھانویؒ سے غایت

درجہ عقیدت تھی، ۱۹۰۲ء میں جب وہ بی۔ اے میں زیر تعلیم تھے تو حسن اتفاق سے حضرت حکیم الامت کی تشریف آوری الہ آباد میں ہوئی، ریلوے اسٹیشن کے قریب شیخ عبداللہ کی مسجد میں مقیم ہوئے اور جابجا شہر میں وعظ ہوتے رہے۔ ’’خواندہ‘‘ اور ’’شنیدہ‘‘ جب ’’دیدہ‘‘ بنا تو دل کا عالم کچھ اور ہی ہوگیا۔ اب وہ تھے کہ دل محبت الٰہی، عشق نبوی اور عظمت شریعت کا روشن چراغ تھا اور واسطہ چونکہ حضرت تھانویؒ تھے اسلئے ان کے ساتھ والہانہ وارفتگی تھے، دنیاوی تعلیم فراموشی کی نذر ہونے لگی، بی۔ اے کی انگریزی خوانی تسبیح وتہلیل کی زمزمہ خوانی بدلنے لگی، دنیاوی مناصب ومراتب کی ہوس نکل گئی اور قرب خداوندی کی تڑپ پیدا ہوگئی۔ بی۔ اے کا امتحان دیا اور ناکام ہوگئے۔ کتنی خوش کام تھی یہ ناکامی کہ اس نے آخرت کی کامیابی کا دروازہ کھول دیا، اب انگریزی پڑھنے کے ارادہ ہی سے ہاتھ اٹھالیا، البتہ ٹریننگ حاصل کرلی اور فتحپور رہسوہ میں ضلع اسکول کی ماسٹری مل گئی۔ تھانہ بھون حاضر ہوکر حضرت تھانویؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوگئے۔ فتحپور میں طبیعت کا رجحان ہوا کہ دینی علوم کی تکمیل کرلَینی چاہئے، اس وقت مدرسہ اسلامیہ میں ایک متبحر عالم مولانا نور محمد صاحب تھے جو عالم فاضل ہونے کے ساتھ ایک صاحب نسبت بزرگ بھی تھے، ان سے درخواست کی مولانا نے پڑھانا منظور کرلیا، اسکول کی ڈیوٹی سے فارغ ہوکر ساڑھے چار بجے شام کو مولانا کے درس میں شرکت کرتے، اس طرح حضرت مولانا نے فقہ، حدیث اور تفسیر کا باقاعدہ درس لیا۔ مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ:

> ’’حضرت کے ایک ہم سبق مولوی صاحب فتحپوری ناقل تھے کہ مولانا محمد عیسیٰ صاحب کا ریاض اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جب حضرت استاذ کچھ تقریر فرمانے لگتے تو ہم پاس بیٹھنے والوں کو صاف محسوس اور مسموع ہوتا تھا کہ

> مولانا عیسیٰ صاحب کا قلب ذکر کررہا ہے‘‘۔

فتحپور سے حضرت مولانا کا تبادلہ لکھنؤ ہوگیا، وہاں سے حضرت مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلّی کے ہمراہ اپنے والد کو لے کر حج پر تشریف لے گئے۔ لکھنؤ سے مرزاپور، الہ آباد، فیض آباد تبادلہ ہوتا رہا۔ فیض آباد میں ۴۵/سال کی عمر میں حفظ قرآن کا داعیہ پیدا ہوا، چنانچہ کچھ مدت میں یہ دولت بھی حاصل کرلی۔ ۱۹۲۳ء میں الہ آباد تبادلہ ہوا اور یہاں ۱۹۳۷ء میں پنشن لے کر سرکاری ملازمت سے یکسوئی حاصل کرلی اور مرشد کے حکم سے اپنے وطن میں مقیم ہوکر طالبین کی تعلیم وتربیت میں مشغول ہوگئے۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب حضرت مولانا تھانویؒ کے اخص الخواص خلفاء میں تھے، حضرت نے خلفاء کی جو فہرست شائع کی تھی، اس میں سب سے پہلا نام انھیں کا ہے۔ زہد وتقویٰ میں آپ کا خاص مقام تھا۔ حضرت حکیم الامتؒ نے سب سے زیادہ طالبین تربیت کے لئے آپ ہی کے سپرد کئے تھے۔

علامہ سید سلیمان صاحب ندوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

> ’’اللہ کی شانِ بندہ نوازی نظر آتی ہے کہ انڈر گریجویٹ مین جس نے صرف انگریزی ہی کی تعلیم پائی تھی، چندروز میں یہ انقلاب پیدا ہوا کہ اس نے اس عمر میں آکر سرکاری ملازمت کے ساتھ عربی کی تعلیم پوری کی اور قرآن وحدیث کا علم حاصل کیا اور ساتھ ہی قرآن پاک حفظ کیا اور سیرت وصورت میں یہ رنگ پیدا کیا کہ کوئی دیکھ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی جانتا ہے۔ وہ نہایت عابد وزاہد اور مرشد کے اصولوں کے سختی سے پابند تھے‘‘۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے خاص مسترشد جو بعد میں حضرت مولانا

شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے مجازِ بیعت ہوئے، حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب مدظلہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت مولانا کہیں تشریف لے جا رہے تھے کئی لوگ ساتھ میں تھے، میں نے کسی موقع پر عرض کیا کہ حضرت جب گفتگو کرتے ہیں، جب چلتے ہیں یا اور بھی کوئی کام کرتے ہیں تو بے ساختہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یاد آ جاتے ہیں، حضرت کا ہر کام حضرت تھانویؒ کے بالکل مشابہ ہے۔ قاری صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ عرض کیا اور حضرت تھانویؒ کا نام ان کے کان میں پڑا تو وہیں رُک گئے اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے اور میری طرف رخ کر کے فرمایا:

> ’’جی ہاں! ابتداءً میں نے بہ تکلف حضرتؒ کی نقل کی پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی رنگ میں ڈھال دیا‘‘

قاری صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت تھانویؒ جاڑوں میں اونی کپڑے استعماک کرتے تھے اور سر پر دوہرا رومال عمامہ کے مثل باندھ لیا کرتے تھے، حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب بھی ہمیشہ جاڑوں میں اسی طرح اونی لباس استعمال کرتے اور سر پر دوہرا رومال باندھا کرتے، ایک سال دیکھا کہ روئی دار لباس پہنے ہوئے ہیں ہم لوگوں کو تعجب ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت تھانویؒ نے بھی روئی دار لباس استعمال فرمایا ہے، اونی کپڑوں کو کیڑے لگ گئے تھے، حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ ان کپڑوں کی حفاظت ایک مستقل مشغلہ ہے اب روئی دار کپڑے بنوا دئے جائیں۔ اُدھر ان کے بدن پر روئی دار کپڑا آیا اور اِدھر حضرت مولانا نے بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔

حضرت مولانا کو ذکر و عبادت، اتباعِ سنت، نماز با جماعت کا خاص اہتمام تھا، آپ کی مجالس اسی ذکر و تذکرے سے ہمیشہ معمور رہا کرتی تھیں۔ میں نے براہ راست حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب کی زبانی سنا کہ حضرت مولانا شاہ

وصی اللہ صاحبؒ نے ایک بار حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ چاہا کہ تہجد و عبادت میں ان سے سبقت لے جاؤں، خانقاہ میں بہت سویرے اٹھا تو دیکھا کہ حضرت مولانا تہجد میں مصروف قرأت ہیں اور دوسرے دن اور سویرے اٹھا تو آج بھی دیکھا کہ مولانا پہلے سے نیت باندھے ہوئے ہیں، میں نے خیال کیا کہ ان سے بازی لے جانا مشکل ہے۔

فرمایا کہ مولانا کو ذکر میں بڑی محویت ہوتی تھی، ایک بار ذکر کرتے ہوئے خانقاہ کی طرف آ رہے تھے، ذکر کی محویت میں انھیں کچھ خیال نہیں رہا خانقاہ کے پھاٹک سے آگے بڑھ گئے میں پیچھے پیچھے تھا، میں نے جا کر عرض کیا تو فرمایا **جزاك الله** مجھے یاد ہی نہیں رہا۔

حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا الٰہ آباد پنشن لینے آتے تو ایک خاص جگہ ٹھہرا کرتے اور قاری صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع کرتے، یہ ان کی خدمت میں پہونچ جاتے، مولانا خیریت دریافت کرنے کے بعد پہلا سوال یہ کرتے کہ نمازوں کی جماعت کے اوقات کیا کیا ہیں؟ پھر ہر نماز سے پانچ منٹ پہلے مسجد میں آ جاتے حالانکہ قاری صاحب کی مسجد آپ کی قیام گاہ سے کافی فاصلہ پر تھی، مگر اہتمام سے ہر نماز سے پہلے مسجد میں آ پہونچتے، جماعت کی نماز سے حضرت مولانا کو عشق تھا، آپ کی ہر مجلس میں نماز کی تاکید کا ذکر ضرور آتا۔

سید صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ:

> ’’اپنے مرشد کی متعدد کتابوں کے خلاصے اور شروح شائع کئے، جن میں سب سے اہم ’’انفاسِ عیسیٰ‘‘ ہے جو سلوک اشرفی کی معتبر ترین کتابوں میں ہے۔ مردوں کے لئے ’’بہشتی زیور‘‘ کا خلاصہ ’’بہشتی ثمر‘‘ کے نام سے

کیا جو مکاتیب میں رائج ہوئی، تفسیر ''بیان القرآن'' کا خلاصہ مترجم قرآن کے حواشی کے طور پر کیا جو الہ آباد میں زیر طبع تھا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''کمالاتِ امدادیہ'' کے طرز پر انھوں نے ''کمالاتِ اشرفیہ'' لکھی جو فن سلوک و معرفت کے متعلق ان کی استعداد و صلاحیت کی آئینہ دار ہے۔ حدیث میں ''ازالۃ الوسن بالف من السنن'' اردو ترجمہ کے ساتھ ان کی مفید تالیف ہے۔ زہد وورع، اخلاق اور سلوک کی ایک ہزار حدیثیں جمع کی ہیں''

مولانا جامیؔ صاحب کے بھتیجے مفتی مجد القدوس سلّمہٗ خبر دیتے ہیں کہ آخری کتاب کا ایڈیشن پاکستان میں بنام ''انتخابِ مشکوٰۃ'' شائع ہوگیا ہے۔

سید صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

صاحبِ مقامات، مستجاب الدعوات اور وارداتِ صحیحہ سے سرفراز تھے۔ کالج سے پنشن لینے کے بعد اپنے گاؤں میں مقیم ہوگئے تھے اور متوسلین کو اپنے رشد و ہدایت سے سیراب کرتے تھے، اسی عالم میں دو برس ہوئے کہ ۱۹۴۰ء میں ایک شب تہجد کے لئے اٹھے تو فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد امسال دوسرا حملہ ہوا جس کے علاج کے لئے جونپور آئے جہاں ۱۱/ مارچ ۱۹۴۴ء کو تیسرا حملہ ہوا اور زبان بند ہوگئی، وفات کے آخری لمحہ میں آخری بار زبان کھلی اور تین دفعہ بلند آواز سے ''اللہ اللہ'' کہا اور جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔

عجیب بات یہ ہے کہ جونپور میں وہ بالکل مسافرانہ وارد تھے، لیکن حضرت تھانویؒ کے متعدد خلفاء، مجازین اور صحبت یافتہ بغیر کسی ظاہری داعیہ کے عین وقت پر پہونچ گئے، انھیں میں ایک نے یٰسین پڑھی، ایک

نے غسل دیا، ایک نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور سب نے پڑھی اور دو نے قبر میں اتارا، جونپور ہی کی ایک اکبری مسجد کے عقب میں ۲/ بجے رات کو تدفین عمل میں آئی، رحمہٗ اللہ تعالیٰ۔''

جونپور میں جیسا کہ مولانا مجد القدوس سلّمہٗ لکھتے ہیں، حضرت مولانا الہ آبادیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خویش جناب سید حسین صاحب کمشنر کے مکان پر بغرض علاج مقیم تھے اور علاج کرا رہے تھے اپنے پیر بھائی حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفیؒ سے! حضرت ڈاکٹر صاحب ہومیو پیتھ معالج تھے، حضرت تھانویؒ نے بھی اپنی زندگی کے آخری ایام میں ڈاکٹر موصوف سے چند روز علاج کرایا تھا، اتباعِ شیخ میں غلبۂ عشق و محبت نے حضرت مولانا کو بھی جونپور ان کے علاج سے استفادہ کے لئے پہونچا دیا۔ اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ وفات کے وقت مفتی مجد القدوس سلّمہٗ کی خبر اور روایت (جو انھوں نے سید حسین صاحب کمشنر سے سنی، اور سید صاحب کے مضمون میں بھی اس کا ذکر بغیر نام کے ہے) کے مطابق حضرت تھانویؒ کے چار جید خلفاء بغیر کسی ظاہری سبب کے عین وقت پر پہونچ گئے، اور ایک صاحب تو معالج ہی تھے۔

(۱) خسرو بارگاہ تھانوی حضرت خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب علیہ الرحمہ
(۲) حضرت مولانا شاہ عبد الغنی پھولپوری علیہ الرحمہ
(۳) حضرت علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ
(۴) حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفی علیہ الرحمہ (معالج)
(۵) حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب مدظلہٗ

جو خود نیک و صالح تھا جس نے اپنی ساری زندگی عشق الٰہی کی سوز و مستی میں گزاری، جو سراپا دین تھا، دینداری کا نمونہ تھا اس کا آخری وقت بھی کتنا پاکیزہ ہوا!

زبان فالج کی وجہ سے بند تھی مگر یکا یک کھل گئی اور جو نام اس نے زندگی بھر رٹا تھا آخری وقت میں وہی نعرہ مستانہ لگاتا ہوا دنیا سے گزر گیا، اور آخری مرحلہ کے رفقاء و معاونین جو دستیاب ہوئے، سبحان اللہ ایک سے بڑھ کر ایک، ان میں سے کوئی ایک اگر کسی کے جنازہ میں شریک ہو جائے تو میت کی خوش بختی ہے اور یہاں پانچ پانچ بیک وقت موجود ہیں، تجہیز و تکفین کا ہر کام عین سنت نبوی کے مطابق، اللہ اللہ اس موت پر زندگی نچھاور اور اس بیماری پر شفا نثار! حق تعالیٰ حضرت مولانا کے درجات اعلیٰ علیین میں بلند فرمائے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت مولانا الہ آباد پنشن لینے آتے تھے، ایک بار تشریف لائے اور حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب مدظلہ حاضر ہوئے تو فرمایا ”جتنی اختیاری سنتیں ہیں سب پر اپنے اختیار سے اہتمام کے ساتھ عمل کرتا رہا ہوں مگر ایک سنت غیر اختیاری ہے، جی چاہتا ہے کہ اس پر بھی عمل ہو جائے، وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ۶۳/سال کی عمر میں ہوا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ۶۳/سال میں میرا انتقال ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے لئے یہ آسان ہے کہ اس پر بھی عمل ہو جائے تو فالج کا اثر ہوا اور اس کے بعد وقفہ وقفہ سے دو تین بار حملہ ہوا، بالآخر ۶۳/سال کی عمر میں وصال فرمایا۔ ایک سچے متبع سنت نے دل سے جو بات چاہی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے پورا کر دیا۔

اوچنیں خواہی خدا خواہد چنیں   می دہد یزداں مرادِ متقیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(یہ مضمون ”ذکر جامی“ میں شائع ہوا ہے، سن تحریر ۱۹۹۳ء)

حضرت مولانا محمد صابر صاحب مئویؒ

والد بزرگوار حضرت محدثِ کبیر علیہ الرحمہ

وفات: ۲۱/ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ

استاذ محترم مدظلہ نے محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کی مفصل سوانح لکھنی شروع کی تھی، مگر بعض عوارض کی بنا پر تقریباً سو، سوا سو صفحات کے بعد قلم کا یہ سفر رکا تو اب تک رکا ہی رہ گیا، اور یہ نامکمل سوانح حضرت محدث الاعظمیؒ کے زمانہ تدریس تک کے حالات پر مشتمل ہے، یہ مضمون اسی سوانح کا حصہ تھا، اسے اب اس کتاب کا جز بنایا جا رہا ہے، از: مرتب

حضرت مولانا کے والد ماجد کا اسم گرامی مولانا محمد صابر تھا، مولانا موصوف نہایت متقی، مخلص، اور نمونہ سلف انسان تھے، علوم دینیہ کی تحصیل باقاعدہ کی تھی، حضرت مولانا عبد الغفار صاحبؒ اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابو الحسن صاحب کے شاگرد تھے۔

حضرت محدث جلیل نے اپنی قلمی یادداشت ”وفیات الاعیان“ میں اپنے والد محترم کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

پدر بزرگوار و ولی نعمت ایں فقیر عالم باسند و تلمیذ مولانا عبد الغفار واخویہ و در طریق چشتیہ مرید حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی بغایت متشرع و متقی و زاہد و تہجد گزار و مہمان نواز و بے نفس و خوش اخلاق بودند، و کان اواھاً تلاء للقرآن“

اس فقیر کے والد محترم اور ولی نعمت سند یافتہ عالم تھے، مولانا عبد الغفار صاحب

اور ان کے دونوں بھائیوں کے شاگرد تھے، سلسلۂ چشتیہ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید تھے۔ انتہائی پابند شرع، پرہیز گار، عابد وزاہد، مہمان نواز، متواضع اور خوش اخلاق تھے۔ یادِ خدا میں کثرت سے رونے والے، اور قرآن کریم کی بکثرت تلاوت کرنے والے تھے۔

مولانا موصوف اپنی دینداری اور ورع وتقویٰ کے باعث اپنے حلقے میں نہایت عزت واجلال کا مقام رکھتے تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں خصوصی امتیاز رکھتے تھے، ان کے سامنے کسی منکر کے ارتکاب کی جرأت مشکل سے ہوتی تھی، اس سلسلہ میں وہ زبانی نصیحت کے ساتھ ہاتھ کی قوت کو بھی کام میں لاتے تھے، کسی کی مجال نہ تھی کہ اان کے سامنے کوئی خلاف شرع کام کرے، اس وصف میں وہ اس درجہ معروف تھے کہ انھیں دیکھتے ہی اشرار اپنی شرارت بھول جاتے تھے۔

اس کے ساتھ معاملات کے اتنے صاف ستھرے تھے کہ فی زمانہ ان کی باتیں سن کر حیرت ہوتی ہے، ان کے حفید رشید مولانا رشید احمد صاحب کی روایت ہے کہ وہ اپنے یہاں جب مزدوروں کو کام پر لگاتے تھے تو ان کا کام اور وقت پورا ہونے سے پہلے ہی ہر ایک مزدور کی اجرت الگ الگ ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوجاتے، اور جونہی مزدور اپنے کام سے فارغ ہوتا اسے فوراً مزدوری دے دیتے۔ حتیٰ کہ اگر مزدور چھت پر کام کرتا ہوتا تو سیڑھی کے پاس مزدوری لے کر کھڑے رہتے۔ اور اس کے زمین پر قدم رکھنے سے پہلے مزدوری دے دیتے۔

گھر جو مزدور کام کرتے تھے، گھر کے بچوں کو حکم تھا کہ ہر ایک کی عمر کے لحاظ سے اس کے تعظیمی خطاب کے ساتھ نام لیں۔ خواہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، مثلاً فلاں بھیا، فلاں چچا، فلاں بابو وغیرہ۔ بظاہر یہ باتیں معمولی اور چھوٹی معلوم ہوتی ہیں، مگر انھیں چھوٹی باتوں میں انسانیت اور تدین کی بڑائیاں پوشیدہ ہیں۔ احترام

انسانیت کی یہ آخری حد ہے کہ اپنے ماتحتوں اور خدمت گزاروں سے تخاطب کا وہی انداز اختیار کیا جائے، جو بڑوں کیلئے ہوتا ہے، یہ اخلاق کی بلند ترین معراج ہے۔

مولانا محمد صابر صاحب پرانے متوکل علماء کے طرز پر اپنی زندگی کو دین اور علم دین کی خدمت میں وقف کئے ہوئے تھے، اپنے محلّہ کی مسجد میں بڑی عمر کے ناخواندہ افراد کو حسبۃً للہ پڑھایا کرتے، یہ خدمت انھوں نے مسلسل ۳۶؍سال تک انجام دی ہے، اس طویل مدت میں اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کتنے لوگوں نے آپ سے استفادہ کیا ہوگا، (تذکرۂ علمائے اعظم گڈھ، ص:) کیوں کہ یہ مدرسہ رجسٹر حاضری اور رجسٹر داخلہ کے قوانین سے بے نیاز تھا، یہاں طلبہ کی گنتی نہیں ہوتی تھی، انھیں دین اور علم دین پلایا جاتا تھا، نہ چندہ تھا، نہ اشتہار تھا، نہ امتحان تھا، بس مسجد کی چٹائی تھی، ایک استاذ، معمر طلبہ تھے، امیوں کو تعلیم دی جاتی تھی اور اجرت ومزدوری اللہ سے لی جاتی تھی۔

کسب معاش کے لئے اپنے آبائی پیشہ پارچہ بافی کو کام میں لاتے رہے، چونکہ طبعاً قناعت پسند تھے، دولت وثروت جمع کرنے کے وسوسہ سے بھی پاک تھے، اسلئے روزانہ ایک خاص حد تک اپنے ہاتھ سے معاش کا کام انجام دے کر، نماز وتلاوت اور خدمت دین میں مشغول ہوجاتے، طبیعت میں انتظام کی صلاحیت اور نعمت الٰہی کی قدردانی بھی اعلیٰ درجہ کی تھی، بڑھاپے میں چرخہ (رہٹا) پر نری (۱) بھرا کرتے تھے، نری بھرتے ہوئے دھاگے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو ٹوٹتے رہتے ہیں، انھیں لوگ عام طور سے اِدھر اُدھر ڈال دیتے ہیں۔ مگر مولانا ٹوٹے ہوئے دھاگوں کو ایک خاص انتظام سے ترتیب کے ساتھ ایک جگہ رکھتے جاتے، جب ضرورت کے بقدر نری بھر چکتے تو ان سارے دھاگوں کو ایک دوسرے میں گرہ گرہ

---

(۱) کپڑا بننے کیلئے بانے کا دھاگہ مستطیل مدور لکڑیوں پر چرخے سے لپیٹا جاتا ہے، اسکو نری کہتے ہیں

دے کر باندھتے اور ان کی بھی نری بھرتے چلے جاتے اور جب چرخہ کے پاس سے اٹھتے تو ایک بھی دھا گا وہاں نہ ہوتا، بظاہر یہ ایک دقت طلب کام ہے۔ اور بہت سارا وقت اس کیلئے درکار معلوم ہوتا ہے، آج کا عدیم الفرصت انسان سوچے گا کہ اتنا وقت فضول کیوں اس چھوٹے سے کام میں لگایا جائے، اور کوئی دوسرا کام اس وقت میں انجام دیا جائے۔ لیکن آپ غور کریں گے تو پرانے مخلص بزرگوں کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی تھی، ان کاموں میں ان کا زیادہ وقت نہیں صرف ہوتا تھا۔ اسلئے انھیں خدمت کے مواقع بھی خوب مل جاتے تھے، تھوڑے وقت میں کام زیادہ ہوتا تھا۔ اتنا زیادہ کہ آج کا عدیم الفرصتی کا مارا ہوا انسان اسے سوچ بھی نہیں سکتا، آج تو ہر کام میں وقت زیادہ لگتا ہے اور کام بہت کم ہوتا ہے۔ اللہ سے دوری اور غفلت کی وجہ سے ہر کام میں، ہر شئے میں عجب بے برکتی اور بے رونقی چھا گئی ہے، تیز رفتار سواریاں ہیں، کام کرنے کے برق رفتار آلات ہیں، ہر طرح کی سہولت میسر ہے، لیکن لوگ تھوڑی زندگی میں جتنا کام کر گئے آج لمبی زندگی پا کر اس کا عشر عشیر نہیں ہوتا۔

مولانا محمد صابر صاحب تقویٰ اور تدین کے ساتھ، اور صرف بقدر ضرورت تحصیل معاش کے باوجود کشادہ دست اور فراخ دل تھے، ہمیشہ اپنے گھر پر مدرسہ کے چند غریب طلبہ کو رکھتے تھے جو دن کو مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے اور رات میں مولانا کے یہاں مقیم ہوتے، کھانا، ناشتہ سب یہیں ہوتا۔ راقم الحروف جس گاؤں کا رہنے والا ہے، وہاں کے کئی طلبہ مولانا مرحوم کی اس فیاضی اور کشادہ دستی سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ (۱)

---

(۱) یہ معلومات مولانا کے حفید رشید وسعید مولانا رشید احمد صاحب اور حاجی سعید احمد صاحب سے حاصل ہوئے ہیں،

مولانا امانت و دیانت کے وصف میں بھی ممتاز تھے، جامعہ مفتاح العلوم کی جب نشاۃ ثانیہ ہوئی تو مولانا مرحوم اس کے خزانچی قرار پائے، اور عرصہ تک اس کے نائب ناظم بھی رہے۔

ان اوصاف حمیدہ وخصائل محمودہ نیز زہد وتقویٰ اور معارف پروری کے ساتھ مولانا احسان وسلوک کے بھی بلند مقام پر فائز تھے، اوپر ان کے عالی مقام فرزند کے حوالے سے یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے بیعت تھے، اذکار واشغال اور تلاوت وتہجد کے بغایت پابند تھے۔ اور اس میں انھیں استقامت کا مقام اور احسان کا درجہ حاصل تھا۔ خواہ کوئی موسم ہو، صحت کا جو حال ہو، مشغولیات چاہے جس قدر ہوں، ہمیشہ دو ڈھائی گھنٹے رات رہے اٹھ جاتے تھے، اور ضروریات سے فارغ ہو کر خشوع وخضوع کے ساتھ قیام لیل میں مشغول ہو جاتے۔ دعا نہایت گریہ وزاری سے کرتے، صبح تک ذکر وتلاوت کی مشغولی رہتی، یہ معمول ہمیشہ کا تھا، گمنام رہے، گمنام گزر گئے، مگر جس کے جاننے اور جس کے راضی کرنے کیلئے یہ جوکھم اٹھاتے تھے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے، پھر اس کا صلہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ ایک ایسا فرزند ان سے وجود میں آیا، جو تا دم قیامت ان کے لئے حسنات وبرکات کا سبب بن کر رہا۔ ان شاء اللہ

صاحب تذکرۂ علماء اعظم گڈھ نے حضرت محدث الاعظمیؒ کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کے تدین وتقویٰ کا اثر ان کے روشن ضمیر شیخ پر کس قدر تھا، اور ان کی کیسی عظمت ووقعت شیخ کے قلب میں تھی لکھتے ہیں:

> ”ایک مرتبہ مولانا نے ان کے (حضرت محدث اعظمی کے) ذریعے ایک رومال حضرت تھانوی کی خدمت میں بھیجا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن

صاحب دامت برکاتہم نے حضرت تھانوی سے عرض کیا کہ والد صاحب نے یہ ہدیہ پیش کیا ہے۔ تو حضرت تھانوی نے اس کو سر پر رکھ کر فرمایا کہ یہ آپ کے والد صاحب کا ہدیہ نہیں تبرک ہے۔ (تذکرۂ علماء اعظم گڈھ، ص:)

مولانا مرحوم کی جہاں اور خصوصیات تھیں، ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہر مسلمان سے سلام کرنے میں سبقت کرتے تھے۔ اس وصف میں کوئی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ باوجود کوشش کے، کوئی دوسرا ان کو سلام کرنے میں پہل نہیں کرپاتا تھا۔ مولانا کو آتے ہوئے آدمی دیکھتا، دور سے تیاری کرتا کہ میں پہلے سلام کروں گا، مگر وہ ابھی پروگرام ہی بناتا ہوتا کہ مولانا اسے سلام کرلیتے۔

۳۷/ سال کی عمر میں ۲۱/ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ بروز دوشنبہ پونے دو بجے دن میں ان کا وصال ہوا۔ مولانا مرحوم کی وفات کا حضرت محدث الاعظمی پر شدید تاثر ہوا، شفیق اور قدرداں باپ نے علم کے شیدائی بیٹے کو امور خانہ داری اور دنیاوی مکارہ کی تمام الجھنوں سے بے نیاز کررکھا تھا، خدا تعالیٰ کے بھروسے اور اپنے حسن انتظام کی بدولت پورے گھرانے کو چلارہے تھے، بیٹے، پوتے سب ان کے زیر سایہ فراغت واطمینان کے ساتھ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی وفات کے وقت حضرت محدث جلیل کی عمر ۴۶/ سال کی تھی، ظاہر ہے کہ اتنے طویل عرصہ تک والد صاحب کا سایہ پانے کے بعد جب یہ سایہ اٹھا ہوگا، تو حضرت اقدس کس قدر متاثر ہوئے ہوں گے، اپنے ایک خط میں اپنے تلمیذ عزیز مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

> ’’ایک ڈیڑھ ماہ سے رشید احمد بھی بیمار رہے، اور اسی کے ساتھ سیدی ووسیلۃ یومی وغدی حضرت پدر بزرگوار بھی بیمار ہوئے، عیداضحیٰ کے ایک دن پہلے مسجد آنے جانے لگے اور عید میں بھی گئے۔ وہ دن عافیت سے گزرا، رات

> گزرنے نہیں پائی تھی کہ قے دست کے بعد جاڑا بخار شروع ہوگیا، تین چار دن کے بعد نمونیہ ہوگیا۔ بالآخر ۲۱/ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو پونے دو بجے دن میں ان کا وصال ہوگیا۔ اس وقت میرا جو حال ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، والد صاحب کی نسبت کچھ لکھنا ’’پدرم سلطان بود‘‘ کا مصداق ہوگا‘‘ (تذکرۂ علماء اعظم گڈھ میں تاریخ وفات ۱۱/ ذی الحجہ چھپی ہے، مگر صحیح ۲۱/ ہے)

ایک اور مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ’’میں چاہتا ہوں کہ باہر نکلوں، مگر والد صاحب کی وفات اور بھائی کی علیٰحدگی کی وجہ سے گھر کی فکر میں ایسا مبتلا ہوں کہ دو دن کے لئے بھی کہیں جانا مشکل ہورہا ہے، (۱)

اخیر میں مولانا مرحوم کے متعلق حضرت محدث الاعظمی کی ایک عربی تحریر کا اقتباس بطور تبرک پیش کردینا مناسب سمجھتا ہوں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزند گرامی باوجود علم وفضل میں علوئے مرتبت کے اپنے والد محترم کے کس قدر عقیدت منداور رتبہ شناس اور مداح تھے۔

كان والدى من عباد الله الصالحين والعلماء العاملين ، معروفاً بصلاحهٖ وتقواه وملازمة التلاوة والذكر بين العامة والخاصة، مرموقاً إليه بنظر الاجلال معتقداً بين المسلمين وغيرهم ، اشتغل بالفقه والتفسير على الشيخ ابى الحسن المئوى وقرأ عليه الكتب الستة من الصحاح حرفاً حرفاً وتلقن الذكر من العارف بالله الشيخ أشرف على التهانوى الفقيه المحدث المفسر (قلمی یادداشت)

میرے والد محترم اللہ کے نیک وصالح بندوں اور باعمل عالموں میں تھے،

صلاح وتقویٰ اور ذکر وتلاوت کے اہتمام میں عوام وخواص سب کے درمیان معروف تھے، وہ بڑی عظمت واجلال کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مسلمان اور غیر مسلم سب ان کے معتقد تھے، حضرت مولانا الحسن مئوی سے فقہ وتفسیر کا درس لیا، اور انھیں کی خدمت میں صحاح ستہ حرفاً حرفاً پڑھی اور عارف باللہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی فقیہ ومفسر کی بارگاہ سے ذکر اخذ کیا۔

اسی اعتقاد کا اثر تھا کہ مولانا موصوف کی خدمت میں ہر طبقہ کے لوگ اپنی ضروریات ومشکلات میں حصول دعا کے لئے آتے ، امراض واعذار میں تعویذ کے لئے حاضر خدمت ہوتے اور ان کے انفاس طیبہ کی برکت سے کامیاب وبامراد واپس ہوتے۔

مولانا رشید احمد الاعظمی کا بیان ہے کہ دادا مرحوم نے غیر مسلموں کیلئے ایک تعویذ اور مسلمانوں کے لئے ایک تعویذ تجویز کر رکھا تھا، پس جو کوئی مسلمان تعویذ کا طالب ہوتا اس کو وہ لکھ کر دیتے۔ اور جو کوئی غیر مسلم آتا، اس کو اس کا والا تعویذ دے دیتے۔ بڑھاپے میں جب خود لکھنے میں دقت ہوتی ،تو اپنے پوتوں اور شاگردوں سے لکھوا لیتے۔ اور وہی ضرورت مندوں کو عنایت فرماتے رہتے، ان کی برکت ایسی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی حاجت براری فرماتے اور اس کا کام پورا ہوجاتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوری علیہ الرحمہ

وفات: ۱۱؍صفر ۱۳۸۷ھ

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور ضلع اعظم گڈھ ، مشرقی یوپی کی نہایت معروف اور بابرکت درس گاہ ہے، اس درس گاہ میں اس بندۂ حقیر نے **ھدایۃ النحو** سے لے کر **ھدایہ فی الفقہ** تک ۴ رسال تعلیم حاصل کی ہے، نشو ونما اور اثر پذیری کے سب سے اہم لمحات یہیں بسر ہوئے ہیں۔ حروف پڑھنے لکھنے اور بولنے کی جو شد بد ہوئی یہیں ہوئی۔ جن اساتذہ سے میں نے یہاں تعلیم حاصل کی ہے، ان کی عقیدت ومحبت دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ ان میں سے اکثر کی وفات ہوچکی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت فرمائیں اور میری طرف سے اور ان کے تمام تلامذہ کی طرف سے ان سب حضرات کو بہترین جزا عطا فرمائیں ، اور جو حضرات موجود ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی حیات، علم وفضل اور فیض میں برکت عطا فرمائیں۔

میرے اساتذہ میں سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسولپوری علیہ الرحمہ کا وصال ہوا، اس وقت میں شرح جامی اور شرح وقایہ پڑھ رہا تھا ان سے میں نے دو کتابیں پڑھی ہیں، ایک **القرأۃ الرشیدہ** (مصری) اور دوسری **نفحۃ الیمن**۔ چاہتا ہوں کہ آج کی مجلس میں ان کا ذکر کروں۔

حیران ہوں کہ کن الفاظ سے ان کا تعارف شروع کروں ، وہ ایک نادرۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے ، باکمال وبے مثال ! ان کی شان بہت بلند تھی ، مبارکپور کے مضافات میں ، اس سے تقریباً تین کلومیٹر دور ایک بستی رسول پور نامی

ہے وہیں کے رہنے والے تھے، ان کے والد محترم مولانا احمد حسین صاحب بھی نامور اور دیدہ ور عالم تھے، عرصہ دراز تک ڈھاکہ میں مدرس رہے، ان کے خاندان کے بعض دوسرے حضرات بھی بڑے عالم تھے، مولانا عبدالعلیم صاحب مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں صدر مدرس تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے مولوی عبدالباقی صاحب اعظم گڈھ میں مشہور وکیل اور وکیلوں کے سرپرست تھے، مولانا محمد یحییٰ صاحب اسی علم پرور گھرانے کے ایک فرد تھے۔ ذہانت وفطانت میں فائق، فلسفہ اور علم ہیئت کے امام، ادب ولغت کے ماہر، تفسیر کے بہترین مدرس، نکتہ رس، دقیقہ سنج، ہمیشہ غور وفکر میں ڈوبے ہوئے، بس کیا عرض کروں کہ وہ کتنے عجیب تھے، نکلتا ہوا قد، تیر کی طرح سیدھا، لمبوترا چہرہ، اس پر قدرے اونچی ناک، داڑھی سفید اور ہلکی، رنگ گہرا سانولا، آنکھیں نیم باز، ہونٹ پتلے، لیکن قدرے بڑے جن پر پان کی سرخی نمایاں، دانت موجود تھے، مگر سب پانوں کے رنگ سے رنگین، بدن پر چھینٹ کی شیروانی اور اسی کی ٹوپی، گردن پر چھوٹی سی چادر پڑی ہوئی جس کے کنارے دونوں طرف سینے پر لٹکتے ہوئے، پاؤں میں خالطہ پاجامہ جس کی مہری بہت زیادہ چوڑی نہ ہوتی، خوبصورت جوتا، چلنے میں قدم بالکل برابر رکھتے کہ اگر ناپنے والا ناپے تو شاید ایک سوت کا بھی فرق نہ آئے، بڑی بڑی مسافت اپنے قدم سے ناپ لیتے، طبیعت بہت نفیس ونستعلیق ہر چیز مرتب ومہذب، جوتے پاؤں سے نکالتے تو بالکل برابر رکھتے، ذرا بھی آگے پیچھے نہ ہوتے، دونوں کے درمیان فاصلہ ہمیشہ یکساں ہوتا۔ پڑھاتے تو تقریر مختصر ہوتی، مگر عام فہم اور دلنشیں، صرف مغز بولتے تھے، مشکل مسائل کو نہایت آسان مثالوں سے سمجھا دیتے، اور مثالیں اتنی دلچسپ ہوتیں کہ آدمی انھیں بھولنا چاہے تو نہ بھول سکے، مگر اتنی نازک ہوتیں کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا بیان بھی نہ کر سکے فلسفہ کی کتاب ہدیہ سعیدیہ پڑھاتے اور اسے ناول سے زیادہ آسان اور

دلچسپ بنا دیتے تھے، طلبہ ان کے سبق کے لئے بے تاب رہتے، جس سال جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں میرا داخلہ ہوا تھا، اس سال میرا کوئی سبق ان کے یہاں نہیں تھا۔ لیکن یہ سوچ کر خوشی ہوتی تھی کہ اگلے سال ایک سبق ان کے یہاں ہوگا۔ ان کے اسباق مخصوص تھے، جنھیں کوئی دوسرا استاذ مانگنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ الّا یہ کہ وہ خود ہی بخشش کر دیں۔ **القرأة الرشیده** حصہ چہارم جس کا معیار ادب خاصا بلند ہے ان کا خاص سبق تھا، پھر شش ماہی امتحان کے بعد اسی گھنٹے میں وہ **نفحة اليمن** پڑھاتے تھے۔

اُس سال جب داخلے شروع ہوئے تو دیکھا کہ ان کی درس گاہ جس کی دیواریں ننگی کھڑی تھیں۔ اب انھیں لباس پہنایا جا رہا ہے، مولانا بڑے انہماک سے نگرانی فرما رہے تھے۔ سبق شروع ہوتے ہوتے پلاسٹر کا کام مکمل ہوگیا۔ فرش پر نیا ٹاٹ بچھایا گیا۔ ان کی نشست گاہ کے پاس ایک الماری دیوار میں بنی ہوئی تھی، اس الماری کے ایک جانب اپنی بیٹھک کی داہنی سمت میں ایک باریک سا گہرا سوراخ بنوایا۔ مستری نے کہا کہ یہ کیوں بنوا رہے ہیں، فرمایا تم کیا جانو میں کس مصلحت سے بنوا رہا ہوں، یہ ان کی خاص ادا تھی، جب کوئی انوکھا کام کرتے اور کوئی پوچھ دیتا تو خفگی کی صورت میں جواب دیتے کہ تم سے کیا مطلب؟ اس وقت مخاطب سمجھ جاتا کہ کوئی ضروری مصلحت ذہن میں ہے۔ پھر انتظار رہتا کہ اس کی کیا حکمت ظاہر ہوتی ہے۔

ان کے یہاں ہم لوگوں کا پہلا گھنٹہ تھا، وہ اپنے گھر سے روزانہ پیدل چل کر گھنٹے کے وقت مدرسہ میں پہونچ آتے تھے۔ آتے تو پہلے سیدھے دفتر جاتے، وہاں رجسٹر پر دستخط کرتے، وہاں سے درس گاہ میں آتے، دروازے کے باہر کھڑے ہو کر درس گاہ کا ایک جائزہ لیتے، طلبہ انھیں دیکھ کر سلام کرتے، اور قرینے سے بیٹھ جاتے، درس گاہ میں اگر کوئی چیز بے قرینے ہوتی، یا ناپسند ہوتی تو اس پر نگاہ جما کر کھڑے

رہتے ، اندر نہ آتے ، طلبہ سمجھ جاتے کہ کوئی بات قابل گرفت ہے۔ طلبہ ان کی نگاہ دیکھتے اور مرکز نگاہ دیکھتے اور تاڑ لیتے کہ فلاں چیز غیر مرتب ہے۔ اس کی فوراً اصلاح کردی جاتی ، تب تشریف لاتے ، ایک روز تشریف لائے اور درس گاہ کے اندر داخل نہیں ہوئے ، ایک کنارے جہاں جوتا اتارتے تھے ، وہاں کھڑے ہوگئے اور غور سے نشست گاہ کے بائیں طرف والی تپائی کے پاس فرش پر نگاہ جمادی ، ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بات ہے؟ تپائی ٹھیک تھی ، مگر اسے کچھ ادھر اُدھر کرکے مزید درست کردیا گیا ، مگر اب بھی کھڑے ہیں ، نہ کچھ بولتے اور نہ کچھ حرکت کرتے ، ہم لوگوں کو بڑی گھبراہٹ ہوئی کہ الٰہی خیر! کہیں ناراض نہ ہونے لگیں ، وہ فرش پر دیکھ رہے تھے ، ہم لوگوں نے بھی وہاں نگاہ جمادی تو دیکھا کہ کچھ سفید سفید دانے شکر کے پڑے ہوئے ہیں۔ جلدی سے انھیں چن لیا گیا ، تو اپنی جگہ تشریف لائے ، اس واقعہ نے طلبہ کو اتنا چوکنا کردیا کہ ان کے آنے سے پہلے درس گاہ میں ایک تنکا بھی پڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر شاید سال بھر ہم لوگوں کے سامنے اس کی نوبت نہیں آئی۔

مولانا پان کھاتے تھے اور ان کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا۔ وہ پان کے اندر چونا اور کتھا کو ایک ساتھ ملادینے کے قائل نہ تھے ، کہتے تھے کہ اس طرح پان سڑ جاتا ہے اور خراب ہوجاتا ہے ، وہ دن بھر کے لئے گھر سے پان لگا کر خاصدان میں بھر کر لاتے تھے۔ بازار کا پان بالکل نہیں کھاتے تھے ، اور حتی الامکان اپنا پان کسی کو نہیں دیتے تھے کہ اور لوگ تو ہر طرح کا پان کھالیتے ہیں ، اور مولانا نپی تلی تعداد لاتے تھے۔ ان کے یہاں پان کا بیڑا بنانا ایک فن تھا ، پان اس طرح موڑا جاتا تھا کہ کتھا اور چونا ایک دوسرے سے نہ ملیں ، اس طرح پان خواہ کتنی دیر تک خاصدان میں رہتا خراب نہ ہوتا ، اور لذت اس کی یکساں برقرار رہتی۔

مولانا نے اپنے ذوق کے لحاظ سے اگالدان کا بھی انتظام کیا تھا ، دو اگالدان

تھے ، ایک پیتل کا نہایت صاف شفاف جس پر کہیں پان کی پیک کی ہلکی سی بوند بھی نہیں ہوتی تھی۔ اسے اس وقت استعمال کرتے جب چارپائی پر استراحت فرماتے ، مولانا کھانسی کے مریض تھے ، اکثر بلغم کے اخراج کی ضرورت پیش آتی ، اس لئے وہ اگالدان چارپائی کے پاس اس طرح رکھا رہتا کہ تھوکنے میں ذرا بھی تکلف نہ ہو ، دوسرا اگالدان مٹی کی ہانڈی کا تھا ، یہ ہانڈی بھی نہایت صاف ستھری تھی ، اس میں آدھی مقدار تک اوپلے کی راکھ رکھ لی تھی۔ اپنی نشست گاہ میں بیٹھتے تو اسے استعمال کرتے ، ایک دن درس گاہ میں تشریف لائے ، تو اپنے جھولے سے ایک لکڑی ایک بالشت کے بقدر پتلی سی گول بنائی ہوئی نکالی ، اس کا ایک سرا نوک والا تھا اور دوسرے سرے پر چھوٹا سا دھاگا باندھ رکھا تھا ، انھوں نے لکڑی کو اس سوراخ میں ڈال دیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ، وہ لکڑی اس سائز سے بنی ہوئی تھی کہ سوراخ اس سے بالکل پُر ہوگیا ، اور دھاگا باہر لٹکتا رہا ، ہم لوگوں نے یہ عمل تو دیکھا لیکن کس کی ہمت تھی کہ جو اس کی حکمت دریافت کرتا۔ انتظار تھا کہ وہ خود ہی ظاہر کریں گے۔ سبق ختم ہوا ، تو انھوں نے لکڑی نکالی اور ہانڈی والے اگالدان میں اسے ڈال کر اٹھایا تو پان کی پیک جو راکھ پر پھیل پھیل کر پپڑی جیسی بن گئی تھی وہ بالکل صاف اوپر اٹھ آئی ، اور باقی راکھ بے داغ بچ گئی۔ اسے ایک طالب علم کے حوالے کیا کہ باہر پھینک آؤ ، تب اس سوراخ اور اس لکڑی کی حکمت سمجھ میں آئی۔

مولانا کے یہاں چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بھی بہت معقول نظم تھا ، یہی ان کا مزاج تھا ، ان کو اس میں تکلف نہ ہوتا ، ان کی ذہانت اس میں عجیب عجیب جدت طرازیاں کرتی ، ایک مرتبہ ان کے پاس دور سے غالباً الہ آباد سے ایک صاحب آئے ، طلبہ میں یہ خبر عام ہوئی کہ ان کے شاگرد ہیں ، وہ گلوب بنانے کے ماہر تھے ، مٹی کا گلوب بنا کر اس پر ساری دنیا کا نقشہ بنایا کرتے تھے ، انھیں اس سلسلے میں مولانا سے

کچھ دریافت کرنا تھا، مولانا بازار میں غبارے کی دکان پر تشریف لے گئے، اور ایک غبارہ گلوب کی شکل کا خریدا، اور اس میں ہوا بھر کر پوری دنیا کا، اس کے براعظموں کا، اس کے سمندروں کا نقشہ بنا کر جو چیز انھیں دریافت کرنی تھی، اسے حل کر دیا، اور اس کی ہوا نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔

مولانا کو روشنائی بنانے میں کمال حاصل تھا، ایسی پکی روشنائی بناتے تھے کہ مٹائے نہ مٹتی تھی، دھوئے نہ دھلتی تھی۔ اس روشنائی سے لکھے ہوئے حروف پر خواہ کتنا ہی پانی پڑ جائے، یا اس پر کتنی ہی مدت گذر جائے، اس کی آب وتاب میں کمی نہ آتی تھی، مولانا بہت عمدہ خطاط بھی تھے، ساتھ ہی نہایت ماہر فن جلد ساز بھی تھے، ان کے ہاتھ کی باندھی ہوئی جلدیں اتنی خوبصورت اور مضبوط ہوتی تھیں کہ پرانے جلد ساز بھی دیکھ کر متحیر رہ جاتے تھے، لیکن اپنے فن کے سلسلے میں مشہور تھا کہ انھیں بخل ہے، کسی کو سکھاتے نہیں تھے۔ مبارک پور میں ایک جلد ساز تھا اس نے بہت کوشش کی کہ مولانا سے کچھ سیکھ لے مگر کامیاب نہ ہوا، وہ سکھاتے تھے مگر ان کے ذہن میں غالبًا کچھ شرطیں تھیں۔

قلم بھی خوب بناتے تھے، ان کے داماد نے ان سے خطاطی سیکھنی چاہی تو فرمایا کہ سرکنڈے لاؤ، وہ قلم کی سائز کے سرکنڈے لائے، مولانا نے انھیں دیکھا تو فیل کر دیا کہ ان میں سے کوئی بھی قلم بنانے کے لائق نہیں، پھر انھوں نے اسکے گُر بتائے۔

جو کچھ وہ بنا دیتے تھے وہ نمونہ کی چیز ہوتی، اور جس چیز کی انھیں دھن ہو جاتی، اس میں عجیب عجیب باریکیاں نکالتے، ایک مرتبہ چونا اور کتھا وغیرہ رکھنے کیلئے مٹی کی بہت خوبصورت کلھیا بنائی، اس کی مٹی میں خدا جانے کیا کیا مسالے استعمال کئے تا کہ آگ میں پکنے کے بعد خوب مضبوط ہو، اسے ایک متعین وقت تک دھوپ میں رکھتے، پھر سائے میں محفوظ رکھ دیتے، اس کا ذکر مولانا نے ہم لوگوں سے بھی کیا تھا، ایک روز درس گاہ میں آ کر بیٹھے تو کتاب نہیں کھولی چہرے پر رنج وملال کے آثار تھے، مولانا جب کسی سوچ میں ہوتے، تو ان پر استغراق کی کیفیت طاری ہو جاتی، کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمانے لگے کہ ”توڑ دیا، کچھ سوچا بھی نہیں۔ توڑ دیا، کم از کم پوچھے ہوتا کہ یہ کیا ہے“؟ انھیں الفاظ کو وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دہراتے رہے، ہمارے ساتھیوں میں ایک صاحب مولانا سے ذرا بے تکلف تھے، انھوں نے پوچھ لیا کہ کیا توڑ دیا؟ انھوں نے بتایا کہ ایک عورت اپنے بچے کو ساتھ لے کر ان کے گھر آئی تھی، وہ بچہ کھیلتے کھیلتے ان کلھیوں کے پاس گیا اور مولانا کی ساری محنت اس نے اکارت کر دی، اسی پر مولانا کو افسوس ہو رہا تھا، مولانا کی استغراقی کیفیت اکثر ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ ایک بار اپنے مکان کے کسی حصے کی تعمیر کرا رہے تھے، دوپہر کے وقفے میں انھوں نے تعمیری کوئی سامان دے کر ہم چند ساتھیوں کو گھر بھیجا، سامان پہونچا کر ہم لوگ آ رہے تھے کہ راستے میں دیکھا کہ مولانا بھی تشریف لا رہے ہیں، انھوں نے مدرسہ سے چھٹی لے لی تھی، مولانا کو دیکھا تو ہم لوگ رک گئے۔ مولانا بھی کھڑے ہو گئے، اور کہا کہ ایک چیز بھول آیا ہوں، کھڑکی بن رہی ہے، اس کے لئے سریا لینی تھی، سریا کا ایک چھوٹا سا نمونہ نکالا کہ فلاں دکان پر جا کر اتنی موٹی سریا تین تین فٹ کی بارہ لے لینا، اتنے میں وہ کچھ سوچنے لگے، اب وہ سوچے جا رہے ہیں اور کہے جا رہے ہیں کہ، تین تین فٹ کی بارہ تین تین فٹ کی بارہ، پانچ سات منٹ تک یہی دہراتے رہے، اس سے افاقہ ہوا تو فرمایا کہ دیکھو یہ تھوڑی سی چپٹی ہے، تم جو لینا وہ گول گول ہو، چپٹی نہ ہو، گول گول ہو چپٹی نہ ہو، اسے دس منٹ تک دہراتے رہے اور پھر فرمایا کہ کہ اچھا جاؤ۔

مولانا کی مبارک پور میں ایک حافظ صاحب سے دوستی تھی، انھیں بھی باتوں میں استغراق ہوتا، گرمی کا موسم تھا، مولانا عصر کے بعد گھر جا رہے تھے، ان حافظ

صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ایک طرف کھڑے ہوکر باتیں کرنے لگے، مغرب کی اذان ہونے لگی، نماز کے بعد مولانا نے کہا کہ اب گھر چلتا ہوں، حافظ صاحب نے کہا کہ چلئے کچھ دور پہونچا دوں، پھر دونوں کو خبر نہیں رہی کہ کہاں تک پہونچے، یہاں تک کہ رسول پور آگیا۔ حافظ صاحب لوٹنے لگے تو مولانا انھیں کچھ دور پہونچانے چلے یہاں تک کہ مبارک پور آگئے، اسی آمدورفت میں رات پوری ہوگئی، نہ یہ اپنے گھر گئے نہ وہ، پھر مولانا مدرسہ میں آگئے۔

ایک مرتبہ دیکھا کہ مولانا اوپر اپنی درس گاہ میں جانے کے لئے زینہ چڑھ رہے ہیں، دوتین زینہ چڑھے ہوں گے کہ مولانا قاضی اطہر صاحب کے فرزند حاجی ظفر مسعود کتاب لے کر اوپر جانے کیلئے آگئے، مولانا کھڑے ہوگئے اور ظفر مسعود ہدایہ اخیرین کی جلد لئے نیچے کھڑے ہوگئے، مولانا کچھ فرمانے لگے، کھڑے کھڑے تھک گئے تو وہ بیٹھ گئے۔ ظفر مسعود کھڑے رہے اسی میں گھنٹہ ختم ہوگیا۔

مولانا ستاروں کے سلسلے میں بڑی معلومات رکھتے تھے، کبھی رات کو مدرسہ میں رہ جاتے تھے اور طلبہ یا اساتذہ ان کے پاس ہوتے، تو انھیں بہت سے ستاروں کی شناخت کراتے، رات میں بہت کم سوتے تھے، مولانا شعبدوں کے بھی ماہر تھے۔ ایک مرتبہ اپنی ہتھیلی پر تیل رکھا تو وہ دوسری طرف ظاہر ہونے لگا۔ ایک سینک ہتھیلی میں چبھوئی تو وہ ہاتھ کے نیچے سے نکلتی محسوس ہوئی، فرمایا کہ یہ شعبدہ ہے اس میں کچھ کمال نہیں ہے۔

چھوٹی چھوٹی چیزوں پر مولانا کی نگاہ خوب رہتی، اور اس کا ہم لوگوں کو بھی خوگر بناتے، تعلیم کے سلسلے میں بھی مولانا کا حال یہی تھا۔ سبق میں وہ باتیں جنھیں عموماً زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، مولانا بہت اہتمام سے ان کی وضاحت کرتے، عربی جملوں میں حروف جارہ جنھیں ‘‘صلہ’’ کہتے ہیں ان کے استعمال کی اہمیت اور

ان کے مختلف مواقع میں استعمال کرنے سے معانی میں جو فرق پیدا ہوتا ہے، اس میں خوب پُختہ کردیتے، چھوٹی چھوٹی گُر کی باتیں خوب بتاتے تھے۔

مولانا دمہ کے مریض تھے، اس بیماری کے علاوہ عموماً ان کی صحت اچھی تھی، ان کی زندگی ایک نظام اور دستور کی پابند تھی، کھانا پینا، سونا اٹھنا، سب باقاعدہ تھا، اور ان کو اپنے اصولوں بلکہ صحیح لفظوں میں اپنے نفس پر بہت قابو تھا، ہر کام ناپ تول کر کرتے تھے، باتیں بہت سوچ کر کرتے تھے۔

ہم لوگوں کو **القرأة الرشيده** حصہ چہارم پڑھائی، طالب علم کو مطالعہ کا پابند کرتے تھے۔ خود کم بتاتے تھے، مگر جو کچھ بتاتے تھے وہ اتنے گُر کی بات ہوتی کہ اس سے بہت سی گرہیں کھلتیں۔ بہت سی گتھیاں سلجھتیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں غور وتدبر کا مادہ انھیں بخشا تھا، وہیں سمجھانے بلکہ یاد کرانے کا بھی ملکہ عطا فرمایا تھا، پہلا گھنٹہ ان ہی کی خدمت میں تھا، ان کی درس گاہ میں جاتے ہوئے خوشی ہوتی تھی۔

حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب علیہ الرحمہ کی ولادت ۱۳۲۸ھ میں ہوئی تھی۔ ابتدائی نوشت وخواند گھر پر والدہ ماجدہ سے سیکھی، پھر جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخل کئے گئے، حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری اور حضرت مولانا محمد صدیق صاحب برئی پوری وغیرہ سے عربی کی کتابیں قدوری تک پڑھیں۔ اس وقت ان کے والد ماجد ڈھاکہ میں رہتے تھے، ان کے ساتھ ڈھاکہ گئے اور متوسطات تک تعلیم وہاں حاصل کی۔ پھر مدرسۃ الشرع سنبھل اور اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ امروہہ میں داخل ہوئے، اور وہیں مولانا انوار الحق صاحب امروہوی اور دیگر اساتذہ سے پڑھ کر سند تکمیل حاصل کی، امروہہ ہی میں طب وحکمت کی تعلیم مولانا حکیم محمد اسمٰعیل صاحب عباسی سے حاصل کی، اس کے بعد **دار المبلغين** لکھنؤ میں حضرت مولانا عبد الشکور صاحب امام اہلسنت ؒ سے

پڑھا، اسی درمیان قدرے انگریزی بھی سیکھی، علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت رکھتے تھے، معقولات میں منطق وفلسفہ، ہیئت، ریاضی، مناظرہ، مرایا اسطرلاب کے جامع تھے، علم ہیئت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ فقہ، تفسیر، حدیث، معانی وبلاغت اور عربی ادب میں پوری مہارت رکھتے تھے، عربی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔

انھوں نے تعلیم وتدریس کے ساتھ قدرے تصنیف کا کام بھی کیا ہے، کچھ علمی وتحقیقی مقالات شائع بھی ہوئے ہیں۔ علم صرف کے مشہور فارسی متن ''زبدہ'' کی اردو میں عمدہ کے نام سے ایک شرح ڈھاکہ میں طالب علمی کے زمانے میں لکھی تھی اور رفاہ عام پریس گورکھپور میں چھپی تھی۔ ایک رسالہ تحقیق رویت ہلال اور اختلاف مطالع کے نام سے لکھا، اس رسالہ میں رویت قبل زوال اور بعد زوال، تشکلات قمریہ، کسوف خسوف، اختلاف مطالع وغیرہ کا ذکر ہے، یہ پورا رسالہ فتاویٰ ثنائیہ جلد اول میں چھپا ہے، شرح سبعہ معلقہ عربی ناتمام، اور اس کے علاوہ دائمی جنتری اور دائمی نقشہ اوقات مرتب کیا تھا۔

مولانا دبلے پتلے تھے لیکن ہڈیاں چوڑی تھیں، زندگی بہت پابند اصول اور محتاط تھی، اس لئے عموماً بیمار کم ہوتے تھے، مگر سل اور دق کا مرض مستقل تھا۔ یہ احتیاط ہی کا اثر تھا کہ باوجود اس مہلک مرض کے کھانستے کھنکھارتے بہت کم تھے۔

۱۳۸۷ھ کا سال تھا، اس سال ہم لوگوں کی کوئی کتاب مولانا کے درس میں نہ تھی، لیکن پچھلے سال چونکہ ان کے یہاں مستقل حاضری رہ چکی تھی، اس لئے باوجود ان کے رعب کے اکثر حاضری ہوتی رہتی تھی۔

ایک دن شام کو سنا کہ مولانا کی طبیعت خراب ہے، آج گھر نہیں گئے ہیں، مولانا معمولاً ہمیشہ شام کو پیدل ہی گھر تشریف لے جاتے تھے، آج معلوم ہوا کہ مدرسہ میں رہیں گے، ہم لوگ رات میں حاضر خدمت ہوئے۔ طبیعت نحیف تھی، خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ رات میں ہوشیار طلبہ کی ڈیوٹی لگی کہ مولانا کے پاس رہیں، مجھے اس دن بہت دکھ ہوا کہ میرا شمار ہوشیار اور کارآمد طلبہ میں نہ تھا۔ اس لئے اس خدمت سے برطرف رہا۔ اپنی اس نالائقی پر ہمیشہ نالاں رہا کہ اساتذہ کی خدمت کا سلیقہ نہ تھا اور اس کی سمجھ نہ تھی، غالباً دوتین روز تک مولانا مدرسہ میں ہی علیل رہے، امتحان ششماہی قریب تھا، طلبہ دیر رات تک پڑھتے تھے، میں اس رات شاید پوری رات جاگتا رہا، صبح صادق کے وقت مولانا کے خدمت گزاروں میں سے ایک طالب علم دوڑتا ہوا آیا کہ مولانا کی طبیعت زیادہ خراب ہے، میں دوڑتا ہوا پہونچا، چہرے کی کیفیت دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ یہ آخری وقت ہے، اس سے کچھ ہی دنوں پہلے میں نے اپنے دادا مرحوم کو نزع کی کیفیت میں دیکھا تھا، وہی کیفیت مجھے مولانا کے چہرے پر بھی معلوم ہوئی۔ یاد نہیں کون صاحب سورۂ یٰسین پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ایک ہلکی سی ہچکی محسوس ہوئی اور زندگی کی آخری سانس باہر آگئی، اور پھر دروازہ بند ہوگیا، اس آسانی سے دم نکلا کہ لوگوں کو احساس ہی نہیں ہوا۔

جب یہ یقین ہوگیا کہ روح قید حیات سے آزاد ہوگئی، تو مدرسہ میں ایک سوگواری پھیل گئی۔ فجر کی نماز کے بعد مولانا کے جسد خاکی کو طلبہ واساتذہ نے اپنے کندھوں پر اٹھایا، بدن پھول جیسا ہلکا تھا، بہت سکون واطمینان کے ساتھ رسول پور پہونچادیا۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ کی نماز پڑھی گئی، اور علماء وصلحاء کے ہاتھوں دفن کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو روح وریحاں سے نوازے۔ آمین

مولانا کا انتقال ۱۱؍صفر ۱۳۸۷ھ کو بروز دوشنبہ ہوا۔ ہم لوگوں کو بہت صدمہ ہوا۔ خاص طور سے اس بات کا شوق تھا کہ اگلے سال مولانا کے درس میں پھر حاضری ہوگی، مگر وہ خوشی جاتی رہی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی روح کو دائمی خوشی عطا فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

مولوی کمال الدین صاحب مرحوم

وفات: ۱۳۸۹ھ

تقریباً ۲۲؍سال پہلے کی بات ہے کہ صوبہ بہار کے ضلع دُمکا (سنتھال پرگنہ) کے ایک مخصوص خطے کے تین طلبہ بنارس جامعہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے یہ تینوں سن وسال کے اعتبار سے اپنی جماعت کے طلبہ سے ممتاز تھے، یہ اس عمر میں تھے، جس میں انھیں تعلیم مکمل کر چکنا چاہئے تھا۔ مگر یہ ابھی قدوری اور کافیہ پڑھ رہے تھے، فراغت کے بعد میری تدریس کا پہلا سال تھا۔ ان کے چہرے پر ایک خاص سنجیدگی اور وقار تھا۔ طلبہ یوں تو بہت سے آتے ہیں، اور مختلف خطوں اور علاقوں سے آتے ہیں مگر ان کی سنجیدگی اور نیکی دیکھ کر ایک خاص کشش محسوس ہوتی تھی، یہ طلبہ پڑھتے رہے، رہ رہ کر خیال آتا رہا کہ انھوں نے بہت دیر کر دی۔ اب تک یہ عالم ہو چکے ہوتے، شاگرد واستاذ کی عمر میں کچھ تفاوت نہ تھا۔ اس سے ایک طرح کا حجاب بھی محسوس ہوتا تھا۔ یہ طلبہ کبھی کبھی اپنے علاقے کے دینی احوال بتاتے کہ وہاں نہ صرف یہ کہ بدعت وجہالت ہے، بلکہ خالص مشرکانہ عقائد ورسوم کی بھی بہتات ہے۔ اس خاص حلقہ میں جہاں کے یہ رہنے والے تھے، کوئی عالم دین اب تک نہیں ہوا تھا۔ ان تینوں طلبہ کو باہر بھیج کر تعلیم دلانے والے مکتب کے ایک معمولی مولوی صاحب تھے، جنھوں نے گھر والوں کی مرضی کے خلاف ان تینوں کو باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کی تاکید کی تھی۔ یہ انھیں کے حکم کی تعمیل میں دو ایک مدرسوں سے ہو کر بنارس پہونچے تھے، انھوں نے کئی بار کہا کہ ان مولوی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، آپ ادھر چلتے تو کچھ کام ہوتا، ان کا اصرار تھا، خلوص کے ساتھ اصرار تھا، اس اصرار میں بڑی محبت تھی، بڑی نیازمندی تھی، بڑا دردوسوز تھا، ان سے سن سنا کر جو حالات وہاں معلوم ہوئے تھے، وہ تو بہت کم تھے ان کا تاثر طبیعت پر زیادہ نہ تھا، مگر ان کے بار بار اصرار میں اتنی قوت تھی کہ میں چند روز کے لئے وہاں جانے پر آمادہ ہو گیا۔ اس وقت تو نہ جا سکا، ایک سال کے بعد جانے کا عزم کیا۔

اگلے سال شعبان کا مہینہ آیا، سالانہ امتحانات ختم ہوئے، وہ طلبہ اپنے اپنے گھر چلے گئے، اور یہ وعدہ لے کر گئے کہ میں پانچ دس دن میں پہونچ جاؤں گا، چنانچہ میں پنجاب میل پر بنارس سے سوار ہو کر روانہ ہوا، رات کے دو ڈھائی بجے ایک اسٹیشن "جسی ڈیہہ" اترا، وہاں طلبہ استقبال کے لئے موجود تھے، معلوم ہوا کہ یہ منزل نہیں ہے، اسٹیشن پر ڈیڑھ دو گھنٹے رہ کر وہاں سے ایک دوسری لوکل ٹرین سے جو ایک اسٹیشن تک جاتی ہے، دیوگھر پہونچے، دیوگھر ہندوؤں کے مقامات مقدسہ میں ہے۔ فجر کی نماز وہاں پڑھ کر ایک بس پر سوار ہوئے، بس سے ایک ایسی جگہ پہونچے جہاں ہلکا پھلکا بازار تھا، معلوم ہوا کہ یہاں سے ابھی ۱۵؍کلومیٹر آگے جانا ہے، دیہاتی قسم کی معمولی سی سڑک ہے، جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان پیچ وخم کھاتی ہوئی چلی جاتی ہے، کہیں کہیں کچھ مسلمان نظر آرہے تھے، یہ ۱۵؍کلومیٹر کی مسافت سائیکل سے طے کرنی تھی، کیونکہ اس سڑک پر رکشے اور یکے کا بھی گذر نہیں ہے۔ وہاں سے میرے لئے ایک سائیکل کا انتظام کیا گیا، ٹوٹی پھوٹی پیچ در پیچ موڑ سے گھومتی ہوئی سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی سائیکل کسی طرح منزل تک پہونچی، منزل کیا تھی ایک چھوٹا سا چند گھروں کی آبادی پر مشتمل گاؤں، اس میں صرف مسلمان آباد ہیں، معلوم ہوا کہ آس پاس چند میل تک قریب قریب چھ سات گاؤں مسلمانوں کے ہیں، اور ان سارے گاؤں کے مجموعے میں صرف ایک مسجد ہے، اس مسجد میں حسب توفیق چند لوگ پانچ وقت کی نماز پڑھنے آجاتے ہیں، جمعہ کی نماز میں البتہ سارا علاقہ جمع

ہوجاتا ہے۔ مسلمان زیادہ تر غریب ہیں، مکانات بیشتر کچے سفالہ پوش، تھوڑی تھوڑی زمین لوگوں کے پاس ہے۔ عام کاشت دھان کی ہے، کچھ ترکاریاں بولیتے ہیں، ایک طرف پہاڑیوں کا سلسلہ ہے اس علاقہ کے آس پاس کوئی قصبہ اور شہر نہیں، قریب ترین بازار ۱۵ر کلومیٹر دور ہے، لوگ اپنی ضروریات کے لئے پیدل جاتے ہیں، زیادہ تر دھوتی اور کھڑاؤں کا رواج ہے، عام طور سے لوگ ناخواندہ ہیں، دین اور دینی تعلیم سے دور، کمالیا، کھالیا، دیہاتی طرز پر لڑ جھگڑلیا، بس یہی مشغلۂ زندگی ہے، معلوم ہوا کہ چندسال پہلے تک یہ پورا علاقہ جہالت کی غلیظ تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا مشرکانہ خرافات عروج پر تھیں، نماز کی تو لوگوں کو خبر نہ تھی لیکن تعزیہ اور چوک کی اہمیت بہت تھی، دھوم دھام سے تعزیہ اٹھاتے، اور اس کی پوجا کرتے، اپنے اہم کاموں، مثلاً شادی بیاہ، ختنہ اور دوسری تقریبات کے لئے پنڈتوں سے تاریخ متعین کراتے، گاؤں کے کنارے پر ایک بڑا سا پتھر تھا، کاشتکاری پر جانے سے پہلے اس پر دودھ چڑھاتے، قحط پڑتا تو عین مسجد کی محراب میں بکری ذبح کرتے اور اس کا گوشت تبرک کی طرح گاؤں بھر میں تقسیم کرتے، کوئی بیمار ہوتا تو مشرکانہ قسم کی نذریں مانتے، طرح طرح کی خرافات کرتے، ہندوؤں جیسے نام رکھتے اور ان میں میاں لگا کر مسلمان کرلیتے، مثلاً جگدیش میاں، لیدھو میاں وغیرہ، مزارات سے گہری وابستگی اور عقیدت تھی، نماز کے قیام کا تو پتہ نہ تھا، مگر میلاد کے قیام پر لڑنے مرنے کے لئے تیار، غرض جہالت کی کوئی ادا نہ تھی جو ان میں نہ پائی جاتی رہی ہو، اور شرک و بدعت کی کوئی بلا نہ تھی، جو گھر گھر چھائی نہ رہی ہو۔ میں جس وقت وہاں پہونچا یہ بلائیں مدھم پڑ چکی تھیں، تاہم ان کی باقیات سیئات موجود تھیں، ان جہالتوں سے لڑنا، انھیں گھروں اور دلوں سے دور کرنا، مدتوں کی بسی بسائی شرک و بدعت کی بستی کو اکھاڑنا اور اجاڑنا، سہل نہیں تھا، ایک جہاد عظیم کی ضرورت تھی، ایک مجاہد درکار تھا، جو تمام

دنیاوی مفاد سے بے نیاز ہوکر، ہر غرض سے بے غرض ہوکر، ہر طرف سے یکسو ہوکر، ہر مصیبت سے بے پرواہ ہوکر، محض اللہ کے نام پر، اللہ کے دین کی آن پر اپنے آپ کو، اپنی عزت وآبرو، اپنے جسم وجان کو، اپنے گھر خاندان کو تج دے۔

میں وہاں ڈیڑھ ماہ رہا، ایک ایسی جگہ جہاں سہولیات زندگی تو ایک طرف، ضروریات زندگی کے لئے کم از کم ۱۵ر کلومیٹر پیدل یا زیادہ سے زیادہ سائیکل پر جانا پڑتا تھا، اس ڈیڑھ ماہ میں ایک نام بار بار سنتا رہا، ہر بوڑھے سے سنتا رہا، ہر جوان سے سنتا رہا، کچھ باشعور بچے بھی یہ نام لیتے رہے، جب کوئی ذکر چھیڑتا تو خود بخود اس نام تک پہونچتا، کہیں سے کوئی بات دین کی، ایمان کی، نماز روزہ کی، تعلیم ومدرسہ کی، چلتی تو ہر پھر کر اسی نام پر جا پہونچتی، بڑی عقیدت سے، بہت محبت سے، بہت احترام سے نام لیا جاتا، جب کوئی وہ نام لیتا تو محبت وعقیدت کی خوشبو دل کی گہرائیوں سے اٹھتی اور پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی، یہ نام تھا ”مولوی کمال الدین“ مرحوم کا۔

دارالعلوم دیوبند کی صورت میں ہمارے علماء ربانیین اور مشائخ اہل حق نے جو دینی تعلیم گاہ اور تربیت گاہ قائم کی تھی، اس کے فیوض وبرکات کا مشاہدہ تو سارے ملک میں ہورہا ہے، بلکہ بیرون ملک بھی اس کا آوازہ گونج رہا ہے، لیکن یہ بڑی شخصیتیں ہیں، جنھوں نے شہرت کا عروج پایا۔ ان کے بڑے کارنامے ہیں، جنھیں تاریخ کے صفحات میں نوٹ کیا گیا، یہ بڑے اساتذہ تھے، جن کے نامور تلامذہ نے اپنے اساتذہ کی یادوں کو تازہ رکھا، دنیا کے سامنے ان کا ان کے کاموں کا تعارف کرایا۔ دنیا نے ان کا نام عقیدت واحترام سے لیا، انھیں بزرگوں کی کوشش کا ثمرہ ہے کہ آج بھی کچھ سر پھرے لوگ حطام دنیا سے بے نیاز ہوکر دین اور علم دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، بیکاری کا الزام سہتے ہیں، پسماندگی اور رجعت پسندی کی تہمت برداشت کرتے ہیں، مگر اپنی دھن میں ہیں، خود کو ناکارہ بنا کر دین کے کام

آتے ہیں۔ بے شک دارالعلوم دیوبند کا یہ عظیم کارنامہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بنیادی اور عظیم خدمت بھی وہاں سے وجود میں آتی ہے جس کو اجمالاً تو بہت سے لوگ کچھ کچھ جانتے ہیں، اور اسے سراہتے ہیں، لیکن اس کی تفصیلات کی کھود کرید میں کوئی محقق، کوئی مؤرخ نہیں جاتا۔ ورنہ اس کی تفصیلات سامنے آئیں تو خدمت دین وایمان کا ایک ایک نیا جہاں نگاہوں کے رُوبرو آجائے، وہ یہ کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے طرز کے مدارس کی آغوش میں ایسے جواں مرد بھی پرورش پاتے ہیں، جو لوگوں کے درمیان اپنی دماغی صلاحیت کے اعتبار سے کمزور اور علمی بضاعت کے لحاظ سے نادار اور معاشی معیار سے پست ہوتے ہیں، انھیں اساتذہ بھی بعض اوقات ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں، اور دوسرے لوگ بھی ناکارہ خیال کرتے ہیں، وہ کسی کسی طرح گرتے پڑتے اپنی تعلیم مکمل کرتے ہیں، اور کتنے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو کبھی معاشی کمزوری سے، کبھی دماغی کوتاہی سے تعلیم مکمل نہیں کرپاتے، مگر جب وہ نکلتے ہیں تو کسی دیہات میں، کسی ناخواندہ بستی میں، کسی اجاڑ گاؤں میں چند بچوں کو لیکر بیٹھ جاتے ہیں، اپنی اسی کمزور صلاحیت لیکن طاقتور ایمان کو لے کر بچوں کو اپنے سامنے بیٹھا لیتے ہین، اور ان کے معصوم دل ودماغ پر ابتدائی حرف شناسی کے ساتھ ایمان وعقیدہ کی پختگی کا بھی نقش بٹھادیتے ہیں، یہ لوگ گمنام رہتے ہیں، گاؤں کے لوگ انھیں مولوی صاحب یا میاں جی کہتے ہیں، انھیں صرف گاؤں کے لوگ جانتے ہیں، یا پھر وہ جانتا ہے جس کا جاننا سب پر بھاری ہے، یہ معمولی غذا کھا کر، معمولی تنخواہ لے کر، کبھی مکتب اور کبھی کسی کے برآمدہ کی ناقابل پناہ چھت کے نیچے اپنی زندگی گذار لیتے ہیں، مگر دین وشریعت اور ایمان وعمل کی جڑیں مضبوط کرجاتے ہیں، انھیں کبھی شہرت کی آرزو نہیں ہوتی یہ خود کو بڑے کارناموں کا اہل نہیں سمجھتے اور نہ اپنے کام کو کارنامہ سمجھتے، سیدھے سادے لوگوں میں رہتے، پانچوں وقت کی امامت

کرتے، کبھی کبھی کوئی کتاب پڑھ کر سنا دیتے، بہت باصلاحیت ہوتے تو چند بے ربط جملوں پر مشتمل سیدھے سادے بول میں تقریر کرلیتے، جمعہ پڑھاتے، عید بقرعید کی نماز پڑھاتے، نکاح پڑھاتے، لوگوں کی قربانیاں ذبح کرتے۔

دنیا والوں کے نظریہ کے اعتبار سے یہی چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہیں، نہ لچھے دار تقریریں کرتے، نہ لمبے لمبے اسفار کرتے، نہ کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کرتے، نہ اشتہارات واخبارات میں القاب وآداب کے ساتھ ان کے نام چھپتے، نہ تجویزیں پیش کرتے، نہ ریزولیشن پاس کرتے، دنیا ان سے ناواقف رہتی، لیکن یہ اپنی گمنامی میں چھوٹے چھوٹے بچوں پر محنت کرتے، ناخواندہ بوڑھوں اور جوانوں پر محنت کرتے ان کے دم سے دیہاتوں مین دین کے چراغ جگمگاتے رہتے ہیں، دارالعلوم دیوبند نے اپنی آغوش تربیت میں ایسے گمنام سپاہیوں کی کھیپ کی کھیپ تیار کی ہے، لیکن کون انھیں جانتا ہے۔

مولوی کمال الدین مرحوم بھی انھیں دین کے گمنام خدمت گزاروں کے زمرہ کے ایک نادرۂ روزگار سپاہی تھے، انھیں شہرت کی ہوس نہ تھی، وہ ایسی جگہ تھے جہاں سے ان کی بات باہر کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی، آج پہلی بار کاغذ پر ان کا نام چھاپ کر ان کی روح سے شرمندہ ہورہا ہوں، لیکن جیسا میں نے انھیں جانا ہے اور جوان کی خدمات ہیں، ان کا میرے اوپر حق ہے کہ جب کچھ ٹیڑھے میڑھے حروف لکھ لیتا ہوں تو انھیں بھی لکھ دوں شاید کسی کے دل سے دعا نکلے، شاید کسی کو دین کی خدمت کا جذبہ بیدار ہو۔

مولوی کمال الدین کہاں کے رہنے والے تھے؟ صرف اتنا معلوم ہے کہ ضلع بھاگلپور کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے، کس گاؤں کے تھے؟ معلوم نہیں اور اس کی ضرورت بھی نہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں پڑھا تھا، غالباً مشکوٰۃ کی جماعت میں

تھے، ناداری کی وجہ سے، یا بیماری کی وجہ سے تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے، گھر چلے آئے، اور پھر نہ جانے پھرتے پھراتے کیسے اس علاقہ میں پہونچے جہاں ان سے کام لینا حق تعالیٰ کو منظور تھا۔

مولوی صاحب اس وقت جوان تھے بلکہ نوجوان تھے، اس حلقہ میں آئے تو ان کی عمر ۲۴؍سال تھی، صحت کے اعتبار سے کمزور تھے، علمی لیاقت بھی زیادہ نہ تھی، اس علاقہ میں خدمت کی نیت سے ٹھہر گئے، نقشہ وہی تھا جو پہلے بتا چکا ہوں، علاقہ والوں کو دین اور علم دین سے کوئی دلچسپی تو تھی نہیں کہ ان کی قدر کرتے، کسی طرح ۲۰؍ روپئے ماہانہ پر بات طے ہوئی، یا اس سے بھی کم، یاد رہے کہ اس کو بہت عرصہ نہیں گذرا ہے، بمشکل ۳۰؍سال قبل کی بات ہے۔

مولوی کمال الدین صاحب کو مکتب کے نام پر ایک صاحب نے قدرے لمبا کمرہ دے دیا، اس میں بچوں کو گھیر گھار کر پڑھانے لگے، وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر مسجد ہے، اس مسجد میں نماز پڑھاتے، ہلکی پھلکی تقریریں بھی کر لیتے، یہاں کے مشرکانہ رنگ پر کڑھتے کھولتے، ان کے خلاف گفتگو کرتے، آہستہ آہستہ ان کو مٹانے کی کوشش کرتے، کچھ نوجوانوں نے ساتھ دیا، کچھ رفقاء ہاتھ آگئے، تو ان کے کام میں تیزی آئی، اب تک قولاً جہاد تھا اب عملاً شروع ہو گیا، سب سے پہلے دودھ چڑھانے اور تعزیہ داری بلکہ تعزیہ پرستی کی بلا کو ختم کرنا تھا، کیونکہ یہ شرک جلی ہے۔ لیکن اس کی جڑیں دلوں میں اس طرح پیوست تھیں کہ اس کے خلاف کچھ کہنا طوفانِ بلا کو دعوت دینا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اس پر خاموش نہیں رہا جا سکتا تھا، انھوں نے کئی نوجوانوں کو خوب پُختہ کر لیا، ایک دن طے کیا گیا کہ جس پتھر پر دودھ چڑھایا جاتا ہے، اسے اس بڑے تالاب میں جو گاؤں کے کنارے پر ہے، ڈال دیا جائے، تاکہ فساد کی بنیاد ہی ختم ہو جائے، لوگوں کا مزاج ایک حد تک اس کے لئے تیار کر چکے تھے

، مگر بیشتر لوگوں کی عقیدت اس سے کسی نہ کسی درجے میں باقی تھی، ایک رات مولوی صاحب کی نگرانی میں نوجوانوں نے اس پتھر کو اٹھا کر بیچ تالاب میں ڈال دیا، مگر شیطان کب ہار ماننے والا تھا، حالانکہ یہ کام رات کی تاریکی میں ہوا تھا مگر صبح دیکھا گیا کہ وہ پتھر تالاب کے باہر رکھا ہوا ہے، کمال حیرت ہوئی کہ جس پتھر کو متعدد نوجوانوں نے مشکل سے تالاب میں ڈالا تھا اسے کس نے باہر لا کر رکھ دیا، یہ معمہ حل نہ ہو سکا، مولوی صاحب نے اسے پھر تالاب میں ڈلوا دیا، دوسرے دن پھر وہ باہر تھا، بڑی حیرت ہوئی، انھوں نے نوجوانوں کو حکم دیا کہ اسے توڑ توڑ کے ریزہ ریزہ کر دو، جو پتھر عرصہ تک مرکز نذر و عبادت رہ چکا تھا، اس کا ریزہ ریزہ کرنا آسان نہ تھا، مگر یہ مشکل کام کر ڈالا گیا اور اس طاغوت سے نجات مل گئی۔

مولوی صاحب کی سرگرمیاں جاری تھیں، کچھ لوگ اگر ان کے فدائی تھے تو بہت سے لوگ ان کوششوں کی وجہ سے ان کے دشمن بھی ہو چکے تھے، جگہ جگہ سے مخالفت کی آوازیں آرہی تھیں، جاہل پیروں کا وہ طبقہ جس نے ایسے دیہاتوں کو اپنی چراگاہ بنا رکھا تھا اس کو اور اس کے پڑھے لکھے سرپرست یعنی رضاخانی مولویوں کے ٹولہ کو مولوی صاحب کا وجود کھٹکنے لگا، وہ آکر اپنے مریدین کو ورغلانے لگے، اور ملک بھر کا چلا ہوا الزام وہابی ہونے کا ان پر لگایا جانے لگا، مگر جب اللہ تعالیٰ کو کسی سے کام لینا ہوتا ہے تو اس کا ایسا غیبی انتظام فرماتے ہیں کہ لوگوں کو اندازہ بھی نہیں ہوتا اور نظام الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔

مولوی صاحب مرحوم کی اصلاحی کوششوں میں ایسے کئی مرحلے آئے، جو بہت نازک اور صبر آزما تھے، مگر جب وہ ان سے عہدہ برآ ہوئے تو غبار چھٹ گیا، وہاں کے لوگوں سے سنا کہ اسی حلقے کے ایک قریبی موضع میں ایک شخص نسبتاً با اثر تھا، وہاں کے عام لوگوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مال بھی زیادہ عطا فرمایا تھا، مولوی

صاحب کے مخالفین میں وہ نمایاں تھا، اوراس کی مخالفت کی وجہ سے پورا گاؤں مولوی صاحب سے دور تھا، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا اکلوتا بیٹا بیمار رہوا، وہ ٹی۔ بی کے مرض میں مبتلا ہوا، اور وہ بھی ایسے دیہات میں، جہاں قریب میں کوئی قابل ذکر علاج کا انتظام نہیں، گھر والوں نے سمجھ لیا کہ یہ لڑکا ہاتھ سے گیا، حتی الامکان دوا وغیرہ کی گئی مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا، کسی نے مشورہ دیا کہ مولوی کمال الدین سے دعا کرائی جائے، مگر وہابی کو بلا کر اپنا ایمان کون خراب کرے؟ انکار کر دیا گیا، مگر بیٹے کی حالت گرتی گئی، بیٹے کی جان عزیز تھی بہر حال مولوی صاحب سے کہا گیا کہ آ کر دم کریں، وہ بے چارے بے دم تھے، جھاڑ پھونک نہیں جانتے تھے، مگر یہ جانتے تھے کہ بیماری سے شفا دینا دوا کا کام نہیں اللہ کا کام ہے، اس لئے اللہ کا نام لے کر دم کرنے کیلئے پہونچ گئے۔ اور دم کرنے کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا، یوں کہئے کہ وہ خاص توفیق الٰہی تھی، بیماری سنگین، موت کا کھلا ہوا دروازہ، انھوں نے طے کیا کہ اللہ کے کلام سے اس دروازہ کو بند کرنا ہے، وہ مریض کے پاس بیٹھ گئے، حافظ نہ تھے، قرآن شریف کھول لیا اور تلاوت شروع کر دی تیس پارے دن بھر میں پڑھ کر اس پر دم کیا اور یہ عمل ایک دن نہیں پورے چالیس دن کیا، چالیس دن کے بعد وہ بچہ ایسا ہو گیا، جیسے اسے کوئی بیماری ہوئی ہی نہ تھی بالکل تندرست ہو چکا تھا، میں نے جب اسے دیکھا تو وہ جوانی کی دہلیز پر تھا، اوراس کی صحت قابل رشک تھی، اسے تو جسمانی صحت حاصل ہوئی اوراس کے گھر والوں کو اللہ تعالیٰ نے رُوحانی صحت بخشی، وہی لوگ جوان کے شدید معاند تھے اب ان کے پُشت پناہ بن گئے۔

ایک دوسرے قریبی موضع میں ایک اور با اثر آدمی ان کا مخالف تھا، اوراس کی مخالفت بھی مؤثر ثابت ہو رہی تھی، وہاں یہ حادثہ ہوا کہ اس کے نوجوان سولہ سال کے بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا، وہ شخص خود جڑی بوٹیوں کا معالج تھا، سانپ بچھو چونکہ

اس علاقے میں بہت ہوتے ہیں، اس لئے اس کا ایک سے ایک علاج اور منتر جانتا تھا، مگر اپنے بیٹے پر اس کی سب تدبیریں فیل ہو گئیں، لڑکا بے جان ہو گیا، منکا ڈھلک گیا، کسی نے کہا کہ مولوی صاحب کو بلایا جائے، باوجود نہ چاہنے کے بیٹے کی جان کی خاطر انھیں بلایا، وہ آئے تو معاملہ بالکل دگرگوں تھا، زندگی کی کوئی علامت نہ تھی، انھوں نے نیم کی ایک ٹہنی پتیوں سمیت لی اور اسے مریض کے جسم پر پھیرتے رہے، اور ایک آیت پڑھ پڑھ کر دم کرتے رہے، اور تقریباً تین گھنٹے تک دم کرتے رہے، یہ بڑا طویل اور صبر آزما کام تھا، مگر وہ یقین کی قوت تھی جوان سے یہ عمل کراتی رہی، اور بالآخر مریض تندرست ہو کر اٹھ بیٹھا، یہ ان کا ایسا احسان ہوا، بلکہ کرامت ہوئی کہ صرف وہ لڑکا اوراس کے اہل خاندان ہی نہیں بلکہ اطراف کے بیشتر لوگ ان کا دم بھرنے لگے، اوراس طرح اصلاح کی کوشش تیز تر ہو گئی۔

اسی دوران ایک رضا خانی مولوی وہاں پہونچ گیا، اور مناظرہ کا چیلنج دینے لگا اور اپنی لچھے دار تقریروں سے عوام کو اپنی طرف مائل کرنے اور مولوی صاحب کے خلاف بھڑکانے لگا۔ مولوی صاحب کو نہ مناظرہ کی ہمت تھی، اور نہ اتنا علم ہی تھا کہ مناظرہ کو سنبھال پاتے، ان دنوں وہ بخار میں مبتلا تھے، مسجد کے پاس اس رضا خانی کے حامیوں نے اسٹیج لگا دیا، اور وہ گرجنے لگا اور مولوی صاحب کو بار بار پکارنے لگا، مولوی صاحب کے فدائیوں نے کہا کہ آپ جس حالت میں ہیں، اسٹیج پر چلیں، ورنہ اس کا جادو چل جائے گا، مولوی صاحب کو اپنی علمی کم مائیگی کا احساس تھا، مگر اللہ کا نام لے کر چادر اوڑھے ہوئے اسٹیج پر پہونچ گئے، رضا خانی مولوی علماء دیوبند کی کسی کتاب سے کوئی حوالہ دے کر چیخ رہا تھا کہ اچانک مولوی صاحب کی پُر جلال آواز سنائی دی انھوں نے کہا کہ کتاب دکھاؤ، کتاب جس کا حوالہ اس نے دیا تھا، اس کے پاس موجود تھی، مولوی صاحب گرجنے لگے، کتاب میں عبارت دکھاؤ، وہ بدحواس

ہوگیا، جلدی جلدی اس کتاب کے اوراق الٹنے لگا، مگر اسے حوالہ نہ مل سکا، جب دیر ہوگئی تو مولوی صاحب نے اسے ڈانٹنا شروع کیا، اب اس نے خیریت اسی میں سمجھی کہ اسٹیج سے بھاگ نکلے، چنانچہ وہ کسی بہانے سے کھسکنا چاہ رہا تھا کہ اس کے موافقین ہی نے اسے آڑے ہاتھوں لے لیا، پھر وہ تو ذلت ہوئی کہ وہاں رکا ہی نہیں، اور پھر کبھی نہیں آیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے بے وہم وگمان ان کی مدد فرمادی۔

ایک اور عجیب واقعہ سنئے! اس واقعہ سے ان کے مخالفین ومعاندین میں ان کی دھاک بیٹھ گئی، اور وہ ان سے ڈرنے لگے، دنیاوی اعتبار سے اور دولت کے لحاظ سے وہاں ایک بڑا خاندان تھا، لیکن کمائی اس کی حرام کی تھی، سودخوری میں بدنام تھا۔ پورا خاندان دین سے دور تھا، اور دین داروں سے عناد رکھتا تھا، مولوی صاحب کی وجاہت بڑھتی دیکھی تو وہ گھرانا ان کا بدترین دشمن ہوگیا، اس کا ایک فرد جو اپنی غنڈہ گردی میں مشہور تھا اور ہمیشہ بندوق لئے رہتا تھا، اس سے سارا علاقہ کانپتا تھا، اس کو ان سے زیادہ چڑھ تھی، وہ ہمیشہ موقع کی تاک میں رہتا کہ ان کو ستائے، ایک بار ایک قریبی ہاٹ میں جو ہفتہ میں ایک دن لگتی تھی، مولوی صاحب جارہے تھے، ہاٹ تک پہونچنے کے لئے تقریباً ایک میل تک غیر آباد زمین طے کرنی ہوتی ہے، یہ میدان ہی میں تھے کہ ایک طرف سے وہ شخص بھی بندوق لئے ہوئے آن پہونچا۔ تاحد نظر اس وقت کوئی آدمی نہ تھا، صرف یہی دونوں تھے، اس شخص نے بھری ہوئی بندوق کی نال ان کے سینے کی طرف سیدھی کر کے کہا کہ اچھا موقع ہے آج میں فتنہ کی جڑ ہی صاف کردوں، قریب تھا کہ وہ گولی چلادے، انھوں نے قدرے چیخ کر کہا کہ مومن کی مثال تو موتی چور کے لڈو جیسی ہے کہ اگر ٹوٹ جائے تو بوندیاں ہیں اور بندھا رہے تو لڈو ہے اسی طرح مومن اگر ماردیا جائے تو شہید ہے اور بچ جائے تو غازی ہے، اس کا مرنا اور بچنا دونوں کامیابی ہے، مولوی صاحب نے جب یہ بات کہی تو وہ ڈر گیا۔ اور بندوق جھک گئی یا چھوٹ کر گر گئی، اور، مولوی صاحب آہستہ آہستہ ہاٹ کی طرف چلے گئے، اور وہ بھی خاموشی سے بندوق لے کر اپنے گھر چلا آیا، اس واقعہ سے، مولوی صاحب کی دھاک بیٹھ گئی۔

مولوی صاحب پڑھاتے رہے، کام کرتے رہے، بچوں کو پڑھنے کے لئے آمادہ کرتے رہے، تین بچوں کو تیار کر کے انھوں نے باہر بھیج دیا، اب اچھی خاصی اصلاح ہوگئی، لوگ دین کی طرف مائل ہونے لگے، عقائد کی اصلاح ہوئی، اعمال درست ہونے لگے، لوگوں کے ہندوانہ نام بدلے گئے، کتنے لوگوں نے دھوتی اتار کر لنگی باندھ لی، چہروں پر داڑھیاں بھی جگمگانے لگیں، بچے قرآن پڑھنے لگے، بعض بچے حفظ کرنے لگے۔

کچھ دن تک مولوی صاحب تعزیہ پرستی کی اصلاح میں لگے رہے، یہ بڑا مشکل کام تھا، مگر انھوں نے محنت کر کے تعزیہ سے لوگوں کا اعتقاد اٹھادیا، اس کی قباحت دلوں میں بٹھادی، ایک سال محرم آیا تو انھوں نے نوجوانوں کو للکارا کہ چوک کھود کر پھینک دو، یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا، قلوب میں چوک کا جو تقدس بیٹھا ہوا تھا وہ کسی طرح اسکے اکھاڑنے کی ہمت نہیں پیدا ہونے دے رہا تھا، ایک دن مولوی صاحب للکار کر نوجوانوں کو چوک پر لے گئے اور پہلا پھاوڑا انھوں نے چلایا، اور پھر آناً فاناً چوک مسمار ہوگیا، اور تعزیہ پرستی کی بنیاد ختم ہوگئی، میں جب وہاں پہونچا تھا تو تعزیہ اور تعزیہ پرستی کا نام ونشان مٹ چکا تھا، صرف اس واقعہ کی یاد باقی تھی۔

مولوی صاحب کی صحت ابتداء سے کمزور تھی، انھیں ٹی۔ بی کا اثر تھا، مگر وہ کام کے جوش میں صحت کی پرواہ نہ کرتے تھے، اور نہ علاج کرتے تھے، اور علاج بھی کہاں سے کرتے، ان کی بیوی بھی ساتھ میں تھی اور ایک بچہ بھی تھا، اور تنخواہ کل بیس روپیہ تھی، اسی میں گذر بسر کرتے تھے، پھر انھیں زیادہ خون آنے لگا، تقریباً سال بھر

تک مرض کی شدت کو جھیلتے رہے، آخر میں بالکل گھل گئے تھے، ناطاقتی انتہاء کو پہونچ گئی، ایک روز وہ چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے، اور ان کے محبین ومعتقدین چارپائی کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے، مغرب کا وقت ہورہا تھا، انھوں نے تیمّم کیا اور لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ مسجد جائیں، سب لوگ اٹھ کر مسجد چلے گئے، اذان ہوئی تو انھوں نے لیٹے لیٹے مغرب کی نماز ادا کی، مسجد میں لوگوں نے جونہی سلام پھیرا تو ایک بچے نے پیچھے سے پکارا کہ مولوی صاحب چارپائی سے نیچے گر گئے ہیں، لوگ دوڑے تو دیکھا کہ مولوی صاحب پٹی پکڑے بے حال بیٹھے ہیں اور لمبی لمبی سانس لے رہے ہیں، لوگوں نے دریافت کیا: آپ کیسے گر گئے؟ وہ اٹک اٹک کر بولتے رہے کہ آپ لوگ چلے گئے، میں نے مغرب کی نماز پڑھی، اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ چند صحابہ کے ساتھ تشریف لائے، مجھ سے رہا نہ گیا میں بے ساختہ اٹھ گیا اور بڑھ کر آپ ﷺ سے مصافحہ کیا، آپ ﷺ نے کچھ فرمایا اور تشریف لے گئے، اس عجیب واقعہ سے لوگوں پر ایک کیف سا چھا گیا، مولوی صاحب کو چارپائی پر لٹا دیا گیا، لٹانا تھا کہ یہ مردِ مجاہد دنیا سے منھ موڑ کر اسی بزرگ ہستی کے پیچھے چلا گیا جو ابھی مصافحہ سے نواز کر گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور بلند درجات سے نوازے۔

گاؤں والوں نے جنازہ پڑھ کر گاؤں کے ایک کنارے اس گنج گرانمایہ کو سپرد خاک کیا، مرنے والے کی یادگار ایک بیوی، اور ایک بچہ ہے، اس بچے کو اپنے عزیز ترین شاگرد مولانا رفیع الدین صاحب کے سپرد کر گئے تھے، اب ماشاء اللہ وہ بچہ بھی دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو گیا ہے۔

انتقال کے وقت مولوی صاحب کی عمر کل ٢٨/سال تھی۔ اس حلقے میں جہاں وہ تھے صرف ٤/سال انھیں قیام کا موقع ملا، لیکن اللہ تعالیٰ کی تائید سے اتنی قلیل مدت میں انھوں نے علاقے کی کایا پلٹ دی۔ ان کی کوششوں اور خلوص کی برکت سے آج اس جگہ متعدد علماء دین اور حفاظ کرام موجود ہیں، لوگوں کے عقائد بھی ماشاء اللہ صحیح ہیں۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ مولوی کمال الدین صاحب مرحوم دارالعلوم دیوبند کے ناتمام تعلیم یافتہ تھے، وہ حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی سے بیعت تھے، مولانا کو بھی ان سے خاص تعلق تھا، ان کے انتقال کے بعد اس حلقے کے لوگوں نے مولانا کا پروگرام لیا، دیہات کے ان دشوار گزار راستوں میں مولانا کا پُر مشقت سفر ہوا، جب مذکورہ علاقہ میں مولانا پہونچے تو سیدھے مولوی صاحب کی قبر پر پہونچے، اور دیر تک وہاں کھڑے رہے، میرا جب وہاں جانا ہوا تو مولانا کے چرچوں سے وہ سارا علاقہ معمور تھا، اور اس کے فوائد بکثرت دیکھنے میں آئے۔

مولوی کمال الدین صاحبؒ کوئی عالم فاضل نہ تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے جو کام لیا، وہ بہت اہم ہے، آج جو کچھ دین، علم دین، اور دینداری کا وہاں اثر اور ماحول ہے، اسی مردِ مجاہد کی دین ہے، جس نے اپنے کو قربان کر کے دین کو زندہ کر دیا۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نَورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوری علیہ الرحمہ

وفات: ۲۲؍محرم الحرام ۱۴۰۴ھ

حقیقی شعور تو خدا جانے کب حاصل ہو، لیکن عُرف عام میں جو عمر شعور کی عموماً کہی جاتی ہے، اس میں بندہ نے قدم رکھا، تو میرا محدود حلقہ، جس میں دین اور دینداری کا چرچا غالب تھا، اس محدود حلقے میں، چند نام بار بار کان میں پڑتے تھے، ان ناموں کے ساتھ بڑا اُنس ہو گیا تھا، ان کے واسطے سے وہ شخصیتیں، جن کے ساتھ یہ نام وابستہ تھے، دل و دماغ کے تصورات پر چھا گئی تھیں، یہ زیادہ تر قریبی اور علاقائی شخصیتیں تھیں، موقع بموقع ان کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوتا رہتا تھا۔ ان کو دیکھ کر، ان کے پاس بیٹھ کر، ان کی باتیں سن کر اللہ و رسول کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، ایمان میں اضافہ ہوتا تھا، دین کی محبت بیدار ہوتی تھی، علمِ دین کے حصول کا شوق دل میں کروٹیں لینے لگتا تھا، ان ناموں میں ابتدائی عمر کے اس مرحلے میں سب سے اہم نام مبارکپور ضلع اعظم گڈھ کی معروف شخصیت حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب علیہ الرحمہ کا تھا۔ انھیں عام طور سے ’’مفتی صاحب‘‘ کہا جاتا تھا۔ جب کوئی آگے پیچھے بغیر کسی قید و تصریح کے ’’مفتی صاحب‘‘ کہتا تو ہر شخص کا ذہن بے تکلف انھیں کی طرف منتقل ہوتا، ہمارے علاقے میں، جو مبارکپور اور اس کے گرد و پیش پر مشتمل ہے۔ یہ نام اتنا جانا پہچانا تھا کہ چھوٹا، بڑا، عالم و جاہل ہر ایک ’’مفتی صاحب‘‘ سے واقف تھا، کوئی دینی مسئلہ خواہ کیسا ہی ہو، روزمرہ کا معمولی مسئلہ ہو، یا کوئی اہم پیچیدہ مسئلہ، اس کے ساتھ ’’مفتی صاحب‘‘ کا نام ضرور لیا جاتا، لوگ کسی مسئلہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جب کہہ دیتے کہ ’’مفتی صاحب‘‘ نے ایسا ہی بتایا ہے، تو سننے والے سمع و طاعت کے ساتھ گردن جھکا دیتے، ہر دل ان کے احترام سے معمور تھا۔ ان کا قول قولِ آخر ہوتا تھا۔ ان کی ثقاہت، ان کے فتاویٰ اور ان کی بے نفسی پر سب کا اتفاق تھا، جہاں پہونچ جاتے دینی مسائل کے علم کی بہار آ جاتی، کبھی کوئی دینی جلسہ ہوتا تو ’’مفتی صاحب‘‘ کو دعوت دی جاتی۔ ’’مفتی صاحب‘‘ بہت مصروف ہوتے، مگر قبول کر لیتے۔ اور لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی، مسائل سوچ سوچ کر رکھے جاتے کہ ’’مفتی صاحب‘‘ سے پوچھے جائیں گے۔

’’مفتی صاحب‘‘ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں صدر الاساتذہ اور صاحب افتاء تھے، احیاء العلوم ہمارے حلقہ کا مرکزی مدرسہ ہے، ایک طرف ’’مفتی صاحب‘‘ کی دینی اور علمی و فقہی عظمت و احترام کی جڑیں اگر لوگوں کے دلوں میں پیوست تھیں، تو قومی و ملی اور خانگی مسائل و معاملات میں احیاء العلوم کے ناظم مولانا عبد الباری قاسمی مرحوم مرکزِ نگاہ تھے، ان دونوں شخصیتوں نے احیاء العلوم کو ہر اعتبار سے مرکز بنا دیا تھا۔

میں نے ’’مفتی صاحب‘‘ کو کس عمر میں دیکھا، کچھ یاد نہیں ہے، لیکن جس عقیدت و محبت کی نگاہ سے انھیں دیکھا تھا، اس نے حافظہ میں آج تک ان کی پہلی زیارت کے نقوش کو تازہ رکھا ہے، لمبا کُرتا، شرعی پاجامہ، سیاہ خوبصورت عمامہ، سینے پر چھائی ہوئی سفید داڑھی، ہلکا پھلکا بدن، سنجیدہ مگر شگفتہ چہرہ، اس حلیہ میں ایک وجیہ شخصیت نظروں کے سامنے اب بھی محسوس ہو رہی ہے، کوئی مخاطب ہوتا، تو مسکرا کر اس کی طرف متوجہ ہوتے، اور جواب دیتے تو سوال کی گرہوں کے ساتھ دل کی گرہیں بھی کھلتی چلی جاتیں۔ کوئی جلسہ تھا، اسٹیج پر بیٹھے تو وہی مرکزِ نگاہ بن گئے، ظاہری حسن و جمال تو نہ تھا، مگر علم دین اور تقویٰ کے نور نے چہرہ کو دیدہ زیب بنا دیا تھا

انھوں نے وعظ شروع کیا، تو مجمع سراپا گوش ہوگیا، اس لئے نہیں کہ کوئی مرصع تقریر ہورہی تھی، سیدھے سادے بول نکل رہے تھے، نہ لچھے دار الفاظ تھے، نہ خطابت کا اتار چڑھاؤ تھا، نہ جوشِ بیان تھا، نہ زورِ زبان تھا۔ مگر محبت و عقیدت نے ہر ایک کو مسخر کر رکھا تھا۔ دورانِ وعظ حدیثیں کثرت سے پڑھ رہے تھے۔

اس دید و زیارت کے بعد بار بار زیارت ہوتی رہی، پھر خوش قسمتی سے توفیقِ الٰہی نے جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے بابرکت ماحول میں اس خاکسار کو پہنچا دیا۔ اب تو ہر روز کی ملاقات اور زیارت تھی۔ چار سال تک بندہ اس مدرسہ کا طالب علم رہا، ان چار برسوں میں ''مفتی صاحب'' کو زندگی کے مختلف مرحلوں میں، دیکھنے کے مواقع خوب ملے، ان سے باقاعدہ کوئی سبق پڑھنے کی نوبت نہیں آئی، کیونکہ ان کی اصل مشغولیت فتویٰ نویسی کی تھی، صرف دو اسباق ان کے پاس ہوتے تھے، ایک عربی کی بالکل ابتدائی جماعت کا، غالباً میزان و منشعب ان کے درس میں رہتی تھی، دوسرے مشکوٰۃ شریف کا درس ان کے ذمہ تھا، بندہ عربی دوم کی جماعت میں داخل ہوا تھا، اسلئے ''حضرت مفتی صاحب'' سے باضابطہ سبق پڑھنے کی نوبت نہ آئی، البتہ استفادہ کا موقع کبھی کبھی مل جاتا تھا۔

اس وقت طلبہ میں ''حضرت مفتی صاحب'' کی جن خصوصیات کا خاص چرچا تھا، ان میں سب سے دلچسپی کی چیز یہ تھی کہ ''مفتی صاحب'' طلبہ سے صرفی و نحوی سوالات بہت کرتے تھے، اس طرح ذہین و ہوشیار طلبہ صرف و نحو میں بہت جلد رسوخ حاصل کر لیتے تھے، ان کے پاس کوئی طالب علم کسی عنوان سے کسی وقت پہونچ جاتا، تو ضرور تھا کہ اس سے صرف یا نحو کا کوئی قاعدہ، اس کی کوئی مثال، مثال پر قواعد کا انطباق دریافت کرتے، مجھے خوب یاد ہے کہ طلبہ ''مفتی صاحب'' کی درسگاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے گھبراتے تھے، اور جب کسی کو گزرنا ضروری ہوتا تو اس طرح دبے پاؤں گزرنے کی کوشش کرتا کہ ''مفتی صاحب'' کو خبر نہ ہو، ورنہ ضرور آواز دیں گے، اور کچھ نہ کچھ پوچھیں گے، ''مفتی صاحب'' کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی درسگاہ میں کتابوں کے مطالعہ میں غرق ہوتے، قدموں کی آہٹ اگر ان کے کان میں آجاتی، تو سر اٹھائے بغیر پُکارتے کون ہے؟ گزرنے والا بیچارہ حاضر ہوتا، اس سے نام پوچھتے، اگر نام کے ذیل میں کوئی سوال ہوتا تو اسے برجستہ پوچھتے، کس جماعت میں پڑھتے ہو؟ اسے دریافت کرتے، پھر اس کی استعداد کے مناسب کوئی صیغہ، کوئی قاعدہ دریافت فرماتے، طالب علم ہوشیار ہوتا تو اسے کوئی نیا علم حاصل ہوجاتا کسی قاعدہ کا کوئی مخفی گوشہ نمایاں ہوجاتا، مغفل ہوتا، تو اسے اپنی غفلت دور کرنے کا احساس پیدا ہوجاتا، ''مفتی صاحب'' کے یہ سوالات بہت کارآمد ہوتے، طلبہ کا ذہن کھل جاتا، صیغوں اور قواعد کے باریک نکتوں کی جانب ذہن کی رسائی ہوجاتی۔

ایک بار مفتی صاحب منشعب کا سبق پڑھا رہے تھے، ایک طالب علم درسگاہ کے سامنے سے گزرا، اسے بلا لیا، پوچھا کیا نام ہے؟ اس نے محمد عیسیٰ بتایا۔ عیسیٰ اسم متمکن کی سولہ قسموں میں سے کون سی قسم ہے، اس کا اعراب کیا ہے؟ وہ عربی چہارم کا طالب علم تھا، مگر ''مفتی صاحب'' کے رُعبِ علم کی وجہ سے لڑکھڑا گیا، اور صحیح جواب نہ دے سکا۔ پھر پوچھا کہ اِدھر کہاں جا رہے تھے، اس کی زبان سے نکلا کہ بارش ہورہی تھی، معاً پوچھا کہ ''بارش'' کون سا اسم ہے، وہ مزید بوکھلا گیا، پھر ''مفتی صاحب'' نے منشعب کے طالب علموں کے سامنے یہی دونوں سوال رکھے، انھوں نے بتایا کہ عیسیٰ اسم مقصور ہے، پھر سوال ہوا کہ اسم مقصور کیا ہوتا ہے۔ اس کا جواب دیا گیا، پھر اس کا اعراب دریافت فرمایا۔ طلبہ نے اس کا بھی صحیح جواب دیا۔ بارش والا سوال کیا تو کسی نے بتایا کہ بارش بروزن فاعل ہے۔ ایک بار طلبہ سے پوچھا ''مار

مینا'' بھون کھا، کون سا صیغہ ہے، طلبہ چکرا اٹھے، پھر خود ہی بتایا کہ ''مَارَمَیْنَا'' صیغہ جمع متکلم فعل ماضی منفی ہے، صیغہ صرف اتنا ہی ہے، مگر طلبہ کے انتقالِ ذہنی کے امتحان کے لئے ''مَارَمَیْنَا'' کی مناسبت سے بھون کھا کا اضافہ کر دیا، کہ دیکھیں طلبہ کا ذہن منتقل ہوتا ہے یا نہیں، اس طرح کے بہت سے الفاظ ان کے پاس محفوظ تھے۔ جن کی وہ طلبہ کو مشق کرایا کرتے تھے، ان کی خدمت میں عربی کی ابتدائی کتابیں جو طلبہ پڑھ لیتے تھے، وہ صرفی اور نحوی قواعد اور ان کے اجراء میں بہت پُختہ اور مشّاق ہو جاتے، اس وقت طلبہ اُردو کے الفاظ سے عربی کے صیغے بکثرت بنایا کرتے تھے۔

''مفتی صاحب'' کا مطالعاتی اور علمی انہماک، نمونے کا انہماک تھا۔ میں نے انھیں بڑھاپے میں پایا، جب کہ ان کی عمر تقریباً ۶۰ر سال کی تھی، قُویٰ کمزور ہو گئے تھے، بینائی بھی مدھم پڑ چکی تھی، مگر ان کا عالم یہ ہوتا کہ درسگاہ میں ہر طرف کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہوتا، اور وہ ان میں گُم ہوتے، وہ کسی وقت خالی نہ رہتے، دن ہو، رات ہو، صبح ہو، شام ہو، اندھیرا ہو، اُجالا ہو، گرمی ہو، سردی ہو، بارش ہو رہی ہو، ہوا چل رہی ہو، کیڑے گر رہے ہوں، وہ ہمہ وقت مطالعہ میں مصروف رہتے، ایک ایک کتاب کو بار بار پڑھتے، ضروری باتوں کے اشارات جلد کے سادہ ورق پر لکھ لیتے، کتابوں پر بکثرت حواشی لکھتے، تحریر ان کی بے حد پاکیزہ تھی، حروف نگینے کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے، جو کتاب بھی ان کے زیر مطالعہ رہی ہوگی، اس کے سادہ اوراق، اس کے حواشی سراپا شہادت ہوں گے کہ ''مفتی صاحب'' کے مطالعہ کا شرف اسے حاصل ہو چکا ہے۔

طلبہ کے درمیان یہ بات معروف تھی کہ ''مفتی صاحب'' ابتداء میں ذی استعداد نہ تھے، حافظہ بھی ان کا بہت کمزور تھا، اپنے ہمدرس رفقاء میں بہت غبی شمار ہوتے تھے، ان کے ایک ہم سبق بزرگ جو مرحوم ہو چکے، میں نے ان سے سنا تھا کہ

حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوریؒ کو جب ''مفتی صاحب'' سبق سناتے، اور اتفاقاً ان کی نگاہ ان کی طرف اٹھ جاتی، تو پھر وہ ایک لفظ بھی آگے نہ بڑھ پاتے، سب کچھ بھول جاتے، اس لئے ان کی طالب علمی بڑی مشقت کی تھی۔ مگر انھوں نے اپنے ذہن و حافظہ کی کمزوری کی تلافی اپنی غیر معمولی محنت و ریاضت اور اپنی سعادت مندی و تقویٰ اور یکسوئی سے کر لی تھی۔ ہمارے بعض اساتذہ طلبہ کو جب علم کی ترغیب دیتے تو ''حضرت مفتی صاحب'' کو مثال میں پیش کرتے کہ دیکھو کیسے تھے اور ان کی غیر معمولی یکسوئی اور محنت و مشقت نے انھیں علم کے کس رُتبے پر پہونچا دیا۔

ان کا خاص فن فقہ و فتاویٰ تھا، اس میں انھیں غیر معمولی استحضار تھا، کثرت و تکرارِ مطالعہ نے تمام کتابیں ان کے ذہن و دماغ میں محفوظ کر دی تھیں۔ مطالعہ کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کبھی رات میں بجلی غائب ہو جاتی، تو دوسرے لوگ تو اس کے انتظار میں اپنا وقت گزارتے، مگر ''مفتی صاحب'' فوراً موم بتی روشن کرتے، اور مطالعہ کا تسلسل جاری رکھتے، ہوا تیز ہوتی، تو خواہ کتنا ہی موسم گرم ہوتا، کمرے کی تمام کھڑکیاں بند کر دیتے تاکہ موم بتی ہوا سے متاثر نہ ہو، گرمی زیادہ ستاتی تو کرتا اتار دیتے، کبھی بنیائن بھی اتار دیتے، پسینے میں تر بتر ہوتے، مگر مطالعہ کے انہماک میں فرق نہ آتا، وقت ضائع کرنے کا ان کے یہاں کوئی خانہ ہی نہ تھا، ان کو کبھی کسی نے خالی بیٹھے نہ دیکھا ہوگا، پڑھتے ہوتے، یا لکھتے ہوتے، پڑھاتے ہوتے، یا مسئلہ بتاتے ہوتے، صحت مند ہوتے تو پڑھتے، بیمار ہوتے تو پڑھتے، اچھے اچھے حوصلہ مند جب ہمت ہار جاتے تب بھی وہ پڑھتے رہتے، کسی کتاب کو وہ ایک مرتبہ نہیں پڑھتے تھے، بلکہ بار بار پڑھتے تھے، اتنی مرتبہ پڑھتے کہ اس کے مضامین محفوظ ہو جاتے، اس طرزِ مطالعہ نے علم کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے ذہن و دماغ میں محفوظ کر دیا تھا، اسی ذہن و دماغ میں، جس کی کمزوری معروف تھی، ان کی محنت اور ان کی یکسوئی، طلبہ

وعلماء کے لئے درسِ بصیرت تھی، مایوس طالب علموں کے لئے ان کی ذات امیدوں کا چراغ تھی۔

باایں ہمہ علم وتفقہ، وہ تواضع وانکساری کے بھی پیکر تھے، انھوں نے اپنی کوئی حیثیت کبھی نہیں سمجھی، وہ ہر شخص سے استفادہ کرنے کیلئے تیار رہتے، اور اس میں ذرا بھی عار محسوس نہ کرتے، تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مرتبہ رمضان شریف میں مجھے جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں قیام کی سعادت حاصل ہوئی، ‘‘مفتی صاحب’’ کی درسگاہ کے قریب ایک حجرہ میرے لئے تجویز کردیا گیا تھا۔ ‘‘مفتی صاحب’’ رمضان شریف کی تعطیل میں بھی دن بھر مدرسہ میں تشریف رکھتے، اور ہمہ وقت منہمک رہتے، مغرب سے کچھ قبل گھر تشریف لے جاتے، اور فجر کی نماز پڑھ کر مدرسہ تشریف لاتے، ایک صاحب دور سے چل کر تراویح کا ایک الجھا ہوا مسئلہ لے کر آئے، اور دریافت کرنے کیلئے مجھ کو واسطہ بنایا، میں نے جاکر صورتِ حال عرض کی، ‘‘مفتی صاحب’’ مسکرائے، اور فرمایا کہ آپ جب پوچھتے ہیں، مشکل مسئلہ ہی پوچھتے ہیں، اس سے چند روز قبل میں نے نوٹ کی شرعی حیثیت کے سلسلے میں ‘‘مفتی صاحب’’ سے کافی استفادہ کیا تھا، اسی کی طرف اشارہ تھا، پھر فتاویٰ قاضی خاں میں باب التراویح نکالا، اور ایک عبارت پر انگلی رکھ کر فرمایا کہ اسے پڑھ لیجئے، اسے پڑھا تو میرے سوال کا جواب بعینہٖ اس میں موجود تھا۔ یہ تھا ان کا استحضار! پھر میں نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو اپنی قیام گاہ پر لے جاکر پوری بحث پڑھ لوں، فرمایا کہ بہت اچھا، اور مزید فرمایا کہ پڑھ لیجئے، اور کوئی نئی بات نظر آئے، تو مجھے بھی بتادیجئے گا، میں حیرت زدہ رہ گیا کہ حضرت آپ کے لئے کون سی بات اس میں نئی ہوگی، فرمایا ہاں ایسا ہوسکتا ہے، ممکن ہے کسی بات کی طرف میرا ذہن نہ گیا ہو۔

میں نے متعدد بار دیکھا کہ جب کسی صاحبِ علم نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، تو

بجائے زبانی جواب دینے کے، کتاب میں وہ مسئلہ نکال کر دیدیتے کہ پڑھ لیجئے، اس طرح وہ خاموشی سے تربیت فرماتے، اور اہل علم کو مآخذ کی نشاندہی کرتے، نوٹوں کے سلسلے میں جب میں نے ان سے استفادہ کرنا چاہا تو اس کے متعلق تمام حوالجات، مضامین اور کتابیں میرے حوالے کردیں، ‘‘مفتی صاحب’’ کے اسی ایک طرزِ عمل سے ان کے علمی استحضار، تواضع وانکسار اور حسن تربیت ہر ایک کا اندازہ ہوتا ہے۔

رمضان شریف میں بھی جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ ہر وقت کتابوں میں مستغرق رہتے، صحت اس وقت ان کی اچھی نہ تھی، بڑھاپا، اعذار اور مختلف عوارض کا ہجوم تھا۔ مگر جب ان کے ہاتھ میں کتاب ہوتی، تو ان میں سے گویا کوئی بات نہ ہوتی۔ کتابوں نے انھیں دنیا کی تمام الجھنوں سے بالکل یکسو کر رکھا تھا،

وہ مبارکپور جامع مسجد کے امام تھے، جمعہ کی نماز وہی پڑھاتے، کبھی سیاہ اور کبھی سبز عبا پہن کر، خوبصورت صافہ باندھ کر عصا بدست خطبہ کے لئے جب کھڑے ہوتے، تو جامع مسجد اسلامی جاہ وجلال سے بھری نظر آتی، ‘‘مفتی صاحب’’ بہت متقی اور دیندار انسان تھے، ان کے تقویٰ اور تدین کی وجہ سے مسلمانوں کو ان پر کمال درجہ اعتماد تھا، اپنے تو اپنے ہیں۔ مسلک کے اعتبار سے جو شدید مخالف ہیں، یعنی رضاخانی فرقہ کے لوگ، ان کے دل بھی ‘‘مفتی صاحب’’ کی عظمت سے لبریز تھے، کسی مسئلہ کا اعلان اگر ‘‘مفتی صاحب’’ کی طرف سے ہوجاتا، تو انھیں بھی اس پر اطمینان ہوتا، اور اسے تسلیم کرتے، یہ اور بات ہے کہ گروہی عصبیت کبھی مانع ہوجاتی ہو۔

‘‘مفتی صاحب’’ کے تقویٰ اور ذوقِ مطالعہ کے سلسلے میں ہمارے دوست مولانا عبدالرب صاحب اعظمی سناتے ہیں کہ ایک روز مغرب کی نماز کے بعد وہ کچھ رفقاء کے ساتھ ‘‘مفتی صاحب’’ سے ملاقات کیلئے مبارکپور پہونچے، معلوم ہوا کہ وہ گھر پر ہیں، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ محلّہ کی مسجد میں مصروفِ مطالعہ ہیں، یہ لوگ

حاضر ہو گئے، دیکھا کہ مسجد کے اندرونی حصے میں گرمی کی وجہ سے کرتا اتارے ہوئے، ایک معمولی چراغ کی روشنی میں کتاب دیکھ رہے ہیں، ان لوگوں نے سلام کیا، وہ چونک کر متوجہ ہوئے پھر چراغ اٹھایا اور اسے ساتھ لے کر گھر کی جانب چلے، انھوں نے چراغ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ یہ میرے گھر کا چراغ ہے، نماز کا وقت ختم ہو جاتا ہے، تو مسجد کا دیا بجھا کر اپنا چراغ جلا لیتا ہوں، اور اس میں مطالعہ کرتا ہوں، اللہ اکبر یہ تھی احتیاط اور یہ تھا تقویٰ! اور صرف اسی ایک معاملہ میں نہیں زندگی کے ہر معاملہ میں ’’مفتی صاحب‘‘ اسی اہتمام سے تقویٰ کو کام میں لاتے تھے۔

’’مفتی صاحب‘‘ نے خود کو علم کے لئے اور خدمت علم کیلئے اس طرح فنا کر دیا تھا کہ پھر اس کے بعد دنیاوی کسی خَــرخَشَـــہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی، انھیں دنیاوی مسائل ومعاملات کی جزئیات کے علم تک سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسی کمال یکسوئی نے علم وتفقہ میں رسوخ تام بخش دیا تھا، ان کے فتاویٰ بہت پُختہ اور معتبر ہوتے، کبھی دوسرے صاحبانِ افتاء سے اختلاف ہوتا، تو دلائل کے لحاظ سے انھیں کی بات بھاری رہتی، فتاویٰ کے رجسٹر میں ایسے کئی مسائل نظر سے گزرے ہیں، جن میں دوسرے مفتیانِ کرام سے ان کا اختلاف ہوا ہے، اور ترجیح وقوت انھیں کے فتاویٰ کو حاصل ہوئی ہے۔

’’مفتی صاحب‘‘ کے فتاویٰ کا ایک انتخاب ’’فتاویٰ احیاء العلوم‘‘ کے نام سے ایک جلد میں شائع ہوا ہے، اس کے بعد اور جلدیں شائع کئے جانے کا منصوبہ تھا، مگر شاید کام رک گیا۔ کاش ان کے تمام فتاویٰ شائع ہو جاتے، ان کی حیات میں رسالہ البلاغ بمبئ میں ان کے فتاویٰ شائع ہوا کرتے تھے، ان کے قلم سے لکھے ہوئے فتاویٰ کی تعداد بہت ہے، وہ علم وتفقہ کا بیش بہا خزانہ ہے، احیاء العلوم کے کارپردازوں کی ذمہ داری ہے کہ اس خزانہ کو بہتر سے بہتر شکل میں وقفِ عام کریں،

’’مفتی صاحب‘‘ اپنے فتاویٰ کے نقول اہتمام سے رکھتے تھے، بہت سا تو خود اپنے دستِ خاص سے نقل کرتے، لیکن مصروفیت میں کبھی وقت نہ ملتا تو کسی خوشخط طالب عِلم سے جس کے فہیم ہونے کا گمان ہوتا، نقل کراتے، اس کی معلومات کرتے رہتے کہ کون طالب علم اچھا لکھتا ہے، جس کے بارے میں معلوم ہو جاتا، اسے بلاتے، اس سے لکھواتے، تحریر پسند آتی تو خوب مسکراتے، تحسین فرماتے کہ اب تمھیں سے لکھوایا کروں گا۔ کئی بار یہ سعادت اس خاکسار راقم سطور کو بھی بخشی گئی

’’مفتی صاحب‘‘ کا علاقہ کے تمام مدارس اور گاؤں اور قصبوں سے گہرا ربط تھا، جب کوئی دینی تقریب ہوتی، کوئی جلسہ ہوتا، کسی مسجد کا سنگِ بنیاد رکھنا ہوتا تو ’’مفتی صاحب‘‘ یاد کئے جاتے، بعض مقامات پر جلسہ ان کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا، ’’مفتی صاحب‘‘ بخوشی ان جگہوں پر تشریف لیجاتے، مدارس میں طلبہ کے امتحانات کے لئے جاتے، وعظ ’’مفتی صاحب‘‘ کا بالکل سادہ ہوتا، اس میں مشکوٰۃ شریف کی احادیث بکثرت پڑھتے، اور ان کا ترجمہ کرتے، ان کا وعظ سادگی کے باوجود بہت مؤثر ہوتا۔

’’مفتی صاحب‘‘ فنافی العلم تھے، اس فنائیت کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ دین، علم دین، فتویٰ اور کتاب کے علاوہ ہر چیز انھیں فراموش ہو گئی تھی، علوم کے استحضار کا عالم تو آپ دیکھ ہی چکے کہ کوئی مسئلہ پوچھا جاتا، تو مسئلہ تو الگ رہا، برہ راست اس کے مآخذ سے عبارت نکال کر دکھلا دیتے، مگر دنیوی امور سے بے تعلقی بلکہ بے خبری کا حال یہ تھا کہ حیرت ہوتی ہے، یقین نہیں آتا کہ دنیا میں رہتے ہوئے ایسا بھی ہو سکتا ہے، اس سلسلے میں ’’مفتی صاحب‘‘ کی طرف ایسی ایسی باتیں منسوب ہیں کہ جو انھیں نہیں جانتا وہ شاید کسی طرح یقین کرنے کیلئے آمادہ نہ ہوگا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خود میرے تجربہ میں ایسے کتنے معاملات ’’مفتی صاحب‘‘ کے آئے ہیں کہ اگر کوئی

دوسرا مجھ سے بیان کرتا، تو شاید یقین کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا اور آج میں ان میں سے چند باتیں لکھنی چاہتا ہوں تو ڈر رہا ہوں کہ پڑھنے والے کہیں تکذیب نہ کر بیٹھیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کو اتنے انواع والوان میں تقسیم فرما رکھا ہے کہ سب کا احاطہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، ایسے لوگ بھی اسی دنیا میں پائے گئے ہیں اور پائے جاتے ہیں کہ جس طرف انھوں نے رُخ کیا ہے، اس میں کمال درجہ رسوخ حاصل کرلیا۔ اس کی ادنیٰ ادنیٰ جزئیات تک ان کی نگاہ کی گرفت میں آجاتی ہیں، علم وفن کے کسی شعبہ میں اپنی ہمت صرف کرتے ہیں تو ایک سے بڑھ کر ایک گل بوٹے کھلاتے چلے جاتے ہیں، لیکن اس کے بالمقابل دوسری سمت سے ایسے غافل ہوتے ہیں جیسے کبھی اس کو دیکھا ہی نہ ہو، حضرت تھانویؒ نے ایک بہت نیک نفس اور بزرگ میاں جی کا واقعہ اپنے ملفوظات میں سنایا ہے کہ وہ اتنے سچے اور بھولے تھے کہ انھیں یہ تصور ہی نہ تھا کہ مسلمان جھوٹ بول سکتا ہے۔ فرمایا کہ وہ مکتب میں پڑھاتے تھے، کبھی کبھی مکتب کے بچے ان کے آنے سے پہلے درسگاہ کی چٹائیاں اٹھا کر زمین پر پانی کا چھڑکاؤ کردیتے، میاں جی تشریف لاتے بچوں کو اِدھر اُدھر بکھرا ہوا دیکھتے تو پوچھتے کہ کیا بات ہے، بچے کہتے کہ حضرت بارش ہوئی ہے، تعجب سے فرماتے کہ خدا کی قدرت بھی عجیب ہے، باہر دھوپ نکلی ہوئی ہے اور اندر بارش ہوئی ہے، پھر وہ چھٹی کردیتے، وہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ بچے جھوٹ بولیں گے، اگر ہم نے ''مفتی صاحب'' کو نہ دیکھا ہوتا، تو یہ واقعہ بہت عجیب معلوم ہوتا، مگر ''مفتی صاحب'' کے یہاں اس سے بھی عجیب تر واقعات ہیں، جن کا ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے، فقہ وفتاویٰ اور دوسرے علوم درسیہ میں نہایت بیدار مغز اور تجربہ کار مگر دنیوی معاملات میں حد سے زیادہ سادہ اور ناواقف۔

جو کچھ دیکھا ہے، یا اپنے پیشروؤں سے سنا ہے، نہ سب کے لکھنے کا موقع ہے

اور نہ سب کا تحمل ہے، کچھ ایسی چیزیں ہیں، جو نسبۃً کم تعجب خیز ہیں، بطور نمونہ کے تحریر کرنا ضروری ہے، تاکہ نہ جاننے والوں کے سامنے ''مفتی صاحب'' کی زندگی کا یہ سبق آموز پہلو بھی سامنے آجائے، جسے دوسرے تو جو چاہیں کہیں، مگر ہم طالب علموں کے نزدیک ان کی زندگی کا یہ بڑا تابناک پہلو ہے۔

''حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ'' مبارکپور کے باشندے تھے، مگر مدرسہ سے نکلتے اور گھر چلے جاتے، گھر سے نکلتے مدرسہ آجاتے، بس اتنا راستہ تو وہ جانتے تھے۔ اس کے علاوہ مبارکپور کی گلیوں اور راستوں سے کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی، گھر جانے کا راستہ بازار ہوکر جاتا، مگر بازار کے شور و ہنگامے سے بے خبر رہتے۔

ایک بار بجلی غائب ہوئی، غائب ہوتی ہی رہتی تھی ''مفتی صاحب'' کے پاس موم بتی رہا کرتی تھی، اس دن اتفاق سے نہیں تھی، ایک طالب علم کو پکارا، اسے دس روپئے دیئے، اور فرمایا کہ ایک موم بتی لاؤ، اگر پیسہ کم پڑ جائے تو اپنے پاس سے لگا لینا، میں بعد میں ادا کردوں گا، حالانکہ اس وقت بڑی موم بتی چار آنے (۲۵/ پیسے) کی ملا کرتی تھی، طالب علم نے جب پیسے واپس کئے تو بہت خوش ہوئے کہ تم نے پیسے بچا لئے۔

''مفتی صاحب'' اپنے ساتھ ایک لمبا سا ہلکا رُومال رکھے رہا کرتے تھے، ایک بار گھر سے تشریف لا رہے تھے، ہاتھ میں سن لائٹ صابن ایک کی ٹکیہ لئے ہوئے تھے، ایک طالب علم کو اپنا وہی رومال عطا فرمایا اور صابن کی ٹکیہ حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے دھودو، اگر صابن گھٹ جائے، تو تم اپنے پاس سے لگا دینا، میں دے دوں گا۔

ایک بار خلافِ معمول طلبہ کے حجروں کی طرف ''مفتی صاحب'' کسی کو تلاش کرتے ہوئے نظر آئے، یہ بالکل نئی بات تھی، ان کی مقررہ جگہوں اور متعینہ

راستوں کے علاوہ کسی نے مدرسہ میں کہیں اور نہیں دیکھا ہوگا، اس دن خلافِ عادت جو ادھر انھیں دیکھا گیا تو بڑی حیرت ہوئی، میں اپنے حجرے سے باہر نکل آیا۔ دریافت فرمانے لگے فلاں نومسلم طالب علم کہاں رہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ دارالاقامہ میں رہتے ہیں، مدرسہ کے احاطہ سے باہر ایک عمارت چند کمروں پر مشتمل تھی، دارالاقامہ کے نام سے بس وہی عمارت موسوم تھی، اور مدرسہ کا ہر فرد اسے جانتا تھا، مگر ''مفتی صاحب'' اس سے بے خبر تھے، فرمایا دارالاقامہ کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مدرسہ کے باہر ہے، حکم دیا مجھے وہاں لے چلو، عرض کیا میں اُنھیں بُلا لاتا ہوں، فرمایا نہیں مجھے ہی لے چلو، نہ جانے کیا کام تھا، میں انھیں دارالاقامہ لے گیا، تو غالباً پہلی مرتبہ انھوں نے وہ عمارت دیکھی، حالانکہ وہ ایک خاص معاملہ اور نزاع کی وجہ سے خاصی شہرت یافتہ عمارت تھی۔

''مفتی صاحب'' پرانے علماء کے طرز پر قلم دان رکھتے تھے، اس میں قلم دوات، چاقو، روشنائی وغیرہ کا پورا نظم تھا، لکڑی کا قلم استعمال فرماتے تھے، بعد میں جب فونٹن پن عام ہوگیا، تو قلم دان میں وہ بھی جگہ پا گیا۔ ان کے پاس قدیم طرز کا فونٹن پن تھا۔ جس میں روشنائی بھرنے کے لئے ربڑ کی خول نہ ہوتی بلکہ قلم کے جوف میں روشنائی بھری جاتی، ''مفتی صاحب'' کے لئے یہ چیز نئی تھی۔ قلم میں روشنائی بھرنا ان کے لئے کارِ اہم تھا، عموماً کوئی طالب علم مل جاتا تو اس سے بھروا لیتے، میں ایک دن گزر رہا تھا، آواز دے کر پکارا، میں جلدی جلدی اپنے حافظۂ دماغ میں صیغوں کی، تعلیلات کی، قواعد کی گردان کرنے لگا، کہ نہ جانے کیا سوال ہو جائے۔ مگر انھوں نے آج صیغہ نہیں پوچھا، انھوں نے فرمایا قلم میں روشنائی بھر سکتے ہو، میں نے اثبات میں جواب دیا، حکم دیا کہ میرے سامنے بھرو، میں نے احتیاط سے روشنائی بھر دی، فرمایا تم کو اچھا ڈھنگ ہے، اب تمھیں کو روشنائی بھرنے کیلئے بلاؤں گا۔ اس

کے بعد بار بار یہ سعادت نصیب ہوئی۔

اس زمانہ میں مشہور مورخ مولانا قاضی اطہر صاحب جو ''مفتی صاحب'' کے تلمیذ رشید ہیں، بمبئی رہتے تھے، ایک بار وہ ایک بیش قیمت، اور خوبصورت قلم ''مفتی صاحب'' کے لئے لائے جس کا نِب پورا، قلم کے خول سے ڈھکا ہوا تھا، صرف نب کا وہ حصہ کھلا ہوا تھا، جو لکھنے کے استعمال ہوتا ہے۔ ''مفتی صاحب'' بہت مسرور ہوئے، کسی دن انھوں نے اوپر والی خول کھول دی اور نب کو کچھ ادھر ادھر کر دیا، اس کے بعد خول اس پر لگا رہے ہیں تو نِب کسی اور طرف اور خول کا سرا کسی اور طرف جا رہا ہے، بہت گھبرائے کہ قلم خراب ہوگیا ہمارے ایک ہمدرس مولوی محمد عامر صاحب مرحوم، جن کو ''مفتی صاحب'' بہت عزیز رکھتے تھے، ان کو بلایا کہ دیکھو جی یہ قلم خراب ہوگیا ہے، قاضی اطہر صاحب نے دیا تھا، ابھی نیا قلم ہے، بگڑ گیا ہے، اب کیا ہوگا؟ عامر مرحوم نے عرض کیا حضرت بن جائے گا، بہت خوش ہوئے، انھوں نے قلم دیا اور کچھ روپے دئے کہ بنوا لاؤ، پیسہ کم ہو تو اور لگا لینا میں دے دوں گا، مولوی عامر مرحوم اسے لے آئے، ہم لوگوں کو دکھانے لگے پھر اسے ٹھیک کر دیا گیا قلم بہت اچھا تھا، مولوی عامر مرحوم ایک روز اسے اپنے پاس رکھے رہے، پھر دوسرے دن واپس کیا، اور روپئے لوٹا دئے، ''مفتی صاحب'' بہت مسرور ہوئے، بالخصوص اس پر کہ بنانے والے نے بڑی رعایت کی پیسے نہیں لئے۔

اس طرح کے متعدد واقعات ذہن میں محفوظ ہیں، جو کچھ لکھا گیا اس سے بھی عجیب تر! بھولا پن، سادگی اور سادہ لوحی صرف دنیاوی امور میں تھی، فقہ وفتاویٰ کے باب میں ان کی ژرف نگاہی کا تذکرہ انہیں سطور میں گزر چکا ہے۔

''حضرت مفتی صاحب'' کی ولادت یکم محرم الحرام ۱۳۲۵ھ کو مبارکپور کے ایک محلّہ پرانی بستی میں ہوئی، تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں ہوئی۔ ان کے خصوصی

استاذ، مبارکپور کے مشہور و معروف عالم دین حضرت مولانا **شکر اللہ** صاحب مبارکپوریؒ المتوفی ۵؍ربیع الاول ۱۳۶۱ھ تھے، مبارکپور میں اہل حق کے قدم انھیں کی مجاہدانہ کاوشوں سے جمے، مولانا عبدالباری صاحب قاسمی مرحوم جنھوں نے بعد میں ایک طویل عرصے تک مدرسہ کی کامیاب نظامت کی، انہیں مولانا شکراللہ صاحبؒ کے بھتیجے تھے۔

کچھ دنوں ''مفتی صاحب'' نے مدرسہ ناصر العلوم گھوسی میں بھی تعلیم حاصل کی ہے، ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، امام العصر حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ کے دیوبندی تلامذہ کی آخری کھیپ میں حضرت مفتی صاحب شامل تھے، اس کے بعد حضرت شاہ صاحب ڈابھیل تشریف لے گئے۔ فراغت کے بعد دو تین سالوں تک کچھ دوسرے مدرسوں میں پڑھایا، ۱۳۴۹ھ میں اساتذہ نے انھیں جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں بلالیا، پھر یہیں کے ہو رہے، اسی وقت نکلے جب فرشتۂ موت حاضریٔ آخرت کے بلاوے کیلئے آگیا۔

''مفتی صاحب'' کا وصال ۲۲؍محرم الحرام ۱۴۰۴ھ کو ہوا، رات میں وصال ہوا تھا، علی الصباح مدرسہ دینیہ غازیپور، جہاں ان دنوں میرا قیام تھا خبر پہونچی، علالت کی اطلاعات ملتی رہتی تھیں، مگر وفات کی خبر سن کر دل پر حسرت والم کے بادل چھا گئے، مبارکپور حاضری ہوئی، جنازہ تیار تھا۔ سوگواروں کا عظیم مجمع تھا، سب کی زبان پر ''مفتی صاحب'' کا ذکر جمیل تھا۔ نماز جنازہ ادا کی گئی، اور اپنے استاذِ محترم حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوریؒ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ ہزاروں رحمتیں ان کی تُربت پر نثار کرے۔

غفر اللہ لہٗ و رحمہٗ رحمة واسعة وادخله الجنة بفضلهٖ ورحمتهٖ

☆☆☆☆☆☆☆

حاجی محمد ایوب صاحب مرحوم

(ایک سوختہ جانِ محبت)

وفات: ۶؍جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ

انسان کی زندگی میں بعض شخصیتیں اتنی آہستگی اور لطافت کے ساتھ داخل ہوتی ہیں کہ بروقت احساس نہیں ہوتا کہ شب و روز کی گردش میں کسی نئی چیز کا اضافہ ہو رہا ہے، جیسے بادِ نسیم، صبح دم پھولوں کے درمیان آتی ہے، اور انھیں مس کرتی ہوئی گزر جاتی ہے، مگر ان میں زندگی کی نئی لہر دوڑ جاتی ہے، پنکھڑیاں کھلکھلا اٹھتی ہیں، اسی طرح کسی کسی شخصیت سے ابتداءً سابقہ پڑتا ہے تو کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوتی، بس جیسے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا جسم سے مس ہوا ہو، مگر کچھ مدت کے بعد ایسا لگتا ہے، جیسے وہ ہلکا سا جھونکا رگ رگ میں سرایت کر گیا ہو، اس سے روح شاداب ہو جاتی ہے، قلب میں ٹھنڈک اور جگر میں طراوت محسوس ہونے لگتی ہے، یہ شخصیتیں بے وہم و گمان مل جاتی ہیں، بغیر آرزو و تمنا کے دستیاب ہو جاتی ہیں، مگر دیر نہیں لگتی کہ وہی سراپا دل کی آرزو و تمنا بن جاتی ہیں، زندگی ان کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے، ان کا تصور انسان کے لئے فرحت و مسرت کا پیغام بن جاتا ہے، یہ واقعہ اکثر انسانوں کو پیش آتا ہے، کچھ لوگ اسے محسوس کر کے رہ جاتے ہیں، کسی کو دکھا اور بتا نہیں پاتے، اور کچھ لوگ اس کو زبان عطا کر دیتے ہیں، تو دنیا بھی اسے جان جاتی ہے، پھر وہ بہت سے لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن جاتا ہے، لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ تو خود ان پر بیتی ہوئی سرگزشت ہے، آج میں اسی طرح کی ایک سرگزشت کو الفاظ و عبارت عطا

کرنے کی کوشش کررہا ہوں، ایک شخصیت جو میری زندگی میں اس طرح داخل ہوئی کہ ابتداءً مجھے نہ کچھ التفات ہوا، نہ خیال، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد دیکھتا ہوں کہ جان و دل کا ریشہ ریشہ اس کی محبت میں بھیگ گیا ہے، اس نے مجھ سے محبت کی، مگر اس طرح کہ اس پر محبت کا گمان نہیں ہوا۔

مجھے نہ دن یاد ہے نہ تاریخ، بس اتنا یاد ہے کہ غالباً ۱۴۰۳ھ میں اپنے ایک عزیز دوست کے ساتھ کلکتہ گیا، پہلی بار کلکتہ جانا ہوا۔ بڑے شہروں سے، بھیڑ بھاڑ کے شہروں سے مجھے وحشت ہے۔ مگر اپنے دوستوں کے اصرار پر کلکتہ گیا۔ وہاں ملاقاتیں ہوئیں پرانے شناساؤں سے بھی، اور کچھ نئے لوگ بھی ملے، ان نئے لوگوں میں ایک بڑے میاں تھے، پستہ قد، گداز بدن، موٹے شیشے کی عینک ضعفِ بصارت کی دلیل، داڑھی سفید مختصر سی، دانت زیادہ تر رُخصت ہو چکے تھے، عمر اسّی، پچاسی کے لپیٹ میں، ہاتھ میں عصا لئے ہوئے، وہ بھی ملے، بے تکلفی سے ملے، دل نے گواہی دی کہ میں درد بھرے دل سے مل رہا ہوں۔ جاننے والوں نے تعارف کرایا کہ یہ حاجی محمد ایوب صاحب ہیں۔ کلکتہ کے رہنے والے، اصلاً دانا پور پٹنہ کے باشندے ہیں۔ لیکن اب دو پشت سے یہیں آباد ہیں۔

میرا قیام کلکتہ میں نارکل ڈانگہ کی جامع مسجد میں تھا، اس کے موذن میرے کرم فرماؤں میں ہیں، ان کے دو بچے میرے پاس پڑھتے تھے، ان کے اصرار اور حکم سے کلکتہ حاضری ہوئی تھی، مغرب کی نماز کے بعد مسجد کے بالائی حصہ میں، میں کچھ پڑھ رہا تھا، دیکھا کہ حاجی محمد ایوب صاحب وہیں دو تین آدمیوں کے ساتھ آرہے ہیں۔ میں ان کے احترام میں اپنی جگہ سے ہٹنے لگا، انھوں نے محبت سے فرمایا کہ اپنی جگہ بیٹھے رہو، ہم لوگ اسلئے آئے ہیں کہ ہمیں کچھ دین کی باتیں بتاؤ، کچھ سمجھاؤ، میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ بزرگوں کو کیا سمجھاؤں، لیکن ان کی طرف سے اصرار ہوتا رہا، میں نے تفسیر ابن کثیر ہاتھ میں لے کر سورۂ احزاب کی آخری دو تین آیتوں کی تفسیر سنائی، بہت خوش ہوئے، انھوں نے حکم دیا کہ جب تک رہو، اسی طرح قرآن کریم کی تفسیر بیان کردیا کرو، دیکھنے میں تو وہ ایک معمولی انسان لگتے تھے، کچھ انگریزی پڑھے ہوئے تھے، جب عمر تھی تو سرکاری ملازم تھے، اب پنشن پاتے تھے، مگر گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ان کا دل غیر معمولی ہے، ان کا دل کیا ہے؟ محبت کا اتھاہ سمندر ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جتنے جذبات وملکات بخشے ہیں، ان میں سب سے طاقتور، سب سے بیش قیمت، اور سب سے مفید و مؤثر جذبہ محبت کا ہے، محبت ہی سے انسان کی زندگی میں شادابی اور تازگی آتی ہے، اسی سے دل میں گداز اور حرارت پیدا ہوتی ہے جو معمولی انسانوں سے غیر معمولی کام کرالیتی ہے، انسانوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ مال و دولت لٹا بیٹھے ہیں، جان کی بازی ہار دی ہے، وہ کون سا جذبہ تھا جس نے ان بڑے بڑے خطرات سے دوچار کیا، اور انھیں سرخ روئی بخشی۔

وہ محبت ہی تو ہے، محبت نہ ہو تو آدمی ایک سوکھی ٹھنٹھ شاخ ہے، جو محض جلا دینے کے قابل ہے، محبت سے کوئی انسان خالی نہیں ہوتا، لیکن کسی کو یہ جذبہ کچھ زیادہ عطا کردیا جاتا ہے، اس پر اس کی وجہ سے ایک نشہ سا چھا جاتا ہے، اس کی ہر حرکت و سکون سے محبت ٹپکی پڑتی ہے، ہاں یہ خیال رہے کہ ہر جذبہ کا ایک رُخ صحیح ہوتا ہے، اور ایک رُخ غلط ہوتا ہے، محبت اگر صحیح رُخ پر ہو، تو وہی محبت، عبادت ہے، طاعت ہے، اور اگر اس نے غلط رُخ اختیار کرلیا، تو وہ محبت نہیں، ہوس ہے، گناہ ہے، معصیت ہے، انسانیت کے لئے مصیبت ہے۔

حاجی محمد ایوب صاحب کو یہ جذبہ غیر معمولی طور پر بخشا گیا تھا، ان کی محبت، پاک محبت تھی، ان کا دل محبت سے لبریز تھا۔ جس طرف اس کا رُخ ہوتا، اس میں

شدت ہوتی۔ انھیں اپنی رفیقِ زندگی، یعنی اہلیہ سے بے حد محبت تھی، انتہائی عشق تھا۔ میں جب ان سے ملا ہوں، تو ان کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور اس پر ۵/سال کا عرصہ بیت چکا تھا، مگر وہ اسے اس طرح یاد کرتے تھے جیسے کل کی بات ہو، اہلیہ کے انتقال کے بعد دنیا سے ان کی دلچسپی ختم ہوگئی تھی، وہ زندگی کے باقی ایام اس طرح کاٹ رہے تھے جیسے کوئی بھاری بوجھ اٹھا کر چل رہے ہوں، زندگی کی رعنائیاں ان کے لئے ختم ہو چکی تھیں، اب ان کے تین کام رہ گئے تھے، اللہ کی عبادت وطاعت، مرحوم بیوی کی یاد، اور موت کا انتظار، امام شافعی علیہ الرحمہ کا قول مشہور ہے کہ ہم کو جنت کا شوق اسلئے ہے کہ وہاں دوستوں سے ملاقات ہوگی، حاجی محمد ایوب صاحب کو موت کا شوق اسلئے تھا کہ اہلیہ سے ملاقات ہوگی۔ مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد اہلیہ سے ملاقات ہوگی؟ میں کہتا کہ ایمان پر خاتمہ شرط ہے۔ اگر یہ دولت دونوں کو حاصل ہو تو ضرور ملاقات ہوگی۔ کہتے تھے کہ وہ نیک بخت تو کلمہ پڑھتے ہوئے گئی ہے، میں کہتا کہ آپ بھی کلمہ پڑھتے ہوئے جائیے، بس خوش ہو جاتے، دعا کرنے لگتے، رو پڑتے، اللہ کی یاد بڑھا دیتے، مجھے بزور واصرار حسن خاتمہ کی دعا کا حکم دیتے، موت کا انتظار انھیں شدت سے تھا، بکثرت توبہ کرتے، قرآن کی تلاوت سے عشق تھا، حالانکہ نگاہ بہت کمزور تھی، کلمہ طیبہ کا ورد بکثرت رکھتے بس یہ لالچ اور آرزو رہتی کہ ایمان پر خاتمہ ہو، اس کے لئے خود بھی روتے رہتے، اور دوسروں کو بھی رونے کا حکم دیتے، دل محبت سے بھرا تھا اللہ کی محبت میں غرق تھے، میں کبھی کبھی سوچتا کہ اللہ کی محبت میں مرنا چاہتے ہیں یا بیوی کی محبت میں، مومن تھے، اللہ کی محبت اصل تھی، بیوی کی محبت اس کی فرع۔ مگر فرع کا رنگ اتنا شوخ اور نمایاں تھا کہ اصل وفرع میں فرق کا ادراک کرنا مشکل ہو جاتا۔ بڑی پاک اور بے لوث تھی محبت، شب وروز کا زیادہ حصہ اللہ کی یاد میں گزرتا۔ تہجد گزار تھے، آخر شب میں اٹھ جاتے اور یاد مولیٰ میں لگ جاتے۔ میں نے مرنے کا شوق کسی شخص میں اتنا نہیں دیکھا، جتنا حاجی صاحب میں پایا، میں کبھی موت کا تذکرہ ان کے سامنے کرتا، تو ان کا چہرہ کھلتا چلا جاتا، خوب مسکراتے ہنستے، پوچھتے میری موت کب آئے گی؟ میں کبھی ازراہ لطف کہہ دیتا کہ ابھی آپ کی موت میں تاخیر ہے، تو جھنجھلا جاتے، خفا ہونے لگتے۔

اور اگر کبھی کہہ دیتا کہ اب کیا دیر ہے، بڑھاپا تو قرب منزل کی کا کھلا ہوا اعلان ہے۔ بس خاموش ہو جاتے۔

ایک بار میں بیٹھا ہوا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ حاجی صاحب عصا ٹیکتے ہوئے آئے، فرمانے لگے آج ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ ذرا خوب اچھا جواب دینا۔ وہ بہت سنجیدہ تھے، میں سمجھا کہ کوئی اہم مسئلہ دریافت کرنے آئے ہیں، میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ فرمایا اپنے کشف سے بتاؤ کہ میری موت کب آئے گی؟ میں نے کہا کہ مجھے کشف نہیں ہوتا، اور موت کا وقت بجز خدا کے اور کون بتا سکتا ہے، افسردہ ہوگئے، کہنے لگے کہ میں سمجھ رہا تھا کہ تم کو کشف ہوتا ہوگا۔

میں کلکتہ پہلی بار تو کسی اور تقریب سے گیا تھا۔ مگر اس کے بعد ہر سال جانا اس لئے لازم ہو گیا تھا کہ جب تک حاجی صاحب زندہ ہیں، ان کی خدمت میں حاضری دینی ہے، ہر مرتبہ ہفتہ بھر قیام رہتا۔ رُخصت ہوتے وقت پوچھتے: اچھا اب کس وقت ملاقات ہوگی۔ میں کہتا انشاء اللہ اگلے سال! وہ خاموش ہو جاتے، ایک بار ان سے نہیں رہا گیا بول اٹھے یہ کیوں نہیں کہتے کہ انشاء اللہ جنت میں ملاقات ہوگی، تب مجھے احساس ہوا کہ وہ میری زبان سے یہ سننا پسند نہیں کرتے کہ اگلے سال ملاقات ہوگی، انھیں اندیشہ ہوتا تھا کہ اس طرح انھیں سال بھر اور جھیلنا پڑے گا، ایک بار رُخصت ہونے سے دو ایک روز پہلے باتیں کرتے ہوئے انھوں نے پوچھا

کہ اب کب ملاقات ہوگی۔ میں نے کہہ دیا کہ انشاءاللہ جنت میں ہوگی، بہت خوش ہوئے۔ انھیں تقریباً یقین سا ہوگیا کہ سال بھر سے پہلے ہی وہ دنیا سے رُخصت ہوجائیں گے، کیونکہ میں سال بھر کے بعد وہاں پہونچتا تھا، خوشی میں انھوں نے فوراً مٹھائی منگوائی، ۱۰۰/روپئے بطور ہدیہ مجھے دیئے، اور فرمایا کہ میرے مرنے کے بعد ایک مرتبہ ضرور کلکتہ آنا، اور میری قبر پر کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھ دینا، بس اس کے بعد اپنی جگہ سے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کرتے رہنا، اس وقت ان کی آواز بیٹھ گئی تھی، صرف سائیں سائیں کی آواز نکلتی تھی، ڈاکٹر اس وقت تک تشخیص نہ کرسکے تھے کہ کیا تکلیف ہے؟ تکلیف کچھ نہ تھی، پھر معلوم ہوا کہ کینسر ہے، میں نے سنا تو گھبرا کر انھیں دیکھنے کلکتہ پہونچا، اسپتال سے ہوکر گھر آگئے تھے، قدرے تکلیف تھی، مگر دنیا سے رخصت ہونے کی خوشی غالب تھی، حسن خاتمہ کی دعا کا حکم دیتے رہے، میں تھوڑی دیر ان کے پاس رہ کر واپس آگیا، کینسر نے انھیں زیادہ تکلیف نہیں دی وہ بآسانی دنیا سے رخصت ہوگئے۔

حاجی صاحب کو خواب سے بہت مناسبت تھی، سچے خواب دیکھا کرتے تھے، اکثر خطوط میں وہ دو ایک خواب لکھ کر بھیجتے اور حکم دیتے کہ تعبیر بتاؤ، مجھے خواب کی تعبیر سے مناسبت نہیں ہے۔ مگر ان سے نہیں کہہ سکتا تھا، کیونکہ وہ ڈانٹنے لگتے تھے، تو جو خواب بھی لکھتے، میں الٹی سیدھی تعبیر لکھ دیا کرتا تھا، ان میں کچھ صحیح بھی ہوجاتی تھیں، ایک بار انھوں نے خواب لکھا کہ میں بیٹھا ہوا ہوں، اچانک بہت سے بزرگ صورت لوگ آئے ان کے ہاتھوں میں پھولوں کی مالا ہے، انھوں نے میرے گلے میں پہنادی، میرا ذہن اس خواب سے ان فرشتوں کی طرف منتقل ہوگیا، جو مومن کے پاس موت کے وقت ...... جیسا کہ احادیث میں تذکرہ آتا ہے ...... جنت کے گلدستے لے کر آتے ہیں۔ میں نے تعبیر لکھ دی کہ یہ بزرگ صورت لوگ فرشتے تھے انشاءاللہ ایمان پر خاتمہ ہوگا۔ اور فرشتے بآسانی روح نکالیں گے۔ اس وقت گلے میں پہنانے کے جز کی طرف ذہن نہیں گیا، لیکن جب گلے کا کینسر ہوا، تب کسی قدر سمجھ میں آیا کہ شاید یہی مطلب رہا ہو۔

خوابوں کا ذکر آیا تو یہ بھی سن لیجئے کہ انھیں چونکہ اپنی اہلیہ سے عشق تھا، اور ان کیلئے بے قرار رہتے تھے، اس لئے ہر روز خواب میں ان کی ملاقات کے آرزومند رہا کرتے تھے، اور مناسبت تو تھی ہی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آرزو پوری کردی تھی، روزانہ خواب میں ان کی زیارت ہوتی تھی، اس بات کا وہ بکثرت زبانی بھی اور خطوط میں بھی تذکرہ کرتے رہتے تھے، ان خوابوں سے انھیں بہت سی رہنمائیاں بھی ہوا کرتی تھیں یہ بات عجیب تھی، مگر اس سے بھی عجیب تر بات یہ تھی کہ کبھی کبھی چند روز کیلئے زیارت بند ہوجاتی، تو قبر پر جاتے، اور خوب ڈانٹتے، مجذوبانہ شان تھی، کہتے کہ تم تو اکیلی جنت کے مزے لے رہی ہو، ہم یہاں پریشان ہیں خواب سے تسلی ہوتی تھی، اب تم کو وہ بھی گوارا نہیں، اچھا اب ہم بھی منہ موڑ لیں گے، نہ دعائے مغفرت کریں گے نہ ایصالِ ثواب! بس اس کے بعد پھر سلسلہ قائم ہوجاتا، ایک دن میں کلکتہ میں تھا وہ صبح کے وقت خلاف عادت ذرا تاخیر سے آئے، میں نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ جاکر ڈانٹ آیا ہوں۔ پھر پوری بات بتائی

یہ بظاہر ناقابل یقین بات معلوم ہوتی ہے کہ، مگر یہ واقعہ متعدد بار پیش آیا، احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ عالم قبر جو کہ دنیا وآخرت کے درمیان میں برزخ ہے، اس کا تعلق دنیا سے بھی ہوتا ہے، اور آخرت سے بھی، آخرت سے اس کا تعلق تو ظاہر ہے، لیکن دنیا سے بھی اس کا ربط قوی ہوتا ہے، اتنا قوی ہوتا ہے کہ دفن کرنے والے جب لوٹتے ہیں، تو ان کے جوتوں کی کھٹکھٹاہٹ مردہ سنتا ہے، چنانچہ بخاری شریف کی حدیث ہے:

العبد اذا وضع فی قبرہٖ وتولیٰ وذھب أصحابه . حتیٰ أنه لیسمع قرع نعالھم . أتاہ ملکان ۔(فتح الباری، ج:۳ص:۲۶۴، کتاب الجنائز)
بندہ جب اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے، اوراس کے ساتھی دفن سے فارغ ہوکر لوٹتے ہیں، اوروہ ان کے جوتوں کی آوازسن رہا ہوتا ہے کہ اتنے میں دوفرشتے اس کے پاس آتے ہیں، اسی طرح بخاری ہی کی ایک روایت ہے کہ بدر کے مقتول کفار کورسول اللہ ﷺ نے ایک کنویں میں ڈلوادیا تھا، اورتین دن کے بعدان سے خطاب فرمایا، اورانھیں نام بنام پکارکرارشادفرمایا:

أیسرکم أنکم أطعتم اللہ ورسولهٗ ؟ فانا قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقاً، فھل وجدتم ما وعدربکم حقاً ۔کیاتمھیں یہ بات پسند ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کئے ہوتے ۔ہم نے تو، جس کا ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا، اسے سچا پالیا، توکیاتم نے بھی جس کا تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا، سچا پایا۔

اس پرحضرت عمرؓ نے عرض کیا، **یا رسول اللہ ماتکلم من اجساد لا روح لھا** ۔یارسول اللہ! آپ ایسے جسموں سے بات کررہے ہیں جن میں روح نہیں ہے۔واقعی حیرت کی بات ہے، مگررسول اللہ ﷺ نے اس کا جوجواب مرحمت فرمایااس نے سارااشکال رفع کردیا، آپ ﷺ نے فرمایا: **والذی نفس محمد بیدہٖ ماأنتم بأسمع لما أقول منھم** ، (فتح الباری، ج:۷ص:۳۸۲، کتاب المغازی، غزوۃ بدر) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم میری بات کوان سے زیادہ نہیں سن رہے ہو۔

(فتح الباری، ج:۳ص:۲۶۵، کتاب الجنائز بحوالہ ابوداؤدوالنسائی والحاکم)

اس سے معلوم ہوا کہ مردہ کا تعلق اس دنیا سے کچھ نہ کچھ قائم رہتا ہے، اسی لئے حکم ہے کہ قبرستان میں جاؤ تو مردوں کوسلام کرو، اوربعض روایات میں آیا ہے کہ

قبروں کے درمیان جوتے پہن کرنہیں چلنا چاہئے۔

غرض مردوں کا تعلق اس دنیا سے متعددطریقوں سے قائم رہتا ہے، تفصیل دیکھنی ہوتو علامہ ابن القیم علیہ الرحمہ کی کتاب ’’الروح‘‘ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔انھوں نے حسب عادت اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اورمفصل گفتگو کی ہے

حاجی محمدایوب صاحب کی محبت کے البیلے انداز تھے، ایک بارانھوں نے مجھے لکھا کہ بہت دنوں سے ملاقات بند تھی، کل جاکرقبرپرخوب بگڑا، خفا ہوا، تو آج زیارت ہوگئی، میں نے انھیں لکھا کہ جب تک وہ خواب میں آتی رہیں گی۔آپ کی موت اورآخرت کی ملاقات ٹلتی رہے گی اور جب ملاقات کا سلسلہ بند ہوجائے، تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا وقت قریب ہے، اس خط کا ملنا تھا کہ وہ پھرقبرپرپہونچ گئے، اور کہہ آئے کہ اب خواب میں مت آنا، اس کے بعدخواب کی ملاقات بہت کم، نہ ہونے کے برابر ہوگئی۔

کسی کوشبہ نہ ہوکہ مردے کوبراہ راست ڈانٹنے کا کیا حاصل! بات یہ ہے کہ یہ بھی محبت کا ایک رنگ ہے، اورذرا شوخ ہے، اس انداز پراللہ تعالیٰ کوبھی پیار آتا رہا ہوگا، مردہ نہ اپنے اختیار سے خواب میں آتا ہے، اورنہ کسی کے حکم سے وہ متاثر ہوتا۔ یہ جوکچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے، صورۃً مردے کوڈانٹ رہے ہیں، لیکن حقیقۃً وہ اپنے مالک اور پروردگار سے دعا کررہے ہیں، اور پھر یہ خدا ہی کی طرف سے قبولیت دعا کا ظہور تھا کہ وہ جوچاہتے تھے، وہ کام ہوجاتا تھا۔

حاجی صاحب کومجھ سے اورمیرے بچوں سے بہت تعلق ہوگیا تھا، کوئی ماہ ایسا نہ گزرتا تھا کہ ان کے دوتین خطوط نہ آتے ہوں۔ان کے جیسی پابندی سے اوران کے اتنی تعداد میں کسی اورنے مجھے خطوط نہیں لکھے، حالانکہ بہت کمزور تھے، ہاتھ میں رعشہ تھا، نگاہ بھی جواب دیتی جارہی تھی۔مگرخطوط لکھتے تھے اور بہت البیلے خطوط لکھتے

تھے ، ہر خط میں ایک دو خواب کا تذکرہ ضرور ہوتا ، جواب کے لئے میرے اوپر پابندی تھی کہ خواب کی تعبیر ضرور بتاؤں ، اور کوئی خط مختصر نہ لکھوں ، کبھی اتفاقاً کوئی خط مختصر چلا گیا تو ادھر سے ڈانٹ چلی آرہی ہے کہ تم کو کون سا ضعف لاحق ہے ، تمھیں کیا مضمون سوچنا رہتا ہے ، کاہل ہو گئے ہو ، ستاتے ہو ، وغیرہ ، میرا خط پہونچتا تو بہت دیر تک اسے پڑھتے ، بار بار پڑھتے ، پھر اپنے دوستوں کو دکھاتے ، اگر ان لوگوں کے منہ سے کوئی تعریفی کلمہ نکل آتا ، تو بہت مسرور ہوتے ، اپنی صاحبزادی کے پاس …… جو ان کے گھر سے کافی فاصلہ پر رہتی تھیں …… لیجاتے انھیں پڑھاتے ، غرض وہ خط ہفتہ بھر گشت کرتا رہتا ، پھر جواب لکھتے ، اور جس روز لکھتے ، اسی روز سے جواب کے دن گننے لگتے ، کبھی تاخیر ہوتی تو خط لکھتے ، خوب ڈانٹتے ، ایک مرتبہ عجیب بات ہوئی ، میں نے کئی خط بھیجے ، مگر ڈاک کی بدنظمی کی وجہ سے سب ضائع ہو گئے ، انھیں ایک نہ ملا ، بس روٹھ گئے ، خط لکھنا بند کر دیا۔ مگر ان کی محبت کو تابِ ضبط کہاں ؟ بالآخر لکھنے بیٹھے اور جی کھول کر مجھے سرزنش کی ، ان کا خط پڑھ کر لطف آ گیا ، واقعی دشنامِ محبت میں جو چاشنی ہے ، شاید وہ میٹھے میٹھے بول میں نہیں ہے۔

میں نے جو جواب لکھا ، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے ، مجھے افسوس ہے کہ ان خطوط کی میں حفاظت نہ کر سکا۔ اور میں نے بھی انھیں جو خطوط لکھے تھے ، پچاس سے کم نہ ہوں گے ، انھیں وہ بڑی حفاظت سے رکھے ہوئے تھے ، مگر ان کی وفات کے بعد میں نے تلاش کروایا ، تو نہ مل سکے ، صرف تین خط جو اتفاق سے میری کاپی میں نقل کر لئے گئے تھے ، وہ موجود ہیں ، تو اس جواب کا اقتباس ملاحظہ ہو:

”ایک خط گھر کے پتہ پر بھیج چکا ہوں ، کیا خبر وہ ملا یا نہیں ؟ ابوذر کی زبانی معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کو بہت اشتیاق و انتظار خط کا رہتا ہے ، اور نہ ملنے کی صورت میں بہت تشویش کا اظہار کرتے ہیں ، میری سمجھ میں نہیں آتا

کہ آخر کوئی خط کیوں نہیں ملتا ، ایک غائب ہوا ، دوسرا غائب ہوا ، کوئی تو ملتا ، ایک انتر دیسی لفافہ آپ نے اپنا پتہ لکھ کر بھیجا تھا ، وہ بھی گم ہو گیا۔ اب تو آپ نے یقین کر لیا ہوگا کہ پتہ لکھنے کی خرابی نہیں ہوتی ، بلکہ کوئی اور بات ہے ، شاید کچھ طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں چھیڑنے میں محبوب کو لطف آتا ہے ، جیسے بعض بچے ایسے ہوتے ہیں ، جنھیں جتنا چھیڑیئے ، پیاری پیاری باتیں ان کے منہ سے نکلتی رہتی ہیں ، لوگ انھیں چھیڑ چھیڑ کر رُلا دیتے ہیں ، وہ کہتا ہے ، کیوں چھیڑتے ہو ، ہم کہتے ہیں تم اتنے پیارے کیوں ہو ، کچھ یہی حال ہے آپ کا معلوم ہوتا ہے ، روتے ہیں ، بلبلاتے ہیں ، مچلتے ہیں ، ادھر سے ایک چٹکی اور بھر دی جاتی ہے۔ آپ کہتے ہیں

؎

جان مہمان ہے دو دن کی ستاتے کیوں ہو
آپ روتے ہوئے آئے ہیں رلاتے کیوں ہو؟

لیکن یہ بھی تو کہیئے

؎

دل ملا مجھ کو ازل میں تو کسی نے نہ کہا
روگ ہے یہ اسے چھاتی سے لگاتے کیوں ہو؟

اصل میں سارا روگ دل ہی کا ہے ، یہ سینہ میں جاگزیں ہوا ، پھر جو قیامت گزرنی تھی گزر گئی ، یہ آیا تو تنہا نہیں آیا ، محبت ، عشق ، انتظار ، سوز ، گداز ، رنج ، اندوہ ، خلش ، ملال ، خوشی ، راحت ، اور اطمینان غرض فوج کی فوج اس کے ساتھ اترتی چلی آئی ، اب ساری زندگی ان مہمانوں کی میزبانی کرتے رہیئے۔“

اس خط میں انھوں کوئی خواب لکھا تھا ، جس کی وجہ سے انھیں وہم ہو گیا تھا کہ

شاید زندگی کچھ زیادہ روز تک انھیں گھسیٹے گی۔ میں نے انھیں لکھا:

’’آپ کے خواب کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ عمر زیادہ ہوگی بلکہ میرا خیال ہے کہ اب بہت کم رہ گئی ہے، وصال محبوب کا زمانہ قریب ہے، لیکن آپ کو انتظار اس درجہ شدید ہے کہ ایک ایک گھڑی، ایک ایک برس معلوم ہورہی ہے، ساری دیر اسی وجہ سے معلوم ہوتی ہے،‘‘

اس خط پر سال نہیں پورا ہوا تھا کہ ان کا وصال ہوگیا۔

انھیں مجھ سے تو تعلق تھا ہی۔ میرے بچوں کو بھی بہت چاہتے تھے، ہر بچے کو نام بنام جانتے تھے، حالانکہ دیکھا ایک کو بھی نہ تھا۔ ہر خط میں فرداً فرداً سب کی خیریت دریافت کرتے مختلف مواقع پر بچوں کیلئے پیسے بھیجتے، مگر پیسے بھیجنے کا انداز بھی مجذوبانہ ہی تھا، منی آرڈر سے پیسے کبھی نہیں بھیجتے، انتر دیسی لفافہ میں روپئے رکھ کر بند کردیتے اور مجھے مل جاتا، ایک بار میں نے انھیں اس سے منع کردیا تو انھوں نے کسی آدمی کے ہاتھوں رقم بھیجی۔ جو بڑی خرابی کے بعد چھ ماہ میں مجھے ملی، پھر میں خاموش ہوگیا، اوران کا وہی کاروبار مجذوبی شروع ہوگیا، اور آخر تک چلتا رہا، اور اللہ کا کرنا کہ کبھی کہ گم ہونے کا حادثہ نہیں پیش آیا۔

انتقال سے سال بھر پہلے ان کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ ابتداءً اس کا معمولی علاج کرتے رہے، کوئی تکلیف نہ تھی، صرف آواز سائیں سائیں ہوگئی تھی، بعد میں گلے کا کینسر تشخیص ہوا، انھیں خوشی تھی کہ اب موت کے دروازے پر آگیا ہوں، مگر تکلیف سے ڈرتے تھے، اسپتال گئے، آپریشن ہوا، کچھ تکلیف رہنے لگی، مگر نا قابلِ برداشت نہ تھی، میں آپریشن کے بعد حاضر ہوا تھا، آہستہ آہستہ باتیں کیں، مجھ سے کہا، میری بات یاد ہے نا! مرنے کی خبر سننا تو ایک بار ضرور میری قبر پر آنا، پھر تمھیں اختیار ہے۔

حاجی صاحب کا وصال ٦/ جمادی الاولیٰ ١٤٠٧ھ کو ہوا، میں اپنے وعدہ کے

مطابق ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد کلکتہ حاضر ہوا، ان کی قبر پر فاتحہ پڑھی، پھر جلد ہی لوٹ آیا، کلکتہ میں قاری عبدالمنان صاحب جونپوری امام جامع مسجد کولوٹولہ سے ملاقات ہوئی، یہ بزرگ میرے استاذِ محترم حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی کے ہم سبق ہیں۔ تعارف کے بعد انھوں نے کلکتہ آنے کی غرض دریافت کی، میں نے حاجی صاحب کے حالات تفصیل سے بتائے، انھیں سخت حیرت تھی کہ ایسے لوگ اب بھی پائے جاتے ہیں۔ انھیں افسوس ہورہا تھا کہ زندگی میں انھیں نہیں جانا۔ وہ مجھ سے کرید کرید کر حاجی صاحب کے متعلق پوچھتے رہے، میں ان کی محبت وشفقت، مجذوبیت ووارفتگی، وفاداری ووضعداری اور شوقِ موت وغیرہ کا تذکرہ کرتا رہا، وہ بڑی دیر تک سوچتے رہے، پھر پوچھا کہ کیا ایسے لوگ اب بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں، میں اس کا کیا جواب دیتا، حاجی صاحب ایک جواب تھے، مگر اب وہ دنیا کو خالی اور ویران کرگئے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور خوش رہے۔ پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ ان کیلئے دعائے مغفرت کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆

میں نے عرض کیا تھا کہ حاجی صاحب کے خطوط میرے پاس محفوظ نہ رہ سکے ورنہ ان سے ان کی مجذوبانہ اور دردمندانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا، لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، ان کے نام میرے تین خطوط موجود ہیں۔ سب سے پہلا خط جو ان کے نام میں نے لکھا ہے، وہ ان کے کسی خط کا جواب ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے مختلف دردوغم کا اظہار کیا تھا۔ میرے خط سے ان کے مکتوب کے مضمون کا اندازہ ہوجائے گا، بلکہ ان کی طبیعت کا بھی خوب پتہ چلے گا، خط ملاحظہ ہو:

’’آپ کا محبت نامہ ملا۔ عشق وتعلق کچھ بے باک اور گستاخ ہوتا ہی ہے، آپ کی ’’تحریرِ پریشاں‘‘ اسی جذب وشوق کا اظہار ہے جس کی قِندیل

آپ کے قلب وجگر میں فروزاں ہے، یہ ایسا جذب ہے، جس پر خدا کو بھی پیار آتا ہوگا، بچوں جیسی ضد! عورتوں جیسی ہٹ! بوڑھوں جیسی تکرار! آخر خدا کو بھی اپنے بندوں پر پیار آتا ہی ہے، جانتے ہیں کہ خواہ کتنا ہی روٹھے، کتنا ہی بگڑے، کچھ بھی کہے، کتنا ہی بھاگے، ان کا دَر چھوڑ کر، ان کی چوکھٹ سے ہٹ کر، اور کہیں جانے کا سوال نہیں، وہیں رہنا ہے، وہیں سر دیئے پڑے رہنا ہے، اور وہیں مر جانا ہے، بھلا پھر اسی جگہ شور مچائے، چیخے، روئے تو کیا مضائقہ ہے؟ آپ روتے رہئے، وہ ہنستے رہیں، اگر یہی ہوتا رہے تو کیا حرج ہے؟ ہمارا رونا کسی کے مسکرانے کا باعث بن جائے، تو ہم اور روئیں گے کسی کا کیا؟ ان کا ایک تبسم ہمارے تمام آنسوؤں کی بیش قرار قیمت ہے، آپ کہتے ہیں کہ صبر کہاں سے لاؤں؟ میں کہتا ہوں کہ صبر آپ کو لانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو آپ کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے، پھر اس کی کیا مجال ہے کہ آپ سے جدا ہو جائے۔

ایک اور بزرگ آپ ہی کے ہم نام (سیدنا حضرت ایوب علیہ السلام) بہت پہلے گزرے ہیں۔ پہلے بڑے خوشحال تھے، صاحب جمال وکمال تھے، پھر جب صبر نے ان کا پیچھا کیا تو پروردگار کو کہہ دینا پڑا کہ **انا وجدناه صابراً نعم العبد انه أواب**، ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا، بڑا اچھا بندہ تھا، وہ ہمیں سے کہتا تھا، جو کچھ اس پر پڑتی تھی۔ آخر انھیں کے نام پر جو آپ کا نام رکھا گیا، تو کچھ تو مناسبت ہونی چاہئے؟

بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **ان اللہ لا یضیع أجر المحسنین**، ہاں یہ صحیح ہے کہ حق تعالیٰ دنیا میں بھی اجر دیتے ہیں، کیا روزی کا ملنا، حیات کا ملنا، اہل محبت کا ملنا، نماز روزہ کی توفیق ہوتے رہنا،

ان کا نام زبان سے لیتے رہنا، یہ کچھ کم انعامات ہیں، اور یہ بھی تو ہے کہ اگر بھلائیوں کا کچھ اجر ملتا ہے، تو برائیوں کی بھی کچھ کچھ سزا مل جاتی ہے، اسی سے توازن برقرار رہتا ہے، اگر کچھ تکلیف ہوتی ہے، تو یہ اثر ہے ان گناہوں کا، جن میں کچھ تو ہمارا حافظہ یاد رکھتا ہے، اور بہت کچھ اس زود فراموش کو فراموش ہو جاتا ہے، پھر کیا حرج ہے، کچھ اس کا ظہور ہوا اور کچھ اس کی نمود ہو، آخر دنیا نام ہی ہے، رنج وراحت کا، خوشی وغم کا، نعمت ومصیبت کا، ذلت وعزت کا، فقر وغنا کا، ضعف وقوت کا، اور حیات وممات کا! اس سے کہاں مفر؟ ہاں انتظار کیجئے اس وقت کا اور اس جگہ کا جہاں راحت ہوگی رنج نہیں، خوشی ہوگی غم نہیں، نعمت ہوگی مصیبت نہیں، عزت ہوگی ذلت نہیں، غنا ہوگا فقر نہیں، قوت ہوگی ضعف نہیں، حیات ہوگی ممات نہیں، وہ نعمتیں جو دوسری جگہ کیلئے ہیں، آپ انھیں یہیں کھینچ لانا چاہتے ہیں، بھلا کیونکر ممکن ہے؟

پھر غور تو کیجئے، اگر آپ کا عشق گستاخ وبے باک ہے، تو ان کا حسن بھی تو بے پروا اور چالاک ہے، اگر اس حسن مطلق نے آپ کے عشقِ بے باک کے آگے سپر ڈال دی، تو وہ حسن کس کام کا؟ اور پھر سوچئے کہ اس حادثہ پر عشق کو کتنی ندامت ہوگی، اس کے بعد تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا، آخر جو خدا ہے، اس کو آپ خدائی سے اتار کر بندگی کی جانب کیوں لانا چاہتے ہیں بتائیے! اگر وہ آپ کی اطاعت کو اپنے لئے ضروری کر لے، تو کون خدا رہا اور کون بندہ؟ آپ کو اور ہم کو جو شکایت ہے وہ یہی تو ہے کہ ''ہم'' جو کہ جاہل ہیں، نہ آگے کی خبر رکھتے، نہ پیچھے کو یاد رکھتے، یعنی ہم جو اول وآخر جاہل ہیں، اسی ''ہم'' کی اطاعت وہ کرے جو

آگے کی بھی خبر رکھتا ہے، اور پچھلا اعمال نامہ بھی اس کے پاس محفوظ ہے، وہی اول وآخر عالم ہے، ایسا عالم جس میں جہل وناواقفی کا نام ونشان نہیں، یعنی علم تابع ہوجائے جہل کے، قوت سپر ڈال دے ضعف کے سامنے، طاقت شکست کھا جائے کمزوری سے، سوچئے تو سہی اگر علم وحکمت نے ناعاقبت اندیشی سے ہار مان لی، تو وہ کیسا علم ہے؟ کیسی حکمت ہے؟

آپ کہتے ہیں دعا کا اثر دنیا میں کیوں نہیں ہوتا؟ میں پوچھتا ہوں کہ کب نہیں ہوتا، اور کہاں نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے، آپ کو بھی تجربہ ہے، بچے نے ابا سے ایک پیسہ مانگا، ابا نے اشرفی دیدی، بچہ ضد کرتا ہے کہ ابا نے میری مانگ ٹھکرادی، ارے ٹھکرائی کہاں؟ تیری نادانی کے عوض دانائی عطا فرمادی، یونہی سوچئے کہ آپ اپنی سوچ مانگ رہے ہیں اور وہ آپ کی مصلحت دے رہے ہیں۔ آج آپ کا مانگا ہوا مطالبہ مل جائے، اور کل آپ اسے بھلا بیٹھیں، کون اس کی ضمانت لے سکتا ہے۔

جی ہاں! نہیں دیتے، جو کچھ آپ مانگ رہے ہیں، تاکہ آپ مزید مانگیں، روئیں، گڑگڑائیں، اور آنسو بہائیں، دیدیتے تو آپ یہ بیش بہا نعمتیں کہاں سے لاتے، اور ہاں دیا، اور بہت کچھ دیا، اپنی یاد دی، اپنے سے دعا کرنا دیا، رونا دیا، آنسو دیئے اور نہ جانے کیا کیا دیا، بہت کچھ اسی دنیا میں دیا، اور یہ وہ چیزیں ہیں، جو خود محنت ہیں اور خود اجر ہیں، پھر ان پر دوبارہ، سہ بارہ اور تسلسل کے ساتھ ملنے اور ملتے رہنے کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔

آپ نے سمجھا میں کیا کہہ رہا ہوں؟ دیکھئے آپ نے ایک عمل کیا، اور اس کی اجرت مل گئی، پیسہ لیا اور گھر چل دئے، جس کا کام کیا اس سے پھر

کوئی مطلب نہیں رہا۔ ایک تو یہ ہوا، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ نے ایک کام کیا۔ کام لینے والے نے کہا کہ تم اچھے آدمی ہو، تم ہمارے گھر ہی رہو، یہ قرب ونزدیکی بھی اجرت ہے، لیکن کیسی اجرت؟ کیا اسی ایک اجرت سے دوسری بہت اجرتیں وجود میں نہیں آجائیں گی؟ پھر ہمارا مالک وخالق ، جس سے ہمیں دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبت ہے، جس کے عشق نے ہمیں پوری زندگی کی مصیبت جھیلنے پر آمادہ کر رکھا ہے۔ جس کی ایک نگاہِ رضا وخوشنودی کے لئے ہم دو جہاں کی قربانی بڑی مسرت کے ساتھ دے سکتے ہیں، وہی ہمارا محبوب ومعبود ہے، وہی ہمارا منظور ومسجود ہے، وہی ہمارا خدا ہے، ہم اس سے ایک چیز مانگتے ہیں، ایک بات کہتے ہیں، اور اس لئے کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ چیز ہمارے حق میں مفید ہے یا مضر، پھر وہی محبوب ہم سے کہتا ہے کہ ہٹو جی! کیا مانگتے ہو، ہماری ڈیوڑھی پر پڑے رہو، دھوپ میں جلو، سردی میں کانپو، تکلیف اٹھاؤ لیکن ہمارے دامن قرب سے چمٹے رہو، خدا کی قسم کتنی بڑی دولت ہے، نگاہِ التفات تو ہوئی، ہماری مانگی ہوئی چیز پر خاک پتھر! ہمیں تو دوسرا سراہاتھ آگیا۔

ان بزرگ کا قصہ آپ نے سنا ہوگا، جنکا راستہ پہاڑی میں گم ہوگیا تھا، سردی نے بھی پریشان کر رکھا تھا، نگاہیں آگ تلاش کر رہی تھیں، وادی طور سے ایک چمک دکھائی دی، لپکے ہوئے گئے کہ آگ لائیں، لیکن وہاں آگ کی گرمی کے بجائے محبت الٰہی کی گرمی مل گئی، پھر کیا ان کو شکایت ہوئی کہ مجھے آگ نہیں دی گئی، انسان خدا سے اپنی حاجت کا سوال کرتا ہے، خدا کی جانب سے مزید عجز ونیاز کا تحفہ مل جاتا ہے۔ ہائے! کوئی اس دولت سرمدی کی قدر کیا جانے۔ ان سوختہ سامانوں سے پوچھئے، جنھیں اس

کی لذت سے آشنائی بخشی گئی ہے، ایک گرم گرم آنسو جو چشم عجز و نیاز سے ڈھلک جائے، ان تمام دولتوں سے بڑھ کر ہے، ہرگز نہ روکئے، یہاں تک کہ انھیں کا دست شفقت آئے، اور آنسو بھی پونچھے اور معذرت بھی کرے، ہا! کتنا مزہ آئے گا۔ اس روز جب وہ خود بندوں سے معذرت کریں گے کہ کچھ خیال نہ کرنا، میں نے تمہاری مانگی ہوئی چیز نہ دی، تو تمھیں تکلیف ہوئی، اب لے لو، جو کچھ لینا ہو، بھلا کہاں اس کا سرور، اور کہاں لذت فانی کی عارضی خوشی!

بس صاحب! کاغذ ختم ہوگیا، پھر کبھی باتیں ہوں گی، آپ کی آنکھیں دُکھ جائیں گی، میرے لئے بھی ایک آدھ آنسو گرا دیجئے۔

اعجاز احمد اعظمی

۲۳/ذوقعدہ ۱۴۰۴ھ

☆☆☆☆☆☆☆

حیات مصلح الامت

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمیؒ کی مفصل سوانح حیات،
تقریباً 500 صفحات پر مشتمل (عنقریب شائع ہونے والی ہے)
مؤلف: ۔حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ
ناشر: ۔فرید بک ڈپو دہلی

جمیل بھائی

وفات: یکم/دسمبر ۱۹۸۸ء

یکم/دسمبر ۱۹۸۸ء کو علی الصباح مدرسہ (ریاض العلوم گورینی) میں یہ خبر پھیلی کہ صاحبزادۂ محترم مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی کے خسر جناب جمیل احمد صاحب کا آج رات الہ آباد میں انتقال ہوگیا۔ سن کر کلیجہ دھک سے ہوکر رہ گیا۔ دل کی گہرائیوں سے اِنا للّٰہ واِنا اِلیہ راجعون پڑھا، اور خیال کے پردے پر جمیل بھائی کی صورت اور ان کے ساتھ وابستہ بہت سی یادیں بھی ابھر آئیں۔ جمیل بھائی کا حق ہے کہ ان کی یادوں کے یہ نقوش جو نہاں خانۂ قلب میں نمایاں ہوئے ہیں، انھیں موئے قلم سے صفحۂ قرطاس پر اتار دوں اور ان کی رحلت سے فرقت کی جو سوزش دل میں پیدا ہوئی ہے، آنکھوں کی راہ اس کے لئے کھول دوں۔

آج سے بارہ سال قبل ۱۹۷۶ء کے اواخر میں جب میں مدرس ہوکر الہ آباد مصلح الامت حضرت اقدس مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے مدرسہ اور خانقاہ میں پہونچا تو جن لوگوں سے جاتے ہی ملاقات ہوئی، تعارف ہوا اور دل نے خلوص ومحبت کی گرمی محسوس کی، ان میں نمایاں ترین شخصیت کا نام ''جمیل بھائی'' ہے، خانقاہ میں ہر شخص خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، انھیں ''جمیل بھائی'' ہی کہتا تھا، اس لفظ میں کچھ ایسی محبت تھی کہ چھوٹے بھی ''جمیل بھائی'' اور بڑے بوڑھے بھی ''جمیل بھائی'' کہتے، چنانچہ میری زبان پر بھی ''جمیل بھائی'' ہی جاری ہوگیا۔ اور اب قلم بھی مجبور ہے کہ ''جمیل بھائی'' سے یاد کرے۔

’’جمیل بھائی‘‘ اصلاً مچھلی شہر ضلع جونپور کے قریب کسی دیہات کے رہنے والے تھے، لیکن اب عرصہ سے الہ آباد میں رہتے تھے۔ اے۔ جی آفس میں افسر گریڈ کے کلرک تھے۔ الہ آباد کے مشہور محلّہ روشن باغ...... جہاں حضرت مصلح الامتؒ کی خانقاہ ہے...... سے کسی قدر فاصلے پر ایک محلّہ گلاب باڑی نامی ہے، اسی محلّہ میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے، اصول کے پابند، اوقات و معمولات بے حد مربوط و منضبط! حضرت اقدسؒ کی مسجد جوان کے مکان سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ دفتر کے علاوہ اوقات کی نمازیں وہیں ادا کرتے، اور کیا مجال کہ تکبیرِ اولیٰ یا صفِ اول کبھی فوت ہو جائے، میں چار سال الہ آباد میں رہا، لیکن کبھی یاد نہیں کہ ’’جمیل بھائی‘‘ کو پچھلی صف میں دیکھا ہو۔ ان کی یہ پابندیٔ اوقات معروف تھی، امام کے دائیں انھیں عام طور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اور ادھر اذان ہوئی اور اُدھر ’’جمیل بھائی‘‘ مسجد میں حاضر! سردی یا گرمی، برسات یا اندھیری رات، اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا تھا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو خانقاہ کے احباب سے ملاقات بھی ضرور کرتے۔ یہ خصوصیت الہ آباد کے خانقاہی احباب میں دیکھی کہ سلام کے بعد مصافحہ ضرور کرتے اور حدیثِ نبوی **تمام تحیاتکم بینکم المصافحة** (تمہارے سلام کا اتمام مصافحہ ہے) پر عمل کرتے، ’’جمیل بھائی‘‘ کا یہ دائمی معمول تھا، دن بھر میں خواہ جتنی مرتبہ ملاقات ہوتی، اسی انہماک اور محبت سے مصافحہ کرتے، جیسے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہو، اور مصافحہ میں اتنا خشوع و خضوع ہوتا اور مصافحہ کی دعا کا اس درجہ اہتمام کرتے کہ مصافحہ کرنے والا شخص بھی متاثر ہو جاتا۔

’’جمیل بھائی‘‘ خانقاہ کی مجلس میں بھی نہایت پابندی اور اہتمام کے ساتھ آتے، دفتر اور مجلس کے وقت میں مفاہمت ہوتی، تو پہلے مجلس میں شرکت کرتے پھر

دفتر جاتے، اور اتوار کی مجلس میں کبھی ناغہ نہ ہوتا۔

’’جمیل بھائی‘‘ کو میں نے جب ابتداءً دیکھا تو دینداری کا یہ تصلب اور معمولات کی یہ استقامت ان کے مزاج و طبیعت میں رچی بسی تھی، متوسط قد، دبلا پتلا مریض سا جسم، تنفس سے متاثر صحت، کہیں سے آتے تو سانس میں تیزی نمایاں ہوتی، تھوڑی تھوری دیر میں گلا صاف کرتے رہتے، داڑھی بھری ہوئی، کھچڑی ہو چکی تھی، بڑی بڑی پُر رُعب آنکھیں، ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے اور باتیں کرتے وقت ہلکا سا شیریں تبسم لبوں پر ہویدا۔ ملاقات میں انتہائی متواضع، مزاج مین کسی قدر جلال، میں سمجھا کہ کہ ابتداء ہی سے ایسے دیندار ہیں۔ لیکن ایک دن باتوں باتوں میں یہ عقدہ کھلا کہ یہ رنگ بعد میں چڑھا ہے، ابتداء میں یہ دوسرے مسلک کے تھے، انگریزی تعلیم یافتہ، دینی معلومات برائے نام تھیں، بدعات کو اصل دین سمجھتے تھے، داڑھی منڈی ہوئی، کوٹ پتلون زیبِ بدن، سر سے پاؤں تک انگریزی معاشرت میں غرق، روزہ تو خیر رکھ لیتے تھے، مگر نماز بس جمعہ ہی جمعہ تھی، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا ورود مسعود جب الہ آباد میں ہوا، اور ان کا غلغلہ شہر میں بلند ہوا، تو ان کے حلقے میں یہ خبر پھیلائی گئی کہ ایک بہت بڑا وہابی آیا ہے، جو لوگوں کے دین و ایمان کو برباد کرتا ہے، انھیں ہدایت کی گئی کہ ان سے دور ہی دور رہو، ان کی صورت مت دیکھو، چنانچہ ’’جمیل بھائی‘‘ نے کبھی ملاقات کی ہمت نہ کی، لیکن جس طرح عطر کا ڈبہ کھول دیا جائے، اور ہوا کے جھونکے اس کی خوشبو کو فضا میں بکھیر دیں تو خواہ کوئی کتنا ہی بے حس ہو، لیکن ایک مرتبہ تو سانس کھینچ کر اس سے لطف اندوز ہو ہی لیتا ہے، حضرت کی شہرت ’’بوئے گل‘‘ کی مانند الہ آباد میں پھیلتی چلی گئی۔ زبانوں پر انھیں کے چرچے تھے، بے مزہ اور پھیکی زندگی میں ایمان کی حرارت دوڑنے لگی۔ جمیل بھائی کے حلقۂ احباب میں بعض لوگ حضرت تک پہونچ چکے تھے، انھوں نے اپنے

تاثرات ذکر کئے، اب انھیں بھی خیال ہونے لگا کہ جا کر ایک بار دیکھ لینا چاہئے۔ اتوار کو دفاتر بند رہتے ہیں۔ اس دن مجلس میں ہجوم خوب رہتا ہے، شرکت کی عام اجازت رہتی ہے۔ ایک اتوار کو جانے کا قصد کیا، مگر پھر یہ خیال پاؤں کی زنجیر بن گیا کہ کہیں ایمان برباد نہ ہو جائے۔ نہیں گئے، اور تفریح میں نکل گئے۔ لیکن یہ خیال دل میں کانٹا بن کر چبھ چکا تھا کہ ایک بار تو دیکھ لینا چاہئے۔ اب ایسا بھی کیا جادو کر دیں گے کہ دین وایمان وہیں کا وہیں رہ جائے، اگلے اتوار کو تیار ہو کر گئے اور ایک طرف بیٹھ گئے، حضرت نے مجلس میں بیان کرنا شروع کیا، بیان کیا تھا۔ دین وایمان اور عشق ومحبت کی ایک بجلی تھی جو حضرت کے لبوں سے کلمات کی صورت میں چمکتی تھی اور اہل مجلس کے قلوب پر اثر بن کر گرتی تھی، تھوڑی دیر میں طبیعت پر محبت الٰہی اور احساسِ ندامت کی گھٹا چھانے لگی، اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں نے برسنا شروع کر دیا، مجلس ختم ہوئی تو دل کی دنیا دھل دھلا کر بے غبار ہو چکی تھی، پھر تو ایک لَو سی لگ گئی۔ چند مجالس کے بعد...... دل تو پہلے دے چکے تھے اب...... ہاتھ بھی مولانا کے ہاتھوں میں دیدیا۔ چہرے پر داڑھی آ گئی۔ انگریزی لباس بدن سے اتر گیا اور اس کی جگہ سیدھا سادا کرتہ پاجامہ آ گیا۔ نمازوں میں استقامت آ گئی۔ تلاوت قرآن کا مشغلہ شروع ہو گیا۔

کہتے تھے کہ اب کس طرح بتاؤں کہ بیعت کے بعد دل ودماغ کا کیا حال ہوا۔ ایمان وعمل کی ایک دھن لگ گئی، جیسے اس کے علاوہ اب کوئی کام ہی نہیں، اے۔ جی آفس کی ملازمت کی پابندی تھی، بجز اتوار کے اور کسی دن حاضری کی گنجائش نہ تھی، دوشنبہ ہی سے اتوار کا انتظار لگ جاتا، دن گنے جاتے، آج منگل گیا، کل بدھ ختم ہو گا پھر اور پھر اس طرح اتوار آنے میں بڑی دیر لگ جاتی، پھر اتوار کو نہ دوست نہ احباب، نہ سیر نہ تفریح، اپنا دل تھامے ہوئے سیدھے مجلس میں جا پہونچتے اور حضرت مولانا

اپنے نفس گرم سے دلوں کو حرارت بخشتے اور نورِ قلب سے حاضرین کو منور فرماتے۔

جمیل بھائی انگریزی تعلیم یافتہ تھے، دفتر کے ملازم تھے، عام دستور کے مطابق رات کو دیر میں سوتے اور صبح دیر میں اٹھنے کے عادی تھے۔ مگر اب نماز کی پابندی ضروری تھی، سویرے سوتے اور سویرے اٹھنے کی کوشش کرتے۔ لیکن کامیاب نہ ہوتے، پھر نہ جانے حضرت مولانا نے کیا تصرف کیا۔ کہتے تھے کہ ہر روز نمازِ فجر سے پہلے ایک بزرگ شخص تشریف لاتے اور جگا کر چلے جاتے، میں نے ان کی صورت کبھی نہیں دیکھی، مگر یہ واقعہ ہر روز ہوتا، اور ان کے جگا دینے کے بعد پھر نیند نہ آتی۔ میں نے اس واقعہ کا تذکرہ کبھی کسی سے نہیں کیا، اس کیفیت پر تین سال بیت گئے، تین سال بعد مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر کر دیا، بس اسی وقت سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا، پھر بہت دعائیں کیں مگر کوئی جگانے والا نہ آیا۔ تاہم ان کو اٹھنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس طرح نماز کی پابندی آئی۔

جمیل بھائی کا ایک ہی لڑکا ہے۔ میں جب الہ آباد پہونچا تو وہ عربی دوم میں پڑھتا تھا۔ مگر اس کا ارادہ پڑھنے کا نہ تھا۔ اس لئے جمیل بھائی نے اسے کاروبار میں لگا دیا، اس سے بڑی ایک بچی ہے۔ اس کا نکاح اس وقت ہو چکا تھا، حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب زید مجدھم کے صاحبزادے مولانا عبدالعظیم صاحب ان کے داماد ہیں، جب یہ نسبت طے ہوئی اس وقت مولانا مدظلہٗ مانی کلاں میں رہتے تھے، مولانا نے انھیں لکھا کہ نسبت تو طے ہو چکی، لیکن ایک مرتبہ اس پر نظر ثانی کر لیجئے، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ میرے یہاں مکان کی تنگی ہے، عبدالعظیم کے لئے کمرہ تک نہیں ہے، اس کا جواب جمیل بھائی نے یہ دیا کہ میرے پاس گھر جائداد بہت ہے، پیسے کی بھی فراوانی ہے، میرے دفتر میں ایک سے ایک صاحب حیثیت ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ لڑکوں سے میں رشتہ منظور کر لوں، مگر میں نے ان سب کو چھوڑ کر

ایک مولوی اور دیندار کا انتخاب جو کیا ہے تو اس لئے کہ میرے مرنے کے بعد میرے لئے دعاء مغفرت اور ایصالِ ثواب کا سلسلہ قائم رہے۔ اس لئے اس انتخاب پر نظر ثانی کا سوال ہی نہیں۔ چنانچہ یہ نکاح ہوا۔ اور ماشاءاللہ جمیل بھائی کے کئی نواسے اور نواسیاں ہیں، بڑا نواسہ عبدالجلیل سلّمہٗ ماشاءاللہ قرآن حفظ کر رہا ہے،

لڑکے کا نکاح بھی سادگی کے ساتھ کر دیا، حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہٗ نے نکاح پڑھایا، ولیمہ میں کسی قدر اہتمام تھا۔ مگر سادگی اور دینداری کا رنگ غالب تھا۔ دستر خوان پر ایک دلچسپ لطیفہ ہوا، خانقاہ کے علماء ومشائخ کھانا کھا رہے تھے، جمیل بھائی کھانا کھلا رہے تھے، ان کے بے تکلف دوست اور شریک حال انیس بھائی بھی کھانے میں شریک تھے، الہ آباد میں پلاؤ کے ساتھ ’’رأیتہ‘‘ ضرور ہوتا ہے، مولانا جامی صاحب پلاؤ لے کر کھانے جا رہے تھے کہ انیس بھائی نے کہا جامی صاحب! ’’رأیتہ‘‘۔ جامی صاحب نے برجستہ فرمایا ’’رأیتَ‘‘ تمام علماء اس لطیفہ پر ہنس پڑے عربی زبان میں ’’رأیتہ‘‘ سے ملتا جلتا لفظ ’’رأیتُ‘‘ ہے، جس کے معنیٰ ہیں آپ نے دیکھا، جامی صاحب نے اسی مناسبت لفظی سے فائدہ اٹھا کر ’’رأیتُ‘‘ جواب میں کہا۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے دیکھا، جواب کا جواب اور لطیفہ کا لطیفہ، جامی صاحب مناسب لفظی کے بادشاہ ہیں۔

یکم ردسمبر کو علی الصباح جب انتقال کی خبر مدرسہ پر پہونچی تو الحاج مولانا عبد الرحیم صاحب نائب مہتمم مدرسہ ریاض العلوم گورینی اپنے چھوٹے بھائی مولانا عبد العظیم صاحب اور ان کی اہلیہ اور بچے اور نیز اپنی والدۂ مکرمہ کو لے کر سویرے الہ آباد کے لئے روانہ ہوگئے، کچھ دیر کے بعد مدرسہ کے اساتذہ کا ایک اور قافلہ شرکت جنازہ کے لئے عازم سفر ہوا۔ سوگواروں کا یہ قافلہ پونے دو بجے وہاں پہونچ گیا، گھر پر غم واندوہ کی چادر تنی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ کئی روز سے طبیعت خراب تھی۔ کل رات

میں غشی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ لوگ لے کر ہسپتال پہونچے، آکسیجن وغیرہ چڑھایا گیا مگر ’’یا اللہ رحم فرما‘‘ کہتے ہوئے آغوشِ رحمت میں جا سوئے۔

جمیل بھائی کو جیسے اپنی موت کا احساس پہلے ہی ہو گیا تھا۔ انھوں نے ایک وصیت نامہ مرتب کر لیا تھا، جو مرنے کے بعد ان کی جیب میں ملا۔ یہ وصیت نامہ ایک مومن کا وصیت نامہ ہے، اس میں درج تھا کہ میرا روپیہ جو کچھ ہے، سب سے پہلے اس میں سے میرے چھوٹے بھائی کا جو قرض میرے اوپر ہے وہ ادا کیا جائے۔ قرض اکیس ہزار روپیہ تھا، پھر گاؤں کی مسجد میں ایک معتد بہ رقم دینے کی وصیت ہے، پھر مولوی عبدالعظیم صاحب کو ہدایت ہے کہ میری طرف سے حجِ بدل کر دیں۔ اپنے لڑکے شکیل سلّمہٗ کو وصیت کی کہ اپنی ماں کے آرام وراحت کا اہتمام رکھے، نماز کی پابندی کرے، اور اگر حج فرض ہو جائے تو فوراً حج کر لے، اور پھر سب احباب سے گزارش ہے کہ میری کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف کر دیں، اور میرے لئے دعاء مغفرت کریں، میں نے سب کی خطائیں معاف کر دی ہیں، مجھے اپنے پروردگار سے پوری امید ہے کہ وہ میری مغفرت ضرور فرما دیں گے۔

یہ خلاصہ ہے، اصل وصیت نامہ اتنا موثر ہے کہ جب مجمع میں پڑھ کر سنایا گیا تو سب آبدیدہ ہو گئے۔

عصر کے بعد جنازہ کی نماز حضرت قاری محمد مبین صاحب مدظلہٗ کی امامت میں ادا کی گئی، قبلہ مولانا شاہ محمد احمد صاحب مدظلہٗ جیسی مقبول ہستی شریکِ نماز تھی۔ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب مدظلہٗ صحت کی خرابی کے باعث الہ آباد نہ جا سکے۔ اسی وقت تدفین عمل میں آئی۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائیں، اور پسماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائیں۔

..................☆☆☆☆☆☆☆..................

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استــــاذالعلمــــاء

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب خیرآبادیؒ

وفات: ۴؍دسمبر ۱۹۸۸ء

بچپن کی بے شعوری نے جب شعور وآگہی کی طرف قدم بڑھایا، اور زندگی کا سفر کام ودہن کی لذت سے آگے بڑھ کر دل ودماغ کے مرحلہ میں داخل ہوا، تو چند نام بار بار سماعت کے راستے سے ذہن میں آتے رہے، ان ناموں کے ساتھ بڑے احترام وتقدس کی فضا ہوتی، گھر، محلے اور مکتب کے بڑے لوگوں کی زبانوں پر یہ نام آتے تو نہ صرف ہم بچے، بلکہ بڑوں کی گردنیں بھی احترام میں جھک جاتیں، اور چہروں پر محبت وعقیدت کا نور پھیل جاتا، جس ماحول میں میرے شعور کی آنکھیں کھل رہی تھیں، وہ ماحول دینداروں کا تھا، جس میں کچھ عالم دین تھے، کچھ حافظ قرآن تھے، کچھ قاری تھے، کچھ ایسے لوگ تھے، جو نہ عالم تھے، نہ حافظ تھے، نہ قاری! مگر ان سے بڑی عقیدت ومحبت رکھنے والے تھے، بقدر ضرورت لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس ماحول میں دین کی محبت، علماء سے عقیدت، نمازوں کا اہتمام، بزرگوں سے تعلق کی خوشبو رچی بسی تھی، مغرب کی نماز کے بعد محلّہ کے ایک بزرگ حافظ قرآن حضرت حافظ احمد کریم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گھر عشاء کی اذان تک ایک ہلکی پھلکی مجلس ہوتی تھی، جس میں دینی تذکرے بکثرت ہوتے، اسی مجلس میں زیادہ تر یہ نام، بہت ہی دلآویز نام! زبانوں پر آتے، اور ہم بچوں کے کان اور ذہن ودماغ ان سے آشنا ہوتے، ماضی کا تذکرہ چھڑ گیا ہے، تو جی چاہتا ہے کہ ان ناموں کو دہراؤں، جن کی حلاوت سے قلب اب تک معمور ہے، اکابر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ (شیخ الہند) حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب شاہجہاں پوریؒ بڑے مولانا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ مجاہد ملت، حضرت مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہاں پوریؒ، یہ نام بہت کثرت سے سننے میں آتے تھے، مقامی اور قریبی علماء میں حضرت مولانا قاری ریاست علی صاحبؒ، حضرت مولانا عبد الباری صاحب مبارکپوریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوریؒ، حضرت مولانا نذیر احمد صاحب خیرآبادیؒ، حضرت مولانا شکر اللہ صاحب ولید پوریؒ، حضرت مولانا محمد عمر صاحب مبارکپوریؒ، قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کے نام روزانہ ہی کانوں میں رس گھولتے تھے۔

اکابر کو دیکھا نہ تھا، دیکھنے کا شوق ہوتا تھا۔ مقامی بزرگوں میں سے اکثر کی زیارت ہوجایا کرتی تھی، یہ حضرات کبھی کبھی میرے گاؤں میں کسی کسی عنوان سے تشریف لایا کرتے تھے، جب یہ حضرات تشریف لاتے تو ان حروف کا لکھنے والا ان کے آس پاس اس طرح حاضر رہتا، جیسے بھونرا پھولوں کا طواف کرتا رہتا ہے، یا پروانہ شمع پر نثار ہوتا رہتا ہے۔

خیرآباد میرے گاؤں کے قریب ہے، شمال میں بھیرہ (میرا گاؤں) جنوب میں خیرآباد، درمیان میں ٹونس ندی حدِّ فاصل! خیرآباد اور بھیرہ مسافت کے لحاظ سے بھی قریب اور رشتہ داریوں میں بھی باہم پیوست! میری پھوپھی خیرآباد میں تھیں، وہاں آنا جانا میرا بہت کثرت سے ہوتا تھا۔ خیرآباد جاتا، تو وہاں کے مدرسہ منبع العلوم میں بھی حاضری ہوتی، جن ناموں سے طبیعت پہلے سے مانوس تھی، ان میں ایک

بزرگ وہاں موجود تھے، میں ٹھہرا بچہ قریب جانے کی ہمت نہیں پاتا تھا، دور سے دیکھتا نہایت نستعلیق، نہایت صاف شفاف لباس زیب تن، چہرہ دمکتا ہوا، خوبصورت اور وجیہ، کچھ سیاہ اور کچھ سفید بال، آنکھوں میں سرمہ بسا ہوا، بارعب وباوقار، اس وقت عربی وفارسی کے درجات کے ساتھ مکتب کے بچوں کو بھی پڑھاتے تھے، میں انھیں دور سے دیکھا کرتا اور دیر تک دیکھتا رہتا، میرا بھی جی چاہا کرتا کہ ان سے سبق پڑھوں، یہ تھے حضرت مولانا نذیر احمد صاحب خیرآبادی (نور اللہ مرقدہٗ)

خیرآباد اعظم گڈھ شہر اور مئو کے ٹھیک درمیان نیشنل ہائی وے پر محمد آباد گہنہ کے قریب مغرب میں واقع ہے، یہ مسلمانوں کی خاصی بڑی آبادی ہے، جہاں علماء وحفاظ کی بڑی تعداد ہے، کپڑا بننے کی صنعت میں یہ قصبہ مشہور ہے۔ یہاں تمول و ثروت کے ساتھ عام مسلمانوں کا مزاج دیندارانہ ہے، دینی تعلیم حاصل کرنے کا عام رواج ہے، صدقۂ وخیرات کرنے اور مدارس دینیہ کی امداد اور ان کے تعاون میں یہ آبادی دور دراز تک مشہور اور نیک نام ہے۔

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب اسی قصبہ میں ۸؍ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے، والد محترم کا اسم گرامی حاجی رحمت اللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ منبع العلوم میں حاصل کی، مولانا کے عالی قدر صاحبزادے حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی مدظلہٗ (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) خبر دیتے ہیں کہ:

”قرآن پاک ناظرہ، اردو، حساب وغیرہ حافظ محمد یوسف صاحب گونچھوی (۱) سے پڑھا، اور فارسی کی تعلیم حضرت مولانا شاہ محمد صاحب مبارکپوری (۲) سے حاصل کی، اول الذکر حافظ صاحب قرآن شریف، ناظرہ، اردو اور

---

(۱) گونچھا، خیرآباد کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے (۲) حضرت مولانا شاہ محمد صاحب سریّاں کے رہنے والے تھے، جو مبارکپور کے مضافات میں ایک چھوٹا سا موضع ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے، تذکرۂ علمائے مبارکپور، ص: ۲۳۴

حساب وغیرہ کی تعلیم میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اور مولانا شاہ محمد صاحب حضرت مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی، مولانا عبدالعلیم صاحب رسول پوری، مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری، صاحب تحفۃ الاحوذی، مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے شاگرد تھے، مگر آپ پر غیر مقلدیت کا اثر نہ ہوا، بلکہ شروع سے آخر تک حنفی رہے، اپنی پوری زندگی زہد وقناعت، صبر وتوکل اور قُوتِ لایموت پر بسر کی، انتہائی نیک نفس، شریف، متواضع اور سادہ مزاج تھے، سلف صالحین کا نمونہ تھے“

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا نذیر احمد صاحب نے پورہ معروف (۱) کے مدرسہ معروفیہ میں داخلہ لیا، وہ اس مدرسہ کے تعلیمی عروج کا دور تھا، خیرآباد کے ایک بزرگ مولانا محمد شبلی صاحب شیداؔ اور مئو کے حضرت مولانا عبدالحی صاحب نے درس وتدریس کی بساط بچھا رکھی تھی۔

مولانا شبلی صاحب فارسی زبان کے ماہر استاذ تھے، بہترین شاعر تھے، اور خوشخطی میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ مدرسہ معروفیہ میں فارسی کی پہلی اور آمد نامہ، گلستاں، بوستاں، مالابدمنہ، یوسف زلیخا، اخلاق محسنی، سکندر نامہ، انوار سہیلی اور بہار بوستاں تک سب کتابیں تنہا پڑھاتے تھے، طلبہ پر بے حد شفیق تھے، سچے عاشق رسول تھے، ۱۳۷۴ھ میں حج کیلئے تشریف لے گئے، اس دوران وارفتگی اتنی بڑھی کہ اپنی کچھ خبر نہیں رہتی تھی، بالآخر اسی حالت میں حج کے بعد ۲۸؍ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ مطابق یکم؍ اگست ۱۹۵۵ء کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور اسی سرزمین کے جزو بن گئے، (تذکرۂ علمائے اعظم گڈھ)

مولانا شبلی صاحب نے ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۶۶ھ تک مدرسہ معروفیہ میں تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔

---

(۱) سابقہ ضلع اعظم گڈھ اور حالیہ ضلع مئو کا مشہور مردم خیز قصبہ، جہاں علماء وحفاظ ہر ہر گھر میں ہیں، اور ایک نہیں کئی کئی

مولانا عبدالحی صاحب علیہ الرحمہ مئو بھکاری پورہ کے رہنے والے تھے ، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ اور مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کے رفیق درس تھے ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۵۵ھ تک آپ مدرسہ معروفیہ میں صدر مدرس رہے، آپ کی علمی استعداد اس قدر ٹھوس تھی ، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر فن کی کتابیں آپ کو ازبر ہیں، آپ پڑھاتے نہیں بلکہ طلبہ کو گھول کر پلاتے تھے، آپ کا طریقۂ درس ایسا تھا کہ طلبہ کے اندر از خود کتاب حل کرنے کی استعداد پیدا ہو جاتی تھی ، بالخصوص عبارت کی درستگی کا ملکہ پیدا ہو جاتا تھا۔

حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ نے عمر کم پائی، ۱۳۶۳ھ میں ان کا وصال ہوا۔ تقریباً ۴۴؍۴۵؍سال کی عمر میں ان کی زندگی کا سفر پورا ہو گیا، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب نے درس نظامی کی سب کتابیں، انھیں سے پڑھیں، نحو میر سے لے کر مشکوٰۃ شریف تک ان کے یہی ایک استاذ رہے، انھیں اپنے استاذ سے بڑی عقیدت اور محبت تھی ، انھیں کے قدموں سے لپٹے رہے، اور بڑی محنت اور ترتیب کے ساتھ سب کتابیں پڑھتے رہے، کبھی کوئی کتاب بغیر مطالعے کے نہیں پڑھی، مولانا فرماتے تھے کہ ہم نے کبھی بیک وقت تین سبق سے زیادہ نہیں پڑھے، اس طرح ہر کتاب میں محنت کرنے اور مطالعۂ ومذاکرہ کا پورا موقع ملتا تھا، ہر کتاب میں پختگی پیدا ہو جاتی تھی ، دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی قواعد میں لکھا ہوا ہے کہ کسی طالب علم کو بیک وقت چار کتابوں سے زیادہ پڑھنے کی اجازت نہ ہوگی ، تعلیمی پختگی کیلئے یہ قاعدہ بہت اہم ہے جب طلبہ پر کتابیں زیادہ لاد دی جاتی ہیں، تو کسی ایک میں پختگی نہیں ہو پاتی ، وقت کی قدرے بچت تو ہو جاتی ہو، مگر استعداد علمی کمزور ہو کر رہ جاتی ہے، اور عموماً مشاہدہ ہے کہ وقت کی بچت بھی نہیں ہو پاتی ، کم

کتابیں ہوں، تو مطالعہ کا وقت بھی خوب ملتا ہے، اور تکرار و مذاکرہ میں کوئی خلل نہیں پڑتا، بشرطیکہ طالب علم محنتی اور شوق والا ہو، مولانا نذیر احمد صاحب بچپن سے ہی مرتب اور بااصول طریقے پر وقت کا استعمال کرنا جانتے تھے، انھوں نے اس سے بہت فائدہ حاصل کیا، ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ بغیر مطالعہ کے کوئی سبق نہیں پڑھتے تھے، اسی کے ساتھ سبق پڑھ لینے کے بعد ہر کتاب کا مذاکرہ ضرور کرتے تھے، کوئی مخاطب نہ ہوتا تو دیوار ہی کو مخاطب کر کے سبق کی تقریر کرتے ، یہ بھی فرماتے کہ رات کو کبھی بارہ بجے سے پہلے سونے کا اتفاق نہیں ہوتا تھا، اور یہ جاگنا گفتگو اور مجلس بازی کیلئے نہ ہوتا ، مطالعۂ ومذاکرہ کیلئے ہوتا، مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی آپ کے خلف الرشید لکھتے ہیں کہ:

> آپ کی عقیدت ومحبت ، تعلیم سے دلچسپی اور ذہانت وذکاوت دیکھ کر استاذ محترم کی توجہ اور شفقت آپ کے اوپر بھرپور رہی، استاذ محترم بھی آپ کے اوپر بہت محنت کرتے ، اور ہر فن کو گھول کر پلانے کی کوشش کرتے ، استاذ محترم کی محنت وتوجہات سے ان کے حلقۂ درس میں رہ کر کندن بن کر نکلے، اور آپ کے نہایت ممتاز، نامور اور وفادار شاگرد ہوئے۔

دارالعلوم مئو میں مولانا کا ارادہ تھا کہ فراغت تک سب کتابوں کی اپنے انھیں محترم استاذ کی خدمت میں تکمیل کریں ، چنانچہ فرماتے تھے کہ اگر استاذ محترم مولانا عبدالحی صاحب دورۂ حدیث کی کتابیں پڑھانے کے لئے تیار ہوتے تو میں دورۂ حدیث کی کتابیں بھی انھیں سے پڑھتا۔ لیکن مدرسہ معروفیہ میں دورۂ حدیث کا نظم نہیں تھا، اسلئے مجبوراً ایک سال کیلئے دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا۔

دارالعلوم مئو اس دور میں ٹھوس اور معیاری تعلیم کیلئے مشہور تھا، اس وقت وہاں کے استاذ تعلیم وتربیت میں بہت ممتاز تھے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب

دیوبندی علیہ الرحمۃ کے خاص شاگرد حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلیؒ ان دنوں شیخ الحدیث تھے، یہ بزرگ تعلیم وتدریس میں بڑی مہارت رکھتے تھے، ان کے شاگردوں میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رامپوریؒ ناظم مظاہر علوم سہارن پور حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کشمیری، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، اور حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب فاروقی بہت نامور ہوئے۔

اس وقت دارالعلوم مئو میں مولانا سنبھلی کے علاوہ حضرت مولانا محمد صدیق صاحب ہزاروی، مولانا عبدالمتین صاحب پشاوری، حضرت مولانا اسلام الحق صاحب کوپا گنجی (رحمھم اللہ) جیسے اساطین علم وفن موجود تھے، انھیں حضرات سے مولانا نے دورۂ حدیث کی کتابیں پڑھیں، حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ خبر دیتے ہیں کہ:

’’اپنی قوت واستعداد، صلاحیت اور ذہانت وذکاوت کی وجہ سے آپ دارالعلوم کے طلبہ میں ممتاز شمار کئے جاتے تھے، خاص کر شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی آپ کو بہت چاہتے تھے، بڑی شفقت ومحبت کا برتاؤ فرماتے، اوران کی استعداد پر بہت اعتماد فرماتے۔‘‘

فراغت دارالعلوم مئو سے آپ نے ؁۱۳۵۲ء میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، اوراعلیٰ درجہ کی ممتاز سند پائی، مفتی صاحب مدظلہٗ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت مولانا عبدالوحید صاحب جیسے یکتائے روزگار عالم نے آپ کی سند میں امتیازی الفاظ لکھے، ارباب دارالعلوم کی زبانی بار بار یہ سننے میں آیا کہ دارالعلوم مئو کی تاریخ میں ایسی اعلیٰ اور امتیازی سند کسی کو نہیں ملی، جیسی مولانا نذیر احمد صاحب کو ملی ہے، خیرآباد میں اب تک کوئی باقاعدہ پورا عالم

نہیں تھا، سب سے پہلے والد صاحب خیرآباد میں عالم وفاضل بن کرآئے۔‘‘

تدریسی خدمات فراغت کے بعد قصبہ رسڑا ضلع بلیا میں کچھ دنوں تک صدر مدرس کی حیثیت سے رہے، اس کے بعد شہر دربھنگہ (بہار) میں پڑھایا، پھر وہاں سے اپنے وطن مالوف خیرآباد میں آگئے، اور وہاں مقامی مدرسہ منبع العلوم میں پڑھانے لگے، مدرسہ منبع العلوم میں آپ نے اڑتیس سال تک مسلسل ایک قلیل تنخواہ پر تدریسی خدمات انجام دیں۔ یہاں آپ ابتداء سے صدر مدرس رہے۔

آپ نے تدریس کا طریقہ اپنے استاذ محترم سے اخذ کیا تھا۔ ٹھیک انھیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے، ان کا بھی حال یہی تھا کہ علوم وفنون طلبہ کو گھول کر پلا دینا چاہتے تھے، اور اس میں مولانا بہت کامیاب رہے، ان سے پڑھنے والے طلبہ ذرا توجہ سے کام لیتے، تو عمدہ صاحب استعداد بن جاتے تھے، بالخصوص فن نحو میں آپ کو بڑی مہارت حاصل تھی، آپ کے درس کی خاص شہرت تھی، اس فن کی آخری کتاب کو جو درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہے وہ کافیہ کی شرح ہے جو اس کے مصنف حضرت ملا عبدالرحمٰن جامی کی طرف منسوب ہوکر شرح جامی کہلاتی ہے، اچھی خاصی دقیق ہے، اسے پڑھانے میں آپ کو خاص ملکہ تھا۔ حضرت مولانا قاری ریاست علی صاحب صدر المدرسین دارالعلوم مئو تو آپ کو ’’رئیس الاذکیاء‘‘ اور ’’امام النحو‘‘ کہا کرتے تھے۔

میرے دوست مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی، جو حضرت مولانا کے خاص تلامذہ میں ہیں۔ فرماتے ہیں کہ بخاری شریف کے سبق میں حضرت مولانا قاری ریاست علی صاحب نے فن صرف کا ایک مسئلہ طلبہ سے پوچھا، جماعت میں بیس طالب علم تھے، کوئی اسے حل نہ کرسکا، آخر میں مجھ سے پوچھا، تو گو کہ جواب پوری طرح میرے ذہن میں بھی نہ تھا مگر میں نے جو کچھ سمجھ میں آیا عرض کردیا، تو

حضرت قاری صاحب نے بے ساختہ فرمایا کہ: تم تو ''امام النحو والصرف'' کے شاگرد ہو تم نہ بتاتے تو اور کون بتاتا؟

مولانا کی تدریسی مہارت کی شہرت دار العلوم دیوبند تک تھی۔ دار العلوم دیوبند کے بعض اکابر اساتذہ مولانا کی تعلیم وتدریس کے مداح ومعترف تھے، آپ کے فیض یافتہ جب تکمیل کے لئے دار العلوم دیوبند داخلے کے لئے جاتے تو یہ معلوم ہونے پر کہ یہ طلبہ مولانا نذیر احمد صاحب سے پڑھ کر آئے ہیں، فوراً کہتے کہ تب تو تمھارا امتحان داخلہ میں کامیاب ہونا یقینی ہے۔ چنانچہ عموماً ایسا ہی ہوتا۔

مولانا کی عمدہ تعلیم وتربیت کی وجہ سے مدرسہ منبع العلوم خیرآباد کی کافی شہرت ہوئی، مولانا کے فیض یافتہ علماء میں چند مشہور روشن نام یہ ہیں۔

☆ حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب شمسی خیرآبادی،
شیخ الحدیث مدرسہ اشاعت العلوم اکل کوا، مہاراشٹر (المتوفی ۱۹؍ رمضان ۱۴۲۰ھ)
☆ حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی، صدر مفتی دار العلوم دیوبند (صاحبزادۂ گرامی قدر)
☆ حضرت مولانا شمیم احمد صاحب غالب پوری (۱)، شیخ الحدیث جامعہ مفتاح العلوم، مئو
☆ حضرت مولانا لیاقت علی صاحب ماہ پوری (۲)، شیخ الحدیث جامعہ مصباح العلوم کوپاگنج
☆ مولانا عبد الصمد صاحب بستوی
☆ مولانا امتیاز احمد صاحب خیرآبادی، استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس
☆ مولانا عبد الحی صاحب مفتاحی، ناظم مدرسہ منبع العلوم خیرآباد
☆ مولانا ابو اللیث صاحب خیرآبادی، استاذ ملیشیا یونیورسٹی، کوالالمپور
☆ مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی، استاذ مدرسہ منبع العلوم خیرآباد

---

(۱) غالب پور، محمد آباد گوہنہ کے قریب جانب شرق میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

(۲) ماہ پور، محمد آباد گوہنہ سے سات آٹھ کیلومیٹر کے فاصلے پر جانب جنوب ایک مختصر سی آبادی ہے۔

یہ سب حضرات ملک کے اہم دینی مدارس میں علم دین کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حضرت مولانا علماء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جو تقریر یا تصنیف وتالیف کے مقابلہ میں خاموشی کے ساتھ مردم سازی میں لگے رہے۔

اوصاف واخلاق مولانا بڑے باوقار، سنجیدہ اور بارعب تھے، مدرسہ میں پہونچتے، تو تمام اساتذہ اور طلبہ مؤدب ہوجاتے اور مستعدی کے ساتھ اپنے اپنے کام میں مصروف ہوجاتے، آپ کی درسگاہ ادب ووقار اور سنجیدگی کا ایک بہترین نمونہ تھی، لیکن اس میں خشکی اور کرختگی کا بوجھ نہ ہوتا، بلکہ ایک لطیف انبساط اور سبک روحی کی کیفیت پائی جاتی، جس کی وجہ سے اکتاہٹ اور ملال کا اثر نہ ہوتا، مولانا خود بہت سبک روح اور خوش مزاج تھے، بذات خود درسگاہ میں ہمہ وقت مصروف رہتے، اور طلبہ کو بھی مصروف رکھتے۔

مولانا دینی احکام کے نہایت پابند، صاحب تقویٰ وطہارت تھے، اور بہت با اصول زندگی گزارتے تھے، پڑھنے پڑھانے میں، اٹھنے بیٹھنے میں، سونے جاگنے میں، پہننے اوڑھنے میں، گھر کی صفائی ستھرائی میں، پیسوں کی آمد وخرچ میں، غرض ہر چیز میں آپ اصول کے پابند تھے، یہ بات آپ کے مزاج میں شامل تھی، بے اصولی کی کوئی بات آپ کو پسند نہ تھی، بے اصولی پر لوگوں کو تنبیہ فرمایا کرتے تھے، معاملات کے نہایت صاف اور کھرے تھے، کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے تھے، لین دین میں نہایت دیانت دار تھے، جھوٹ بولنے سے، دھوکہ دینے سے، کسی کا پیسہ غلط طریقے سے حاصل کرنے سے، اور ہر قسم کی بد معاملگی سے آپ کو سخت نفرت تھی، اکلِ حلال کا مولانا کو نہایت اہتمام تھا، حرام تو حرام ہے، مشتبہ مال سے بھی بہت محتاط رہتے تھے، ایک حدیث ہے: لاورع کالکف، حرام سے بچنا ہی سب سے بڑا تقویٰ ہے، مولانا اس پر زندگی بھر عامل رہے، اور اکثر یہ حدیث سناتے تھے، مولانا کے

تقویٰ اور احتیاط کا فطری ثمرہ یہ تھا کہ لوگوں کے قلوب میں باوجود ان کی سادگی، بے نفسی اور خاموش مزاجی کے بڑا رعب اور بڑی ہیبت تھی، اور بہت ادب واحترام تھا، مولانا جس طرف نکل جاتے، بڑے اور بچے سب ادب اور شائستگی کے ساتھ کھڑے ہوجاتے، کوئی کھیل تماشہ کرتا ہوتا، تو اسے چھوڑ کر الگ ہوجاتا، گھر کے اندر بھی محبت کے ساتھ ساتھ آپ کا بڑا رعب تھا۔

آپ معاملات میں اس درجہ محتاط تھے کہ کبھی کوئی سودا ادھار نہ خریدتے، نہ کسی سے قرض لیتے، حسن انتظام یہ تھا کہ اپنی آمدنی کے حساب سے چیزیں خریدتے، مگر اس میں اتنی برکت تھی کہ نفاست اور عمدگی آپ کی ہر چیز سے نمایاں ہوتی۔

مولانا کی طبیعت میں نفاست رچی بسی تھی، نہایت خوش پوشاک تھے، بہت صاف ستھرے کپڑے پہنتے، معمولی کپڑا بھی ہوتا، تو آپ کے بدن پر نہایت دیدہ زیب ہوتا، آپ کے جسم پر کپڑا بہت کم میلا ہوتا، صرف جمعہ کو لباس تبدیل کرتے تھے، لیکن صفائی کا یہ عالم ہوتا کہ اتارے ہوئے کپڑے اور نئے کپڑے میں بہت کم فرق ہوتا۔ صرف اتنا فرق ہوتا کہ ایک پریس والا ہوتا، اور دوسرے پر کچھ شکنیں ہوتیں، ان کی اس خوبی کی وجہ سے بعض لوگ انھیں فرشتہ کہا کرتے تھے، مولانا ہر چیز کا استعمال بہت احتیاط کے ساتھ کرتے تھے، ان کے جوتے تین تین سال تک نہیں گھستے تھے، فضول خرچی سے بہت بچتے، مگر اشیاء کا انتخاب عمدہ کرتے، ہر کام وقت پر انجام دیتے، کسی کام کو سستی میں ہرگز نہ ٹالتے، خود بھی چست اور مستعد رہتے اور گھر والوں کو بھی اس کی ہدایت کرتے۔

مولانا نذیر احمد صاحب علیہ الرحمۃ بہت زیادہ نوافل اور اوراد واذکار کا اہتمام نہیں کرتے تھے، فرائض وسنن پر اکتفا کرتے، البتہ تلاوت قرآن بہت پابندی سے کرتے، بعد نمازِ فجر ایک پارہ کی تلاوت میں کبھی ناغہ نہ ہوتا۔ اور رمضان شریف میں

روزانہ تین پارے پڑھتے، باقی اوقات تعلیم وتدریس اور تربیت ونگہداشت میں صرف فرماتے، مگر اخلاق کی درستگی اور تقویٰ وطہارت کا بغایت اہتمام فرماتے، زندگی اصولِ شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، اس میں بے احتیاطی اور بد اخلاقی کا کہیں گزر نہیں تھا، ایک بے داغ اور معصوم سی زندگی تھی، شاید ان کو طیش میں کسی نے نہ دیکھا ہو۔

اس دور کے مشہور بزرگ حضرت مولانا سید محمد امین صاحب نصیرآبادی علیہ الرحمۃ (۱) جن کے دورے ہمارے علاقے میں ہوا کرتے تھے، وہ بہت بابرکت اور متبعِ سنت بزرگ تھے، شرعی اوامر ونواہی کے خود بھی شدت سے پابند تھے اور دوسروں سے بھی بہت اہتمام سے پابندی کرواتے تھے، مولانا نذیر احمد صاحبؒ غالباً

---

(۱) حضرت مولانا سید محمد امین صاحب نصیرآبادی علیہ الرحمۃ ان علماء ربانی اور مشائخ حقانی کے سلسلۃ الذھب کی ایک زریں کڑی تھے، جن سے سنت وشریعت کا نور پھیلا، اور شرک وبدعت کی تاریکیاں کافور ہوئیں۔ ۲۲/ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کو آپ کی ولادت ہوئی، حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ کی خدمت میں درسیات کی تکمیل کی، حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ سے بھی علم حدیث کی سند حاصل کی، سلوک وطریقت کی منزلیں رائے بریلی میں حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے نانا حضرت مولانا سید ضیاء النبی صاحبؒ کی خدمت وصحبت میں حاصل کیں۔

جمعہ کے دن مولانا کا وعظ ہوا کرتا تھا، وعظ میں ایک خاص تاثیر ہوتی تھی، مولانا کے دل میں اتباعِ سنت وشریعت کا بہت قوی جذبہ اور داعیہ تھا، محبت الٰہی میں سرشار اور عشق نبوی میں دلفگار تھے، اس کا اثر آپ کے وعظ وبیان سے پھوٹا پڑتا تھا۔ ان کے وعظ سے لوگوں کی زندگیاں بدل جاتی تھیں، مولانا کے تبلیغی اور عرفانی دورے پرتاب گڈھ، سلطان پور اور اعظم گڈھ، جونپور میں ہوا کرتے تھے، جس طرف نکل جاتے نور کی ایک جوئے رواں بہتی چلی جاتی، بدعات، رسوم جاہلی اور بت پرستی کے شعائر مٹتے چلے جاتے، سود، اکل حرام، تعزیہ اور محرم کی بدعات سے تنفر پیدا ہوجاتا۔

حضرت مولانا سید محمد امین صاحب نصیرآبادیؒ، منکرات کی نکیر میں بہت سخت تھے، مجال نہ تھی کہ کوئی شخص داڑھی منڈائے ہوئے یا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے پہنے، اور بڑی بڑی مونچھیں رکھے ان کے پاس سے گزر جائے، اور ان کی نکیر شدید سے بچ جائے۔

خلق خدا کو آپ کی ذات گرامی سے بہت نفع ہوا، ۱۳۴۹ھ میں انتقال ہوا۔ نزہۃ الخواطر ج:۸ ص:۸۶، ۸۷

انھیں سے بیعت تھے۔

مولانا کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے، میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں طالب علم تھا، کافیہ، قدوری وغیرہ پڑھ رہا تھا۔ قرآن مجید کے ابتدائی پندرہ پارے بھی درس میں تھے، سالانہ امتحان میں مولانا نے ترجمہ کلام پاک کا پرچہ بنایا تھا۔ کون سا پرچہ کہاں سے بن کر آیا ہے، طالب علموں کو اس کی خبر نہ ہوتی تھی۔ مگر یہ پرچہ حضرت مولانا نذیر احمد صاحب نے بنایا ہے، اس کی اطلاع مجھے ایک خاص تقریب سے ہوگئی، ہوا یہ کہ طالب علموں کے جواب کی کاپیاں ان کے پاس جانچنے کے لئے گئیں، تو انھوں نے میری کاپی جانچنے کے بعد اس وقت کے ناظم حضرت مولانا عبدالباری صاحب قاسمیؒ کو کاپیوں کی واپسی کے ساتھ ایک خط لکھا تھا، حضرت مولانا عبدالباری صاحب قاسمی نے مجھے بلا کر فرمایا کہ مولانا نذیر احمد صاحبؒ تمہارے جوابات سے بہت خوش ہوئے ہیں، انھوں نے بطور خاص لکھا ہے کہ ’’فراغت کے بعد تمہیں مدرسہ احیاء العلوم میں مدرس مقرر کر دیا جائے، ان شاء اللہ مدرسہ کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا‘‘ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد الفاظ بعینہٖ یاد نہیں ہیں، مگر مفہوم یہی تھا، اور شاید الفاظ بھی یہی تھے، اس وقت تو میری ہمت نہیں ہوئی کہ حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا، کئی سال کے بعد جب رسمی فراغت حاصل ہوئی، تو بار بار خدمت میں حاضری دیتا رہا، اور متعدد بار مولانا نے فرمایا کہ میں نے آپ کی ترجمے والی کاپی دیکھی تھی، میں نے اسی وقت مولانا عبدالباری صاحبؒ کو لکھا تھا کہ آپ کو فراغت کے بعد تدریس پر مامور کر دیں۔

مگر میری محرومی دیکھئے یہ بات نہ حضرت مولانا عبدالباری صاحبؒ کے دورِ نظامت میں عمل میں آسکی اور نہ ان کے بعد۔ مگر میں جہاں بھی ہوں پروردۂ احیاء

العلوم ہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ پر اور اس کے تمام تعلق والوں پر اپنی رحمت کاملہ نازل فرمائیں۔

آخری ایام میں جب حضرت مولانا عمرِ طبعی کو پہونچ چکے تھے، عام صحت آپ کی اچھی تھی۔ گزر چکا ہے کہ آپ کی زندگی اصول کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، کھانے پینے، سونے جاگنے میں ایک معمول کے پابند تھے، اس لئے بڑھاپے تک صحت میں زیادہ اختلال نہیں آیا تھا۔ لیکن ’’یک پیری وصد بیاری‘‘ ضعف پیری میں بیماریاں آپ کو گھیرنے لگی تھیں، جب کمزوری زیادہ بڑھی تو مدرسہ منبع العلوم کی ملازمت سے یکسو ہو کر خانہ نشین ہوگئے، صاحبزادگان اور گھر والوں نے دوا علاج اور خدمت و تیمارداری میں کوئی کوتاہی نہیں کی، مولانا بڑے خوش نصیب تھے، کہ دو صاحبزادے اور دونوں عالم دین، دو صاحبزادیاں اور دونوں نہایت نیک، اہلیہ فرشتہ صفت، سب نے خدمت کا حق ادا کیا، اور گھر والے بھی خوش نصیب کہ ایک معصوم صفت برگزیدہ عالم کی خدمت کا خوب خوب موقع ملا۔

آخر وقت مقرر آ ہی گیا، ۳؍دسمبر ۱۹۸۸ء کا دن گزار کر شب میں یکا یک آپ نے نگاہ اوپر اٹھائی اور مسکرا پڑے، پھر کلمۂ طیبہ لا إلٰــــــه إلا الله پڑھا، اور جان، جاں آفریں کے حضور پہونچ گئی، إنا لله وإنا إليه راجعون۔ ہاہ! اقبال نے کیا سچی بات کہی ہے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

(مرد مومن کی نشانی تمہیں بتاؤں؟ جب موت آتی ہے تو اس کے لبوں پر تبسم پھیل جاتا ہے)

آپ کے انتقال کی خبر بستی میں اور قرب وجوار میں بہت تیزی کے ساتھ پھیل گئی، اور اس کثرت سے عوام وخواص اور علماء وصلحاء جنازہ میں شریک ہوئے کہ اس سے پہلے خیرآباد میں کسی جنازہ میں علماء کا اتنا بڑا مجمع نہیں ہوا تھا، ایک بڑے

میدان میں مولانا کی نمازِ جنازہ آپ کے چھوٹے صاحبزادے مولانا عبدالحی صاحب خیرآبادی کی امامت میں ادا کی گئی، اس دن لوگوں کو حضرت مولانا کی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔ پھر وہیں خیرآباد کے مقامی قبرستان میں یہ امانت ان کے والدین کے پاس، آغوشِ زمین کے سپرد کردی گئی، رحمۂ اللہ رحمۃً واسعۃً **وأدخلهٗ الجنة بنعمته السابغة**

حضرت مولانا کے پس ماندگان میں اہلیہ مکرمہ حضرت صفیہ خاتون تھیں، خاتون محترم مولانا کے بعد عرصہ دراز تک حیات رہیں، ابھی چند روز قبل ۴؍ربیع الاول ۱۴۲۴ھ مطابق ۷؍مئی ۲۰۰۳ء بروز چہارشنبہ ان کا انتقال ہوا۔

صفیہ خاتون ہمارے گاؤں بھیرہ کی ایک برگزیدہ شخصیت حضرت مولوی عبد المجید صاحب علیہ الرحمۃ کی صاحبزادی تھیں، مولوی صاحب مرحوم عرصۂ دراز تک بھیرہ میں جمعہ کے امام رہے، نہایت نیک نفس، پاک طینت، فرشتہ صفت بزرگ تھے، میں نے اپنے بچپن میں ان کی زیارت کی تھی، بہت بوڑھے اور کمزور ہوچکے تھے، گاؤں میں ان کا بڑا احترام تھا، ان کے دو صاحبزادے حضرت مولوی محمد یونس صاحب اور حضرت مولوی محمد یوسف صاحب تھے، اول الذکر کی بزرگی اور تقویٰ و طہارت سب کے نزدیک مسلم تھی، بہت کم گو، بہت بے ضرر انسان تھے، اپنے ذریعۂ معاش میں نہایت محتاط اور صاحب ورع، رمضان شریف میں فجر کی سنت پڑھتے ہوئے عین نماز کی حالت میں انتقال ہوا، دوسرے بزرگ حضرت مولوی محمد یوسف صاحب علیہ الرحمۃ میرے استاذ تھے، مکتب درجہ ۲؍اور درجہ ۳؍کی تعلیم میں نے انھیں سے حاصل کی ہے، نماز پڑھنے کا طریقہ انھیں نے سکھایا تھا، بہت کامیاب مدرس اور مربی تھے۔

حضرت مولوی عبدالمجید صاحب کی تین صاحبزادیاں تھیں بڑی صاحبزادی حضرت مولانا نذیر احمد صاحب کے بڑے بھائی بشیر احمد صاحب مرحوم کے عقد میں تھیں ان کے دو صاحبزادے ہیں، مولانا عبید الرحمٰن صاحب خیرآبادی استاذ مدرسہ چراغِ علوم بنارس دوسرے مولانا عبدالحکیم صاحب خیرآبادیؒ جو عرصہ دراز تک مدرسہ منبع العلوم کے ناظم رہے، ان کی وفات یکم؍ذوقعدہ ۱۴۲۲ھ میں ہوئی۔ یہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں، دوسری صفیہ خاتون صاحبہ جو مولانا نذیر احمد صاحب کی اہلیہ اور حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی مدظلہٗ کی والدہ مکرمہ تھیں، تیسری ام کلثوم جو ہمارے مدرسہ کے صاحب افتاء مولانا مفتی منظور احمد صاحب کی والدہ ہیں، یہ سب ؎ ایں خانہ ہمہ آفتاب ست کے مصداق ہیں۔

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب کے دو صاحبزادے ہیں، اور ماشاءاللہ دونوں آفتاب و ماہتاب ہیں، بڑے صاحبزادے حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی مدظلہٗ جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مسند افتاء کے صدر نشیں ہیں۔ دوسرے مولانا عبدالحی صاحب جو مدرسہ چشمۂ فیض ادری ضلع مئو میں استاذ ہیں۔

اور دو صاحبزادیاں ہیں، بڑی صاحبزادی میرے استاذ گرامی ماسٹر شفیع احمد صاحب بھیرہ کے حبالۂ عقد میں ہیں، ان کے صاحبزادے مولانا جاوید اختر صاحب استاذ مدرسہ مصباح العلوم کوپا گنج ہیں، دوسری صاحبزادی استاذی حضرت مولوی عبدالکافی صاحب مبارکپوری صاحبزادہ گرامی حضرت مولانا عبدالباری صاحب قاسمیؒ کی اہلیہ محترمہ ہیں، علمی اور عملی اعتبار سے حضرت مولانا کی نسل ماشاءاللہ بہت بابرکت ہے۔

(ماہنامہ **ضیاء الاسلام** جون؍جولائی ۲۰۰۳ء مطابق ربیع الثانی؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ)

..............☆☆☆☆☆☆☆..............

حضرت مولانا شکر اللہ صاحب ولید پوریؒ

وفات: ۲۱؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ

تیس سال سے زیادہ مدت گزری، بچپن کی مکتبی زندگی تھی، اپنے گاؤں بھیرہ کے مکتب میں زیر تعلیم تھا۔ مکتب کے ایک مختصر سے حجرے میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی، جس میں کتابوں کا ایک معمولی سا ذخیرہ تھا۔ پرائمری کے ہمارے ایک استاذ اس لائبریری کے منتظم تھے، صبح کو جب ہم لوگ درسگاہ میں پہونچتے، اور ماسٹر صاحب آجاتے، تو ہم لوگ کبھی کبھی دیکھتے کہ ایک صاحب پستہ قد، نحیف بدن، چھوٹا سا چہرہ، اس پر بہت مختصر سی داڑھی، فراخ دہن، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ان پر موٹے شیشوں کی عینک، ایک ہاتھ میں کپڑے یا ریگزین کا تھیلا، اور دوسرے ہاتھ میں کوئی کتاب لئے ہوئے، ہمارے ماسٹر صاحب کے پاس آتے، ہم لوگ انھیں دیکھتے ہی مولوی صاحب! **السلام علیکم** کا نعرہ بلند کرتے، وہ مسکراتے، بلند آواز سے جواب دیتے، آواز میں خاصا کراراپن ہوتا، پھر ماسٹر صاحب کو وہ کتاب دیتے، اور ان سے دوسری کتاب لیتے، اور فوراً چلے جاتے، کبھی وہ کچھ گفتگو کرتے تو ہم لوگ بہت غور سے ان کی باتیں سنتے، کیونکہ وہ صاف اور واضح طور پر بات کرتے اس میں شیرینی اور دلکشی ہوتی، ان کی باتیں دل کو کھینچتی تھیں، ان کے جانے کے بعد ہم لوگ آپس میں تذکرہ کرتے کہ یہ ”**مولوی شکر اللہ صاحب**“ ولید پور کے رہنے والے ہیں، ولید پور، ہمارے گاؤں سے متصل جانب شمال میں، ایک قصبہ نما آبادی ہے۔ خیر آباد میں پڑھاتے ہیں، ولید پور سے خیر آباد کا فاصلہ تین چار

کلومیٹر ہوگا، مولانا اپنے گھر سے نکلتے تو کتاب کھول لیتے، قدم ان کا راستہ پر ہوتا، اور نگاہیں کتاب پر، میں نے بچپن میں انھیں بارہا دیکھا ہے کہ نظر بر کتاب، رستہ چلے جارہے ہیں، دائیں بائیں کیا ہے، اس سے انھیں کوئی مطلب نہیں، کسی نے سلام کیا، تو جواب دیدیا، یہ بات سب جانتے تھے کہ انھیں کتابوں سے، مطالعہ سے، شغف ہی نہیں عشق ہے، کتاب ان کے ہاتھ سے کبھی جدا نہیں ہوتی تھی، خیرآباد روزانہ وہ صبح کو جاتے اور شام کو لوٹ آتے تھے، اس دوران کبھی کسی نے نہ دیکھا ہوگا کہ یونہی عام راہ گیروں کی طرح چلے جارہے ہوں، بس کتابوں میں غرق رہتے، راستہ اتنا جانا پہچانا ہوتا تھا کہ بھولنے بھٹکنے کا کوئی سوال نہ تھا، مگر مطالعہ کی محویت اور استغراق میں کبھی ایسا ہوتا تھا کہ راستہ تو مُڑ رہا ہے، لیکن مولانا ہیں کہ سیدھے چلے جارہے ہیں۔ کچھ دور جانے کے بعد احساس ہوتا تو واپس ہوتے۔

ہم لوگوں کے دل میں مولانا کے اس شوق مطالعہ اور جذبۂ علم کی بڑی قدر تھی، مولانا کو ہم لوگ تحصیل علم کیلئے نمونہ سمجھتے تھے، مولانا کا جثہ مختصر تھا، بہت مختصر، لیکن اس مختصر جثہ میں ذہانت وذکاوت، علم وفضل اور فصاحت وبلاغت کا دریا موجیں مار رہا تھا، کثرت مطالعہ اور وفور علم نے مولانا کو سراپا علم بنادیا تھا، کیسی ہی عامیانہ گفتگو ہو، مولانا اس میں علم کے پھول کھلاتے چلے جاتے، گفتگو اتنی واضح اور صاف ہوتی، اور سمجھانے کا انداز اتنا دلنشیں ہوتا، کہ بس یہ جی چاہتا کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، ان کی گفتگو سے طبیعت سیر نہ ہوتی۔

جب کسی شخصیت کی عظمت کا نقش، آغاز شعور سے دل ودماغ پر جم جاتا ہے، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص ہمیشہ سے ایسا ہی ہے، اس کا بچپن، اس کی تعلیم، اس کے اساتذہ وغیرہ کا کوئی سوال ہی ذہن میں نہیں پیدا ہوتا، مولانا کے بارے میں میرا حال یہی رہا، میں بس یہ جانتا تھا کہ مولانا بہت بڑے عالم ہیں، کہاں پڑھا ہے؟

کس سے پڑھا ہے؟ کس مدرسہ سے فراغت حاصل کی ہے؟ یہ سوالات ذہن میں آتے ہی نہ تھے، یہ سارے سوالات صرف اس ایک بات میں کہ مولانا بہت بڑے عالم ہیں، ہضم ہو گئے تھے، پھر بعد میں معلوم ہو گیا تھا کہ مولانا مفتاح العلوم مئو کے فارغ التحصیل ہیں، اور محدث جلیل ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہٗ کے شاگرد ہیں، تاہم مولانا کی عظمت ہم لوگوں کی نگاہ میں بس اسلئے تھی کہ وہ علم کے زبردست شیدائی ہیں۔ کسی مسئلہ کے متعلق ان سے سوال کیجئے، علم و تحقیق کا دریا امنڈ پڑتا تھا، اتنی معلومات فراہم کردیتے جس کی مخاطب کو توقع بھی نہ ہوتی، بیان ایسا ہوتا کہ فصاحت و بلاغت بلائیں لیں۔ سوال کرنے والا صرف مطمئن ہو کر ہی نہیں معلوماتِ فراواں لے کر اٹھتا، ایسا لگتا کہ جیسے فقر و تنگدستی کے ساتھ آیا تھا اور غنا و تونگری لے کر واپس جا رہا ہے۔

میرے والد محترم کو ابتداء میں شاعری کا شوق تھا۔ دینی ذوق رکھنے کی وجہ سے غزل کم اور نعت زیادہ کہتے تھے، اور اصلاح اس وقت کے ایک ماہرِ فن استاذ ابر احسنی گنوری سے لیتے تھے، ابر صاحب داغ دہلوی کے اسکول کے ایک مسلّم استاذ تھے، ایک بار والد گرامی نے ایک نعت لکھی، جس میں حشر و نشر، قیامت اور جنت و جہنم وغیرہ کا تذکرہ تھا، استاذ نے اشعار کی فنی اصلاح پر اکتفا نہ کی، اس کے ساتھ حاشیہ پر قیامت اور حشر و نشر کے اس مفہوم کو جو مسلمانوں کے درمیان معروف ہے، خرافات کہا، والد صاحب کو اس پر بے حد تعجب ہوا، والد صاحب ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، ان کے دل میں استاذ کی بھی بے حد عظمت تھی لیکن اسلامی عقائد کا رسوخ اس سے زیادہ مستحکم ہے۔ انھوں نے قیامت وغیرہ کی کچھ تفصیلات معتبر علماء کی کتابوں سے نقل کر کے بھیجیں، اس کے جواب میں ابر صاحب کا جو خط آیا وہ والد صاحب کیلئے بالکل ناقابل فہم تھا۔ میں اس وقت عربی کی بالکل ابتدائی کتابیں پڑھ

رہا تھا، میں نے بھی وہ خط پڑھا، مگر سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس اسلام کی تشریح ہے، اتفاقاً اسی دوران مولانا شکر اللہ صاحب، ہمارے گاؤں میں تشریف لائے، والد صاحب نے وہ خط و کتابت انھیں دکھائی، دیکھتے ہی فرمایا کہ یہ صاحب بہائی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر اس فرقہ کا مفصل تعارف کرایا، اس کے بانی کا حال بتایا، اس کے عقائد کی تفصیل بتائی، ہمارے اطراف میں یہ نام کبھی سنا نہیں گیا تھا۔ مولانا نے اس تفصیل سے اس موضوع پر گفتگو کی کہ طبیعت کی ساری خلش دور اور دل کی الجھن کافور ہوگئی، بعد میں ابر صاحب کے خطوط اور ان کی بعض تحریرات سے مولانا کے ارشاد کی تصدیق ہوگئی۔

تحصیل علم سے رسمی فراغت کے بعد کچھ دنوں یہ خاکسار گھر پر رہا، مطالعہ کا شوق مجھے بھی بہت ہے۔ اس دوران ہر قسم کی کچی پکی کتابیں پڑھتا رہتا تھا، انھیں دنوں مشہور مصری ادیب طٰہٰ حسین کی دو کتابیں، ''عثمان'' اور ''علی'' مترجمہ مولانا عبد الحمید نعمانی مل گئیں۔ دورِ طالب علمی میں، اس کی بعض ادبی کتابیں پڑھ چکا تھا، اس کے اُسلوب اور اس کی قابلیت اور اس کی ذہانت و ذکاوت کا سکہ دل پر بیٹھا ہوا تھا، اسی کے زیر اثر عادت کے مطابق ان دونوں کتابوں کو بھی پڑھ گیا، لیکن پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ علم اور عقائد کی دنیا میں بھونچال آگیا ہے، صحابۂ کرام کے مقدس گروہ کے بارے میں ہمارے اساتذہ، ہمارے اکابر اور ہمارے گھریلو ماحول نے عظمت و تقدس کا جو ہالہ بنایا تھا، وہ ان دونوں کتابوں کے پڑھنے کے بعد غائب ہوتا نظر آیا، مسلمات کے خلاف دعاوی، اور ان پر دلائل کی سحر کاری! دل آمادہ نہ تھا کہ جو عقائد و نظریات صحابہ کے بارے میں ایمان کی حیثیت سے راسخ ہو چکے ہیں، ان سے دست بردار ہوا جائے، لیکن طٰہٰ حسین کی جادو بیانی اور دعویٰ و دلیل کی سحر طرازی، سارے رنگ کو بدل دینا چاہتی تھی، طبیعت میں ہیجان برپا تھا۔ کبھی افسوس کرتا کہ

کیوں یہ کتابیں پڑھیں؟ کبھی سوچتا کہ شاید یہی حقائق ہوں اور ہم لوگ صحابہ کے بارے میں خوش عقیدگی کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہوں، غرض ایک کچے علم والے کا جسے علمی رسوخ نہ ہو، لیکن اپنے عقائد سے اسے بے پناہ محبت ہو، اس کے ساتھ بلند آہنگ دعووں اور دلائل کی گرفت میں آجانے کی کمزوری بھی ہو، جو حال ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے، پھر کریلا اور نیم چڑھا، اسی دوران ہمارے ملک کا مشہور ادیب، جو دینی مسلّمات وعقائد سے بغاوت میں بدنام تھا، یعنی نیاز فتحپوری، اس کی بعض لغویات پڑھ ڈالیں، دونوں اپنی اپنی زبان کے ماہر ادیب تھے، دونوں جادو بیان تھے، مجھ پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی، میں کسی طرح اسلامی عقائد کو جنھیں اپنے اساتذہ اور اکابر...... جو اپنی ذہانت وذکاوت میں کسی طرح ان دونوں سے کم نہ تھے...... سے حاصل کیا تھا، چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ اور ان دونوں کی جادو بیانی بری طرح ان افکار وعقائد کی بنیادوں کو جھنجھوڑ رہی تھی، میں پریشان ہوکر، مولانا شکر اللہ صاحب کے پاس پہونچا، وہ مدرسہ سے گھر آئے ہوئے تھے، میں نے عثمان، اور علی کے پڑھنے اور اپنی کیفیت کا ابھی تذکرہ شروع ہی کیا تھا کہ مولانا بول پڑے: بس میں پوری بات سمجھ گیا، پھر بہت تفصیل کے ساتھ انھوں نے ان دونوں کتابوں اور ان کے مصنف اور نیاز فتحپوری کے بارے میں باتیں بتائیں، کتاب کی کمزوریاں اور مصنف کی گمراہیاں واضح کیں، مولانا کی گفتگو بڑی تحقیقی ہوتی تھی، کمزور اور بے دلیل بات بیان نہیں کرتے تھے، مولانا کا بیان جوں جوں آگے بڑھتا گیا، دل کا غبار چھٹتا گیا، دیر تک مولانا کی پُر مغز اور دلنشیں تقریر جاری رہی، اور میرے تمام شبہات کا ازالہ ہوگیا اور ایسا محسوس ہوا جیسے چاند گہن میں آ گیا تھا، اب پھر اجالا ہوگیا، مولانا کی عظمت تو پہلے ہی سے دل میں تھی، لیکن اس دن اس کا نقش بہت گہرا ہوگیا۔ گفتگو کے خاتمہ پر مولانا نے مسکراتے ہوئے ایک جملہ ارشاد فرمایا، جو گویا پوری گفتگو کا

خلاصہ تھا، فرمایا:

> ”مولوی صاحب! طٰہٰ حسین جیسے آنکھوں کا اندھا تھا، ویسے ہی دل کا بھی اندھا تھا“

مجھے یاد آتا ہے کہ یہ جملہ انھوں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ کے حوالے سے نقل کیا تھا۔ بعد میں جب میں نے طٰہٰ حسین کی کچھ اور تحریرات پڑھیں، تو اس جملہ کی صداقت روشن ہوتی چلی گئی، مولانا کی اس تقریر کے بعد ہیجان ختم ہوگیا، اور صحابہ کرام کی عظمت وتقدس کا رنگ اور پُختہ ہوگیا۔

مولانا بہت خوش تقریر اور بہترین واعظ تھے، میرے بچپن میں اور فراغت کے بعد چند سالوں تک ہمارے علاقہ کا کوئی جلسہ مولانا شکر اللہ صاحب کی شرکت کے بغیر کامیاب نہیں سمجھا جاتا تھا، میں نے بارہا ان کے مواعظ سنے ہیں، اس میں بھی ان کی گل افشانی گفتار کا وہی عالم ہوتا کہ ”وہ کہیں اور سنا کرے کوئی“۔ مولانا خشک تقریر نہیں کرتے تھے، نہ کچی پکی روایتیں اور واہی تباہی حکایتیں سناتے، تقریر میں لطیف سی ظرافت کا اثر ہوتا، جو آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تو پیدا کر دیتی، مگر قہقہہ لگانے کی اجازت نہ دیتی، کثرت مطالعہ کی وجہ سے معلومات امنڈتی اور پھیلتی چلی جاتیں اور وعظ کا دائرہ بڑھتا جاتا، مگر انداز بیان کی شگفتگی، اور معلومات کے تنوع کی وجہ سے سامعین سراپا گوش ہوتے، مولانا کا وعظ حق گوئی و بیباکی کا نمونہ ہوتا، وہ وعظ میں کسی سے مرعوب نہ ہوتے، حقائق کے بیان میں ذرا نہ جھجھکتے، بعض مرتبہ مخالفتوں کے ہجوم میں بھی انھیں تقریر کی نوبت آئی، مگر وہی سب پر چھائے رہے۔

بعد میں مولانا کو ایسے امراض لاحق ہوگئے کہ جلسوں کی شرکت چھوٹ گئی، اور وعظ وتقریر کو موقوف کرنا پڑا، پھر اخیر عمر تک ان کو اس سے احتیاط ہی برتنی پڑی۔

مولانا اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے، میں نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں، تو مولانا مدرسہ منبع العلوم خیرآباد میں مدرس تھے اور بہت مقبول تھے، پھر کسی وجہ سے وہاں کی مدرسی ترک کرکے مدرسہ اشاعت العلوم پورہ معروف تشریف لے گئے، وہاں بہت دنوں تک پڑھایا، اچھے اچھے تلامذہ تیار کئے، اس وقت میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں زیر تعلیم تھا، وہاں وہ سالانہ امتحان لینے آئے تھے، ان کا امتحان بھی دلچسپیوں سے معمور ہوتا تھا۔ طلبہ خواہشمند ہوتے کہ امتحان ان کے پاس جائے، سوالات آسان کرتے، طلبہ اگر اچھا جواب دیتے تو ان کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کرتے، جواب میں غلطی ہوتی، تو ایسے اشارات کرتے کہ وہ صحیح جواب پالیں۔ پھر بھی نہ پاتے تو خود ہی واضح کرکے سمجھادیتے، نمبر طالب علم کے جواب کے اعتبار ہی سے دیتے، مگر جواب کی غلطی باقی نہ رہنے دیتے، صحیح بات ذہن نشیں کرکے ہی طالب علم کو واپس کرتے، ان کا امتحان صرف امتحان نہ ہوتا، ایک دلچسپ درس بھی ہوتا۔

پھر ان کے اساتذہ اور جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے ذمہ داروں نے انھیں پورہ معروف سے مبارک پور بلالیا، یہاں مولانا نے درس نظامی کی انتہائی کتابیں پڑھائیں، کتب حدیث بھی زیر درس رہیں، اسی زمانہ میں غالباً طحاوی شریف پر کچھ کام بھی کررہے تھے معلوم نہیں کہاں تک وہ کام پہونچا ہے، سالہا سال تک احیاء العلوم مبارکپور میں ان کا فیضان جاری رہا، اور آخر میں جب گھوسی میں دارالعلوم محمدیہ کا قیام عمل میں آیا اور وہاں اچھے استاذ کی ضرورت پیش آئی تو اس کے منتظمین کی درخواست پر گھوسی تشریف لے گئے، اور زندگی کی آخری سانس اسی مدرسہ میں پوری کی

مولانا تدریس اور تفہیم کے ماہر تھے، کیسا ہی کوئی مشکل مسئلہ ہو، مولانا اس کو اس سہل انداز سے سمجھاتے تھے کہ اس کا مشکل ہونا محسوس ہی نہ ہوتا تھا، میں نے مولانا سے باقاعدہ کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے مگر مختلف مواقع پر استفادہ بہت کیا ہے،

مولانا اپنے چھوٹوں پر بے حد شفیق تھے، ان کی دلجوئی کرتے ان کی حوصلہ افزائی کرتے وہ کوئی درخواست کرتے تو اسے حتی الامکان پورا کرتے، انھیں صحیح مشورہ دیتے، مجھے وعظ وتقریر کا اتفاق اکثر پڑتا رہتا ہے، بارہا مولانا کے ساتھ جلسوں میں بھی شرکت ہوئی ہے، میں نے دیکھا ہے کہ جن جلسوں میں ان کے ساتھ میری بھی شرکت ہوئی ان میں وہ تقریر مختصر کرتے اور مجھے تاکید کرتے کہ تفصیلی تقریر تم کرو، ہنس کر فرماتے کہ تم جوان ہو اب تمہارے کام کا وقت ہے، ہم لوگ بڑھاپے کی منزل میں داخل ہوچکے ہیں، مجھے اوراد وظائف کا شوق غالب ہوا تو ایک دن فرمانے لگے کہ مولوی صاحب ابھی کتابوں کا مطالعہ خوب کرلو، علم بڑھالو، بعد میں نہ طاقت رہے گی نہ فرصت۔

کچھ دنوں تک وعظ وتقریر سے میری طبیعت بہت اچاٹ رہی، جلسوں کی شرکت سے بیزار تھا، تقریر کے نام سے بخار آتا تھا، بہت اصرار کے بعد بھی تقریر کیلئے طبیعت آمادہ نہ ہوتی تھی، گھوسی میں ہر سال پابندی سے جلسہ ہوتا ہے، مولانا کی ہمیشہ خواہش رہتی کہ ان جلسوں میں شرکت کروں لیکن ان دنوں میری طبیعت اس طرح اچاٹ تھی کہ میں مولانا کی اس خواہش کی تعمیل نہیں کرپاتا تھا، ایک مرتبہ بہت تاکیدی حکم دیا تو میں حاضر ہوا لیکن تقریر کے لئے طبیعت آمادہ نہ تھی، اس سلسلے میں مولانا سے میں عذر ومعذرت کررہا تھا، مولانا نے سب سن کر اپنے مخصوص لہجے میں بڑی قوت کے ساتھ فرمایا:

> ”مولوی صاحب قوم نے سرمایہ صرف کرکے آپ کو پڑھایا ہے، مدرسہ بنایا، اساتذہ کو تنخواہیں دیں، آپ کیلئے کتابوں کا نظم کیا، کھانے پینے کے انتظام سے آپ کو فراغت بخشی، اب جب کہ آپ پڑھ کر فارغ ہوگئے تو

> قوم کو توقع ہے کہ آپ پر جو سرمایہ لگا ہے اسے دینی نفع کی صورت میں لوٹائیں گے، مانا کہ آپ طلبہ کو پڑھاتے ہیں یہ بھی قوم کی خدمت ہے، مگر یہ بھی سن لیجئے کہ اس سے حق ادا نہ ہوگا، آپ کو قوم کے پاس براہ راست بھی جانا ہوگا اور انھیں دین کی باتیں بتانی ہوں گی''

نہ جانے دل کی کس گہرائی سے یہ بات نکلی تھی کہ اسی وقت سے طبیعت کا رنگ بدل گیا، اس سے پہلے بھی بعض بزرگوں نے وعظ وتقریر کا حکم دیا تھا مگر طبیعت آمادہ نہ ہوئی تھی، مولانا کی اس بات کے بعد خود کو میں نے وعظ وتقریر کے لئے مستعد کرلیا، اب کہیں موقع آتا ہے اور کوئی قوی مانع نہیں ہوتا تو ضرور وعظ کہتا ہوں۔

ایک بار یہی گفتگو میں نے وقت کے مشہور ماہر حدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوری شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور سے نقل کی تو شیخ بہت متاثر ہوئے۔ وہ میری وعظ گوئی اور جلسوں کی شرکت کے بارے میں فرمارہے تھے کہ بھائی کس جھنجھٹ میں پڑ گئے تم تو کتابوں میں لگے رہتے، تو اس پر میں نے مولانا کی گفتگو نقل کی تو تاثر کے ساتھ فرمانے لگے کہ ہاں بھائی انھوں نے سچ کہا، جاؤ تم وعظ کہو ہم سے تو یہ کام ہو پاتا نہیں ہم صرف دعا سے کام چلاتے ہیں۔

مولانا سے جب ملاقات ہوتی تو وہ میرے علمی مشاغل تقریر وتصنیف اور مطالعہ تدریس کے بارے میں ضرور پوچھتے، مناسب نصیحتیں بھی فرماتے۔

اِدھر کئی سال سے رمضان شریف میں چند طلبہ میرے پاس تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آجاتے ہیں، رمضان بھر اپنی درسی کتابوں کی تیاری کر کے شوال میں دارالعلوم دیوبند داخلہ کے لئے چلے جاتے ہیں، رمضان میں میری مصروفیات کچھ بڑھ جاتی ہیں اسلئے بجز ایک دو کتاب کے اور کچھ پڑھانے کا موقع نہیں ملتا، ایک سال جب کہ رمضان میں شدت کی گرمی پڑ رہی تھی، میں نے بعض طلبہ کو مولانا کی خدمت میں بھیجا کہ ایک دو کتاب اگر پڑھا دیں تو بچوں کی سعادت بھی ہوگی اور میرا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا، باجودیکہ مولانا کی صحت اس وقت بہت کمزور تھی مگر میری گزارش اور بچوں کی درخواست بخوشی قبول کرلی اور دو کتابیں پڑھانی منظور کرلیں اور بڑے اہتمام سے انھیں پڑھایا۔

مولانا جس مرتبے کے صاحب علم تھے اسی لحاظ سے زاہد وقانع بھی تھے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی ذہانت وذکاوت اور غزارت علم کے اعتبار سے بڑے سے بڑے علمی مرتبہ ومقام پر فائز ہوسکتے تھے۔ کسی بڑے مدرسہ کے شیخ الحدیث ہوتے اور شہرت کے اعلیٰ مقام پر پہونچتے مگر مولانا کی طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے زہد وقناعت کا ایسا مادہ رکھدیا تھا کہ انھیں نہ کبھی دنیوی مال ومتاع کی حرص ہوئی اور نہ جاہ ومنصب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہمیشہ اساتذہ کے تابع فرمان رہے، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارکپوری علیہ الرحمہ سے خصوصی تعلق تھا انھوں نے مبارکپور بلایا وہاں آگئے، انھوں نے گھوسی میں رہنے کا حکم دیا وہاں پہونچ گئے، اس مرتبہ ومقام پر پہونچ کر اس قدر تابعداری اور فنائیت بے نظیر ہے، مولانا جس حال میں رہے خوش اور مطمئن رہے، تمام عمر غربت میں گزار دی، مال کی فراوانی کبھی نہیں دیکھی مگر تھوڑے مال میں عزت وحرمت کی زندگی گزارنے کا سلیقہ انھیں خوب آتا تھا، انھوں نے مصائب بھی بہت جھیلے، امراض کے بھی، خاندانی احوال کے بھی اور عزت وآبرو کے بھی، مگر وہ اس طرح ان باتوں کو پیتے رہے جیسے کوئی تلخ گھونٹ نہ ہو۔

جس زمانہ میں وہ مبارکپور میں پڑھاتے تھے، بایں ہمہ علم وفضل دیکھا کہ گھر سے پیدل چلے جارہے ہیں، ولید پور سے مبارکپور کا فاصلہ آٹھ، نو رکلومیٹر ہے، اتنی لمبی مسافت پیدل طے کرلیتے تھے، ایک بار مجھے مبارکپور جانا تھا میں بھی ساتھ ہولیا،

میرے ساتھ ہونے کی وجہ سے مولانا نے خلاف معمول کتاب بند کردی، راستے بھر باتیں کرتے رہے اچھی اچھی باتیں معلومات افروز اور حوصلہ افزا، اسی دوران مولانا نے کسی ماسٹر صاحب کا نام لے کر کہا کہ وہ میرے ساتھ پڑھتے تھے ابتدائی تعلیم کی منزل سے نکل کر انھوں نے انگریزی کی راہ لی اور میں عربی مدرسے میں چلا گیا۔ وہ تعلیم کا ایک دور مکمل کر کے انگریزی اسکول میں ٹیچر ہو گئے اور میں عربی مدرسہ میں مدرس ہو گیا۔ فرمانے لگے کہ ابھی چند دنوں پہلے انھوں نے مجھ سے ازراہِ ہمدردی پوچھا کہ مولانا آپ کی تنخواہ کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ مجھے مدرسہ سے ۱۳۵/روپئے ماہانہ ملتے ہیں۔ انھیں بہت افسوس ہوا، وہ کہنے لگے کہ اس سے کیا ہوگا، گھر کا خرچ چلنا بھی مشکل ہے۔ دوسری ضروریات کے لئے کیا ہوگا، اسی لئے تو آپ کچھ نہیں کر پاتے، بڑے نقصان میں آپ ہیں۔ آپ جیسی صلاحیت کا آدمی تو بڑی سے بڑی تنخواہ پا سکتا ہے، پھر وہ کہنے لگے کہ مجھے دیکھئے، میں آپ کا ساتھی ہوں ایک ہزار سے زائد تنخواہ پاتا ہوں۔ کھیتی باڑی بھی ہے، سب بچوں کیلئے ضروریات کا انتظام کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مولانا فرمارہے تھے کہ میں نے ان ماسٹر صاحب سے کہا کہ آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ بلا شبہ آپ کی تنخواہ زیادہ ہے آپ نے اپنے لئے سب کچھ کرلیا ہے، اپنے بچوں اور بچیوں کیلئے بھی سامان مہیا کر دیا ہے، بیوی کے لئے بھی انتظام کر دیا لیکن بھلا بتایئے آپ مسلمان ہیں؟ کہنے لگے کیوں نہیں؟ میں نے کہا مرنے کے بعد خدا کے یہاں حاضر ہونے کا یقین بھی ہے نا؟ فرمایا بے شک، میں نے کہا اگر خدا تعالیٰ نے پوچھا میرے بندے، تم نے اپنے لئے بہت کچھ کرلیا، بچوں کے لئے بہت سامان کیا، بیوی کے لئے انتظام کیا، یہ سب ہوا، بتاؤ میرے لئے کیا کیا؟ تو آپ کا جواب کیا ہوگا۔ اس پر ماسٹر صاحب خاموش ہو گئے، پھر کہنے لگے، واقعی اس سوال کا

جواب میرے پاس نہیں۔ میں نے خدا کے لئے کچھ نہیں کیا ہے، میں نے کہا کہ اب مجھ سے سنئے، میں نماز پڑھتا ہوں، روزہ رکھتا ہوں کیونکہ یہ اسلام اور مولویت کے لوازم میں سے ہے، لیکن ان عبادات کو جیسا کچھ کرتے ہیں ہم جانتے ہیں۔ ان کا تو بھروسہ نہیں، لیکن اس معمولی تنخواہ بلکہ اس سے بھی کم تنخواہ پر میں بہت دن سے علم دین پڑھا رہا ہوں، اور میرے پڑھائے ہوئے بہت سے علماء و صلحا تیار ہو چکے ہیں، ان میں بہت سے اللہ والے ہیں، یہ لوگ بہت وفادار ہوتے ہیں ان میں سے کوئی بھی میرے لئے دعا کر دے گا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں میری نجات ہو جائے گی۔ میرے پاس گو دنیا بہت ساری جمع نہیں ہوئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آخرت میں خسارے میں نہیں رہوں گا۔ اس کے علاوہ اس کام کی برکت سے حق تعالیٰ نے جو سکون قلب اور اطمینان جان بخشا ہے وہ شاید آپ کو حاصل نہ ہو۔ (۱)

اس پر ماسٹر صاحب نے اقرار کیا کہ واقعی خوش نصیب آپ ہی ہیں، دنیا میں بھی آپ پُرسکون ہیں اور آخرت کا تو پوچھنا ہی کیا، ہم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے،

حضرت مولانا یہ باتیں سنا رہے تھے، اور محسوس ہو رہا تھا کہ یہ باتیں صرف زبانی نہیں ہیں دل کی گہرائی سے نکل رہی ہیں۔ اطمینان و سکون ان کے وجود پر نثار ہو رہا ہے۔ ان کی قناعت نے انھیں تونگر بنا رکھا تھا۔ وہ پیدل چلتے تھے، وہ بہت معمولی کپڑا پہنتے تھے، ان کی صورت سے سادگی برستی تھی، لیکن ان کا دل غنی تھا۔ وہ سب سے بے نیاز ہو کر رہے، کبھی کبھی ہم لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ اپنی کھال میں مست رہو، کم از کم مجھ کو اپنی کھال میں مست رہنے کا سلیقہ نہیں آیا۔

مگر مولانا زندگی بھر اپنی کھال میں مست رہے، دوسروں پر احسان کیا، لیکن

---

(۱) اس جگہ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڈھیؒ کا شعر یاد آتا ہے، مولانا شکر اللہ صاحب غالباً حضرت پرتاب گڈھیؒ سے بیعت تھے، شاہ صاحب فرماتے ہیں:

میری صورت دیکھ کر مت کھائیے ہرگز فریب
ہیں بہاریں سیکڑوں پنہاں دل برباد میں

خودکسی کے منت کش نہ ہوئے۔ ان کی ضرریات بہت مختصر تھیں۔

جس دن ان کا وصال ہوا۔ میرے پاس مدرسے میں خبر پہونچی۔ مگر میری طبیعت بہت خراب تھی پیشاب میں تکلیف تھی، باربار پیشاب کا تقاضا ہوتا تھا اور تکلیف کے ساتھ، اس لئے جنازہ میں حاضر نہ ہوسکا لیکن سنا ہے کہ ان کے تلامذہ واحباب کی بڑی تعداد جو اطراف میں پھیلی ہوئی ہے، ہرطرف سے جنازہ میں سمٹ آئی تھی، خیرآباد، بھیرہ، پورہ معروف، گھوسی، مبارکپور اور خود ولید پور کے اتنے علماء جمع ہوگئے تھے کہ ولید پور میں کسی جنازے میں اتنے علماء نہیں دیکھے گئے، اور مولانا کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی کہ اتنے لوگوں کو پڑھایا ہے، کہ اگر ان میں کوئی دعا کردے گا تو میری نجات ہوجائے گی اور یہ کہ یہ لوگ بہت وفادار ہوتے ہیں، جنازے میں اتنے صالحین کا جمع ہونا اور سب کا ان کی خوبیوں کا معترف ہونا، خود مغفرت اور ترقی درجات کے لئے کافی ہے اور یہ تو وہ لوگ تھے، جو قریب کے رہنے والے تھے اور جنازے میں شریک ہوگئے، ان کے علاوہ نہ جانے کتنی بڑی تعداد ان تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کی ہوگی جنھوں نے مولانا کی وفات کی خبر سنی ہوگی اور دعاء مغفرت اور ایصال ثواب کیا ہوگا۔ نیز حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ علم پھیلانے والے کا دفتر اعمال اندراجِ حسنات کے لئے اس وقت تک کھلا رہتا ہے جب تک علم کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ مولانا کا سلسلۂ علم کب تک پھیلتا اور کہاں تک بڑھتا رہے گا۔ لطف تو یہی ہے کہ عمل بند ہوگیا مگر اندراج عمل کا سلسلہ قائم ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی مغفرت فرمائے۔ انکے درجات کو بلند فرمائے۔

مولانا کی طبیعت عرصہ سے خراب چل رہی تھی، کمزوری کا غلبہ تھا، لیکن اس حالت میں بھی قیام مدرسہ ہی میں رہتا تھا۔ پڑھاتے بھی رہتے تھے، خود ان کا وجود اتنا بابرکت تھا کہ اگر نہ پڑھاتے، جب بھی ان کی مدرسہ میں موجودگی ہی باعث خیر وبرکت تھی، مگر مولانا نے تعلیم وتدریس کا کام کبھی بند نہیں کیا، ضعف واضمحلال کے جھونکے چلتے رہے، لیکن مولانا کی ناقابل تسخیر ہمت کو کوئی چیز ہلا نہیں سکتی تھی، بیمار بھی ہوتے رہے، پڑھاتے بھی رہے، مزاج کی شگفتگی اور دل ودماغ کی زندگی وتازگی ہرحال میں برقرار رہی، ملنے والے ایک مشت استخواں سے ملتے، مگر قلب وروح کی توانائی، جسم کی ناتوانی کو چھپائے رکھتی، اس لئے کسی کو اندازہ نہ ہوتا کہ وہ وقت قریب ہے کہ علم وفضل کا یہ خزانہ اب جلد ہی زمین میں چھپ جانے والا ہے۔

ایک وقت وہ تھا کہ والدین نے اپنے ننھے بچے کو علم دین کی درسگاہ میں لاکر سونپا تھا۔ پھر گویا ایک خاموش عہد ہوگیا تھا کہ اب خود اپنے ارادہ سے اس حلقہ سے نہیں نکلنا ہے، یہ عہد انھوں نے پورا کردیا، بالآخر فرشتۂ موت کو انھیں لیجانے کیلئے مدرسہ میں ہی آنا پڑا۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تذکرۂ شیخ ہالیجوی
حضرت مولانا شاہ حماداللہ صاحب ہالیجویؒ (سندھی) کی مفصل سوانح حیات،
224 صفحات پر مشتمل، قیمت، =/56 روپئے
مصنف: ۔ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ
ناشر: ۔ فرید بک ڈپو دہلی

نسخۂ آدمیت

حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتا بگڈھی نور اللہ مرقدہٗ

وفات: ۲؍ربیع الآخر ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۱ء

گرمی کا موسم ہے، دھوپ کی شدت ہے،، کرۂ ارض گویا آگ کی بھٹی بنا ہوا ہے، لُو کے جھونکے دم بدم چل رہے ہے۔ الہ آباد کی سرزمین موسم گرما میں کچھ زیادہ ہی دہک اٹھتی ہے، ایک مدرس چند طلبہ کو لئے، مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خانقاہ کے ایک چھوٹے سے حجرہ میں سبق پڑھا رہا ہے، اچانک اس کی نگاہ دروازہ کی جانب اٹھی تو دیکھا کہ ایک بزرگ ضعیف العمر، منحنی جسم، خمیدہ قامت، عصا بدست چند رفقاء کے ساتھ کھڑے ہیں، مدرس ٹھٹک گیا، درس رک گیا، مدرس اٹھا طلبہ بھی کھڑے ہوئے، سب نے بڑھ کر استقبال کیا، درسگاہ میں تشریف لانے کی درخواست کی، وہ بزرگ کیا تھے؟ جلیل مانکپوری کے اس سہل ممتنع شعر کی ہو بہو تصویر! ؎

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں   وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اندر تشریف لائے، وہ تشریف کیا لائے کہ شفقت وکرم کا پیکر مجسم آیا، رحمت وعنایت کی بادِ بہار آئی، انسانیت وشرافت کا بحر بیکراں ایک چھوٹے سے حجرے میں آسمایا، چہرے پر سرور عشق، آنکھوں میں یقین کا نور اور باتوں میں محبت کا وفور، گویا محبوبیت کی ایک بسی بسائی دنیا درسگاہ میں اتر پڑی، مدرس حیران تھا کہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل

آپ نے پہچانا، یہ بزرگ کون تھے؟ اور بن مانگے موتی ملے کا شاداں وفرحاں مصداق کون تھا؟ آنے والے بزرگ وقت کے مشہور شیخ طریقت، غواص بحر معرفت، سالک جادۂ حقیقت، پیکر انسانیت، سراپا لطف وعنایت، عارف باللہ فنا فی اللہ، فضل اللہ الصمد حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ تھے، اور جس غریب کو بن مانگے یہ موتی مل رہا تھا، وہ یہ خاطی وآثم ان سطور کا راقم، سراپا خطا کار وبے اعتبار!

الہ آباد میں آئے ہوئے ابھی مجھے تھوڑی ہی مدت گذری تھی، حضرت کی زیارت سرسری طور پر ہو چکی تھی۔ غالباً تعارف بھی ہو چکا تھا، مولانا کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاق عالیہ، نیز ان کی بزرگی وروحانیت کا شہرہ پہلے سے کانوں میں پڑا ہوا تھا، ان کی عظمت وبلندی کا نقش دل پر جما ہوا تھا، معلوم تھا کہ وقت کے تمام اکابر ان کی قوت نسبت اور عظمت ولایت کے قائل ومداح ہیں، بلکہ اکثر حضرات ان کی بارگاہ میں نیازمندانہ حاضر ہوتے ہیں، اتنے عظیم انسان کو جو آج اچانک اپنے سے اتنا قریب دیکھ رہا ہوں تو یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ خواب کا افسانہ ہے یا بیداری کی حقیقت!

حضرت مولانا نہ صرف یہ کہ تشریف لائے بلکہ دیر تک بیٹھے لطف ومحبت کی باتیں کرتے رہے، بیش قیمت نصائح سے نوازتے رہے، دعائیں دیتے رہے، جتنی دیر تک مولانا تشریف فرما رہے ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا بدل گئی ہو، اب نہ وہ زمین ہے اور نہ آسمان، نہ گرمی کی شدت ہے نہ دھوپ کی تپش، بس ایمان کی چاندنی چھٹکی ہوئی اور یقین کی خنکی پھیلی ہوئی، نگاہ ہے تو لطف وکرم کی، اور بات ہے، تو عشق وسرمستی کی، مولانا ہمہ تن رحمت وشفقت ہیں۔

آج جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو سوچ رہا ہوں کہ مولانا کس سن میں پیدا ہوئے ہوں گے، اب سے پہلے کبھی اس کو سوچا بھی نہ تھا۔ حضرت کی حیات میں کبھی اس کا خیال ہی نہیں ہوا، حضرت کی مجلس مبارک میں اتنی مرتبہ حاضری ہوئی ہے کہ اب اندازاً بھی اس کی گنتی نہیں بتا سکتا مگر وہاں پہونچ کر ایک بات کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں تھی، ایک ذکر کے علاوہ کوئی دوسرا مذکور نہ تھا۔ ان کی مجلس میں بیٹھ کر ایک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کسی اور کو یاد رکھنے کا یارا نہ تھا، ان کی قوت نسبت اتنی زبردست تھی کہ غافل سے غافل انسان ان کے پاس پہونچ کر ایسا ذاکر ہوجاتا کہ غفلت کا احساس تک جاتا رہتا۔

خود حضرت سے تو نہیں سنا، مگر دوسرے واقف کاروں سے سنا اور بعض تحریروں میں پڑھا کہ حضرت کا ابتدائی تعلق لکھنؤ کے مشہور صاحب فیض بزرگ حضرت شاہ وارث حسن صاحبؒ سے تھا جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مجاز تھے، ان کے بعد رائے بریلی کے ایک گمنام درویش عالم حضرت مولانا شاہ بدر علی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو مشہور بزرگ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ کے مرید وخلیفہ تھے، حضرت اپنی مجالس میں اپنے احوال کے متعلق اور اپنے مجاہدات کے بارے میں کبھی کچھ نہیں فرماتے تھے، ماضی کی کوئی اپنی داستان گویا انھیں یاد نہ تھی، انھیں اگر کچھ یاد تھا، تو بس اللہ یاد تھا، اللہ کا رسول ﷺ یاد تھا، سنت یاد تھی، شریعت یاد تھی، انھیں بس ایک دُھن تھی۔ وہی دُھن جس کے لئے انھوں نے مشائخ کا ہاتھ پکڑا تھا۔ جس کی یاد کے لئے انھوں نے ساری دنیا بھلا دی تھی، جس محبت کے لئے انھوں نے تمام محبتیں فراموش کی تھیں، بس وہی دُھن وہی یاد اور وہی محبت ان کے رگ وریشہ میں اور بال بال میں سمائی ہوئی تھی، مولانا شعر بھی کہتے تھے، شعر کہتے نہ تھے، جس خیال کی قسمت اچھی ہوتی تھی وہ مولانا کہ زبان

فیض ترجمان سے شعر بن کر ادا ہوجاتا، مولانا کا مجموعہ کلام شائع ہوچکا ہے، نام اس کا ’’عرفان محبت‘‘ ہے، واقعی معرفت ومحبت کا زینہ بلکہ خزینہ ہے، مولانا خود فرماتے ہیں۔ ؎

فرماتے ہیں یہ اہل محبت ہو مبارک　　احمد تیرا دیوان ہے عرفان محبت

سنا ہے مولانا نے ابتدائے سلوک میں بڑی ریاضتیں کی ہیں، لیکن اب کی تفصیلات کسے معلوم؟ ممکن ہے مولانا نے اپنی خاص مجالس میں کبھی کچھ بیان کیا ہو، لیکن ان کی طبیعت اور ذوق کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے پلٹ کر کبھی ماضی پر نظر ڈالی ہی نہیں، مولانا رومؒ کا مصرعہ ہے ؎

ماضی ومستقبلت پردہ خدا

یعنی ماضی ومستقبل کی مشغولیت خدا سے حجاب ہے، صوفیاء کا مشہور مقولہ ہے کہ **الماضی لایذکر، والمستقبل لا ینتظر، والحال هو المعتبر**، ماضی قابل ذکر نہیں، مستقبل شایان انتظار نہیں، فقط حال ہی لائق اعتبار ہے، مولانا کا ارشاد ہے، ؎

اتنا تو ہوش ہے مرے سامنے ہیں وہ　　اس کے سوا مجھے کسی شئ کی خبر نہیں

مولانا کی جتنی زندگی میں نے دیکھی ہے، سراپا اسی کا نمونہ تھی، نہ کبھی ماضی کا تذکرہ سنا، نہ ہی مستقبل کے اندیشوں میں فکر مند پایا، بلکہ سرے سے خود اپنی ذات کو ساقط کر رکھا تھا، جو تذکرہ تھا معبود حقیقی کا تھا، جو کلام تھا عشق وسرمستی کا تھا، جو گفتگو تھی شریعت وسنت کی تھی، جو حکایت تھی مہر وفا کی تھی۔ ؎

ماقصۂ سکندر ودارا نخواندہ ایم　　از ما بجز حکایت مہر وفا مپرس

وہاں تو یہ رنگ تھا کہ ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم　　الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

یہ حدیثِ یار کیا ہے قرآن ہے، حدیث ہے، خاصان خدا کے تذکرے ہیں، بس انھیں کے انوار سے مولانا کی مجلسیں جگمگاتی رہتی تھیں، گفتگو میں قرآن و حدیث کا حوالہ بکثرت آتا تھا اور اس طرح آتا کہ سننے والے سرشار ہوجاتے۔

کبھی کبھی اپنے اشعار جو عشق الٰہی اور محبت نبوی میں ڈوبے ہوئے ہوتے، سناتے، ان کی آمد کی شان بتاتے، ان کی تشریح کرتے، اس وقت علم و حکمت اور ذوق وشوق کا ایک باب کھل جاتا، کبھی ذوق میں آکر ترنم سے سناتے پھر مجلس پر بے خودی کا عالم طاری ہوجاتا، ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے بقدر فیضیاب ہوتا، قلوب دُھل جاتے، روح کا تزکیہ ہوتا، ایمان میں تازگی آجاتی۔

مولانا کو جب میں نے دیکھا اور یہ تقریباً ۱۵؍سال پہلے کی بات ہے، بیمار پایا، نحیف ونزار مختلف امراض کا شکار، ضعف واضمحلال بے حد مگر یہ بھی دیکھا اور تقریباً ہر ملاقات میں دیکھا کہ تکلیف کی شدت سے بے قرار ہیں، خود سے اٹھنے کی طاقت نہیں ہے، بستر پر لیٹے ہوئے ہیں، اتنے میں کوئی صاحب ذوق صاحب انس آگیا، اور مولانا تازہ دم ہوکر اٹھ بیٹھے، پھر حدیث یار کا کوئی سلسلہ چل پڑا اور کسی کو یاد نہ رہا کہ مولانا ابھی شدت کرب کی وجہ سے بیتاب تھے، ساغر محبت کا دور چلنے لگتا، اور مولانا جوانوں جیسی ہمت وچستی کے ساتھ مصروفِ فیضان ہوجاتے، ؎

ہر چند پیر خستۂ وبس ناتواں شدم ہر گہہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

جوشش عشق کسی ضعف وناتوانی کو باقی نہیں رہنے دیتی، پھر مجلس موقوف ہوتی تو دیکھنے والے دیکھتے کہ وہی شدت بیتابی اور غایت بیقراری لوٹ آئی۔

میں قاصر النظر نہیں جانتا کہ مولانا کی خصوصیات کیا کیا ہیں۔ اسے تو مولانا کے مخصوص، ہمہ وقت کے حاضر باش خدام اور خلفاء بہتر بتا سکتے ہیں، مجھے تو مولانا کی ہر بات خاص ہی نظر آتی تھی، میں وہ الفاظ نہیں پا رہا ہوں جو مولانا کے اوصاف

جمیلہ کی کماحقہٗ ترجمانی کرسکیں، کبھی میں نے ایک کتاب پڑھی تھی، ''ذکر احسن'' یہ کتاب حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے ایک مرید اور مجاز صحبت بابا نجم احسن پرتاب گڈھیؒ کے تذکرہ میں ہے۔ بابا صاحب بڑے ذہین تعلیم یافتہ اور مردم شناس بزرگ تھے اور محتاط ایسے کہ کسی کی تعریف میں مبالغہ کے قطعاً روادار نہ تھے، اس کتاب میں ان کا قول میں نے پڑھا، لفظ بہ لفظ تو یاد نہیں ہے مگر مفہوم ہو بہو یاد ہے، فرمایا کہ:

> میں نے مولانا محمد احمد صاحب کو ۲۰؍سال تک دیکھا ہے، سفر میں، حضر میں، جلوت میں، خلوت میں، تکلیف میں آرام میں، میں نے ہر اعتبار سے انھیں کامل پایا۔ ان میں کہیں جھول نہیں ہے۔

یہ ایک معتبر شہادت ہے، شہادت دینے والا صاحب نظر بھی ہے اور ہمعصر بھی، ایسی شہادت کا جو وزن ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔

اس اجمال کی تفصیل کی جائے تو بہت کچھ کہا اور لکھا جاسکتا ہے تاہم ایک بات جس کا احساس ہر اس شخص کو ہوجاتا ہے جو حضرت مولانا کی ملاقات کا تھوڑی دیر بھی شرف پاتا، وہ آپ کی بے کراں شفقت ومحبت تھی، ہر آنے والا خواہ وہ دنیا والوں کی نگا میں کتنی ہی معمولی حیثیت کا ہوتا، حضرت کی شفقت وعنایت کا اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ حصہ پاتا، آپ کی رحمت ومہربانی بارش کی طرح برستی اور دلوں کی سوکھی کھیتی کو سیراب وشاداب کرجاتی، جن کے ساتھ حضرت کا خصوصی تعلق تھا ان کا تو کیا کہنا، ہم جیسے عام لوگ جو کبھی کبھی کے حاضر باش تھے اور مولانا کے مرید تھے نہ شاگرد نہ عزیز، حاضر ہوجاتے تو اس مسرت اور خوشی کا اظہار فرماتے اور اتنی دعائیں دیتے کہ طبیعت سرشار اور دل نہال ہوجاتا، باوجود ضعف اور ناتوانی کے دو آدمیوں کے سہارے کھڑے ہوکر استقبال کرتے، مصافحہ کے ساتھ معانقہ سے

ضرور نوازتے، اپنے دست مبارک سے مٹھائی نکالتے، پاپے نکالتے اور التفات خاص سے عنایت فرماتے، رخصت کی اجازت مانگی جاتی تو ایک خاص کیفیت کے ساتھ یہ شعر پڑھتے، شعر مولانا ہی کا ہے، ؎

ترا آنا مرے احساس میں جانِ مسرت ہے
مگر جانا ستم ہے، غم ہے، حسرت ہے، قیامت ہے،

پھر باہر تک پہونچانے آتے کبھی کبھی اپنے سامنے رکشہ منگواتے اصرار کرکے اس پر بٹھاتے اور جب تک رکشہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہوجاتا کھڑے رہتے، بارہا ایسا بھی دیکھا کہ رخصت ہونے والے کو کمال آہستگی کے ساتھ کچھ ہدیہ عنایت فرماتے، وہ شرمندہ ہوتا، معذرت کرتا مگر مولانا اس سے زیادہ نیاز مندانہ تواضع اختیار کرتے، قبول کئے جانے پر احسان مندی ظاہر فرماتے حتیٰ کہ وہ بجز قبول کرنے کے اور کوئی چارۂ کار نہیں پاتا۔ اپنے اہل تعلق کے متعلقین میں سے کوئی آجاتا تو اس کی اتنی خاطر داری فرماتے جیسے ان کا کوئی بڑا محسن آگیا ہو، بار بار خیریت دریافت فرماتے، دعائیں دیتے خوشی کا اظہار فرماتے، غرض جو گیا مولانا کے لطف وکرم کا کلمہ پڑھتا ہوا آیا اور اس کی لذت وحلاوت، کو کبھی نہیں بھولا، ہر شخص یہی گمان کرتا کہ سب سے زیادہ تعلق ومحبت حضرت کو مجھ ہی سے ہے، کوئی اپنا دکھ درد بیان کرتا تو مولانا اس کے درد کو اپنے دل میں محسوس کرتے اور اس طرح محسوس کرتے کہ وہ اپنا درد بھول جاتا، اس محبت وکرم کا اثر تھا کہ مولانا کی مجلس سراپا رحمت وسکینت تھی، غمزدہ اور چوٹ کھائے ہوئے دل آپ کی مجلس میں باریاب ہوتے اور یکایک ایسا سکون واطمینان پاتے کہ دکھ درد کا نام تک باقی نہیں رہتا، درد خواہ جسمانی ہو یا روحانی ہر ایک کا علاج اس نورانی مجلس میں ہو جایا کرتا۔

ایک بار ہم تین آدمی حضرت کی خدمت میں حاضری کی نیت سے چلے۔ الہ آباد پہونچ کر حضرت کی قیام گاہ کی طرف جاتے ہوئے ہمارے ایک ساتھی کے سینے میں درد شروع ہوا، سخت بے چینی اور گھبراہٹ پیدا ہوئی، تھوڑی دور چل کر انھوں نے کہا کہ بجائے مولانا کے یہاں جانے کے مجھے اسپتال لے چلئے، ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ اس وقت شاید حضرت کی خدمت میں حاضری نہ ہو سکے گی، راستہ میں ڈاکٹروں کی تلاش ہونے لگی، مگر وقت ایسا تھا کہ زیادہ تر مطب بند تھے، ہم نے کوشش کی کہ کسی طرح حضرت کی خدمت میں پہونچ جائیں، وہاں مشہور معالج ڈاکٹر ابرار احمد صاحب ملیں گے ان سے دوا لے لی جائے گی، خیر بہزار دقت وہاں پہونچے، مولانا مجلس میں تشریف فرما تھے، دو تین آدمی اور وہاں موجود تھے، بندہ نے سلام ومصافحہ کرتے ہی ان کا حال عرض کیا، اس وقت مریض کا چہرہ پُرسکون ہو چکا تھا، حضرت نے بیتاب ہو کر پوچھا کیا اب بھی درد ہے اور دو تین مرتبہ پوچھا پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر دم کیا، آنکھیں بند کر کے خاموشی سے دعا کی اور معاً ڈاکٹر صاحب کو بلوایا لیکن اب مریض کو ڈاکٹر اور دوا کی ضرورت نہ تھی، بعد میں انھوں نے بتایا کہ جیسے ہی میں نے داہنا قدم حجرۂ مبارکہ میں داخل کیا ابھی زمین پر رکھا بھی نہ تھا کہ یکایک درد بالکل کافور ہو گیا، ذرا بھی تکلیف باقی نہ رہی، مولانا ہی کا شعر ہے۔ ؎

جو ہیں اہل محبت بس وہی اس کو سمجھتے ہیں،
کسی کا دیکھ لینا درد کا کافور ہو جانا

مولانا رحمتِ مجسم تھے، پیکر کرم تھے، ہر کس وناکس پہ یہ ابر رحمت برستا تھا، ہر دکھیارا ان کے پاس پہونچ کر خود کو امان میں پاتا تھا، مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

رحمت کا ابر بن کے جہاں بھر میں چھایئے
عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھایئے

رحمت کی یہ شان انھیں حضور رسالت مآب حضرت **رحمة للعٰلمین علیه الصلوٰة والسلام** سے بطور وراثت کے ملی تھی، فرماتے ہیں، ؎

خُلق نبی کا اب تو نمونہ دکھایئے
اغیار کو بھی اپنے گلے سے لگایئے

ایک طرف تعلق ومحبت اور شفقت وکرم کا یہ عالم تھا، کہ ہر چہار طرف یہ ابر رحمت برس رہا تھا، اور دوسری طرف ان کے قلب کا ایسا حال تھا کہ سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی سب سے جدا تھا، باہمہ ایسا کہ سب اسے اپنا سمجھیں اور بے ہمہ ایسا کہ کوئی اس کے قریب تک نہ پہونچا، اس کی مثال چاند کی سی تھی، کہ سب اس سے مستفید ہوتے ہیں سب اس کے نور کو اپنے گھر میں، اپنے آنگن میں، بلکہ اپنی آغوش میں پاتے ہیں، مگر سب سے دور اتنا دور کہ کسی کی رسائی اس کے حریمِ بلند تک نہیں ہوتی، میں نے محسوس کیا کہ مولانا کا پاکیزہ قلب لوثِ دنیا کے شائبہ تک سے پاک تھا، دنیا کے ذکر ومذکور کا تو خیر مولانا کی مجلس میں گذر تھا ہی نہیں، روزمرہ کی ضروریات زندگی میں دور تک دنیا کی کوئی پرچھائیں نہ تھی، مولانا صاحبِ جائداد تھے، صاحب اولاد تھے، مگر نہ کبھی جائداد سے کوئی واسطہ رکھا اور نہ اولاد کے بارے میں مستقبل کے اندیشوں کی پرورش کی، اگر مولانا چاہتے تو الہ آباد میں ان کی ذاتی ملکیت کا شاندار سے شاندار مکان تعمیر ہوسکتا تھا، مگر زہد وقناعت اور متاع دنیا سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جب میں نے انھیں دیکھا تو الہ آباد کے محلّہ سوئیں منڈی میں صابری منزل ان کی قیام گاہ تھی، پھر صاحب مکان نے ضرورت ظاہر کی تو مولانا نے اسے فوراً خالی کردیا اور بخشی بازار کے مدرسہ بیت المعارف کے ایک حجرے میں اٹھ آئے، کچھ دنوں یہاں قیام رہا پھر مولانا کی علالت طبع اور تیمارداری کے پیش نظر الہ آباد کے مشہور معالج حضرت مولانا کے مخلص خادم ڈاکٹر ابرار احمد صاحب اپنے مکان پر لے آئے اور ایک حجرہ مولانا کے قیام کے لئے مختص کردیا، ڈاکٹر صاحب کا یہ مکان اپنا ذاتی نہ تھا، اسی کے تنگ حجرے میں مولانا کا قیام کئی سال رہا، دنیا جہان کے تمام چھوٹے بڑے لوگ اسی میں آتے اور سمٹ سمٹا کر بیٹھتے، پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنا ذاتی مکان بنوایا تو اس میں دو کمرے مولانا کے لئے خاص کردیئے اور کسی قدر

وسعت حاصل ہوئی۔

مولانا پوری زندگی اتنے ہی پر قانع رہے، انھیں شاید اس قسم کا کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ اپنی کوئی خانقاہ بنانی چاہئے، یا کوئی مدرسہ قائم کرنا چاہئے، میں نے دیکھا کہ انھیں چھوٹے چھوٹے حجروں میں دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں حاضر ہوتیں اور مولانا کی توجہ وعنایت سے شادکام ہوکر واپس جاتیں، مولانا سب کی دلجوئی کرتے، مولانا کے قلب میں جو وسعت تھی، اس کے سامنے شاید کسی کو احساس نہ ہوتا کہ یہ حجرہ تنگ ہے، آج جب مولانا کے سلسلے میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں، تو مجھے احساس ہورہا ہے کہ حضرت جن حجروں میں مقیم رہا کئے ہیں، وہ چھوٹے اور مختصر تھے، اب سے پہلے کبھی ان کی تنگ دامانی کا احساس نہیں ہوا، سچ تو یہ ہے کہ آج مولانا نہیں ہیں تو دنیا ہی تنگ معلوم ہورہی ہے، مولانا کی حیات میں بڑی سے بڑی بات ہوتی تو اطمینان رہتا کہ مولانا کے پاس جائیں گے اور یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔

مولانا جس دنیا کے آدمی تھے اس میں متاع دنیا کی کوئی قدر وقیمت نہ تھی، ان کے یہاں جس چیز کی قیمت تھی وہ محبت ہے، انس ہے، عشق الٰہی ہے، اتباع سنت ہے، پاس شریعت ہے، قرآن ہے، ذکر اللہ ہے، مولانا اس شعر کی دلکش تصویر تھے۔

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام ہے اپنے کام سے
ترے ذکر سے تری فکر سے تری یاد سے ترے نام سے

مولانا کی دنیا الگ تھی، دنیا کی جن چیزوں سے لوگ خوش ہوا کرتے ہیں، مولانا کے لئے ان میں خوشی کا سامان نہ تھا، اور جن چیزوں کو لوگوں نے بے وقعت سمجھ رکھا ہے مولانا ان کے قدرداں تھے، دنیا اور دنیا کی ساری متاع یہاں نظر اعتبار سے ساقط تھی، اگر اعتبار تھا تو بس اُس کا جو محبوب کی نظر میں پسندیدہ ہو۔

آخر میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حضرت پر استغراقی کیفیت ہو، نگاہیں بظاہر چاروں طرف کا جائزہ لیتی رہتی تھیں، مگر دل کسی اور طرف ہوتا تھا، آخری دور کی مجالس میں بارہا دیکھا کہ حضرت خاموش بیٹھے ہوئے ہیں کسی نے حضرت کو متوجہ کیا تو ایسے چونکے جیسے یہاں تھے ہی نہیں، اور نہ کوئی بات انھوں نے سنی چونکنے کے انداز سے خوف ہوتا کہ شاید یہ تخاطب حضرت پر گراں گذرا، مگر معاً حضرت اپنے فطری حلم اور شفقت ومحبت سے اس اندیشہ کو دور کر دیتے، میری ہمت کبھی حضرت کو ابتداءً متوجہ کرنے کی نہیں ہوئی، کہ نہ جانے کس عالم میں مستغرق ہوں، خود ہی توجہ فرماتے تو کچھ عرض کر لیتا، حقیقت یہ ہے کہ بزرگوں کے احوال وکیفیات کا دریافت کرنا کچھ آسان نہیں ہے جو اس کوچے سے گذرا ہو جو ان کیفیات کا ذوق آشنا ہو وہ تو کچھ سمجھ سکتا ہے، ورنہ وہ صرف ظاہر سے ہمارے درمیان رہتے ہیں، ہماری طرح باتیں کرتے ہیں اور ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں، مگر ان کی کیفیات کا عالم کچھ اور ہوتا ہے، مولانا کبھی کبھی اپنا ایک شعر بہت کیف کے ساتھ سناتے تھے، میں نے کئی بار حضرت کی زبانِ مبارک سے سنا ہے۔

اب سوا ان کے سب کو بھول گیا   ہو مبارک یہ نعمتِ نسیاں

اس شعر کو سناتے وقت حضرت سراپا ممنونیت ہوتے کہ دیکھئے نسیان بھی ایک نعمت ہے، لوگوں کے نزدیک تو یہ ایک مصیبت ہے، مگر اہل اللہ اسے نعمت سمجھتے ہیں، جن کا یہ حال ہو کون جانے وہ کس دنیا میں رہتے ہیں، ہم نے سمجھا کہ ہم ان کے ساتھ ہیں، مگر بنظر تحقیق دیکھا تو چاند کی چاندنی تو ہم آغوش تھی مگر چاند بہت دور تھا۔

احمدؔ تجھے نہ جانا نہ سمجھا تمام عمر   گو ساتھ جا رہے ہیں ترے آ رہے ہیں ہم

مولانا جس طرح یاد محبوب میں گم تھے اور جس طرح انھوں نے یاد الٰہی میں اپنی ہستی تک کو فراموش کیا تھا اس کو خود مولانا سے سنئے۔

اب سوا ان کے کسی کا ہوش باقی ہی نہیں   رفتہ رفتہ کھو گیا احمدؔ کسی کی یاد میں

مرض الوفات کے بالکل آغاز میں جب کہ باوجود شدید تکلیف کے آنے والوں کی خاطر سے دیر تک بیٹھے رہا کرتے تھے، ہم چند ساتھیوں کی حاضری خدمت اقدس میں ہوئی، اس وقت حضرت تکلم بہت کم فرماتے تھے، ایک استغراقی کیفیت طاری رہا کرتی تھی، خدمت میں حاضری ہوئی، خاموش گم سم بیٹھے ہیں، کسی کسی وقت آہستہ سے فرما دیتے کہ آپ کے آنے سے بہت خوشی ہوئی، دوستوں کی خواہش تھی کہ حضرت اپنی زبان مبارک سے کچھ نصیحت فرما دیں، مجھ سے اشاروں میں فرمائشیں ہو رہی تھی، مگر میں اپنے اندر تابِ سخن نہیں پاتا تھا، جب تقاضا زیادہ ہوا اور حضرت ایک بار ملتفت ہوئے تو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت! یوں تو آپ کی مبارک ذات ہمارے لئے سراپا نصیحت ہے مگر جی چاہتا ہے کہ زبان مبارک سے کچھ ارشاد ہو جائے، حضرت نے یہ بات سنی اور بغور میری طرف دیکھا مگر کچھ بولے نہیں، بہت دیر تک سکوت قائم رہا، مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ شاید حضرت کو اس وقت میری یہ بات ناگوار ہوئی ہو، دیر کے بعد حضرت نے ٹھہر ٹھہر کر دھیرے دھیرے لہجے میں فرمایا کہ ''اللہ کا ذکر کثرت سے کیجئے'' بس اتنا ہی فرمایا اور خاموش ہو گئے، یہ آخری بات تھی جو بندے نے حضرت کی زبان مبارک سے سنی۔

اس کے بعد زمانۂ علالت میں حاضری ہوئی دیکھ کر کلیجہ منھ کو آنے لگا، عاشق اب سراپا داستان ہوتے ہوئے بے داستان ہو چکا تھا بلکہ اب وہ خود داستان بن جانے کے مرحلے میں تھا، استغراق اور بے خبری کا عالم تھا، معلوم ہوا کہ کسی کسی وقت اِدھر کا ہوش ہو جاتا ہے ورنہ اب دنیا سے انقطاع ہے، مولانا کے خواص میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ دو ایک روز پہلے اسی بے خبری کے عالم میں مولانا فرما رہے تھے کہ دنیا کو خوب دیکھ لیا، یہی دنیا ہے، تھو، تھو، تھو، تھو، کئی بار یہ کلمات ارشاد فرمائے،

ہم لوگوں نے صرف زیارت پر اکتفا کی، اور چشم گریاں وسینۂ بریاں کے ساتھ واپس آگئے، پھر ایک ہی ہفتہ کے بعد وہ ساعت موعود آگئی جس کیلئے ساری زندگی تڑپے اور بے قرار رہے تھے اور جس کے لئے عمر بھر تیاری کی تھی۔

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر عمر بھر کی بیقراری کو قرار آہی گیا

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز کو فراموش کر دینا جس کو مولانا نے نعمت نسیاں سے تعبیر کیا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟ جو لوگ حضرات مشائخ کی تعبیرات نہیں سمجھتے، ان کو اس سے غلط فہمی ہوسکتی ہے، اس لئے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

ماسوی اللہ کے نسیان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کے علاوہ کوئی چیز یاد ہی نہ آئے، ایسا تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب آدمی بے ہوش ہو، ورنہ ہوش وحواس رکھتے ہوئے آدمی سب کچھ بھول جائے ممکن نہیں، پس یہ بات بے شبہ ہے، کہ اہل اللہ کو بھی دنیا کی بہت سی چیزیں یاد رہتی ہیں، اور عوام الناس کو بھی یاد رہتی ہیں، مگر دونوں یادوں میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا زمین وآسمان میں۔

دنیاداروں کو دنیا کی چیزیں اس لئے یاد رہتی ہیں، کہ وہی مقصود ہوتی ہیں، اور اہل اللہ کو دنیا کی چیزیں صرف اللہ کی وجہ سے اور اللہ کے واسطے یاد رہتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا کی چیزوں سے بس اسی حد تک سروکار رکھتے ہیں جس سے خدا کی رضا حاصل ہو، ہر وہ چیز جس کا تعلق خدا کی رضا سے نہ ہو اس کو یہ حضرات دل سے نکال دیتے ہیں، یعنی کسی چیز کو یاد رکھتے ہیں تو اللہ کے لئے اور اللہ کا حکم پا کر! اپنے نفس کی خواہش یا دنیاداری کے رجحان کو یہ حضرات فنا کر دیتے ہیں، اسی بات کو بعض حضرات نے اس طرح کہا ہے کہ میں نے جب کوئی چیز دیکھی، تو اس سے پہلے اللہ کو دیکھا، مطلب یہ ہے کہ خدا کی رضا کو دیکھا، یہ دیکھنا اور برتنا بواسطۂ رضاءِ الٰہی ہے، اس میں نفس کی آمیزش نہیں ہے اور جس بات کے بولنے اور جس بات کے برتنے اور دیکھنے میں اللہ کی رضاء اور عدم رضاء کا دھیان نہ ہو اور اس کی مرضی اور نامرضی کی پرواہ نہ ہو وہی ماسوی اللہ ہے، پھر یہ بھی تجربہ ہے کہ آدمی جس قدر ذکر اللہ میں انہماک اور سرگرمی کے ساتھ مشغول رہتا ہے اللہ تعالیٰ اسی کے بقدر اس کی ضروریات وحوائج کا تکفل غیب سے فرماتے ہیں، اس صورت میں ذاکر کی ضروریات مختصر سے مختصر ہوتی جاتی ہیں، اسے اب کسی چیز کی فکر میں کھپنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کی ضروریات کا انتظام اس کے انہماک کے بغیر ہوتا رہتا ہے، پھر وہ ہمہ تن ذکر وفکر میں محو رہتا ہے، یہاں تک کہ اسے نسیانِ حقیقی کی دولت بھی حاصل ہوجاتی ہے، مولانا فرماتے ہیں۔

اسے نسیان کامل غیر سے واللہ ہوتا ہے عجب کچھ شان دیکھی میں نے بیمار محبت میں

مولانا کس درجہ عظیم انسان تھے، اس کی ایک ناتمام سی جھلک اس مضمون میں آپ دیکھ رہے ہیں، مولانا کے دیکھنے والوں نے مولانا کی عظمت کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا ہے، لیکن اس بے حد وحساب عظمت ومقبولیت کے باوجود کسی نے یہ نہ دیکھا ہوگا کہ مولانا بھی اپنی عظمت کو محسوس کر رہے ہیں، یہ بڑے اعلیٰ ظرف کی بات ہے کہ آدمی عظیم ہوتے ہوئے خود اپنے اندر احساسِ عظمت نہ رکھے، ان کے کسی حال سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان میں اپنی اس عظمت کا احساس ہے، انتہائی متواضع حد درجہ خلیق وملنسار ہر ایک سے بے تکلف اور خود کو سب سے چھوٹا بنائے ہوئے، دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے لوگوں کو مولانا نہایت اکرام واہتمام کے ساتھ باوجود ضعف واضمحلال کے باہر تک رخصت کرنے آئے، دوسروں پر اپنے کسی کرم واحسان کا ذکر نہ تھا۔ البتہ دوسروں کی ممنونیت کا اظہار بال بال سے ہوتا۔ ملک کے ایک لیڈر جو عالم بھی ہیں اور اس وقت مسلمانوں کی خدمت میں ممتاز تھے،

ایک بار مولانا کی خدمت میں آئے اور نیاز مندانہ آئے، اس وقت ان کی خدمات کا چرچا تھا، چونکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی بہی خواہی میں کوشاں تھے، اس لئے مولانا ان کے سامنے بچھے جارہے تھے، بے حد اکرام، بہت محبت، اور بہت دعائیں پیش کررہے تھے، پھر جب وہ رخصت ہونے لگے تب تو مولانا نے غضب ہی کردیا، تمام مریدین ومتوسلین کے سامنے لپک کران کی جوتیاں سیدھی کردیں، پورا مجمع سکتہ میں آگیا، وہ لیڈر بھی سخت پریشان اور پشیمان ہوئے، لیکن مولانا اس طرح مطمئن تھے، جیسے اپنا ضروری فرض انجام دیا ہو۔

مولانا کی خدمت میں ملک کے مشہور علماء مشائخ بھی تشریف لاتے تھے، اس وقت زیادہ تر حضرت خاموش رہتے، اور چاہتے تھے کہ جو عالم یا شیخ تشریف لائے ہیں، وہ اپنے افادات سے نوازیں، عالم اسلام کے نامور عالم محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نوراللہ مرقدہٗ ایک مرتبہ حضرت کی مجلس میں تشریف فرماتھے، اور نہایت مؤدبانہ بیٹھے تھے، اور مولانا کا بھی یہ عالم تھا کہ غایت ادب سے سمٹے ہوئے دوزانو تشریف رکھتے تھے، جب تک رہے دونوں خاموش رہے، پوری مجلس میں سنّاٹا چھایا رہا، حضرت کو کسی سے کچھ کہنا ہوا، تو چپکے سے اس کو اشارہ کرکے باہر تشریف لے گئے اور باہر جو کچھ کہنا تھا کہا، ہر ایک دوسرے کا ایسا احترام کررہا تھا کہ چھوٹوں کے لئے درس عبرت تھا۔

اللہ کے فضل سے مولانا بڑے مستجاب الدعوات تھے، جس امر مہم کے لئے حضرت سے دعا کرائی گئی کم ایسا ہوا کہ وہ کام نہ ہوا ہو، اس سلسلے میں اپنے اوپر بیتا ہوا تازہ واقعہ ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

میرے لئے اپنے آبائی گاؤں میں ایک مکان کی ضرورت تھی، والدین اور دوست احباب کو فکر تھی، کہ کوئی بنا بنایا اچھا مکان مل جائے، تو خرید لیا جائے لیکن اس میں دو الجھنیں تھیں، ایک یہ کہ مناسب مکان آبادی کے اندر ملے، دوسرے رقم کا مسئلہ، مکان ملنے کا مسئلہ تو یوں حل ہوا کہ ایک بڑھئی کا مکان فروخت ہورہا تھا، جو موقع ومحل کے اعتبار سے بہت مناسب تھا، مگر قیمت کا مسئلہ بہت سنگین تھا، ایک مرتبہ گفتگو مکمل ہوکر قیمت کی فراہمی نہ ہوسکنے کی وجہ سے معاملہ ختم کردیا گیا تھا، ملّا کی دوڑ مسجد تک، اس گفتگو کے دوران حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، ان دنوں حضرت بعد نماز عصر کبھی کبھی تفریح کے لئے جمنا کے کنارے تشریف لے جاتے تھے، اس روز مجھے بھی حکم ہوا کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ، جمنا کے کنارے گاڑی روکی گئی، دوسرے رفقاء تو اتر کر دریا کی سیر کرنے لگے، مگر مولانا گاڑی سے نہ اترے، میں اتر کر مولانا کے پاس کھڑا ہوگیا اس وقت اور کوئی نہ تھا، میں اس وقت ذرا دلگیر تھا، میں نے حضرت سے پورا واقعہ ذکر کیا اور اپنی مجبوری بیان کی، مولانا نے دل سے دعائیں دیں پھر بہت قوت اور اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ میں نے آپ کے لئے دعا کی ہے، اور کرتا ہوں، اور انشاء اللہ کروں گا، آپ مطمئن رہئے، انشاء اللہ وہی مکان آپ کو ملے گا۔ یہ بات کئی بار فرمائی اس گفتگو کے بعد رقم نہ ہونے کی وجہ سے معاملہ ختم کردیا گیا، مولانا کی دعا مجھے یاد تھی، سوچتا تھا کہ یہ دعا خالی نہ جائے گی، بس وقت کا انتظار ہے، بظاہر اسباب کوئی امید نہ تھی، اس واقعہ کے ایک سال بعد مولانا کا وصال ہوگیا، وصال کے چند روز کے بعد اس مردہ معاملہ میں جان پڑی، گفتگو شروع ہوئی، پہلے ایک لاکھ پر مکان طے ہوا تھا اب مولانا کی دعا کی برکت سے اسی ہزار میں طے ہوگیا اور بغیر وہم وگمان کے اس کی خریداری کے تمام اسباب بہم ہوگئے اور جلد ہی اس کی رجسٹری ہوگئی **فالحمد للہ**، حضرت کی دعا اور حضرت کی بشارت کہ وہی مکان آپ کو ملے گا۔ اللہ نے اسے سچ کر دکھایا۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس نوع کے متعدد واقعات ذہن میں محفوظ ہیں، کہاں تک کوئی سنائیے۔

حضرت کی اصلاحی شان بھی بہت بلند تھی، باوجود انتہائی رحم ومروت اور کرم وتواضع کے خلاف شرع امور پر نکیر ضرور فرماتے، ایک بار ایک صاحب نے اپنے یہاں شادی کی تقریب میں شرکت کی دعوت دی، حضرت نے شرط کرلی کہ کوئی امر خلافِ شرع نہ ہوگا، انھوں نے وعدہ کیا لیکن حضرت پہونچے تو خلافِ شرع کوئی بات دیکھی، اس پر آپ نے نکیر فرمائی اور وہاں سے لوٹ آئے، حضرت کی نگاہ میں بڑی تاثیر تھی، ایک بار مجلس میں ارشاد فرمایا کہ حدیث میں آیا ہے کہ **العین حق** نظر لگنا حق ہے، یعنی نظر بد لگ جاتی ہے، میں اس سے استنباط کرتا ہوں، کہ جب نظر بد لگنا حق ہے تو کیا نظر نیک حق نہیں ہے، نظر نیک بھی لگتی ہے، اور آدمی کی کایا پلٹ جاتی ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں، صاحب استعداد اور ذی علم، طبیعت مناظرانہ پائی ہے، گمراہ فرقوں کا کامیاب تعاقب کرتے ہیں، ایک بار بہائی فرقہ کے کچھ لوگوں سے الجھ گئے اور ان کے دفتر میں جا کر للکار آئے، جب وہاں سے واپس آرہے تھے تو انھیں اپنے دل میں بڑا تغیر محسوس ہوا، ایسا لگتا تھا جیسے ایمان رخصت ہورہا ہے، وساوس کا ہجوم تھا، قلب ظلمات میں گھر گیا تھا یہ پریشان ہوگئے، انھیں معلوم تھا کہ حضرت مولانا ان دنوں یہاں آئے ہوئے ہیں، یہ سیدھے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا نے ایک نظر ڈالی اور سلام کا جواب دیا، پھر انھوں نے مصافحہ کیا، بس اتنے ہی سے دل روشن ہوگیا، تمام وساوس کافور ہوگئے۔

اس چھوٹے سے مضمون میں گنجائش نہیں کہ مولانا کے سلسلے میں اس احقر نے جو کچھ محسوس کیا ہے، اسے مکمل طور پر قلمبند کرسکے، میں انھیں پہچاننے کا دعویٰ نہیں کرتا، اہل اللہ کو پہچاننا آسان نہیں تاہم جو کچھ اس ظاہر بیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا

ہے، وہ بھی ایک کتاب کا مضمون ہے۔

مولانا کی زندگی کے ترجمان، مولانا کے یہ اشعار ہیں۔

مٹادو مٹادو اپنی ہستی تم محبت میں
یہی کہتے ہیں بسطامی غزالیؒ اور جیلانی
سنو تم گوشِ دل سے حضرت احمد یہ کہتے ہیں
محبت میں فنا ہو تب غذا ملتی ہے روحانی

☆☆☆☆☆

مرا مقصود ان کی یاد ہے ان کی طاعت ہے
نہ بدنامی کا خطرہ اب نہ پروائے ملامت ہے

☆☆☆☆☆

کٹ کے غیروں سے فقط اللہ کے ہو جایئے
دوستو! بس احمد عاصی ک یہ پیغام ہے

☆☆☆☆☆

(مجلّہ ''المآثر'' مئو، ج:۱ شمارہ:۱ ص:۵۱۔ محرم تا ربیع الاول ۱۴۱۳ھ مطابق جولائی تا ستمبر ۱۹۹۲ء)

قربت میں تری ہم نے جو لطف اٹھائے ہیں

حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتا بگڈھی نور اللہ مرقدہٗ

آہ! کہ زمانے کا نور، عہدِ حاضر کی برکت، ہادیٔ راہ شریعت، امام جادۂ طریقت، رہبر سالکان، رہنمائے گمرہان، نسخۂ آدمیت، پیکر لطف و محبت، ابر گہر بار رحمت، قدوۂ اصحاب شریعت، کاشف اسرار حقیقت، جانشینِ فضل رحمٰں، صاحب روح البیاں، عارف باللہ الصمد الشاہ **مولانا محمد احمد** قدس سرہٗ الاحد، نے اس دنیائے فانی کو باذن رب جلیل تقریباً تین چوتھائی صدی تک اپنے نور ایمانی اور شمع عرفانی سے جگمگا کر عالم آخرت کی راہ لی۔ کائنات اندھیری ہوئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

وہ جس نے آخری دور میں جنید و شبلی کی یاد تازہ کردی، جس کے انفاس طیبہ سے مشائخ پیشیں کی، خوشبو محسوس ہوتی تھی، جس کی نگاہوں میں ایمان و ایقان کی بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ جس کی گفتگو سے احسان و عرفان کے گلشن مہک اٹھتے تھے، جس کی شفقت و عنایت انبیاء کرام **علیہم السلام** کے لطف و کرم کی یادگار تھی، جس کی مبارک صحبت میں دلوں کو روشنی اور ایمان کو تازگی ملتی تھی، جس کی مجلس میں وساوس و خطرات کا صفایا ہو جاتا تھا، جس کی مسیحائی سے مردہ قلوب زندگی پاتے تھے،

آہ! کہ وہ پیکر محبوبیت تھا، وہ سراپا محبت تھا، وہ خالص اللہ والا تھا، اس کا ہر لمحہ، اس کی ہر ساعت، اس کی ہر ہر رگ، ہر ہر ریشہ وقف للہ تھا، وہ اپنا کچھ نہ تھا، وہ سب کچھ اللہ کا تھا، اللہ کے لئے اس نے سب کچھ فنا کر دیا تھا، اپنے کو مٹا دیا تھا، اس کے بعد وہ کن درجات تک پہونچا اللہ ہی جانتا ہے۔

اتنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہوا اور اس سے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہوا

اب وہ اپنے مولا کے حضور پہونچ گیا ہے، وہ دنیا میں بہت بیقرار رہا تھا، اب جان دے کر اسے دائمی قرار حاصل ہوا ہے، وہ کمال عشق میں مر مر کے جیتا تھا، اب وہ شہید عشق ہو کر حیات جاوداں حاصل کر چکا ہے۔

وہ ایک بندہ تھا جو بندگی میں کامل تھا، وہ اب نہیں رہا، تھا تو کبھی خیال نہیں ہوا کہ ایک دن وہ نہیں رہے گا، حالانکہ وہ بہت ضعیف اور نحیف تھا، چہرے پر جھریاں تھیں، منہ میں دانت نہ تھے، بال سفید تھے، کمر میں قدرے خم تھا، پاؤں سے چلنے میں تکلف تھا، لیکن اس کی روحانی طاقت نے بڑھاپے کو کالعدم بنا دیا تھا، اس کے چہرے کی جھریاں بڑی شاداب محسوس ہوتی تھیں، منہ میں دانت نہ تھے، مگر جمال محبوبیت نچھاور ہوا جاتا تھا، بال سفید تھے، مگر نور باطن کی دمک نے اسے رشکِ شباب بنا رکھا تھا، اس کی باتوں میں روح زندگی تھی، اس کی نگاہوں میں نور خدا تھا، وہ ایک ابر کرم تھا، جو سب پر برستا تھا، وہ ایک جہانِ رحمت تھا، جس کی پناہ میں ہر خاطی و عاصی تھا۔ کبھی احساس نہ ہوا تھا کہ سب کے آنسو پوچھنے والا، لوگوں کو یوں اشکبار چھوڑ جائے گا۔

مجھے اس تحریر میں مولانا کے عام حالات کا بیان منظور نہیں ہے، مجھے آپ بیتی سنانی ہے۔ وہ جو کچھ نہیں ہے، جو علم شریعت سے کورا، اور نور طریقت سے کور ہے جو ہمت و حوصلہ سے تہی دامن اور جہد و عمل میں کمزور ہے، جس میں کوئی وصفِ کمال نہیں، جو کسی لائق نہیں ہے، اسی کو اس اللہ والے نے اپنی آغوشِ محبت میں جگہ دی، گندگی کے اس ڈھیر پر بار بار نگاہِ لطف و عنایت ڈالی۔ اس کی عالی ظرفی نے ایک

ذرۂ حقیر کو اتنا نوازا جس کا اسے تصور بھی نہ تھا، مولانا نے اس کمزور اور بے ہنر کو کس طرح نوازا، جی چاہتا ہے کہ سینۂ اوراق میں اسے محفوظ کر دوں شاید ان کی یہ اعلیٰ ظرفی پچھلوں کیلئے درسِ نصیحت بن جائے اور بڑے کس طرح چھوٹوں کو نوازتے ہیں، اس کا سلیقہ آجائے۔

یہ حلاوت بھری داستان کہاں سے شروع کروں، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں حضرت کو ابتدائے شعور سے جانتا ہوں، جب سے کچھ شُد بُد ہوئی ہے خیال کرتا ہوں، تو مولانا سے ناواقفیت کا کہیں پتہ نہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ ابتداء میں مولانا سے عقیدت کا نقش مدھم ملتا ہے، جب یہ حقیر و بے مایہ **جامعہ عربیہ احیاء العلوم** مبارکپور میں زیر تعلیم تھا، اس زمانہ میں حضرت ایک بار جین پور تشریف لائے تھے، ایک صاحب نے مولانا کا تذکرہ شکایت کے لہجہ میں کیا، میں ہمیشہ علماء و مشائخ کا دلدادہ و شیدائی رہا ہوں، مجھے ان کا یہ شکایتی لب و لہجہ پسند نہیں آیا، مگر مولانا کو دیکھا نہ تھا، ان کی باتیں سنی نہ تھیں، اسلئے نقش عقیدت مدھم سا ہی رہا، پھر بہت عرصہ بعد حق تعالیٰ نے الہ آباد **وصیۃ العلوم** میں پہونچا دیا، میں وہاں چار سال تک رہا، حضرت مولانا کا قیام اس وقت مستقلاً الہ آباد میں تھا۔ محلّہ سوئیں منڈی کے ایک مکان صابری منزل میں تشریف فرما تھے۔

اس وقت مجھے درس و تدریس میں اتنا انہماک تھا کہ حضرت کی خدمت میں حاضری کی توفیق نہیں ہوئی، لیکن خود حضرت مولانا اپنے خاص لطف و کرم سے مدرسہ و خانقاہ میں کبھی کبھی تشریف لاتے تھے، اور ہم لوگ حسب موقع حضرت کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے، اس وقت حضرت کی عظمت ولایت اور قوت نسبت تمام بزرگوں میں معروف تھی۔

تمام مشائخ ان کی عظمت اور تقدس کے معترف و مداح تھے، ہم جیسے لوگ تو

مولانا کے پاس پہونچ کر اپنا وجود اور اپنی شخصیت تک کو مضمحل اور مفقود پاتے تھے۔

لیکن مولانا کا کمال تھا کہ ہر ایک پر لطف و عنایت کی بارش برساتے تھے، مولانا کے پاس بیٹھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ محبت و رحمت کا ایک دلکش اور خوش منظر ہالہ ہے جو بیٹھنے والوں کے وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

مولانا کا حافظہ بھی غضب کا تھا، کسی کو ایک بار دیکھ لیتے، تو اسے پہچاننے میں کوئی تکلف نہ ہوتا۔ میری حیثیت ایک معمولی سنگریزے سے زیادہ نہیں ہے ایسے سنگریزے نہ جانے کتنے اِدھر اُدھر رہتے ہیں، لیکن حضرت کا کمال تھا کہ پہلی ملاقات کے بعد پھر بھولے نہیں۔

ابھی ایک یا دو بار شرف ملاقات حاصل ہوا تھا، وہ بھی خصوصی نہیں بلکہ مجمع عام میں، مگر مولانا کی عنایت ملاحظہ ہو، میں ایک روز گرمی کے موسم میں ایک چھوٹے سے حجرے میں ہدایہ پڑھا رہا تھا، مدرس اپنے انہماک میں تھا، طلبہ بھی درس میں کھوئے ہوئے تھے، اچانک دروازے پر چند پرچھائیاں محسوس ہوئیں، میں نے نگاہ اٹھائی تو حضرت والا بہ نفسِ نفیس چند خدام کے ساتھ دروازے پر کھڑے تھے، میں تڑپ کر اٹھا، طلبہ بھی اٹھے، سب نے بڑھ کر حضرت کا استقبال کیا، مصافحے کئے، حضرت نے معانقہ سے نوازا، حضرت اقدس کا ہمیشہ یہ دستور رہا کہ کبھی صرف مصافحہ پر اکتفا نہیں کیا، ہمیشہ گلے سے لگایا، میں نے درسگاہ میں تشریف لے چلنے کی درخواست کی، حضرت تشریف لائے، رفقاء طالب علموں کی صف میں بیٹھے، حضرت صدر میں رونق افروز ہوئے، بندہ پیچھے کھسکا تو حکماً اپنے پہلو میں بٹھایا، سبق اختتام کے قریب تھا، چند سطریں باقی تھیں، طبیعت میں تقاضا تھا کہ باقی سبق پورا کر دوں، اور حضرت کا رعب لب کشائی سے مانع تھا۔

آخر تقاضائے درس غالب آیا، میں حضرت سے سبق پورا کرنے کی اجازت

لی، اور ایسا دو نیت سے کیا، ایک یہ کہ سبق ناتمام نہ رہے، دوسرے یہ کہ حضرت کی موجودگی میں سبق پڑھا لوں گا تو اس میں برکت ہوگی، اور حضرت کی دعائیں حاصل ہوں گی، حضرت نے بکمال مسرت اجازت دے دی، میں نے سبق مکمل کر کے دعائے برکت کی درخواست کی، حضرت نے نہایت خوش ہوکر دعاء کیلئے ہاتھ اٹھائے اور بہت مسرت کا اظہار کیا۔

بچوں نے شربت کا انتظام کیا، حضرت دیر تک تشریف فرما رہے، نصیحتیں فرماتے رہے، دعائیں دیتے رہے، اس عنایت ونوازش کی حلاوت ولذت آج تک قلب وجگر میں محسوس ہوتی ہے، یہ پہلا موقع تھا کہ اس عظیم انسان نے اِس حقیر و بے مایہ اور گمنام ظلوم وجہول کو نوازا۔

مشہور ہے کہ ایک بزرگ اپنے مریدوں کے حلقے میں تشریف فرما تھے، فیضان الٰہی چھلکا ہوا تھا، سب کے دل کیف وسرور سے لبریز تھے، اسی حال میں شیخ اپنی خانقاہ سے باہر تشریف لائے، نگاہیں محبت الٰہی کا میکدہ بنی ہوئی تھیں، یہ مے بار نگاہیں ایک کتے پر پڑ گئیں، کتا از خود رفتہ ہوگیا، تھوڑی دیر کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ جدھر وہ کتا جاتا ہے، کتوں کا ایک مجمع اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے، ایک نگاہِ لطف اس حقیر کتے پر کیا پڑی کہ وہ محبوبیت کا پیکر بن گیا۔

میں نہیں جانتا کہ حضرت کی اس نگاہِ خاص نے کیا کام کیا، مگر یہ ضرور ہے کہ اس کے بعد اکثر صاحبانِ دل اور اہل اللہ نے اس حقیر سراپا تقصیر کو اپنی توجہ وعنایت سے نوازا ہے، کیا عجب ہے کہ حضرت کی نگاہ محبت کے اثر نے ان حضرات کی شفقت ومحبت حاصل کرادی ہو، ورنہ میں تو اتنا کُھر درا اور ناتراشیدہ ہوں کہ مجھ پر کوئی نگاہ پڑنی ہی نہ چاہئے اور پڑے تو اچٹ جانی چاہئے۔

پھر بارہا ایسے خوش نصیب مواقع نصیب ہوتے رہے کہ حضرت کی دید

وزیارت اور شرف ہمکلامی میسر آئی۔ حضرت کی طرف سے لطف وعنایت میں اضافہ ہوتا رہا، کئی بار ایسا ہوا کہ حضرت رکشہ پر تشریف لے جا رہے ہیں اتفاقاً یہ خادم بھی کسی طرف سے سامنے آگیا، آج جب یہ بات یاد آتی ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، دل تڑپ اٹھتا ہے۔ حضرت دیکھتے ہی رکشہ رکوا دیتے، باوجود ضعف ونقاہت کے رکشہ سے نیچے اترتے گلے سے لگاتے، دعائیں دیتے، ایک بار ایسا ہی ایک موقع آیا، حضرت کے گھٹنوں میں ان دنوں تکلیف تھی، مگر اس کے باوجود رکشہ سے اترنے لگے، میں نے گستاخی کی اور حضرت کے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اترنے سے روک دیا، اس پر حضرت نے قدرے جھک کر میرا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر، نور سجود سے جگ مگ کرتی، اپنی پیشانی مبارک سے لگا لیا، اور یہ صرف ایک بار نہیں ہوا ہے، مجلس مبارک میں، میں حضرت کی دائیں جانب بہت قریب بیٹھا کرتا تھا، حضرت نے بارہا خوش ہوکر میرے سَر کو اپنی مبارک پیشانی سے لگایا ہے، ہائے! میں اپنی گندگی اور نجاست پر کتنا روؤں کہ ایسے پاکیزہ ومقدس اور ذکر وفکر سے معمور سر کے مساس کے باوجود اپنا کاسۂ سر خالی کا خالی ہی رہا۔

قیام الہ آباد کے آخری سال یعنی ۱۴۰۱ھ میں حضرت سے ربط بہت زیادہ ہوگیا تھا، میں جب مجلس مباک میں حاضر ہوتا، حضرت بہت خوش ہوتے، میں جاتے ہی حضرت کے سامنے اپنا نام لے کر تعارف کراتا، ایک دن حضرت نے فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے، میں آپ کو پہچانتا ہوں۔

جن دنوں میں نے قیام الہ آباد کے ترک کا ارادہ کر لیا تھا، انہیں ایام میں میرے ایک دوست بہرائچ سے تشریف لائے تھے، میں نے اپنا ارادہ ابھی کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا، دوسرے روز مدرسہ میں سالانہ امتحان کی چھٹیاں ہونے والی تھیں، میں تیاری کر چکا تھا، شام کو بہرائچی دوست کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضر

ہوا، دیر تک لطف وکرم کی باتیں ہوتی رہیں۔

میں نے حضرت سے بھی ترک الہ آباد کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا، حضرت سے رخصت ہو کر جونہی باہر نکلا، ایک آدمی میرا نام پکارتا ہوا دوڑا آیا کہ حضرت آپ کو یاد کررہے ہیں، میں فوراً پلٹا، لیکن دیکھا تو حضرت بنفسِ نفیس کمرے سے باہر تشریف لا چکے ہیں، فرمایا کہ دوبارہ مل لوں، معلوم نہیں پھر کب ملاقات ہو، پھر دیر تک میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے لطف وعنایت کے موتی لٹاتے رہے، مجھے اندیشہ ہوا کہ حضرت تھک جائیں گے، میں اجازت چاہی تو جیب سے دس روپئے نکال کر عنایت فرمائے کہ میری طرف سے ہدیہ ہے، میں بہت نادم ہوا، معذرت کی، مگر حضرت نے اصرار کیا کہ لے لیجئے، اب دیکھئے کب ملاقات ہوتی ہے، میں نے تبرک سمجھ کر لے لیا، اور مجھے احساس ہوا کہ غالباً ان پر یہ بات پروردگار کی طرف سے منکشف ہوگئی ہے، کہ میں اب یہاں نہیں رہوں گا، اور ملاقات میں تاخیر ہوگی، چنانچہ ایسا ہی ہوا، پھر ایک سال بعد ملاقات کی نوبت آئی۔

یہ پہلا مادی عطیہ تھا جو حضرت کی طرف سے اس خاکسار کو ملا، اس کے بعد جب بھی جانا ہوا، حضرت نے کچھ نہ کچھ ضرور عنایت فرمایا، کبھی میں نے کچھ پیش کیا تو اسے قبول فرمایا، بڑی محبت سے اور بہت التفات کے ساتھ۔

الہ آباد سے میں مدرسہ دینیہ غازی پور آگیا، غازی پور سے بار بار حاضری کی توفیق ہوئی، حضرت کو بھی اتنا تعلق خاطر ہوگیا تھا، کہ ایک وقت جب کہ حضرت کی طبیعت کچھ زیادہ علیل رہنے لگی تھی، ہر چند روز کے بعد خیریت کا ٹیلیگرام بھجواتے، اور میں حاضر ہوتا، اہل مجلس جو مستقل حاضر باش تھے، وہ بھی خوش ہوتے، ان سے سنتا کہ حضرت آپ کو بہت یاد کرتے رہتے ہیں، بار بار پوچھتے رہتے ہیں، ایک بے ہنر کی اس درجہ قدر افزائی پر مجھے حیرت بھی ہوتی اور مسرت بھی، واقعی داد کیلئے

قابلیت شرط نہیں۔

مجھے صابری منزل حاضری کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، میں پہلی مرتبہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ مدرسہ بیت المعارف بخشی بازار کے ایک حجرے میں مقیم تھے، کچھ عرصہ کے بعد حضرت کا قیام، حضرت کے مخلص معالج ڈاکٹر محمد ابرار صاحب کے مکان پر ایک چھوٹے سے حجرے میں ہوا، یہ مکان ڈاکٹر صاحب کا ذاتی نہ تھا، بعد میں انھوں نے اپنا ذاتی مکان بنایا تو اس کے حجرے میں قیام فرمایا، انھیں تینوں جگہوں پر بندہ کی حاضری ہوتی رہی، یہ حجرے اپنی ساخت کے اعتبار سے مختصر تھے، لیکن حضرت جب ان میں تشریف فرما ہوتے تو تنگی کا ذرا احساس نہ ہوتا، حضرت کی وسعتِ قلب کے مقابلے میں تنگی مکان کا تصور سرے سے نہ ہوتا، حضرت کی مجلس میں پہونچ کر سوائے ایک تذکرہ کے کوئی دوسرا تذکرہ نہ ہوتا۔ بس اللہ کا ذکر، شریعت کی پیروی اور سنت کے اتباع کا تذکرہ، محبت الٰہی کی گرما گرمی، معرفت کی حلاوتیں اور محبت کی حکایتیں، اس کے علاوہ کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔

مولانا مختلف امراض واعذار کے شکار تھے، میں حضرت کی خدمت میں دیر تک نہ بیٹھتا، مبادا حضرت کو تکلیف ہو، اور یہ بھی خیال رہتا کہ میرا دل بہت گندہ اور پراگندہ ہے، حضرت کے قلب مصفا پر اس کا عکس پڑے گا تو حضرت کو تکدر ہوگا، یہی سوچ کر میں جلد حضرت کی خدمت سے اُٹھ جانے کی کوشش کرتا، اٹھتے وقت حضرت دوبارہ ملنے کا وعدہ لیتے، اور جس وقت آنے کا وعدہ کرتا، اسوقت اہتمام سے تشریف فرما ہوتے، انتظار کرتے، اگر خدانخواستہ کبھی چند منٹ کی تاخیر ہوجاتی تو بار بار دریافت فرماتے اور جب پہونچ جاتا تو بہت مسرور ہوتے، حضرت کی خواہش ہوتی کہ جب میں الہ آباد سے روانہ ہونے لگوں تو آخری ملاقات حضرت سے کرکے جاؤں اور میں بھی ہمیشہ اس کا اہتمام کرتا، کبھی کبھی رخصت کرتے وقت بڑے کیف

کے ساتھ فرماتے۔

ترا آنا مرے احساس میں جانِ مسرت ہے
مگر جانا ستم ہے، غم ہے، حسرت ہے، قیامت ہے

ایک مرتبہ بوقت رخصت میں ذرا دلگیر تھا، آبدیدہ ہوکر عرض کیا کہ دوری اتنی ہے کہ جلد جلد نہیں آپاتا، جی چاہتا ہے کہ بکثرت حاضری ہو، لیکن بُعدِ مسافت کی وجہ سے معذوری رہتی ہے، حضرت نے یہ سن کر بڑے جوش کے ساتھ فرمایا کہ کچھ مضائقہ نہیں، میرا ایک شعر ہے۔

دور ہوکر بھی ہے کوئی نزدیک اور نزدیک ہوکے کوئی دور

یعنی بعد مکانی کی وجہ سے گو دوری ہے، مگر جب قرب روحانی حاصل ہے تو اس دوری سے کچھ نقصان نہیں، اسی طرح ایک موقع پر حضرت نے اپنا ایک شعر سنایا، اور پھر خود ہی اس کی تشریح فرمائی، فرمایا:

کہیں بھی ہم ہوں مگر فیض ہے یہ ساقی کا
ہمارے پاس پہونچتے ہیں اُڑ کے پیمانے

اس کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ کسی نے بوقت رخصت حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی علیہ الرحمہ سے دوری ومہجوری کی شکایت اور توجہ والتفات کی درخواست کی، حضرت نے فرمایا کہ پہاڑی علاقوں میں ایک چڑیا ہوتی ہے، جس کا نام قاز ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انڈا دے کر اڑ جاتی ہے، اور فضائے آسمانی میں اڑتے ہوئے اپنے انڈے کو محض خیال اور توجہ سے سیتی اور اس کو گرمی پہونچاتی ہے، اس کے اثر سے انڈے میں بچہ پیدا ہوجاتا ہے، حضرت نے فرمایا کہ جب ایک بے شعور پرندے میں اللہ تعالیٰ نے یہ قوت رکھی ہے کہ وہ اپنے خیال اور توجہ سے انڈے کو گرمی پہونچا دیتا ہے، تو کیا اہل اللہ کو اتنی طاقت نہ بخشی

ہوگی کہ ان کی توجہ سے دور تک فیضان پہونچتا رہے، اسی بات کو میں نے یوں ادا کیا ہے کہ

کہیں بھی ہم ہوں، مگر فیض ہے یہ ساقی کا
ہمارے پاس پہونچتے ہیں اُڑ کے پیمانے

یہ بات ہم دور افتادوں کے لئے ایک عظیم بشارت تھی، بہت تسلی ہوئی، کہ گو قربِ جسمانی میسر نہیں ہے، مگر قربِ روحانی نصیب ہے، چنانچہ حضرت کی توجہ مسلسل رہا کرتی تھی، حضرت نے ہمیشہ اپنی دعاؤں میں اس محتاجِ دعا کو یاد رکھا، میں وقتاً فوقتاً عریضے ارسال کرتا رہتا تھا، اور حضرت بڑے اہتمام سے بدست خاص جواب لکھا کرتے تھے، ہر خط ذکرِ محبت سے لبریز اور دعائے خیر سے معمور! یہ خطوط مجھ ضعیف وناتواں کے لئے بہت سہارا تھے۔

عرصہ سے اس خاکسار کا دستور ہے کہ رمضان شریف کے ایام، وطن کے لئے وقف رہتے ہیں، اور جو کچھ بن پڑتا ہے، اہل وطن کی کچھ دینی خدمت ہوجاتی ہے، کسی سال رمضان سے ایک دو ماہ قبل حاضری ہوئی تو میں نے اس کا تذکرہ کرکے دعاء کی درخواست کی، حضرت نے دعاؤں سے نوازا، اور وعدہ فرمایا کہ رمضان میں بھی انشاء اللہ دعا کروں گا، رمضان شریف نصف گذر چکا تھا میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب ڈاکیہ نے حضرتِ والا کا ایک مفصل خط لاکر دیا، حضرت کی اس کرم فرمائی کو دیکھ کر دل امنڈ آیا، رمضان کا مہینہ، شدت کی گرمی، معمولات ومشاغل کا ہجوم، واردین وصادرین کی دلجوئی ودلداری اور پھر ایک دور افتادہ، ناقابل ذکر کی یاد اور صرف یاد ہی نہیں، ایک مفصل مکتوب، جس میں دعائیں بھی، بشارتیں بھی، ہدایتیں بھی، اور ان سب سے بڑھ کر بے پایاں محبت بھی، آپ بھی محظوظ ہوں۔

محمد احمد الہ آباد، ۲۱/ رمضان (۱۴۰۳ھ)

عزیز محترم و معظم و مخلصم سلمہٗ اللہ

سلام مسنون ودعائیں

خدا کرے مزاجِ گرامی بخیر ہو، اور متعلقین بھی بعافیت ہوں، کافی عرصہ سے خیریت نہیں معلوم ہوئی، دل لگا ہے، میں سچ عرض کرتا ہوں کہ آپ روزانہ یاد آتے ہیں، جب مخلصم انیس صاحب آتے ہیں، بس آپ کا ذکر ہونے لگتا ہے، شعبان میں میری طبیعت زیادہ خراب تھی، کمزوری بہت بڑھ گئی تھی، غشی طاری رہتی تھی، رمضان المبارک آتے ہی الحمد للہ تکلیف کم ہوگئی، اللہ پاک پر قربان، اس کی مہربانی اور خاص کرم سے روزے بھی رکھتا ہوں، تراویح بھی پڑھتا ہوں، اللہ پاک قبول فرمائیں، اللہ پاک نے روزہ میرے لئے بالکل آسان کر دیا ہے، آپ کے لئے برابر دل سے دعا کرتا ہوں، ہفتہ عشرہ سے ارادہ کرتا رہا کہ آپ کو عریضہ ارسال تحریر کروں، مگر ضعف اور مشغولی کے باعث عریضہ تحریر نہ کرسکا، مجھے ندامت ہے، یہ آپ کی محبت جو میرے ساتھ ہے، اس کو سوچ کر دل کا عجب حال ہو جاتا ہے۔

اللہ پاک نے آپ کے دل میں میری محبت ڈال دی ہے، اور میرے دل میں بھی آپ کی محبت ڈال دی ہے، اس ماہِ مبارک میں ہمیشہ آپ کے لئے تہِ دل سے دعا کرتا ہوں، میرے لئے دعا فرماتے رہیں کہ اللہ پاک راضی ہو جائیں، اور اپنا بنالیں، اب بہت کمزور ہو گیا ہوں، دعا فرمائیں کہ جب وقت آئے، ایمان پر خاتمہ ہو، متعلقین کی خدمت میں سلام مسنون ودعائیں، سب کے لئے دعا کرتا ہوں۔

محمد احمد

اس مبارک خط کو پاکر کئی روز تک میرے اوپر ایک کیف طاری رہا، باوجودیکہ غایت درجہ بے حس اور بے ذوق ہوں، مگر اس مکتوب کی برکت سے

رمضان المبارک کی حلاوت ولذت محسوس ہونے لگی، میں نے اپنے دوستوں سے حضرت کی اس عنایت کا تذکرہ کیا، تو سب کے دلوں میں حضرت کی زیارت کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ ۲/ شوال کو ہم لوگ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، حضرت بہت مسرور ہوئے، سب ساتھیوں کو فرداً فرداً مصافحہ ومعانقہ سے نوازا، خوب دعائیں دیں، اور بہت عرصہ تک ان دوستوں کو یاد رکھا، ان کو سلام کہلواتے اور دعائیں دیتے رہے، یہ سب باتیں یاد آتی ہیں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔

حضرت اس سیہ کار پر اس قدر مہربان تھے کہ میں ہمیشہ حیرت میں رہا، سنا ہے، اور ایک دوبار تجربہ بھی ہوا ہے کہ بزرگوں کو کشف ہوتا ہے، اور حضرت کے متعلق تو تواتر سے معلوم ہوا ہے کہ وہ صاحب کشف صحیح تھے، میں اپنے دل کی گندگی وآلودگی اور بداعمالیوں کی وجہ سے ہمیشہ خائف رہا کرتا تھا، کہ کہین حضرت والا کے قلبِ اطہر پر یہ گندگیاں منکشف ہوکر باعثِ تکدر نہ بن جائیں، کہیں مجلس سے نکال نہ دیا جاؤں، اسی کے پیش نظر جب بھی حضرت والا کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کرتا تو سفر شروع کرتے ہی استغفار کی کثرت کرتا، اللہ تعالیٰ پر تو سب کچھ ہمہ وقت روشن ہے، ان سے کیا حجاب؟ لیکن اللہ والے صرف وہی جان سکتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ ان پر ظاہر کر دیں، میں ڈرتا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میرے رازہائے سربستہ جو چالیس سالہ دفترِ حیات میں لپٹے ہوئے ہیں، کھول دئے تو حضرت کا قلب مکدر ہو جائے گا، اس لئے بہت اہتمام سے استغفار کرتا، اور حق تعالیٰ سے ستاریٔ عیوب کی درخواست کرتا، میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے معائب حضرت پر کھلے نہیں؟ یا حضرت نے ازراہِ کریمی **تخلقوا بأخلاق الله** (اللہ کے اخلاق کو اپناؤ) کے پیش نظر چشم پوشی کی، بہرحال ہوا یہی کہ جب حاضری ہوئی ایک تازہ جوش کرم کے ساتھ نوازا، اور اتنا نوازا کہ میں عرق عرق ہو گیا۔

اس موقع پر دو باتیں مجھے بطور خاص یاد آرہی ہیں، گو کہ یہ دونوں باتیں میری حیثیت سے بہت بلند ہیں، اتنی بلند کہ ان کا ذکر کرنا بالکل نازیبا معلوم ہوتا ہے، مگر کیا کروں کہ حضرت کی شانِ کرم کی تحریر مقصود ہے، کہاں تک اس سے دامن بچاؤں گا، پھر یہ کہ حضرت کا ہر معاملہ میری خسیس حیثیت سے بلند تر تھا، یہ تو محض ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ ایک کھر درے کنکر اور ناتراشیدہ پتھر پر نوازش فرماتے رہے، تو جب ان کی نوازشوں کا تذکرہ منظور ٹھہرا، تو کیوں نہ وہ سب بے کم وکاست سنا ڈالوں جو اپنی آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا، اور جن کا براہ راست اس خاکسار کو تجربہ ہوا۔

الہ آباد میں انجمن اتحاد المسلمین کا پہلا جلسہ منصور پارک میں منعقد ہوا، اس میں، میں بحیثیت واعظ مدعو تھا، سعادت کے پیش نظر اور عادت کے مطابق سیدھا حضرت اقدس کی خدمت میں پہونچا، حضرت نے بڑی نوازش فرمائی، عشاء کی نماز کے بعد جلسہ میں تقریر کرنے سے پہلے پھر درخواست دعا کے لئے حاضر ہوا، حضرت نے دعائیں دے کر رخصت کیا، وعظ شروع ہوا تو تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ حضرت بنفس نفیس تشریف لائے، آپ کو آتا دیکھ کر منتظمینِ جلسہ کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی، اور میں رُعب کی وجہ سے خاموش ہوگیا، فرمایا کہ آپ وعظ جاری رکھئے، میں سنوں گا، حضرت کی مرضی پاکر میں نے وعظ شروع کیا، اتحاد واتفاق بین المسلمین پر وعظ ہوا، وعظ ختم ہوا، تو حضرت تشریف لے گئے، دوسرے روز جب بعد نمازِ فجر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، تو بعض لوگ بشارت دینے لگے کہ حضرت والا آپ کے وعظ سے بہت خوش ہوئے ہیں، میں خدمت میں پہونچا تو حضرت کا چہرۂ مبارک گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا، حاضرین مجلس سے خطاب کرکے فرمایا کہ رات میں نے ایک عالمِ ربانی کا وعظ سنا، اور پھر دعائیں دینے لگے۔

دوسرا قصہ یہ ہوا کہ حضرت والا ڈاکٹر ابرار صاحب کے سابق مکان میں مقیم تھے، طبیعت علیل تھی، آپ چارپائی پر چادر سر پر اوڑھے ہوئے آرام فرما تھے، چارپائی کے سامنے ایک صوفہ پر حضرت کے متوسلین علماء کرام تشریف فرما تھے، اور درمیان میں جو جگہ خالی تھی، اس میں کئی احباب بیٹھے تھے، اور جناب کامل صاحب چائلی، حضرت ہی کے اشعار سنا رہے تھے، مجلس پر نور برس رہا تھا، اسی دوران یہ بندہ حاضر ہوا، صوفہ پر بیٹھے ہوئے علماء اپنی اپنی جگہ سے کھسک کر جگہ بنانے لگے، میں بکمال آہستگی اشارہ کیا کہ سب حضرات اپنی جگہ تشریف رکھیں، اس مجلس مبارک میں کسی طرح کا تغیر نہ ہو، اور چپکے سے بغیر سلام کئے حضرت کے پائے مبارک کی طرف بیٹھ گیا، میرا اندازہ ہے کہ تین چار سکنڈ نہ گزرے ہوں گے کی یکا یک چادر ہٹا کر حضرت بیٹھ گئے، اور فرمایا کہ آپ وہاں کیوں بیٹھ گئے، میں نے عرض کیا کہ یہاں ٹھیک ہے، فرمایا کہ نہیں یہاں آیئے، اور اصرار کے ساتھ اپنی چارپائی پر بیٹاھیا، اور پھر باوجود میرے اصرار کے نہیں لیٹے، میں شرمندگی اور اپنے قلب کی گندگی کے احساس سے پسینہ میں شرابور ہوا جارہا تھا، مگر حضرت نے نہ نیچے اترنے کی اجازت دی، اور نہ خود لیٹے۔

اسی قسم کی ایک سرگذشت اور سناتا چلوں، میں الہ آباد جب حاضر ہوتا، تو قیام کے لئے ایک جگہ متعین تھی، وہیں ٹھہرتا، وہیں کھانا کھاتا، جب تک وہاں قیام رہا، حضرت نے کبھی نہ پوچھا کہ کہ کہاں ٹھہرے ہو، اور نہ کبھی اپنے ساتھ کھانے کے لئے کہا، حالانکہ کبھی کوئی شخص میری طرف سے حضرت کی خدمت میں پہونچتا، تو پورے اہتمام کے ساتھ اس کی میزبانی کرتے، اور اس کے قیام کا انتظام کرتے، مگر خود میرے ساتھ ایسا معاملہ نہ تھا، میں کبھی کبھی سوچتا کہ حضرت والا مہربانی تو اتنی کرتے ہیں مگر نہ کبھی کھانے کے لئے پوچھا، اور نہ قیام کی بابت دریافت کیا، ایک بار میں کسی مصلحت سے اپنی سابقہ جگہ نہیں گیا، اور نہ وہاں قیام کا ارادہ تھا، اور ابھی

کوئی دوسری جگہ متعین نہیں کی تھی، ارادہ تھا کہ کھانا ہوٹل میں کھالوں گا، حضرت کی خدمت میں پہنچا تو اپنی عادت کے مطابق تھوڑی دیر کے بعد رخصت چاہی، دریافت فرمایا کہ قیام کہاں ہوگا؟ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ آج پہلی بار آپ نے قیام کے لئے پوچھا ہے، میں نے عرض کیا کہ الہ آباد میں بہت سی جگہیں ہیں، کہیں ٹھہر جاؤں گا، اشارہ فرمایا کہ فلاں مدرسہ میں آرام رہے گا، میں نے عرض کیا کہ بہت اچھا، پھر فرمایا کہ اس وقت کھانا میرے ساتھ کھالیجئے گا، میں نے دل میں سوچا کی بڑے میاں کو احساس ہوگیا ہے، کہ میرا انتظام بدل گیا ہے، اس کے بعد میں برابر اسی مدرسہ میں ٹھہرتا رہا، جس کا اشارہ حضرت نے فرمایا تھا، یہ مدرسہ افضل المعارف ہے، جو حضرت اقدس کے خاص متوسل حضرت مولانا عمار احمد صاحب مدظلہٗ کا قائم کردہ ہے اور انھیں کے زیر اہتمام ہے، مولانا ہی میرے میزبان ٹھہرے اور وہ مہمان کی حیثیت سے بہت بڑھ کر حقِ میزبانی ادا کرتے رہے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

دوسال قبل بمبئ سے مولانا مستقیم احسن صاحب اعظمی جو ایک صاحبِ ذوق عالم اور صاحب ثروت تاجر ہیں، اپنے وطن شیخوپور تشریف لائے، ایک دن دورانِ گفتگو پروگرام بنا کہ الہ آباد مولانا محمد احمد صاحب قبلہ کی اور باندہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کی زیارت کے لئے چلا جائے، چنانچہ مولانا مستقیم احسن صاحب حاجی عبدالاحد صاحب معروفی اور یہ بندۂ حقیر تین آدمی عازم سفر ہوئے۔

علی الصباح حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی، حضرت نے اپنی سابقہ شانِ کرم کے مطابق بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، اپنے اشعار سناتے رہے، ان کی شرح کرتے رہے، محبت ومعرفت کی باتیں، عاشقی وفنائیت کے اشعار اور دل نواز ودل نشیں تشریح! معمول کے خلاف کافی دیر تک اس

روز حاضری رہی۔

اس سفر میں حضرت نے غیر معمولی التفات وکرم کا معاملہ فرمایا، گوکہ میں بہت دنوں سے اس کا عادی تھا، مگر یہ حاضری کچھ اور ہی سعادتوں سے معمور تھی، مولانا مستقیم احسن صاحب بہت زیادہ متاثر ہوئے، حضرت سے بھی، اور حضرت کی میرے اوپر کرم فرمائی سے بھی، مجھ سے کہنے لگے کہ سفر کے آغاز میں آپ نے اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ حضرت کے دربار میں آپ کو اس قدر حسنِ قبول حاصل ہے، میں کیا کہتا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ میری حقیقت وحیثیت جو کچھ ہے، وہ معلوم ہے، اگر میں کسی سے کہوں کہ حضرت کی توجہ خاص مجھے حاصل ہے، تو یہ محض دعویٰ ہوگا، خدانخواستہ حاضری کے بعد اپنی حماقتوں اور آفات ظاہری وباطنی کی وجہ سے حضرت کی بے التفاتی اور اعراض کا شکار ہوتا، تو محض اپنے منھ میاں مٹھو بننے کی مثل صادق آتی، اس لئے اس سلسلے میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے، بس اسی حد تک کہہ دیا کرتا تھا کہ حضرت سے تعارف ہے، اور مجھے حضرت سے بہت محبت ہے، اور حضرت بھی اس محبت کا لحاظ رکھتے ہیں، اب جب کہ حضرت دنیا میں نہیں رہے تو گذری ہوئی ان یادوں کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ سطریں تحریر کر رہا ہوں، یہ میری بہت بیش قیمت متاع ہے، اگر حافظہ کبھی دغا کرے گا، تو قلم کے یہ نقوش ان شاء اللہ وفا کریں گے، اس میں خدانخواستہ اپنی خودستائی منظور نہیں ہے، حضرت کے اخلاقِ کریمانہ کی جھلک دکھانی مقصود ہے، ورنہ میں جیسا کچھ ہوں، میں خود بھی جانتا ہوں میرے ناقدین جانتے ہیں، میرے احباب بھی جانتے ہیں، مگر وہ پردہ پوشی سے کام لیتے ہیں۔

دورانِ گفتگو مولانا مستقیم احسن صاحب نے ایک بہت قیمتی بات ایک بزرگ کے حوالے سے ارشاد فرمائی، اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے ناظرین کی

خدمت میں پیش کردیا جائے ، انھوں نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کے ایک مجذوب خلیفہ عبداللہ شاہ کا تذکرہ چھیڑا، میں ان بزرگ سے اس وقت سے واقف ہوں، جب میں **دار العلوم دیو بند** میں زیر تعلیم تھا، اس وقت وہاں وہ روٹیاں اور لکڑیاں بیچا کرتے تھے، ان کا ایک قول مولانا نے نقل کیا کہ

> ’’کسی شخص کے لئے یہ بات اتنی مفید اور اہم نہیں ہے کہ کوئی بزرگ اور اللہ والا اسے بہت مانتا ہے، اصل فائدہ اس وقت ہوتا ہے جب خود اس شخص کے دل میں اس بزرگ کی عظمت وعقیدت ہوگی‘‘

یعنی جس قدر عظمت وعقیدت مرید اور معتقد کو ہوگی ، اسی کے بقدر اس کو فائدہ ہوگا ، اگر کسی کو کوئی اللہ والا بہت چاہتا ہو، مگر وہ خود اس کا معتقد نہ ہو تو اسے نفع کم ہوگا ، یا بالکل نہ ہوگا ، میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ حضرت نے تو مجھے اتنا نوازا ہے کہ تصور سے زیادہ، لیکن خود میرے دل کا کیا حال ہے؟ میں اپنے دل کا حال کیا بتاؤں، یہ بالکل نامعتبر ہے ، بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نامعتبر دل عظمت وعقیدت سے معمور ہے! مگر مجھے حاصل کیا ہوا؟ کیا بتاؤں ؎

تہید ستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامل   کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

حضرت کی خدمت میں آخری حاضری اس وقت ہوئی ، جب آپ سفرِ آخرت کے لئے پابرکاب تھے، حضرت کے ایک خادم کا خط پہونچا کہ حضرت کی طبیعت بہت ناساز ہے، اکثر اوقات دنیا کا ہوش نہیں رہتا، ہم چند رفقاء خدمت میں حاضر ہوئے ، لیکن آہ! کہ اب حالت غیر تھی ، ہڈیوں کا ایک مختصر سا ڈھانچہ بستر پر پڑا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں، بے خبری کا عالم تھا، کسی کسی وقت کروٹ بدلتے تھے اس سے محسوس ہوتا تھا کہ تکلیف شدید ہے ، بڑے صاحبزادے مولانا اشتیاق احمد

صاحب سِرہانے بیٹھے تھے، میں دیر تک کھڑا دیکھتا رہا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا، دل کی دھڑکن بے کیف ہوگئی تھی ، غم کے ماروں کا مسیحا آج یوں سب سے بے خبر پڑا ہے ، کلیجہ منہ کو آگیا ، آنکھیں ڈبڈبا گئیں ، خدا کے حضور دل نے مناجات کی ، پروردگار عالم! آپ کا یہ عاشق وشیدا بندہ، اب دنیا سے بالکل بے نیاز، ہمہ تن اور ہمہ قلب آپ ہی کی طرف متوجہ ہے ، زندگی بھر اس نے آپ کی محبت کا پیغام دنیا والوں کو سنایا ہے، اس نے آپ کے ساتھ ایسی محبت کی کہ نہ جانے کتنے سینوں میں آپ کی محبت فروزاں ہوگئی ، اب وہ وقت قریب ہے کہ اس کی پاکیزہ روح اور عشق میں بسی ہوئی جان ، تن کی قید سے آزاد ہوکر آپ کی بارگاہ قدس میں جاپہونچے ، اے پروردگار! تری رحمت اپنے بندوں کو خوب نوازنا جانتی ہے ، ہم اس بندے کے لئے کیا دعا کریں ، ہم نے تو زندگی بھر اس سے دعائیں چاہی ہیں، اب وقت ہے کہ یہ بندہ اپنی دعاؤں کی قبولیت کا حقیقی منظر دیکھنے ترے حضور حاضر ہوجائے! **یا اللہ یا کریم** !

پھر ہم لوگ بادیدۂ نم وہاں سے رخصت ہوئے ، میرے پاس وقت کم تھا ، میں تو جلد ہی رخصت ہوگیا ، میرے ایک دوست جو پہلی بار حضرت کی زیارت کے لئے گئے تھے ، ان کی پیاس اس ایک زیارت سے نہیں بجھی ، انھوں نے کہا کہ میں ابھی ٹھہروں گا ، واپسی کے بعد وہ بتا رہے تھے کہ حضرت کو ہوش آیا تھا ، اور انھیں مصافحہ کی سعادت نصیب ہوئی تھی ، انھوں نے میرا نام لے کر کہا کہ فلاں بھی آئے تھے ، فرمایا اچھا ، ان کے لئے دعا کرتا ہوں ، اللہ رے کرم! حالت یہ ہے لیکن دعا میں اس غلام کو نہیں بھولے ، خدا تعالیٰ حضرت کو اپنی شانِ عالی کے مطابق جزائے خیر دیں ، حضرت نے اس ناکارہ کے لئے بہت دعائیں کی ہیں ، اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلیٰ علیین میں جگہ دیں ، اور ہم خدام کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دیں ۔ (آمین)

حضرت اقدس کا وصال ۲؍ربیع الآخر ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۱ء بوقت بوقت شب ۱۰؍بج کر ۲۰؍منٹ پر ہوا، ...... جیسا کہ الہ آباد کے میرے ایک دوست نے خبر دی...... اس وقت میں اپنے وطن سے دور الہ آباد سے بھی دور کاس گنج ضلع ایٹہ میں ایک جلسہ میں شریک تھا، وہاں سے واپسی میں اعظم گڈھ میں یہ روح فرسا اطلاع ملی، دل رنج واندوہ میں ڈوب گیا، اعظم گڈھ سے شیخو پور مدرسہ میں پہونچا تو معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی تاریخ میں حضرت کے وصال کے دس منٹ کے بعد یعنی ساڑھے دس بجے شب میں، میرے گھر میں بچہ تولد ہوا ہے، بے ساختہ دل میں آیا کہ تبرکاً اس کا نام محمد احمد رکھ دوں کہ اس میں سرورِ کائنات روحی وقلبی فداہ ﷺ کی برکت ازل سے موجود ہے، اور پھر ان کے ایک نہایت درجہ عاشق وشیدا، متبع ومطیع امتی نے ایک عرصہ تک دنیا کو حرارت محبت سے گرما کر اور نور سنت سے جگمگا کر اسی وقت شربتِ وصالِ حق نوش کیا ہے، شاید یہ نورٌ علیٰ نورٌ نام بچے کے نصیبے کو منور کر دے، اللہ تعالیٰ اس بچے کو قبول کرے، جیسا کہ اپنے بندوں کو قبولیت سے نوازا ہے۔

(مجلّہ ''المآثر'' مئو، ج: ۱ شمارہ: ۲ ص: ۶۲ ربیع الآخر تا جمادی الآخر ۱۴۱۳ھ مطابق اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۲ء)

مکاتیب محبت

حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتا بگڈھی نور اللہ مرقدہٗ کے چند خطوط

مجلّہ ''المآثر'' کے ابتدائی دو شماروں میں خاکسار مدیر تحریر کے قلم سے حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی نور اللہ مرقدہٗ کی عقیدت ومحبت نے دو مضامین لکھوائے تھے، ان مضامین میں یہ بھی ذکر آیا ہے کہ حضرت اقدس اس ناکارہ کو وقتاً فوقتاً اپنے مبارک خطوط سے بھی نوازا کرتے تھے، آج کی صحبت میں جی چاہتا ہے کہ حضرت نے جو خطوط مجھے تحریر فرمائے ہیں، ان کا متن بعینہٖ نقل کر دوں، حضرت کے خطوط میں نے بہت حفاظت سے رکھے تھے، مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض موجود نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ میری اس غفلت کو معاف فرمائیں، خطوط میں نے بھی حضرت کو بہت لکھے تھے، اور میں حضرت کی ضعفِ بصارت کی رعایت سے موٹے قلم سے روشن حروف میں لکھا کرتا تھا۔ ان میں بعض تو مختصر ہوتے، لیکن بیشتر طویل ہوتے، حضرت انھیں بہت محبت سے پڑھتے، یہ خطوط میں ڈاک سے نہیں بھیجتا تھا، دستی بھیجتا تھا، چونکہ حضرت کو ضعف بصر اور کمزوری صحت کی وجہ سے خود لکھنا دشوار ہوتا تھا، اس لئے ہر خط میں یہ درخواست کرتا تھا کہ حضرت جواب میں کچھ تحریر نہ فرمائیں۔ خط لے جانے والے سے دعائیں کہلوا دیں، یا کسی کو حکم دیں، وہ مجھے لکھ دے گا۔ تقریباً ہر خط میں، میں یہ درخواست ضرور کرتا، کیونکہ بعض اوقات حضرت کو لکھتے ہوئے دیکھا تھا، اور اس وقت حضرت کو جو دقت ہوتی تھی، اسے خوب سمجھے

ہوئے تھا۔ گو کہ دلی خواہش اور طبعی چاہت میری یہی ہوتی تھی کہ حضرت اپنے دست اقدس سے ایک ہی سطر سہی تحریر فرمادیں، مگر اس دلی خواہش کو ہمیشہ حضرت اقدس کی تکلیف وتعب کے خیال سے دبائے رکھتا تھا۔ مگر واہ رے حضرت کی ذرہ نوازی، کم ایسا ہوا کہ میرے خطوط کا جواب تحریر نہ فرمایا ہو، اور دوسرے سے تو کبھی نہیں لکھوایا، جب لکھا خود لکھا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ میں حاضر ہوا تو حضرت نے خوش ہو کر فرمایا کہ میں آپ کے خطوط محفوظ رکھتا ہوں اور انھیں کبھی کبھی پڑھتا ہوں۔ ان میں بڑی محبت ہے، اس سے میں محظوظ ہوتا ہوں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ بعض خطوط میں اہل مجلس کو بھی سناتا ہوں، قربان! حضرت کی مہربانیوں اور ذرہ نوازیوں کے۔

حضرت نے اپنے خطوط پر تاریخ نہیں لکھی ہے، اور میری غفلت کہ میں نے بھی کسی خط پر وصولی کی تاریخ درج نہیں کی، اس لئے ان میں کوئی ترتیب قائم نہیں کی جاسکتی، اور میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، خطوط کا یہ سلسلہ ۱۴۰۲ھ سے شروع ہو کر ۱۴۱۰ھ پر ختم ہوا ہے، اس کے بعد ضعف کی شدت کی وجہ سے کوئی خط نہیں لکھا گیا، میں خود بھی کوئی خط نہیں لکھتا تھا اس کے بجائے یا تو خود ہی حاضر ہو جاتا تھا، یا دریافت خیریت کے لئے کسی کو بھیج دیتا تھا۔ ایسا بھی بکثرت ہوا کہ میرے جاننے والوں میں سے کوئی حضرت کی خدمت میں پہونچ گیا تو اس سے سلام ودعا اہتمام کے ساتھ کہلوادیا، اور اسے تاکید کردی کہ میرے پاس پہونچ کر ضرور سلام کہہ دے، اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا، جب بہت ساری سرگزشت لکھ چکا ہوں تو اسے بھی لکھ دوں۔

میں غازی پور مدرسہ دینیہ میں تھا، ایک نوجوان مولوی صورت، جو کتابوں کی تجارت کرتے ہیں۔ بہار کے رہنے والے، ہنستے مسکراتے بہت ہشاش بشاش

میرے پاس تشریف لائے اور حضرت کا سلام، دعا اور پیام لائے، کہنے لگے حضرت آپ کو بہت یاد کررہے تھے، اور آپ کے نام کیوجہ سے حضرت نے مجھے اتنا نوازا کہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، میں نے تفصیل دریافت کی، کہنے لگے کہ میں کتابیں لینے الہ آباد گیا تھا، واپسی کے وقت خیال آیا کہ یہاں آگیا ہوں تو حضرت مولانا کی زیارت کرتا چلوں، چنانچہ ٹرین کے وقت سے دو گھنٹے قبل حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت نے ملاقات کے بعد دریافت فرمایا کہ کہاں سے آئے ہو، میں نے کہا غازی پور سے، اتنا سننا تھا کہ حضرت خاص طور سے میری طرف متوجہ ہوگئے، فرمایا کہ مولانا اعجاز صاحب کو جانتے ہو، میں نے کہا خوب اچھی طرح، بہت خوش ہوئے، مجھے اپنے قریب بلا کر بیٹھایا، پاپے کھلائے، چائے پلائی، پوچھا کب جاؤگے، میں نے بتایا کہ تھوڑی دیر میں ٹرین ہے، فرمایا اگر شام تک رکتے تو میں مولانا کو ایک خط دیتا، اچھا جاؤ زبانی سلام کہہ دینا، میں نے کہا حضرت میں شام تک ٹھہر جاؤں گا، حضرت خط لکھ دیں، میں نے سوچا کہ اسی بہانے اور نوازش ہوگی، اس پر حضرت بہت مسرور ہوئے، بہت دعائیں دیں۔ فرمایا اچھی بات ہے، تم شام کو آجاؤ میں خط لکھ کر رکھے رہوں گا۔ مولوی صاحب کہتے کہ میں شام کو گیا، تو دیکھا کہ حضرت کی طبیعت خراب ہے، فرمایا کہ دیکھو میں بیمار ہوگیا ہوں خط نہیں لکھ سکا، اگر کل تک رک سکو تو صبح لکھ دوں، اور اگر حرج ہو تو جاؤ زبانی سلام اور بہت بہت دعا کہہ دینا، اس وقت بھی حضرت نے بہت نوازش فرمائی، میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں رک جاتا ہوں، حضرت نے فرمایا نہیں میری وجہ سے نہ رکو، میں نے کہا حضرت میرا ابھی کچھ کام ہو جائے گا، حضرت نے پھر دعائیں دیں، سر پر ہاتھ پھیرا، معانقہ فرمایا۔ میں دوسرے دن صبح حاضر ہوا تو ابھی طبیعت رات ہی کی طرح تھی۔ آپ نے معذرت کی، فرمایا کہ تم میری وجہ سے بہت زیادہ رکے اب جاؤ، میں نے کہا کہ

حضرت میرا ارادہ رات کی ٹرین سے جانے کا ہے، میں پھر شام کو حاضر ہوں گا حضرت نے پھر بہت نوازشیں فرمائیں۔ شام کو بعد نماز مغرب حاضر ہوا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میں بہت شرمندہ ہوں، مشغولیت بہت رہی اس لئے خط نہ لکھ سکا، اب تم نہ رکو، مجھ سے فرمایا کہ کھانا کہاں کھاؤ گے میں نے ایک طالب علم کا نام لیا، فرمایا ہاں جاؤ کھانا کھالو، میں ابھی کھا ہی رہا تھا کہ ایک صاحب تیزی سے آئے اور کہا کہ کھانا جلد کھالو، حضرت یاد کر رہے ہیں، میں جلدی جلدی کھا کر حاضر ہوا، تو حضرت کمرے کے باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے، میرا ہاتھ پکڑا اور باہر تک تشریف لائے، پھر کھڑے ہو کر کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے، پوچھا کیا کاروبار کرتے ہو، میں نے بتایا، برکت کی دعا دی، اور میرے پورے بدن پر ہاتھ پھیر کر دم کیا، پھر آپ کو بہت بہت سلام کہا بہت دعائیں دیں۔ میں رخصت ہو کر اسٹیشن آ گیا۔ وہ صاحب بہت مزے لے کر یہ داستان سنا رہے تھے، اور حضرت کی توجہات اور دعاؤں کے اثر سے میرا دل امنڈا چلا آ رہا تھا۔ کہنے لگے کہ محض آپ کی وجہ سے حضرت نے اتنی نوازشیں فرمائیں۔

اسی طرح ایک بار میں نے ایک طالب علم کو مدرسہ دینیہ سے بھیجا، حضرت نے ان کی بہت خاطر کی، اپنے پاس بٹھایا۔ اپنے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلایا، اور رخصت کرتے وقت ۵؍روپئے تبرک عنایت فرمائے، میرے بہت سے طلبہ حضرت کی خدمت میں جاتے اور حضرت کے الطاف وعنایات سے خوب خوب سرفرز ہوتے۔ اب خطوط ملاحظہ ہوں۔

عزیز محترم ومعظم ومخلصم سلّمہٗ اللہ

سلام مسنون ودعائیں

خدا کرے مزاجِ گرامی بخیر ہو، اور متعلقین بھی بعافیت ہوں، آپ کا محبت نامہ (ملا)، دلی مسرت ہوئی، آپ یاد آتے رہتے ہیں، آپ کیلئے دل سے دعا کرتا ہوں، آج کل مرض کی تکلیف زیادہ ہے ایک ہفتہ بخار بھی آیا۔ الحمد للہ اب بخار نہیں ہے، مگر ریاحی تکلیف باقی ہی، غذا مطلق نہیں ہوتی، ۵؍دن ہچکی بہت آئی۔ اللہ کا شکر ہے، اب دو چار آ جاتی ہے، ناف کے نیچے تکلیف زیادہ ہے، کمزوری بہت بڑھ گئی ہے، آپ دعا فرمائیں، اللہ پاک رحم فرمائیں، اور صحت عطا فرمائیں۔ میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، بس دعا فرماتے رہیں، آنے کی ضرورت نہیں ہے، مدرسہ کھل گیا، مجبوری (ہے)، میں ہر حال میں راضی ہوں، دل سے دعا کرتا ہوں۔

محترم وکیل ضیاء اللہ صاحب سے ملاقات (ہوئی) دلی مسرت ہوئی، ، ان کے لئے دعا کرتا ہوں، محترمی حافظ نابینا صاحب اور دیگر احباب سے سلام مسنون کہئے، سب کے لئے دعا کرتا ہوں۔

دعا گو

محمد احمد

وکیل ضیاء اللہ ابو الخیری صاحب غازی پور کے ایک دیندار اور سچے وکیل ہیں ، غالباً میں نے ان کے ہاتھوں خط بھیجا ہوگا۔ حافظ نابینا سے مراد میرے قدیم رفیق جناب حافظ قاری شبیر احمد صاحب ہیں، جو اس وقت مدرسہ دینیہ میں میرے ساتھ پڑھاتے تھے، اور میرے ساتھ ہی حضرت کی خدمت میں بار بار حاضر ہوئے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عزیز محترم ومعظم ومخلصم سلّمہٗ اللہ

سلام مسنون ودعائیں

خدا کرے مزاجِ گرامی بخیر ہو، اور متعلقین بھی بعافیت ہوں، آپ یاد آتے رہتے ہیں، آپ کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں، اپنی شدید علالت اور کمزوری کے باعث عریضہ ارسال نہ کر سکا، ندامت ہے، مگر برابر یاد کرتا ہوں، میں ۱۷؍نومبر کو

بغرض علاج علی گڈھ گیا تھا، ۳۰ر دسمبر کو واپس آیا، دوا لے کر واپس آیا، استعمال کر رہا ہوں دعا فرمائیں، اللہ پاک صحت عطا فرمائے، کمزوری بہت زیادہ ہے، اس لئے پرتاب گڈھ نہیں گیا، الہ آباد میں قیام ہے، آپ یاد آتے ہیں، میں تہِ دل سے دعا کرتا ہوں۔ والسلام

محمد احمد پرتاب گڈھی، مقیم الہ آباد

عزیز محترم و معظم و مخلصم زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل آپ کا محبت نامہ ملا۔ پڑھ کر دل پر بے حد اثر ہوا، آپ کے لئے دل سے دعا نکلی، بار بار آپ کا محبت نامہ پڑھتا رہا، اللہ پاک بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائیں، اور صحت وسلامتی سے رکھیں، آپ بہت یاد آتے رہتے ہیں، آپ کے لئے تہِ دل سے دعا کرتا ہوں۔ آج کل میری طبیعت پہلے سے زیادہ خراب ہے، کمزوری بہت بڑھ گئی ہے، میرے لئے دعا فرماتے رہیں، آپ جب چاہیں محبت نامہ روانہ فرمائیں۔ مجھے بہت مسرت ہوگی، میں جسم سے دور ہوں مگر دل سے آپ کے قریب ہوں، انشاء اللہ سنیچر یا اتوار کو پرتاب گڈھ جاؤں گا، ہفتہ عشرہ کے بعد الہ آباد ان شاء اللہ آؤں گا۔ آپ کا محبت نامہ پڑھ کر دل پر بہت اثر ہے، آپ کی محبت اور حسن ظن ہے، اللہ پاک آپ کے ظن کے مطابق میرے ساتھ فیصلہ فرمائیں، میرا شعر ہے:

یہ دل کی ہے آواز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں
اس پر ہے مجھے ناز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں

اللہ پاک وہ دن پھر لائیں کہ آپ سے ملاقات ہو اور میرا دل مسرور ہو، اس (وقت) ایسا معلوم ہو رہا ہے آپ میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، میں آپ کیلئے تہِ دل سے دعا کرتا ہوں۔ **محمد احمد** پھولپوری، مقیم الہ آباد

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عزیز محترم و معظم و مخلصم سلّمہٗ اللہ

سلام مسنون ودعائیں

آپ کا محبت نامہ ملا، دل بے حد مسرور ہوا، اور دل کی عجیب حالت ہوگئی، جواب روانہ کر چکا ہوں، دل میں آیا کہ پھر ایک عریضہ ارسال کروں، یہ محبت کا اثر ہے، خدا کرے مزاجِ گرامی بخیر ہو، اور متعلقین بھی بعافیت ہوں، میری طبیعت مزید خراب چل رہی ہے، دعا فرماتے رہیں، آج پرتاب گڈھ جا رہا ہوں، آپ کی یاد سے دل پر بہت اثر ہے۔ دعا گو

محمدا حمد

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

محمد احمد الہ آباد

عزیز محترم و معظم و مخلصم زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل بروز جمعہ آپ کا محبت نامہ ملا۔ پڑھ کر دلی مسرت ہوئی، جب بھی آپ کا محبت نامہ ملتا ہے تو دل بہت مسرور ہوتا ہے، آپ کی محبت بھری تحریر پڑھ کر آپ کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے، آپ برابر یاد آتے رہتے ہیں، آپ کے لئے تہِ دل سے دعا کرتا رہتا ہوں، آپ کے تشریف لانے سے دلی مسرت ہوئی، آپ کے احباب جو آپ کے ساتھ آئے تھے، ان سے مل کر دل بہت خوش ہوا، آپ نے ان کا حال تحریر فرمایا ہے، ماشاء اللہ مبارک ہو، ان سب کے لئے بھی تہِ دل سے دعا کرتا ہوں، اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ میرے پاس ہی تشریف رکھتے ہیں، الحمد للہ محبت بڑھتی جا رہی ہے، ان سب دوستوں سے میرا اسلام مسنون کہہ دیجئے، سب کے لئے

دعا کرتا ہوں، آج کل میری طبیعت پہلے سے زیادہ خراب ہے، کمزوری بہت ہے، دعا فرماتے رہیں، میرا ارادہ پرتاب گڈھ جانے کا ہے، انشاء اللہ پھر واپس آجاؤں گا، میں کہیں بھی رہوں، آپ یاد آتے رہتے ہیں، عزیز محترم حافظ احمد کریم صاحب کا حال معلوم کر کے دلی صدمہ ہوا، میرے دل پر بہت اثر ہے، ان کے لئے تہِ دل سے دعا کرتا ہوں، اللہ پاک ان کو کامل صحت عطا فرمائیں، آپ میرے لئے دعا فرماتے رہیں، متعلقین کی خدمت میں سلام مسنون ودعائیں۔ سب کے لئے دعا کرتا ہوں،

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عزیز محترم ومعظم ومخلصم زیدمجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل آپ کا محبت نامہ ملا۔ دل باغ باغ ہوگیا، جب کبھی آپ کا محبت نامہ ملتا ہے دل بے حد متاثر ومسرور ہوتا ہے، الحمد للہ بہت ذوق شوق سے آپ کا محبت نامہ بار بار پڑھتا ہوں، مجھے ذرا بھی تکلیف کا کیا سوال ہے، بار بھی نہیں ہوتا، تہِ دل سے آپ کے لئے دعا کرتا رہتا ہوں، آج کل طبیعت زیادہ خراب ہے، کمزوری بہت ہے، الحمد للہ آج سکون ہے، دعا فرماتے رہیں، آج کل امتحان کا زمانہ ہے، اس لئے آپ کو مشغولی ہوگی، میں تہِ دل سے دعا کرتا رہتا ہوں، آپ بھی میرے لئے دعا فرماتے رہیں، میں دل سے آپ کے ساتھ ہوں، آپ کی محبت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

فقط والسلام

دعا گو، محمد احمد، الہ آباد

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

محترم حافظ احمد کریم صاحبؒ میرے اور میرے گاؤں کے تقریباً تمام حفاظ کے استاذ تھے، **حسبةً لله** بچوں کو قرآن حفظ کراتے رہے، بہت بابرکت شخص تھے، عرصۂ دراز سے پاؤں میں پھوڑا تھا، بہت دنوں تک مصیبت جھیلی، نہایت صابر شاکر تھے، چلنے پھرنے سے معذور تھے، ان کے لئے دعا کی درخواست کی تھی، اسی کا اس خط میں تذکرہ ہے، میرے نام اس خط کے علاوہ خود حافظ صاحب کے نام بھی حضرت نے ازراہِ کرام ایک دعائیہ محبت نامہ ارسال کیا تھا۔ حافظ صاحب کا وصال ہوگیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں۔

عزیز محترم ومعظم ومخلصم زیدمجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل قبل عصر عزیزم مولوی انوار احمد صاحب آپ کا محبت نامہ لائے، پڑھ کر دل کی جو حالت ہوئی، وہ بیان نہیں کرسکتا، دل کا عجب حال ہوگیا، آنسو نکل آئے آپ کے لئے دل سے دعا نکلی، آپ بہت یاد آتے ہیں، تہِ دل سے آپ اور آپ کے متعلقین کے لئے دعا کرتا ہوں، میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، ایسی محبت کے ساتھ آپ نے خط تحریر فرمایا ہے کہ میری عجیب حالت ہوگئی، آپ کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں، آپ کی اہلیہ کے لئے بھی دل سے دعا کررہا ہوں، خدا کرے آسانی سے ولادت ہوجائے، اللہ پاک صالح لڑکا عطا فرمائیں۔ آپ کو اس احقر کے ساتھ ایسا حسن ظن ہے، اللہ پاک ہم سب سے راضی ہوجائیں، اور اپنا بنالیں، آپ کی محبت کو سوچ کر دل کا عجیب عالم ہوجاتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسی محبت کرنے والے ہیں، اللہ پاک آپ کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائیں۔

محمد احمد

حضرت نے شدت علالت کا ٹیلی گرام دلوایا تھا، اس وقت گھر میں ولادت ہونے والی تھی، بس گھڑی ٹل رہی تھی، اس لئے میں حاضر نہ ہوسکا، برادر محترم جناب مولانا انوار احمد خیرآبادی کو جو اس وقت میرے ساتھ مدرسہ دینیہ غازی پور میں استاد تھے، رقعہ لکھ کر بھیجا تھا، اس کے جواب میں حضرت کا یہ نامۂ مبارک آیا، حضرت کی

دعا سے اللہ تعالیٰ نے لڑکا عطا فرمایا، ولادت میں بھی سہولت رہی، امید ہے کہ صالحیت کی دعا بھی رنگ لائے گی۔ (یہ بچہ فرزند عزیز مولوی محمد عامر سلمہٗ ہیں)

* * *

عزیز محترم و معظم و مخلصم سلّمہٗ اللہ

سلام مسنون و دعائیں

خدا کرے مزاجِ گرامی بخیر ہو، اور سب خیریت ہو، آپ بہت یاد آتے ہیں، آپ کے لئے برابر دل سے دعا کرتا رہتا ہوں، اس محبت کا کیا ٹھکانہ کہ آپ نے ایک صاحب سے محبت نامہ پرتاب گڈھ روانہ فرمایا، پڑھ کر دل بھر آیا، آپ کی محبت اور خلوص کو سوچ کر آپ کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے، میں نے آپ کے محبت نامہ کا جواب پرتاب گڈھ سے روانہ کیا تھا، خدا کرے میرا عریضہ آپ کو مل گیا ہو، میری طبیعت پہلے سے زیادہ خراب ہے، تکلیف زیادہ رہتی ہے، بہت کمزور ہو گیا ہوں، آج کل الہ آباد میں قیام ہے، ۸/دن ہوئے میں نے ایک جوابی تار آپ کو روانہ کیا تھا، اب تک جواب نہیں آیا، خدا کرے میرا تار آپ کو مل گیا ہو، خیریت نہ معلوم ہونے سے فکر ہے، اب اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ خط لکھنا بھی مشکل ہے، میں نے آپ کے محبت بھرے ہوئے خط کا جواب پرتاب گڈھ سے روانہ کیا تھا، دعا کرتا ہوں کہ میرا خط آپ کو مل گیا ہو میرا دل برابر لگا ہوا ہے۔ براہ کرم خیریت سے مطلع فرما کر مجھے مطمئن و مسرور فرمائیں۔ آپ کے لئے برابر دعا کرتا رہتا ہوں اور میں خود بھی دعا کی درخواست کرتا ہوں، آپ سے دلی تعلق و محبت ہے۔ فقط والسلام

دعا گو محمد احمد الہ آباد

تار مجھے بہت تاخیر سے ملا۔ خط سے ذرا پہلے، بھلا ایسے خط کے بعد میرا کیا حال ہوا ہوگا، میں فوراً الہ آباد حضرت کی خدمت میں پہونچا، اور حضرت کی دعائیں

حاصل کیں۔

* * *

عزیز محترم و معظم و مخلصم زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل آپ کا محبت نامہ ملا۔ دل بہت متاثر ہوا، آپ کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے، آپ یاد آتے رہتے ہین، میری طبیعت پہلے سے زیادہ خراب ہے، کمزوری زیادہ ہے، دعا فرماتے رہیں، میں آپ حضرات کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں، مدرسہ کی ترقی کیلئے بھی دعا کرتا ہوں، حاضری کے لئے میرا دل خود بہت چاہتا ہے، اس وقت بالکل معذور ہوں، دعا فرمائیں میں اس قابل ہو جاؤں کہ سفر کرسکوں، اور آپ کی خدمت میں میری حاضری ہو۔ فقط والسلام

دعا گو محمد احمد پھولپوری

* * *

عزیز محترم و معظم و مخلصم سلّمہٗ اللہ

سلام مسنون و دعائیں

آج بروز اتوار بعد نماز مغرب آپ کا محبت نامہ ملا، دل مسرور ہوا، محبت نامہ پڑھ کر دل پر بہت اثر ہوا، آپ سے دلی تعلق اور محبت ہے، آپ یاد آتے رہتے ہیں، آپ کے لئے برابر دعا کرتا رہتا ہوں، آپ کی جو رائے ہے، میں اس سے راضی ہوں، میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، آج کل میری طبیعت خراب ہے، کمزوری بہت ہے، آنکھ کی روشنی بھی کم ہو گئی ہے، انشاء اللہ اکتوبر میں آپریشن ہوگا، میرے لئے دعا فرماتے رہیں، میں آپ کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں، مطمئن رہیں۔ فقط والسلام دعا گو محمد احمد

اس خط پر میرے قلم سے تاریخ ۲۸؍محرم ۱۴۰۹ھ کی پڑی ہوئی ہے، اس مکتوب گرامی کے بعد حضرت اقدس کا ضعف واضمحلال اس قدر بڑھ گیا اور بینائی اس قدر گھٹ گئی تھی کہ چند سطریں لکھنے میں دقت ہوتی تھی، میں حتی الامکان کوئی خط نہیں لکھتا تھا کہ حضرت کو جواب تحریر کرنے کی تکلیف اٹھانی نہ پڑے، بعض احباب کبھی حضرت کے یہاں زیارت ودعا کے لئے حاضر ہونا چاہتے تو چند سطریں بطور تعارف گاہے گاہے لکھ دیا کرتا، اوراس میں یہ بھی ضرور تحریر کردیتا کہ حضرت جواب لکھنے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ حاضری البتہ خدمت اقدس میں ہوتی رہتی تھی، کبھی کبھی اس میں بھی طویل وقفہ ہوجاتا تھا۔ اس مکتوب عنایت کے بعد صرف ایک مختصر سا رقعہ حضرت کے دست مبارک کا لکھا ہوا میرے پاس ہے، میں نے اپنے ایک عزیز کو حضرت کی خدمت میں بھیجا تھا۔ انھیں کے ہاتھوں یہ رقعہ آیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

محترم ومخلصم زیدمجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ دلی مسرت ہوئی، آپ کی محبت سے دل پر بہت اثر ہے، آپ یاد آتے رہتے ہیں، آپ کیلئے دعا کرتا رہتا ہوں۔ اب میں بہت کمزور ہوگیا ہوں، میرے لئے دعا فرماتے رہیں۔ محمد احمد

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ کل بارہ خطوط ہیں۔ رمضان شریف والا مکتوب پہلے نقل کیا جاچکا ہے، باقی یہاں تسلسل کے ساتھ درج کئے گئے۔ ان خطوط کو آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ ہر خط میں ایک ہی روح ہے، وہ محبت ہے، واقعی حضرت والا سراپا محبت تھے، بلکہ بقول حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری قدس سرہٗ صرف ''محبت'' تھے۔ محبت کا لفظ

شاعروں کے یہاں بہت استعمال ہوا ہے، لیکن وہاں زیادہ تر لفظ ہی لفظ ہے، معنیٰ سے خالی، بولنے والے محبت وخلوص کا لفظ بہت بولتے ہیں، مگر انکی زندگیاں اس کے پاکیزہ مفہوم سے خالی ہوتی ہیں۔ لیکن حضرت اقدس کے یہاں جب محبت کا لفظ آتا ہے، تو یہ ایک زندہ حقیقت بن کر آتا ہے۔ محبت کے لفظ کی تفسیر دیکھنی ہو تو حضرت کی ذات گرامی اس کی مکمل تفسیر تھی، میں لفظوں میں حضرت کی اس خصوصیت کی تصویر کھینچنے پر قادر نہیں ہوں۔ جن لوگوں نے اس کی حلاوت چکھی ہے، وہی کچھ محسوس کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے حضرت اقدس کو نہیں دیکھا ہے، وہ ان الفاظ سے قدرے تصور تو کرسکتے ہیں مگر پورا اندازہ نہیں کرسکتے، حضرت کا ارشاد ہے

نہ پائے گا ہرگز وہ خوانِ محبت　　نہیں جس نے دیکھی دکانِ محبت

حضرت کی مجلس واقعی دکان محبت تھی۔ جس نے یہ دکان نہیں دیکھی، اس کو حقیقۃً خوان محبت کا اندازہ دشوار ہے، محبت بڑی ہوش رُبا ہے، یہ جب آجاتی ہے، تو محبوب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ فرماتے ہیں۔

رہا ہوش اپنا نہ غیروں کا احمد　　سنی جب سے میں نے اذانِ محبت
ادھر ہی ہوامیں بھی احمد روانہ　　چلا جس طرف کاروانِ محبت

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہے ہر وقت اک کیف ومستی کا عالم　　جہاں سے الگ ہے جہانِ محبت
محبت محبت زباں پر ہے جاری　　ہماری زباں ہے زبانِ محبت

حضرت والا نے اذانِ محبت اس زور کے ساتھ پکاری ہے، کہ عالم سود وزیاں کے تمام پیمانے ٹوٹ گئے، اس کے بعد تو صرف عشق الٰہی اور سرمستی لاہوتی کا سرمدی نغمہ گونجتا رہتا ہے، اس وقت حالت یہ ہوتی ہے کہ

زباں پر جب آتا ہے نامِ محبت　　تو ہوتا ہے رقصاں غلامِ محبت

یہ محبت شاعروں کی بے معنیٰ اور گناہگارانہ محبت نہیں ہے، یہ ایک مقدس اور پاکیزہ محبت ہے، جو انسان کو حق تعالیٰ کی بارگاہ کا دیوانہ بنادیتی ہے۔

ہر وقت ترا ذکر ہے، ہر وقت تری یاد   کچھ اور نہیں، ہے یہی سامانِ محبت
رونا کبھی، ہنسنا کبھی، جلنا کبھی بجھنا   الوانِ محبت ہیں یہ الوانِ محبت
ہر حال میں محبوب کی مرضی پہ ہو راضی   ہے جانِ محبت یہی ایمانِ محبت

حضرت کے اشعار کا مجموعہ ’’عرفانِ محبت‘‘ ہے، یہ حقیقت میں دیوانِ محبت ہے جو انسان کو دیوانۂ محبت بنادیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ معرفت بھی ایسی بخشتا ہے کہ، جو دیوانۂ محبت کو کبھی بے قابو اور بے لگام نہیں ہونے دیتی، محبت اگر معرفت سے خالی ہو، تو نہ اس کا اعتبار ہے اور نہ وہ جادۂ مستقیم پر قائم رہ سکتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ؔ

اگر ہم آزاد ہوتے خدا جانے کہاں ہوتے
مبارک عاشقوں کے واسطے دستور ہو جانا

یہ دستور کیا ہے؟ قرآن وسنت اور یہی دونوں جانِ معرفت ہیں، حضرت نے اپنے اشعار میں قرآن وسنت کی ترجمانی کی ہے، اسی کی دعوت دی ہے۔ حضرت کے مجموعہ کلام میں فیضان محبت چھلکا پڑتا ہے، اور عرفانِ محبت کا نور برستا رہتا ہے۔ حضرت خود جہانِ محبت تھے۔

اے اللہ! آپ کی محبت پر جان و دل قربان کرنے والا عاشق سرمست! اب آپ کے حضور پہونچ گیا۔ آپ انعام محبت دینا جانتے ہیں، آپ کے اسی بندے نے ایک موقع پر کہا تھا۔ؔ

ہر ایک سانس ہے طالب دید لیکن   نظر کب وہ آئیں گے، جب دم نہ ہوگا

سو یہ بندہ دنیا سے دم توڑ چکا، اس کا انعام یہی ہے کہ آپ نظر آجائیں، ہمارا

حسن ظن آپ کے ساتھ اور آپ کے اس بندے کے ساتھ یہی ہے، یا اللہ! ہم کو بھی ایسا ہی بنا۔ آمین یارب العٰلمین

☆☆☆☆☆☆☆☆

(مجلّہ ’’المآثر‘‘ مئو، ج: ۲ شمارہ: ۲ ربیع الآخر تا جمادی الآخر ۱۴۱۴ھ مطابق اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۳ء)

مؤلف کے قلم سے نکلنے والے

تذکرے اور سوانح حیات

(۱) ’’حیات مصلح الامت‘‘ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمیؒ کی مفصل سوانح حیات (۲) ’’سراج الامت‘‘ (حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہویؒ، خلیفہ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کی سوانح۔ (۳) ’’ذکر جامی‘‘ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے کاتب خاص، مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی کی سوانح۔ (۴) ’’تذکرۂ شیخ ہالیجویؒ‘‘ سندھ کے معروف عالم اور مجاہد فی سبیل اللہ حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجوی کا مفصل تذکرہ۔ (۵) ’’تذکرہ مولانا عبدالقیوم صاحب (مولانا قاری ولی اللہ صاحب امام مسجدِ نور بمبئی کے والد ماجد کا تذکرہ)۔ یہ سب مطبوعہ ہیں۔

ضیاء الحق خیر آبادی

انیس بھائی مرحوم

وفات: ۱۴/۱اکتوبر ۱۹۹۱ء

میں الہ آباد ۱۹۷۷ء میں پہونچا، وہاں پہونچنے کے بعد دل ودماغ نے جن حضرات سے ملتے ہی اخلاص ومحبت کی خوشبو محسوس کی اور جن سے بے ساختہ قریب ہونے، ان سے ملتے رہنے اور ان کی باتیں سننے کا جی چاہا ان میں ایک نمایاں شخصیت ندوہ سرائے ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے، انیس بھائی کی تھی، انیس بھائی کا تعارف کن لفظوں میں کراؤں، وہ میرے لئے بھائی کی عمر اور بھائی کے رتبے کے نہ تھے، باپ کی عمر اور رتبے کے تھے، لیکن حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی اور حضرت قاری محمد مبین صاحب انھیں انیس بھائی کہتے تھے، انھیں سے سن کر میری زبان پر بھی یہی لفظ چڑھ گیا، اور پھر اس طرح یہ نام دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گیا کہ اس لفظ کے علاوہ اور کسی لفظ سے انھیں پہچاننے میں دقّت محسوس کرتا ہوں۔

متوسط قد، چہرہ گول، کسی قدر لمبائی مائل، اس پر ہلکے ہلکے داغ، گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، داڑھی سفید، دانت چمکدار، سفید براق لباس، شرعی پاجامہ کرتا، سر پر پنج گوشیہ ٹوپی، دبلا پتلا جسم، تنفُّس کے مریض، بدن کمزور، ہمت توانا، دل بیدار، دماغ ہوشیار، بہترین مُشیر، بہترین دوست، نہایت شریف انسان! یہ تھے انیس بھائی!

ندوہ سرائے کے رہنے والے مگر وہاں رہے نہیں، عرصہ تک بھوپال میں رہے، بھوپال میں ان کا بڑا فارم تھا پھر نہ جانے کیا ہوا کہ فارم فروخت کر دیا اور بمبئی میں کوئی جائداد بنالی، حضرت مصلح الامتؒ سے بیعت ہوئے، دانا تو تھے ہی، دل بھی محبت سے بھرپور تھا بہت جلد حضرت کے یہاں قرب واختصاص حاصل کرلیا۔ بعد میں حضرت قاری صاحب کے سمدھی بھی ہو گئے، ان کے فرزندِ گرامی مولانا عرفان احمد صاحب قاری صاحب کے داماد ہیں۔

میں جب الہ آباد پہونچا تو وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ حضرت مولاناؒ ہی کے مکان کے ایک حصہ میں مقیم تھے۔ اس وقت مدرسہ اور خانقاہ اور حضرت قاری صاحب ایک ابتلائی دور سے گزر رہے تھے، انیس بھائی ایسے میں حضرت قاری صاحب کے لئے ڈھارس کا سامان تھے۔

بات کے کھرے اور زبان کے سچے، بزرگوں کے عقیدت کیش اور نیازمند، حضرت مصلح الامتؒ کے عاشق وشیدا، وہ اور جامی صاحب اکٹھا ہوتے تو اول سے آخر تک زیادہ تر حضرت ہی کا تذکرہ ہوتا رہتا، خلوت کے شیدائی تھے لیکن جب کوئی ہم مزاج اور ہم مشرب مل جاتا تو خوب باتیں کرتے اور دیر تک کرتے، ان کی زبان سے میں نے حضرت کی باتیں بہت سنی ہیں، ان سے سنی ہوئی چند باتیں ناظرین کو بھی سنادوں، ایک بار فرمایا:

حضرت کی خدمت میں میرٹھ کے ایک شیخ الحدیث غالباً مولانا لائق علی صاحب تشریف لائے، بوڑھے آدمی تھے، حضرت سے ملے، مصافحہ ہوا، معانقہ ہوا اور اس کے بعد زور سے چیخ مار کر رونے لگے، حضرت ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے، ان کے اس بے تحاشا رونے سے حضرت متاثر ہوئے، چاہا کہ تھوڑی دیر کے لئے مولانا وہاں سے ہٹ جائیں، انیس بھائی موجود تھے، انھیں آہستہ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ انھیں لے جاؤ اور چائے وغیرہ پلادو، انیس بھائی کہتے تھے کہ میں انھیں حضرت کے پاس سے اٹھالایا، گریہ کا طوفان تھم چکا تھا مگر سسکیاں باقی تھیں، انیس

بھائی نے پوچھا کہ حضرت آپ اس زور سے کیوں روئے، انھوں نے بھرائی آواز میں جواب دیا کہ کہ بھائی میں گنہگار آدمی ہوں، حضرت کے چہرۂ اقدس پر نظر پڑی تو میرے سب گناہ ایک دم آئینہ ہوگئے، میں اپنی گنہگاری دیکھ کر ضبط نہ کرسکا، بھائی میں بڑا گنہگار ہوں یہ کہہ کر پھر رونے لگے۔ انیس بھائی نے دیکھا کہ یہ پھر سابقہ حال پر آگئے تو انھوں نے برجستہ کہا کہ حضرت آپ کی بڑائی بہت چیزوں میں تسلیم ہے، آپ بڑے عالم ہیں، بڑے بااخلاق ہیں، بڑے بزرگ ہیں، ان سب چیزوں میں ہم آپ کی بڑائی مانتے ہیں، لیکن یہ کیا کہ سب بڑائیاں ہم آپ ہی کے لئے تسلیم کرلیں اور یہ بھی مان لیں کہ آپ ہی بڑے گنہگار بھی ہیں، جی نہیں، اس میں ہم آپ سے بہت بڑے ہیں۔

اس پر مولانا موصوف ہنس پڑے، پھر انیس بھائی نے انھیں اہتمام سے چائے پلائی۔

انیس بھائی بتارہے تھے کہ ایک بار حضرت نے گیارہ بجے شب کے بعد مجھے بلوایا، میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ مسجد میں جاؤ، فلاں جگہ ایک صاحب ہوں گے انھیں بلالاؤ۔ میں سوچنے لگا کہ صرف اتنے کام کے لئے حضرت نے اتنے اہتمام سے کیوں بلوایا لیکن خیال کیا کہ حضرت کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا اس میں بھی کوئی حکمت ہوگی، چنانچہ وہ مسجد میں گئے وہاں پہونچ کر جو منظر دیکھا تو کہہ رہے تھے کہ میری آنکھ کھل گئی، جن صاحب کو بلایا تھا انھیں دیکھا کہ کھڑے ہوکر دربار الٰہی میں مشغول مناجات اور محو دعا و نیاز ہیں اور اس انہماک سے کہ ادھر اُدھر کا ذرا ہوش نہیں، آنسو تھے کہ موتیوں کی طرح ٹپ ٹپ گر رہے تھے میں حیران تھا کہ انھیں کس طرح آواز دوں، یہ خدا سے مناجات میں مشغول ہیں میں مخل کیوں کر ہوں، میں وہیں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اللہ اکبر اس خانقاہ میں اللہ کے کیسے کیسے نیک بندے آتے ہیں انھیں اللہ کے ساتھ کیسا والہانہ لگاؤ و تعلق ہے۔ میرے دل میں یہ بات آئی کہ حضرت نے اسی لئے بطور خاص مجھے بھیجا ہے کہ اس روح پرور اور ایمان افروز منظر سے میں بھی اثر لوں، میں دیر تک بیٹھا رہا جب انھیں اس کیفیت سے قدرے افاقہ ہوا تو حضرت کا پیغام سنایا پھر وہ آنسو پوچھتے ہوئے حضرت کی خدمت میں حاضری کیلئے چل پڑے۔

ایک روز بیان کررہے تھے کہ مجھے اپنی نماز میں ریا کا شبہ بہت ستاتا تھا، میرے دل میں بار بار خیال آتا تھا کہ میری نماز سراسر ریاکاری پر مبنی ہے۔ ایک روز اپنے دل کی یہ بات میں نے حضرت سے عرض کی، تو فرمایا کہ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں نے نہایت مخلص، اللہ کا ولیٔ کامل اور انتہائی متقی و پرہیزگار سمجھتا ہوں، فرمایا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو، میں تم سے کہتا ہوں کی یہ لوگ میری نماز بھی نہیں دیکھتے تو پھر تمہاری نماز کیا دیکھیں گے، پھر ریا کیسی، ریا کا تعلق تو دوسروں کے دکھاوے سے ہے، میاں کہیں مخلوق کے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی جاتی ہے۔ **لاحول ولاقوۃ الاباللہ** اس کو دوتین بار فرمایا۔

انیس بھائی کہتے تھے کہ اس کے بعد پھر کبھی اس کا دھیان نہیں رہا کہ کوئی دیکھتا ہے یا نہیں۔

انیس بھائی نہایت دانا وزیرک تھے اسی طرح نہایت شجاع اور ہمت ور بھی تھے ان کے دل میں خوف ودہشت نام کی کوئی چیز نہ تھی، اسی وجہ سے قول کے بہت سچے تھے نہ انھیں دوسروں کو ٹوکنے میں کوئی دغدغہ تھا اور نہ ہی اپنی غلطی کے اقرار کرنے میں کوئی تامل تھا۔

جس گھر میں وہ رہتے تھے اس میں دوہری آبادی تھی، نیچے یہ لوگ رہتے تھے اوپر ایک پٹنی تھی، پٹنی کیا نیچی چھتوں والی دوسری منزل تھی، چونکہ اس کی چھت سر کو

چھوٹی تھی اس لئے وہ قابل رہائش نہ تھی، غالباً سامان وغیرہ رکھنے کے لئے بنائی گئی تھی، اس وقت وہ بالکل خالی تھی، آثار سے معلوم ہوتا تھا کہ اس میں جنات آباد تھے، اس کے دروازے میں ہمہ وقت قفل بند رہتا تھا، گھر کی عورتیں کبھی کبھی جھاڑو بہارو کرنے کیلئے اس میں جاتی تھیں، ایک دن ایک لڑکی گئی تو دیکھا کہ اس میں پاخانہ ہے، وہ ڈر گئی کہ اس میں بلّی کے گھسنے کی جگہ تو ہے نہیں یہ پاخانہ کہاں سے آیا؟ وہ فوراً اتر آئی، انیس بھائی سے کہا تو یہ بے تکلف اوپر گئے اور خود ہی پاخانہ اٹھا کر پھینک دیا اور قفل بند کر کے کنجی اپنے پاس رکھ لی، دوسرے دن جا کر دیکھا تو پھر پاخانہ جگہ جگہ پڑا تھا انھوں نے دوبارہ اٹھا کر پھینک دیا اور مقفل کر کے کنجی اپنے پاس رکھ لی، تیسرے دن پھر یہ قصہ ہوا تو انھوں نے زور سے پکار کر کہا کہ کمبختو! خوب ہگو، ہم تمہارے بھنگی ہیں روز پھینکتے رہیں گے اور کچھ سخت سست کہا اس کے بعد سے یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اس طرح کے کئی واقعات وہ سنایا کرتے تھے۔

بزرگوں کی خدمت میں حاضری دینے کا انھیں بہت شوق تھا، بھوپال میں ایک بزرگ شاہ عبد الخالق صاحب نقشبندی تھے، ان کی خدمت میں بھی یہ گاہے ماہے حاضر ہوا کرتے تھے ان کے یہاں چائے کا دور برابر چلتا رہتا تھا اور یکے بعد دیگرے پان کی گلوریاں بھی گردش میں رہا کرتی تھیں، ایک روز انھوں نے انیس بھائی کو پان پیش کیا، انیس بھائی کہتے ہیں کہ میں نے معذرت کی انھوں نے اصرار کیا کہ ایک کھالو، لیکن میں اپنے انکار پر جم گیا مگر وہاں سے نکلنے کے بعد میرا حال یہ ہوا کہ بے تحاشہ پان کی خواہش دل میں پیدا ہوئی، بھوپال میں پان کی دوکانیں قریب قریب ہیں، کہتے ہیں کہ میں نے ایک دوکان سے پان لے کر کھایا چند قدم کے بعد دوسری دوکان سے کھایا، اسی طرح لگاتار دن بھر پان کھاتا رہا۔ دوسرے دن حاضر ہوا تو پھر انھوں نے پان پیش کیا میں نے پھر انکار کیا کر دیا اس روز کل سے

زیادہ پان کا تقاضا رہا، دن بھر میں پچاسوں پان کھا گیا اور دن بھر پریشانی رہی، تیسرے دن میں خوب منہ صاف کر کے گیا تاکہ پان کا کوئی دھبہ دانتوں پر باقی نہ رہے، آج بھی انھوں نے پان پیش کیا اور میں نے حسب معمول انکار کر دیا، انھوں نے آہستہ سے کہا میاں کھالو بہت پریشانی ہوتی ہے۔ انیس بھائی چونکے اور پان کھالیا، اس کے بعد پھر پان کی خواہش نہیں ہوئی۔ فرماتے تھے کہ میں نے اپنے دل میں سوچ لیا کہ بزرگوں کی بات مان لینے میں ہی خیریت ہے۔

انیس بھائی عرصہ تک الہ آباد میں رہے، ندوہ سرائے میں آبائی مکان تھا، وہ اپنے چھوٹے بھائی کو دیدیا تھا، انھیں ندوہ سرائے منتقل ہونے کا خیال ہوا تو کھیت میں ایک مکان کی بنیاد ڈال دی اور جب وہ کسی درجہ میں رہائش کے قابل ہو گیا تو اپنے اہل وعیال کو لے کر گاؤں میں آگئے۔ یہ مکان آبادی سے الگ تھلگ بنوایا ہے جو ان کے ذوقِ خلوت کے آثار میں سے ہے۔

انیس بھائی انگریزی داں تھے مگر سر سے پاؤں تک کہیں اس کا اثر محسوس نہیں ہوتا تھا، حضرت مولانا کی برکت سے خالص دینداری ذوق وطبیعت بن گئی تھی، اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم میں لگایا بھی نہیں، بڑے صاحبزادے مولانا عرفان احمد کو حفظ کرایا، عربی تعلیم دلائی، انھوں نے دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، ان سے چھوٹے مولوی انوار احمد سلّمہٗ نے بھی حفظ کی تکمیل کی، اور وصیۃ العلوم کے بعد دار العلوم دیوبند سے تعلیم کی تکمیل کی (افسوس نوعمری میں بیمار ہوئے اور انتقال کر گئے)۔ ان سے چھوٹے مولوی سلمان احمد سلّمہٗ بھی مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہیں، سب سے چھوٹے عزیزم نعمان احمد سلّمہٗ تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔

انیس بھائی تنفس کے مریض تھے، دوا کھاتے رہتے تھے، بیماری کی حکایت شکایت کے عادی نہ تھے، اسے رفیق زندگی سمجھ رکھا تھا، شدید حملہ ہوتا تو گھر سے نکلنا

بند ہو جاتا تھا کچھ اچھے ہوتے تو نماز اور دوسری ضروریات کیلئے آمد و رفت ہونے لگتی، بیماری میں گھلتے رہے، جسم کمزور ہوتا گیا مگر طبعی اور روحانی قوت کا اثر تھا کہ طبیعت نشاط پر رہتی، مسکراتے رہتے، ہنستے رہتے، باتیں کرتے رہتے، بالآخر اسی طرح ہنستے مسکراتے ایک دن سب کو روتا چھوڑ کر اس دربار میں پہونچ گئے جس کی تیاری میں انھوں نے اپنی دنیا، دنیاوی تعلیم اور اس کی رونق اور چمک دمک کو تج دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی کریم ذات سے امید ہے کہ وہ ان پر اپنی مغفرت کی چادر پھیلا چکے ہوں گے۔ ۱۴؍اکتوبر ۱۹۹۱ء دوشنبہ کے دن بعد مغرب نبض کا نظام بگڑا سانس تیز تیز چلنے لگی اور اخروی زندگی سے قریب تر ہوتے گئے، اسی عالم میں ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا، سورۂ یٰسین شریف بلند آواز سے پڑھنے کا حکم دیا، اس وقت بھی پورے ہوش میں تھے، آیات مبارکہ کو سنتے ہوئے روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

☆☆☆☆☆☆☆

(یہ مضمون ''ذکر جامی'' میں شائع ہوا ہے، سن تحریر ۱۹۹۳ء)

حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ صاحب

جلال آبادی نور اللہ مرقدہٗ

وفات: ۱۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۳؍ نومبر ۱۹۹۲ء

دن بیتتے کتنی دیر لگتی ہے؟ ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن شمار کیجئے تو پورے پچیس سال ہو گئے (۱)، ایک چوتھائی صدی کا عرصہ! آج ان سطور کا لکھنے والا، اس وقت ایک عجیب نا قابل بیان، تکلیف دہ ابتلاء میں گرفتار ہو گیا تھا، نہ کوئی راہِ فرار نہ کہیں جائے قرار! تمام راستے مسدود اور تمام وسائل مفقود! ایسی آزمائش خدا کسی پر نہ ڈالے، ڈوبنے والے نے ہر تنکے کا سہارا لینا چاہا، لیکن جہاں شہتیریں تنکا ثابت ہو رہی ہوں، وہاں تنکوں کی کیا حقیقت؟ تاہم ہاتھ پاؤں مارنے والا ہر تنکے کو شہتیر ہی سمجھ کر لپکتا رہا، پھر اسے واقعی ایک شہتیر مل گئی۔

ہمدردوں نے مشورہ دیا، اور دل نے اسے قبول کیا کہ جلال آباد (ضلع مظفر نگر) میں ایک بزرگ ہیں سراپا کرم و شفقت، ہمہ تن رحم و محبت، دکھیاروں کے سہارا، اور بیماروں کے مسیحا! ان کی خدمت میں جاؤ، اور ان سے دردِ دل کا مداوا اور زخمِ جگر کا علاج کراؤ۔

امید کی کرن نظر آئی، جھٹ پٹ سامان سفر تیار کر کے خدمت میں حاضری دے ڈالی، جیسا سنا تھا، اس سے سوا ہی پایا، صورت اور سیرت دونوں رحمت الٰہی کا مظہر، چہرہ پر نور الٰہی کی بارش، اور دل میں شفقت و کرم کا جوش، نظر پڑتے ہی گھبراہٹ رخصت ہونے لگی، اور اس کی جگہ ایک سکون اور ایک بشاشت کی آمد کا

احساس ہونے لگا۔

مجلس میں حاضری نصیب ہوئی، تو جو ہر طرح کی سرزنش کا مستحق، ملامت کا سزاوار اور طَرد و رَد کا مستوجب تھا، وہی پارہا تھا عنایت و توجہ کی ہلکی ہلکی پھوار اور دلجوئی و دلداری کی ایک نرم جوئبار، گفتگو کی حلاوت اور لہجے کی لطافت آج تک دل میں رچی اور بسی ہوئی ہے، بیٹھ جانے کے بعد جی چاہتا رہا کہ اب یہاں سے اٹھنا مقدر نہ ہو۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

آہ! کہ وہ ہستی، جس کی پہلی ملاقات کا اثر آج بھی دل پر تازہ ہے، قلب نے امانت سمجھ کر آج تک اس کی حفاظت کی ہے، بقول اصغر مرحوم ؎

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی
ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لئے ہوئے

اب وہ سراپا کرم اور ہمہ رحمت و شفقت ہستی اپنا وقت پورا کرکے دنیا سے اٹھ گئی، مسیح چلا گیا اور بیماروں کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

خبر آئی کہ ۱۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۳؍ نومبر ۱۹۹۲ء کو جلال آباد میں حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب شیروانی کا وصال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

پچیس برس پہلے کی داستان یکایک لوحِ دل پر ابھر آئی، اس کے نقوش اس طرح جگمگا اٹھے، جیسے ابھی کل کی بات ہو، مولانا کے میٹھے میٹھے بول، دل آویز انداز گفتگو، خدا پر اعتماد کی تلقین، مصائب کی یورش میں صبر و سکون کی پُر تاثیر نصیحت اور پھر محبت بھرے دل سے تسلی بخش دعائیں! حافظہ کی لپٹی ہوئی بساط کھل گئی، اس وقت کی فضا، اس دور کا ماحول، دل کی الجھنیں، طبیعت کا اضطراب، اور اس کی بے چین کیفیات، ایک ایک کرکے نمایاں ہوتی چلی گئیں۔

تھانہ بھون کے عارف درویش، دینی علوم کے دانائے راز اور احسانی معارف

کے شارح و ترجمان، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمہ جب دنیا سے رخصت ہوئے، تو اپنے بعد انھوں نے خلفاء و مجازین کی ایک بڑی تعداد چھوڑی، جو ہر ایک اپنی اپنی جگہ ہدایت و ارشاد کا روشن چراغ تھا۔ جو جہاں تھا اس نے وہیں دین و ایمان کی شمع روشن کی۔ تقسیم ہند کے بعد ان میں سے متعدد حضرات پاکستان منتقل ہوگئے، کچھ مغربی پاکستان میں کچھ مشرقی پاکستان میں، بعض وہیں کے رہنے والے تھے، چند اکابر ہندوستان میں رہ گئے، بعض حضرات مدینہ طیبہ میں بھی تھے۔

یہاں رہ جانے والوں میں حضرت مولانا عبد الغنی صاحب پھولپوریؒ، حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ ناظم مظاہر علوم سہارن پور، حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہویؒ، حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادیؒ، حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی مدظلہٗ، بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ حضرت پھولپوریؒ بھی اخیر حیات میں پاکستان تشریف لے گئے اور وہیں ان کا وصال ہوا۔

حکیم الامت کے وصال پر آدھی صدی گزر چکی ہے، ان کے فیضِ صحبت سے جو لوگ جگمگائے تھے، ایک ایک کرکے اٹھتے گئے، ابھی ایک ستارہ پاکستان میں ڈوبا، تو دوسرا بنگلہ دیش میں جھلملایا، کوئی چراغ ہندوستان میں بجھا تو کوئی سرزمین عرب میں گل ہوا۔ غرض لڑی کے دانے ایک ایک کرکے گرتے رہے، اور اس وقت پاکستان میں تو کوئی نہ رہا، ہندوستان میں دو بزرگ تھے موجود تھے، اب ان میں سے بھی ایک صاحب رخصت ہوئے۔

حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب علی گڈھ کے مشہور شیروانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، دینی اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے اس خاندان کی ناموری کو کون

نہیں جانتا، حق تعالیٰ نے اس خاندانی امتیاز کے ساتھ مولانا کو قلبی و باطنی اور ذہنی ودماغی بہترین صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، اسی دور میں ان کی انفرادی شان نمایاں تھی، خاموشی، یکسوئی، ذوق علم اور شوق عمل میں ممتاز تھے، اسی دور میں حضرت تھانویؒ سے تعلق پیدا ہوا۔ اور تعلیم وسلوک کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہا، پھر جونہی سند فضیلت حاصل کی اس کے جلد ہی بعد سند خلافت سے بھی مشرف ہوئے، علمِ نبوت کی تکمیل کے ساتھ نور نبوت کے حصول کی بشارت سے سرفراز ہوئے۔

علی گڑھ کے رئیس خاندان کا ایک رئیس فرد اگر ارادہ کرتا، تو شہرت ونا موری کی بلندیوں اور ریاست کے بڑے سے بڑے منصب کو اپنے قدموں تلے پاتا، مگر جس نے اللہ کے نام پر سب کچھ پھونک دیا تھا۔ اب اس کی بکھری ہوئی راکھ کو وہ کیا کریدتا، حضرت تھانویؒ نے جلال آباد کے ایک معمولی مکتب میں بیٹھادیا، بس اسی میں بیٹھ گئے اور پھر اٹھنے کا نام نہ لیا، اسی وقت اٹھے جب پیغامِ حق اس دنیا سے ہی اٹھنے کیلئے آ گیا۔

حضرت مولانا کا اخلاص وجذبۂ اطاعت بلکہ فنائیت اور پیرومرشد کی دلی دعائیں خالی جانے والی نہ تھیں، کچھ دنوں کے بعد دیکھا گیا کہ وہی جو جلال آباد کے ایک معمولی مکتب میں بیٹھایا گیا تھا، ایک عظیم درسگاہ کی تعمیر میں مشغول ہے، اب وہ مکتب باقی نہ رہا، قرآن وحدیث کی انتہائی تعلیم کا ایک ممتاز ادارہ بن گیا۔ ...... **مفتاح العلوم جلال آباد** ...... جہاں ہندوستان ہی نہیں دوسرے ممالک کے طلبہ بھی کھنچے چلے آرہے ہیں، جو نوجوانون، ابتدائی بچوں کو حروف شناسی کے لئے بیٹھایا گیا تھا، اب وہ قرآن وحدیث کے رموز وحقائق کا فیضان جاری کررہا ہے، اللہ تعالیٰ نے قبول عام نصیب فرمایا۔

مولانا کے کمالات علمی وعملی کی مفصل تشریح تو ان کا سوانح نگار کرے گا، اس خاکسار کو صرف وہ تأثرات ومشاہدات درج کرنے ہیں، جن کا تجربہ ایک دوبار کی حاضری میں ہوا۔

پہلی حاضری اس وقت ہوئی تھی، جب میں ایک ابتلائی دور سے گذر رہا تھا وہ طالب علمی کا دور تھا۔ اس موقع پر حضرت کی نرمی ودلجوئی اور شفقت وعنایت کا برتاؤ اوپر کی سطروں میں ذکر کیا گیا۔

دوبارہ غالباً ۱۴۰۳ھ میں حاضری ہوئی، میرے ساتھ میرے کرم فرما جناب حاجی عبدالاحد صاحب معروفی بھی تھے، اس مرتبہ کئی روز قیام کا ارادہ تھا، خدمت میں حاضری ہوئی، تین دن قیام رہا، اور تینوں دن میزبانی حضرت ہی کی حاصل رہی، اس حاضری میں چند باتیں بطور خاص محسوس ہوئیں۔

پہلی بات تو یہ نظر آئی کہ مولانا کے یہاں نظم وضبط کا بہت معتدل اور خوشگوار اہتمام ہے، ایسا انتظام کہ ملاقات کے خواہشمند ہر شخص کو ملنے کی، اپنی پوری بات سنا لینے کی اور اپنا مدعا بیان کردینے کی سہولت ہے، اس نظم وضبط میں قانونی روکھا پن کے بجائے بے تکلفی ہے، محبت ہے، راحت ہے، نہ ہٹو بچو، نہ انتظار نہ خوف وہراس، ہم لوگ تقریباً ۹ ربجے حاضر ہوئے تھے، غالباً اگست کا مہینہ تھا، حضرت کمرہ میں تشریف فرما تھے، دروازے پر چلمن پڑی ہوئی تھی، ہم دونوں نووارد کھڑے سوچ رہے تھے کہ ملنے کی کیا صورت ہوگی؟ ابھی ہم گومگو میں تھے کہ ایک صاحب نے قدرے فاصلہ سے پکارا کہ سلام کیجئے، انھوں نے جس محبت بھرے انداز میں یہ بات کہی اس سے بے اختیار جی چاہا کہ پہلے انھیں سے ملا جائے، چنانچہ میں ان کی طرف لپکا، وہ بھی آگے بڑھے، علیک سلیک کے بعد میں نے ملنے کے قواعد اور اوقات معلوم کرنے چاہے، انھوں نے بتایا کہ کوئی تکلف نہیں ہے، بس بلند آواز سے

سلام کیجئے، اجازت مل جائے گی، ہم نے دروازے پر کھڑے ہوکر سلام کیا، اندر سے ایک بھاری بھرکم آواز آئی گونجی وعلیکم السلام اندر تشریف لایئے، چلمن اٹھا کر ہم نے قدم رکھا تو وہ ایک بڑا ہال تھا، جس میں ایک معمولی قالین پر مولانا تشریف فرما تھے، نورانی چہرہ، گورا چٹا رنگ، سفید اور سادہ لباس، سر پر چوگوشیہ ٹوپی، داڑھی اور سر کے بال دودھ کی طرح سفید برق، دوزانو بیٹھے ہوئے، ہم لوگوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا، دریافت فرمایا کہاں سے تشریف لائے ہیں، ہم نے بتایا، آنے کی غرض پوچھی، عرض کیا گیا زیارت وملاقات، قیام پوچھا، ہم نے اسے عرض کیا، بڑے لطف ومحبت سے فرمایا، بہت کرم فرمایا، بڑی مہربانی فرمائی، یہ بات تھوڑے وقفہ سے دوتین بار دہرائی۔

پھر ہم نے دیکھا کہ جو بھی آتا ہے اس سے مصافحہ کے بعد آنے کی غرض ضرور پوچھتے ہیں، ہم لوگ جب تک رہے آنے والوں کا ایک سلسلہ دیکھا، ہر قسم کے لوگ امیر وکبیر بھی، غریب وفقیر بھی، محتاج وضرورت مند بھی، اور محض ملاقات کے خواہشمند بھی، علماء بھی طلبہ بھی، لیکن ایک بات مجھے بطور خاص ہر شخص کی ملاقات کے وقت محسوس ہوتی رہی کہ اس کی طرف بھرپور التفات فرماتے، اس کی پوری بات سنتے، اور اس وقت تک اس کی جانب سے رُخ نہ ہٹاتے جب تک وہ اپنی بات سے فارغ نہ ہوجاتا، اور ایسا ہمہ تن اس کی جانب متوجہ ہوتے جیسے اس کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے، ہاں جب وہ اپنی بات سے اور اپنے مقصد سے فارغ ہوجاتا، تو اسے جلد ہی رخصت کردیتے، تاکہ دوسرے کام کا حرج نہ ہو، اور یہ بھی دیکھا گیا کہ اگر کسی نے خاموش بیٹھے رہنے کی اجازت مانگی تو اجازت بھی دیدیتے، غرض یہ کہ کسی کو انتظار کی حالت میں اپنی طرف سے نہ رکھتے، اس حسن انتظام کی وجہ سے کوئی آنے والا قلت التفات کا شاکی نہ ہوتا، اس سلسلے میں حضرت کو بعض اوقات کلفتیں بھی جھیلنی پڑتیں، مگر مخاطب کو اس کا احساس نہ ہونے دیتے۔

صبح کو گھر کے اندر سے تشریف لانے کا ایک خاص وقت متعین تھا، ہم لوگ اور ہماری طرح کئی لوگ اس وقت سے ذرا پہلے مکان کے باہر وسیع صحن میں حاضر تھے، تھوڑی دیر میں حضرت باہر نکلے، آتے ہی پورے صحن میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، ایک طرف ذرا فاصلہ پر ایک شخص بظاہر نہایت معمولی حیثیت کا، بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے الگ تھلگ بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت سیدھے اس کی طرف بڑھے، وہ دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔ ہم نے دور سے دیکھا کہ حضرت بعد سلام ومصافحہ کے اس سے کچھ باتیں کرتے ہوئے نشستگاہ کی طرف تشریف لارہے ہیں، دروازے کے قریب پہونچ کر اس سے پوچھا کہ کوئی کام ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ مقصد صرف زیارت وملاقات بتایا، حضرت کمرے میں داخل ہوئے تو پھر اس سے پوچھا، اس نے اب بھی وہی جواب دیا، پھر آپ اپنی جگہ بیٹھ گئے، اور کچھ علمی باتیں کرنے لگے ۔قدرے وقفہ کے بعد پھر اس سے دریافت کیا کہ کوئی کام ہے؟ اس نے پھر نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا بہت اچھا ملاقات ہوگئی، اب رخصت! یہ کہہ کر آپ نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ اب اس نے کہا کہ ایک تعویذ چاہئے، آپ نے فرمایا، بھائی میں نے کتنی بار آپ سے پوچھا، مگر آپ نے کچھ نہیں کہا، پھر میری طرف مخاطب ہوئے کہ کیا کریں، یہ حال ہے، لیکن اسے برداشت کرنا ہے، پھر اسے تعویذ عنایت فرمایا۔

مولانا کو جب بھی بیٹھے ہوئے دیکھا، دوزانو ہی دیکھا، گھنٹوں اسی طرح بیٹھے رہتے، نہ ٹیک لگاتے، نہ مسند کا سہارا لیتے، البتہ بعد عصر کی مجلس میں مسند کا ہلکا سا سہارا لیتے، ہماری حاضری کے دوران صبح اشراق کے تھوڑی دیر بعد سے غالباً دس بجے تک اور پھر بعد ظہر، نماز عصر تک بیٹھنے کا معمول رہا، اور بعد نماز عصر بھی کمرے

کے باہر بیٹھتے رہے مدرسہ کے ایک استاذ نے بتایا کہ ادھر بہت عرصہ سے عصر بعد نشست کا دستور نہ تھا، آپ حضرات کی خاطر سے اس وقت بیٹھ جاتے ہیں، حضرت کی اس عنایت خاص کا دل پر گہرا نقش قائم ہوا۔

ہم لوگوں کو ان تینوں مجالس میں حاضری کا موقع ملتا رہا، ان میں زیادہ تر تصوف وسلوک، معرفت ومحبت اور قرآن وحدیث کے دقائق واسرار پر گفتگو فرماتے تھے، اسی عصر کے بعد کی مجلس میں ایک روز کانپور کے رہنے والوں کا ایک مختصر سا قافلہ مدراس سے لوٹتا ہوا، جلال آباد حاضر ہوا، اس قافلہ میں تاجر حضرات تھے، اور ایک عالم بھی تھے، آپ نے فرداً فرداً سب پر توجہ فرمائی، اور دریافت کیا کہ کسی خاص ضرورت سے آنا ہوا، ایک صاحب نے عرض کیا جی ہاں ایک ضرورت سے ہم لوگ حاضر ہوئے ہیں، اس کے جواب میں مولانا کے کمال انتظام اور کمال عنایت دونوں کا ظہور ہوا، فرمایا کہ کیا ضرورت ہے؟ یہاں کہہ سکتے ہوں، تو یہیں کہئے، اور اگر اس کیلئے خلوت کی ضرورت ہو تو اندر چلئے، پھر خود ہی حاضرین مجلس سے فرمایا کہ بعض باتیں آدمی مجمع میں کہنے سے شرماتا ہے، اللہ اکبر! کیا حسن اخلاق ہے؟ انھوں نے مجلس میں ہی جو کچھ عرض کرنا تھا کیا، ملنے اور بات کرنے کا ایسا بہتر انتظام بہت کم دیکھنے میں آیا۔

دوسری خاص بات جس کا احساس نمایاں طریقے سے ہوا، بلکہ کہنا چاہئے کہ حضرت مولانا کی کتابِ زندگی کا وہ سب سے جلی عنوان ہے، وہ ہے کمالِ حلم وتحمل اور غایت صبر وضبط، حلم خدا تعالیٰ کی پسندیدہ ترین صفت ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگیاں اس صفت علیا کے بہتری نمونے ہیں، اسی سے کمال اخلاق کا ظہور ہوتا ہے، اور ہر شخص جانتا ہے کہ ''خُلق عظیم'' ہی انسانیت کی معراج ہے، حضرت مولانا اخلاق حسنہ کے پیکر جمیل تھے، ہر ایک سے خواہ وہ کتنا ہی معمولی شخص

ہو نہایت خندہ جبینی سے ملنا، اس کی ضرورت کو محبت سے دریافت کرنا، پھر دلجمعی کے ساتھ اس کو پورا کرنا، تکلیف دہ باتوں کو بخوشی سہ جانا اور چہرہ پر شکن نہ آنا، ہمہ وقت کا دستور تھا۔

مولانا کی یہ خصوصیت جاننے والوں میں اس درجہ معروف اور اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ نہ صرف یہ کہ لوگ اس کو جانتے تھے، بلکہ حضرت کے فیض صحبت سے جو بھی بہرہ اندوز ہوا ہے، وہ اس رنگ میں رنگا ہوا ہے، غصہ تو جیسے مولانا کو آتا ہی نہ تھا۔

ایک صاحب جو غصہ کی وجہ سے بیشتر اوقات شعلہ بداماں رہتے تھے، ذرا خلاف مزاج بات ہوئی کہ تیغ برہنہ ہو جاتے، تقدیر نے انھیں حضرت کی خدمت میں پہونچادیا، یہاں سب سے پہلے انھیں اپنے اسی رفیق زندگی کو صدائے الفراق سنانی پڑی، کچھ دنوں کے بعد ان کے اس دیرینہ ہمدم کو ساتھ چھوڑ ہی دینا پڑا، ان کے ایک بے تکلف دوست نے ایک بار پوچھا کہ آپ کا وہ غصہ کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ حضرت کے یہاں اس کی سمائی نہیں، ان کے یہاں تو عجب دستور ہے، یہ نہیں کہ غصہ آئے اور اسے پیا جائے۔ جی نہیں، وہ آئے ہی کیوں، اسے اتنا موقع کیوں دیا جائے، کہ وہ دراندازی کرے۔

غور کیجئے تو یہ بات بالکل بجا ہے، نہ جانے کتنی بدخُلقیوں کی جڑ یہی حضرت ہیں، غصہ آیا، اور آدمی خود بھی زیروزبر ہوا، اور دوسروں کو بھی تہ وبالا کیا، اگر اسی پر قابو ہو جائے، تو آدمی اچھا بھلا صاحب اخلاق ہو جائے، حضرت کے یہاں اس کی خوب اصلاح ہو جاتی تھی۔

بعد عصر کی اسی مجلس میں اسی روز، جس دن اہل کانپور کا قافلہ آیا تھا، ایک شخص میلے کچیلے کپڑے پہنے، بے ہنگم صورت آیا، اور سلام کر کے حضرت مولانا سے لگ کر

بیٹھ گیا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مسافر ہے اور سائل، اپنے اہل وعیال کو لے کر کہیں دور سے آیا ہے، اور کہیں آگے جانا ہے، پیسے ختم ہو گئے ہیں، آپ نے اس کی پوری بات توجہ سے سنی، اور اس پر کوئی ردوقدح اور جرح نہیں کی، جیسا کہ عام طور سے ایسے اجنبی سائلوں سے کی جاتی ہے، آپ اس کی باتیں سن کر اٹھے، اور اندر جا کر ایک اچھی خاصی رقم لے کر تشریف لائے، اور قدرے جھک کر دونوں ہاتھ سے نہایت تعظیم سے اسے پیش کی، اور لجاجت سے فرمایا کہ یہ میری طرف سے آپ قبول کر لیں، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائیں، یہ فرما کر اسے رخصت کیا۔

حاضرین مجلس اس معاملے سے بہت متاثر ہوئے، واقعی اخلاق وانسانیت کا پیکر جمیل، جلال آباد میں دیکھنے کو ملا، تیسری خصوصیت جو اس مختصر سی ملاقات میں بڑی قوت کے ساتھ محسوس ہوئی، وہ مولانا کی شان علم تھی، جس وقت ہم لوگوں کی حاضری خدمت میں ہوئی تھی، تو درس وتدریس کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا، مگر علم کے استحضار کا یہ عالم تھا کہ بات بات سے علم کا نور دمکتا تھا۔ ایک روز بعد نماز عصر، مجلس میں توحید کے متعلق ایسی پُر مغز اور فاضلانہ تقریر فرمائی کہ طبیعت وجد میں آ گئی، میں نے پوری تقریر نہایت غور سے سنی، اور بعد مغرب قریب قریب مولانا کے الفاظ میں اسے لکھ لیا اور صبح کی حاضری میں پیش خدمت کیا کہ اسے ملاحظہ فرما لیں، اور کہیں غلطی ہو گئی ہو تو اس کی اصلاح فرما دیں، حضرت نے کمال شفقت سے اسے حرفاً حرفاً ملاحظہ فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ ماشاء اللہ آپ کو علوم سے مناسبت ہے۔

یہ سطریں جب لکھ رہا ہوں، تو اس تقریر کو میں نے کاغذات میں تلاش کیا، نہ جانے میری غفلت نے اسے کہاں ڈال دیا، باوجود تلاش بسیار کے نہیں ملی، افسوس ہو رہا ہے کہ اس کے مضامین بھی اب ذہن میں محفوظ نہیں ہیں۔ انا للہ وانا الیہ رجعون

حضرت مولانا کی تصنیفات، مواعظ اور ملفوظات شائع ہو چکے ہیں، ان کے

مطالعہ سے حضرت کی وسعت علم، استحضار اور شانِ معرفت کا اندازہ اہل نظر کر سکتے ہیں۔

یہ تو وہ چیزیں ہیں، جنھیں ہر شخص، مولانا سے ملنے اور کچھ وقت ان کی صحبت میں گزارنے کے بعد محسوس کر لیتا تھا، لیکن حضرت مولانا کی اصل خصوصیت یہ تھی کہ وہ راہِ طریقت کے زبردست سالک تھے، حضرت حکیم الامتؒ کے صحبت یافتہ بلکہ تربیت یافتہ، تھانہ بھون کی تربیت باطنی نے انھیں قلبی وروحانی کن احوال ومقامات پر پہونچا دیا تھا، اس کا اندازہ کسی صاحب بصیرت ہی کو ہو سکتا ہے، ہم جیسے لوگ کا ہی سمجھ سکتے ہیں، تاہم میں وہاں برابر اس تجسس میں لگا رہا کہ اس سمندر کا بھی کوئی قطرہ چھلکے۔

میری بے بصیرتی نے مجھے کچھ سمجھنے نہیں دیا، تاہم یہ بات بداہۃً محسوس ہوتی رہی کہ حضرت مولانا قرآن کی اس آیت کے دلآویز نمونہ تھے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْناً وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلاماً.

ترجمہ: اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں، اور جب جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں، تو سلامتی کی بات کہتے ہیں۔

مولانا کی ہر ہر حالت سے عبدیت، فنائیت، تواضع، خود شکنی اور خاکساری کا ظہور ہوتا تھا، میں نے دیکھا کہ حضرت نماز کیلئے مسجد تشریف لے جا رہے ہیں، دو چھوٹے بچے آپ کے ساتھ ہیں، اور آپ دونوں کے ہاتھ پکڑے ایسی محبوبانہ چال سے چل رہے ہیں کہ مجھے بے ساختہ ترمذی شریف کی وہ روایت یاد آ گئی، جس میں ہے کہ: **اذا زال زال تقلعاً تکفؤاً ویمشی ھوناً ،ذریع المشیۃ اذا مشیٰ کأنما ینحط من صببٍ** (شمائل ترمذی، ص:۲)

قدم قوت سے اٹھتا اور جھک پڑتا تھا دھرنے میں
بلندی سے جو ہیئت ہوتی ہے نیچے اترنے میں
متانت چال میں تھی پاؤں رکھتے تھے بڑھا کر کے
تواضع سے نظر نیچی کئے سر کو جھکا کر کے
تھی سرعت چال میں ہمراہ چل سکتا نہ تھا کوئی
خرام ناز کی کھینچے بھلا تصویر کیا کوئی (۱)

مولانا کا انداز رفتار ٹھیک اس حدیث کے مطابق تھا، میں دیر تک کھڑا دیکھتا رہا، دل کہہ رہا تھا کہ اس شخص نے اپنی پوری سیرت سنت کے سانچے میں ڈھال لی ہے

مولانا نے اس تاریک دور میں جب کہ غیر تو غیر ہیں، اپنے بھی کتاب وسنت کے ظواہر الفاظ پر انحصار کر کے باطنی حقائق اور روحانی کیفیات سے بھڑک رہے ہیں ، دوسروں کو بھڑکا رہے ہیں، تصوف کے نام سے کیفیت احسانی کی جو خدمت عرصۂ دراز سے ہوتی چلی آرہی ہے، اس کو اَحداث (نوخیز) بدعت کا نام دے کر اس سے وحشت پھیلا رہے ہیں، امت کا ایک بڑا طبقہ اسے خواہشات نفس پر ناگوار پابندی سمجھ کر اس کے فنا کر دینے پر تُلا ہوا ہے، ایسے وقت میں مولانا نے اسلاف کے اس طریقہ کو زندہ رکھا، حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس دور آخر میں تصوف وسلوک کی تجدید فرمائی، مولانا نے ان کے تجدیدی کارناموں کو تازہ رکھا، اور ٹھیک اسی نہج پر اپنے متوسلین کی تربیت فرماتے رہے، جس پر ان کی تربیت تھانہ بھون میں ہوئی تھی۔

یہ طریقت وہ نہیں ہے، جسے شریعت کے مقابل کہا جائے، یہ طریقت کیا ہے ؟ مقاصدِ شریعت کی تکمیل ہے، آدمی ظاہری طور پر احکام الٰہی کی بجا آوری کر لیتا ہے لیکن عین ممکن ہے کہ اس کی توجہ قلب کی طرف نہ ہو، اس کا دل **أن تعبد الله كأنك تراه** (تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اسے دیکھ رہے ہو) کی احسانی کیفیت سے محروم ہو، اسے اللہ کی محبت کی حلاوت نصیب نہ ہو، تقویٰ کی پاکیزگی سے اس کا دامنِ نظر خالی ہو، ایسا ہوسکتا ہے، ہوسکتا ہے کیا معنیٰ ، ہوتا ہے، آدمی خدا کے حضور ہاتھ باندھے کھڑا ہے نگاہ اس کی سجدہ گاہ پر ہے، زبان سرگرم تلاوت ہے، بدن سراپا سکون ہے مگر اس کا دل دنیا جہان کی خاک چھانتا پھر رہا ہے، جسے حاضر ہونا تھا، وہی غائب ہے، جسے ساکن ہونا تھا وہی متحرک ہے، جسے پابند ہونا تھا، وہی آوارہ ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عین اس وقت جب انسان خوف خدا، محبت الٰہی کے حکایات بیان کرتا ہے، اس کے دعوے بھی کرتا ہے، ٹھیک اسی وقت اس کا باطن درندہ بنا ہوا ہوتا ہے، یہ محض احتمال نہیں جس کا جی چاہے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لے، یہ حقائق اسے سورج کی طرح نظر آئیں گے۔

نفس کی یہ وہ شرارتیں ہیں، جن کی درستگی کے بغیر انسان خدا کو منہ دکھانے کے لائق نہین ہوسکتا، حضرات مشائخ انھیں کی اصلاح کر کے، بنا سنوار کر حضوریٔ حق کے قابل بناتے ہیں، تو دنیا ان سے خفا ہوتی ہے، اس سے انکار نہیں کہ بہت سے برخود غلط افراد، اس راہ سے ناجائز مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ نااہلوں کی نااہلی سے کسی ضروری چیز کو نظر انداز کر دینا معقولیت کے خلاف ہے۔

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، حضرات مشائخ نے جن لوگوں کو تربیت کر کے سنوار دیا ہے، ان سے ملئے انھیں پرکھئے، کڑی آزمائشوں میں ان کی زندگی کا مطالعہ کیجئے، دور بیٹھے قیاس آرائیاں کرنے، پھبتیاں کسنے اور بدگمانیوں کی پرورش کرتے رہنے کا اعتبار نہیں قریب جا کر دیکھئے۔ انشاء اللہ انسانیت کی بادِ نسیم چلتی ہوئی پائیں گے، دردمند دل لے کر جایئے گا، اور خوش وخرم واپس آیئے گا، زخم

---

(۱) حلیۂ نبی اکرم ﷺ، مؤلفہ قاری عبدالسلام صاحب مظؔہر ہنسوری، ص: ۲۲

جگر لے کر جایئے گا، اور راحت جگر لے کر آیئے گا، ان حضرات کی خدمت میں ایسی خنک حلاوت محسوس ہوگی کہ روح نہال ہوجائے گی، بخدا انسانیت کی وہ معراج نظر آئے گی کہ دوسرے بزعمِ خود بڑے بڑے قد آور بونے لگیں گے۔ لطف یہ کہ انھیں خود اپنی رفعت وعظمت کا ذرا بھی احساس نہ ہوگا۔ آج خانقاہیت اور تصوف کا مذاق اڑانے والے بتائیں کل کی وہ بڑی بڑی مایہ ناز ہستیاں جن کے تجدیدی کارناموں کے چرچے سے دنیا معمور ہے، کس بساط علم وعمل سے اٹھتی، اور آفتاب وماہتاب بن کر چھاتی رہیں۔

مولانا کے یہاں تصوف بڑا اسلجھا ہوا، مرتب اور حدود شریعت کا محافظ وامین تھا۔ یہ تصوف روحِ شریعت ہے۔ اس کی بنیاد تقویٰ اور محبت الٰہی ہے۔ اس تصوف کا سارا زور اس پر ہے کہ: **ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کلہٗ واذا فسدت فسد الجسد کلہٗ ألا وهی القلب** (بلاشبہ بدن میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہوجائے تو بدن کا سارا نظام درست ہوجائے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سب کچھ بگڑ جائے سن لو وہ قلب ہے)

مولانا کی تعلیمات اور طرز تربیت کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، اس کیلئے ان کے ملفوظات اور تصنیفات کا مطالعہ کرنا چاہئے، نیز ان کے خلفاء سے ربط قائم کرنا چاہئے جو مولانا کے حسن تربیت کے صدقے میں، انھیں کے نقش قدم پر تربیت واصلاح کا کام کر رہے ہیں۔

ہمارے ایک دوست جناب ضمان اللہ ندیؔم صاحب دربھنگوی نے قرآن کریم کی عبارت سے تاریخ وفات نکالنے کی سعی کی ہے، اور اس میں کامیاب رہے ہیں، انھوں نے تاریخ وفات کے لئے ذیل کی عبارت قرآنی ارسال کی ہے۔

أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللهِ۔۔۔۱۴۱۳ھ۔۔۔

ایک قطعہ بھی تحریر کیا ہے، جس میں تاریخ وفات بطرز زبر وبینہ(۱) نکلتی ہے۔

زیب سجادۂ مرشد تھانوی   وہ مسیح خدا برگزیدہ ولی
فکر کی زبروبینہ میں ندیؔم   حق سے آئی صدا ''وادخلی جنتی''
۱۴۱۳ھ

(۱) زبروبینہ کا مطلب یہ ہے کہ حروف کے نام میں جتنے حروف آتے ہیں، ان سب کے اعدا لئے جائیں، مثلاً الف کے اعداد یوں لئے جائیں گے۔ الف، کے ۱۔ لام کے ۳۰۔ ف، کے ۸۰، پس کل ۱۱۱ ہوئے، اسی طرح تمام حروف کے اعداد لئے جائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(مجلّہ ''المآثر'' مئو، ج:۱ شمارہ:۳ رجب تا رمضان ۱۴۱۳ھ مطابق جنوری تا مارچ ۱۹۹۴ء)

کثرتِ عبادت عزیمت یا بدعت؟
''حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ کے قلم اعجاز رقم سے''
کثرت عبادت کو بدعت کہنے والوں کیلئے نہایت مُسکت اور شافی جواب
ناشر:۔ فرید بک ڈپو دہلی

استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب

بمھوری نور اللہ مرقدہٗ

وفات: ۲۹؍محرم ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۰؍جولائی ۱۹۹۳ء

ایک حادثہ جو ہر اس شخص کے لئے یقینی ہے جس نے اس دنیائے ناپائیدار میں قدم رکھا ہے اور جس نے زندگی کی آنکھ کھولی ہے، بہرحال اسے اس حادثہ سے دوچار ہونا ہے، ہر شخص اللہ کے پاس سے ایک لکھی لکھائی عمر لے کر آیا ہے، لیکن نہ اسے خبر کہ وہ عمر کتنی ہے؟ اور نہ دوسروں کو پتہ کہ وہ ہمارے درمیان کتنے دن رہے گا؟ لیکن اس کے باوجود آدمی صحت وتندرستی دیکھ کر، قوت وطاقت دیکھ کر، جوانی ونوعمری دیکھ کر ایک اندازہ کرتا ہے کہ ابھی حیات دراز ہے، ابھی اور جینا ہے، ابھی مرنے والی نہ عمر ہے اور نہ صحت ہے، اور اسی اندازے سے وہ مطمئن رہتا ہے اور ایسا مطمئن رہتا ہے جیسے وہ اس ''حادثۂ ناگزیر'' کو ٹالنے میں کامیاب ہو چکا ہو مگر پھر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنی عمر کی گنتی پوری کر کے چل دیتا ہے تو وہ تو اپنا اعمالنامہ لے کر خدا کے حضور پہونچ جاتا ہے، لیکن اسے دیکھنے والے، اس سے تعلق رکھنے والے اور اس کی محبت میں جینے والے ہکا بکا ہو کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگتے ہیں کہ یہ کیا ہوا؟ ابھی تو بالکل صحت مند تھے، ابھی عمر ہی کیا تھی؟ ابھی نوجوان تھے، ابھی تو جوانی ڈھلی ہی تھی، بڑھاپا کہاں آیا تھا؟ ارے اس کا تو وہم بھی نہ تھا، لیکن اب تو ہو گیا جو ہونا تھا۔

آج قلم ایسا ہی ایک حادثہ لکھنے پر مجبور ہو رہا ہے، کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ

ہمارے محبوب استاذ، بہترین مشیر، ہمہ تن شفقت ومحبت، رہبر ورہنما حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمھوریؒ اس طرح اچانک ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلدیں گے۔ کتنے صحت مند تھے؟ کیسے توانا تھے؟ صرف بال ہی تو سفید ہوئے تھے بڑھاپے کا اور تو کوئی نام ونشان بھی نہ تھا، کیا بیماری تھی انھیں؟ بیماری تو انھیں محض چھو کر گذر جاتی تھی ابھی کتنے دن ہوئے مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کی شوریٰ کی میٹنگ میں آئے تھے، کتنے ہشاش بشاش تھے، رات میں دیر تک مجلس شوریٰ کا اجلاس چلتا رہا، انھیں کی صدارت میں اجلاس ہو رہا تھا۔ ان کی رائے سب کیلئے قابل تسلیم ہوتی تھی۔ صبح انھیں واپسی کی جلدی تھی، لیکن مدرسہ کا ایک ضروری کام انھیں پر موقوف تھا، نماز فجر پڑھ کر اس طرح یکسو ہو کر اس کے لئے بیٹھے، جیسے انھیں اور کوئی کام نہیں، پورے انشراح وانبساط کے ساتھ اس معاملہ کو طے کیا اور پھر یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے جانے کے لئے دیر سے تیار رہے ہوں، کون جانتا تھا کہ حالت صحت کا یہ آخری دیدار ہے۔

۲۳؍محرم الحرام ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۴؍جولائی ۱۹۹۳ء کو اچانک اطلاع ملی کہ کل مولانا پر فالج کا حملہ ہوا، غسل کرنے لئے حمام میں تشریف لے گئے تھے وہیں یہ حملہ ہوا۔ کسی کو خبر نہ تھی، کئی گھنٹے کے بعد لوگوں کو احساس ہوا، دروازہ توڑ کر اندر گئے تو گرے ہوئے تھے، ہوش قائم تھا۔ پوچھنے پر جواب بھی دیا۔ مگر آہستہ آہستہ ہوش کم ہوتا گیا، معلوم ہوا کہ اعظم گڈھ کے ایک شفاخانے میں داخل ہیں۔ دل دھک سے ہو کر رہ گیا، بھاگم بھاگ اعظم گڈھ پہونچا۔ آہ! کہ وہ شفقت وکرم کا پیکر مجسم، جس کے چہرے پر اپنے عزیزوں کو دیکھتے ہی خوشی ومسرت کا نور دمک اٹھتا تھا آج اس طرح بے سدھ پڑا ہوا ہے، کہ اپنے تن بدن کا ہوش نہیں۔ بایاں حصہ بالکل مفلوج ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ دایاں ہاتھ اور دایاں پیر حرکت کر رہا ہے۔ میرا مولانا سے

شاگردانہ تعلق اٹھائیس، انتیس، سال سے ہے، لیکن میں نے کبھی انھیں ننگے بدن نہیں دیکھا تھا۔ آج صرف ایک لنگی بندھی ہوئی جو نظر آئی تو، طبیعت بے قابو ہوگئی۔ قریب جا کر دھڑکتے ہوئے دل سے سلام کیا، تو سلام کا جواب دیا۔ نام بتایا تو اچھا کہا مگر آنکھیں نہیں کھول سکے، چند گھنٹے ان کی خدمت میں رہا۔ پھر واپس چلا آیا کہ کل پھر آؤں گا۔ کل پہونچا تو معلوم ہوا کہ حالت نازک ہوتی جا رہی تھی اس لئے ڈاکٹروں کے مشورے سے لوگ رات ہی میں لکھنؤ لے گئے پھر لکھنؤ سے کبھی امید کی خبر آتی اور کبھی یاس کی بات آتی۔

آخر ۲۹؍محرم ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۰؍جولائی ۱۹۹۳ء کو بعد نماز مغرب اطلاع آئی کہ مولانا کا وصال ہوگیا، سنتے ہی سر چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دل صدمے سے چور چور ہوگیا رات کس طرح گذری بس کچھ نہ پوچھئے۔ نیند آتی تھی اور مولانا کا شاداب چہرہ سامنے آجاتا تھا بس آنکھ کھل جاتی تھی۔ صبح سویرے بھور پہونچا۔ سوگواروں کا ہجوم تھا، اکثر آنکھیں سرخ تھیں، صاحبزادہ گرامی قدر مولانا محمد راشد سلّمہٗ کو دیکھا تو آنکھیں برس پڑیں۔ ایک جملہ بھی تو تسلی کا ادا نہ ہوسکا۔ سب صورت سوال بنے ہوئے تھے کہ اچانک یہ کیا ہوگیا؟ ہر ایک چہرہ اداس تھا، عوام بھی تھے، خواص بھی تھے، علماء بھی تھے، طلبہ بھی تھے، لیکن سب کے چہروں پر رنج واندوہ کی پرچھائیاں تھیں۔ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور۔ جس کے وہ عملاً سرپرست تھے۔ کے اساتذہ وطلبہ آ گئے تھے۔ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور کے طلبہ واساتذہ بھی تھے۔ ان کے علاوہ مدرسہ منبع العلوم خیرآباد، مدرسہ انوار العلوم جہانا گنج، مدرسہ عین الاسلام نوادہ کے اساتذہ و منتظمین پہونچ گئے، جامعہ رشیدیہ بھور کے تو سبھی حضرات تصویر غم بنے ہوئے تے۔

مولانا کو غسل دیا گیا، کفن پہنایا گیا، کتنا نرم اور گداز بدن تھا، موت نے ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی تھی، بدن جیسا زندگی میں تھا پس مرگ بھی ویسا ہی رہا۔

کیا مرے ہوئے آدمی کا چہرہ ایسا ہی ہوتا ہے؟ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرام کی نیند سو رہے ہوں۔ چہرے پر تازگی وشادابی تھی۔ نماز جنازہ ان کے استاذ مکرم حضرت مولانا عبدالمنان صاحب مدظلہٗ العالی نے پڑھائی، اور ساڑھے دس بجے دن میں یہ گنج گرانمایہ تہِ خاک چھپا دیا گیا۔ ان سارے مراحل میں ان کا یہ خادم وشاگرد شریک رہا، اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے۔ ان کی روح کو سکون واطمینان بخشے اور انھیں جنت میں جگہ دے۔

دفن کر کے آیا تو ذہن میں ماضی کے دریچے کھل گئے۔ پچھلی یادیں ایک ایک کر کے آنے لگیں۔ دل شکستہ اور زخم خوردہ ہے، قلم تھرتھرا رہا ہے، لیکن اس کے باوجود تقاضا ہے کہ ان یادوں کو کاغذ کے حوالہ کر دوں۔ شاید دل محزوں کو کچھ تسلی ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شوال کے مہینے سے عربی مدارس اپنا تعلیمی سال شروع کرتے ہیں۔ داخلہ کے خواہشمند طلبہ ابتداء ماہ شوال میں ان مدارس کا رُخ کرتے ہیں۔

ہجری سن غالباً ۱۳۸۴ھ اور عیسوی ۱۹۶۴ء رہا ہوگا۔ ایک ڈرا سہا طالب علم اپنے ایک رفیق اور رہنما کو لے کر جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخلہ کے لئے پہونچا، ناظم مدرسہ نے حکم دیا کہ مولانا محمد مسلم صاحب کو جا کر امتحان داخلہ دو۔ وہ مولانا کی تلاش میں نکلا تو دیکھا کہ ایک صاحب ہینڈ پائپ سے پانی نکال رہے ہیں۔ کسی نے بتایا کہ یہی مولانا محمد مسلم صاحب ہیں۔ متوسط قد، تندرست گٹھا ہوا جسم، گہرا سانولا رنگ، پورے چہرے پر خوبصورت بھری ہوئی سیاہ داڑھی، آنکھیں مخمور سی۔ چہرہ بارعب، لمبا کرتا، تنگ مہری کا پائجامہ ٹخنوں سے اونچا، سر پر دوپلی خوبصورت ٹوپی، کندھے پر بڑا سا رومال، بہت ہی جامہ زیب نظر آئے۔ انھوں نے

کھڑے کھڑے ہی امتحان لیا۔ صرف تین سوال کئے پہلے دوسوال کا جواب دے دیا مگر تیسرے کا جواب نہ بن پڑا کیوں کہ جس کتاب کا سوال انھوں نے کیا تھا وہ اس کی پڑھی ہوئی نہ تھی اسے عربی دوم میں داخلہ لینا تھا۔ لیکن تعلیمی لحاظ سے وہ اس لائق نہ تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ رعایتاً عربی دوم میں تمہارا داخلہ کرلیا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ فلاں کتاب پڑھ ڈالو۔

یہ مولانا سے میری پہلی ملاقات تھی ، ایک ہفتہ کے بعد تعلیم شروع ہوئی تو میرے درجہ کی ایک کتاب ’’علم الصیغہ‘‘ کا سبق ان کے پاس تھا۔ مولانا نہایت اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے ۔ بڑے بارعب وباوقار ! پڑھاتے ایسا تھے جیسے گھول کر پلا بلا دینا چاہتے ہوں ۔ ان کا انداز تدریس نمونہ کا تھا۔ مشکل سے مشکل بات کو اس طرح سمجھاتے تھے کہ اس کے مشکل ہونے کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا تھا، طالب علم کے ذہن میں وہ بات اس طرح بیٹھ جاتی ، جیسے اسے پہلے سے معلوم رہی ہو میں نے مولانا سے چارسال تعلیم حاصل کی ہے۔ پڑھانے کا انداز انھیں سے سیکھا خود مقرر و خطیب نہ تھے ،لیکن بہتوں کو خطیب بنادیا جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں مولانا کا تدریسی اور تربیتی کمال ظاہر ہوا، باوقار اور بارعب بھی بہت تھے، مہربان و بااخلاق بھی بہت تھے ہر طالب علم ان سے ڈرتا تھا اور ان سے محبت بھی کرتا تھا ،طلبہ فجر سے پہلے سوئے ہوتے ان کی آواز مردوں میں جان ڈالدیتی اور ہر طرف بیداری کی ہلچل پیدا کردیتی۔

پڑھنے کے لئے طالب علموں کی ہمت افزائی ایسے ایسے طریقوں سے کرتے کہ وہ دیوانہ وار تعلیمی محنت میں مشغول ہوجاتے طلبہ سے رات رات بھر پڑھوا دینا ان کے لئے معمولی بات تھی

مولانا مدرسہ کی مدرسی کے ساتھ ملی مسائل کا بھی پورا شعور رکھتے تھے اور ابتدا

ہی سے مسلمانوں کے ملکی اور بین الاقوامی احوال ومعاملات میں دلچسپی لیتے تھے اور اس باب میں انھیں جمعیۃ علماء ہند کی رہنمائی پر یقیناً کامل تھا۔ انھوں نے ہمیشہ جمعیۃ علماء ہند کے جھنڈے کے نیچے کام کیا اور پورے شرح صدر کے ساتھ کیا۔ انھوں نے یہی روح مدرسہ کے تمام طلبہ میں بھی پھونک رکھی تھی۔

جن دنوں صدر ناصر نے اسرائیل سے شکست کھائی تھی اور قبلہ اول (**حفظها الله واعادها الى المسلمين**) پر یہودیوں کا قبضہ ہوگیا تھا تو ساری دنیا کے مسلمان بلبلا اٹھے تھے ۔ ہر مسلمان غمزدہ تھا، ہندوستان میں جمعیۃ علماء ہند نے اس صدمے کی چوٹ کو سب سے زیادہ محسوس کیا۔ اسرائیل نے فلسطینیوں کی ایک بڑی تعداد کو ان کے گھروں سے نکال کر بے گھر کردیا تھا۔ یہ خانماں برباد لوگ کیمپوں میں ، آسمان کے نیچے دھوپ میں بے سایہ کے پڑے ہوئے تھے ۔ قبلۂ اول کی بازیافت کا مسئلہ تو تھا ہی فوری طور پر ان پناہ گزیں بے پناہوں کی امداد واعانت لا مسئلہ سب سے اہم تھا، دنیا کے تمام مسلم ممالک اس کار خیر میں لگے ہوئے تھے ۔ ہندوستان کا مسلمان گو کہ مفلوک الحال ہے ، مگر حوصلہ بہت بلند ہے ، اس نے امداد وتعاون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس وقت کے ناظمِ عمومی جمعیۃ علماء ہند اور اب کے صدرِ گرامی حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہٗ کی اپیل پر مسلمانوں نے اپنی بساط بھر بلکہ کچھ زیادہ ہی تعاون کیا۔

استاذ محترم نے مظلومین کی اعانت کے لئے طالب علموں میں وہ ولولہ پیدا کیا کہ بیشتر طلبہ اس کیلئے مستعد اور سرگرم کار ہوگئے ،مولانا نے ایک مختصر سی مگر نہایت پُرجوش تقریر لکھ کر طلبہ کو دیدی ۔ انھوں نے اسی تقریر کی روشنی میں آس پاس قریہ جات اور گاؤں میں ایک آگ سی لگادی، طلبہ کی کوششوں سے کافی سرمایہ جمع ہوگیا جو دفتر جمعیۃ علماء ہند میں بھیج دیا گیا اور وہاں سے مستحقین کو پہونچادیا گیا۔

مولانا کو جمعیۃ علماء کے اکابر سے بالخصوص شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ سے اوران کے خانوادے سے جو خلوص اور قلبی لگاؤ تھا اور جیسی فدائیت وفنائیت تھی، اس کو عشق کے علاوہ اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، میں نے اٹھائیس، انتیس سال کے اس عرصہ میں کبھی نہیں دیکھا کہ مولانا کا یہ جذبۂ عقیدت ومحبت کسی بھی سرد وگرم سے متاثر ہوا ہو یا اس میں کبھی کسی طرح کا تغیر ہوا ہو، مولانا طبیعت کے اور قلب کے نہایت پُختہ اور مضبوط انسان تھے۔ فیصلہ کرتے تو بہت سوچ کر اطمینان کے بعد کرتے اور جو فیصلہ کرلیتے اس سے پیچھے ہٹنے کا تصور تک نہ کرتے۔ قلبی لگاؤ سبھی بزرگوں سے تھا، عقیدت کیش سب کے تھے، مگر حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کا نام آتا تو سر سے پاؤں تک ان پر ایک کیف اور سرور چھا جاتا۔ ایسا کیف اور ایسا سرور جو دوسروں کو بھی متاثر کردیتا۔ خاکسار جب مولانا کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوا تو حضرت کا نام ان کی زبان سے بکثرت سنا، میں اس وقت تک حضرت مدنیؒ پر جو کچھ لکھا گیا تھا، تقریباً سب پڑھ چکا تھا، لیکن مولانا کی زبان سے جب حضرت مدنیؒ کا نام اور تذکرہ سنتا تو کچھ اور ہی لطف آتا۔ ایک دن فرمانے لگے کہ تم لوگوں نے حضرت مدنیؒ کو دیکھا نہیں۔ انھیں دیکھ کر صحابہ کرام یاد آتے تھے، ایسا محسوس ہوتا کہ حضرت مدنیؒ صحابہ کی مثال ہوں۔

اسی طرح حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم سے بھی والہانہ شیفتگی کا معاملہ تھا۔ ایک دن بہت دیر تک ان کا ذکر عقیدت ومحبت سے کرتے رہے، یاد رہے کہ یہ میری طالب علمی کے دور کی بات ہے، تو میں نے ان سے پوچھ لیا کہ آپ مولانا کے شاگرد ہیں؟ فرمایا میں نے ان سے کچھ نہیں پڑھا ہے، لیکن میرا تعلق شاگردانہ ہی ہے، پھر میں نے پوچھا کہ آپ ان سے بیعت ہیں؟ فرمایا میں بیعت نہیں ہوں، لیکن عقیدت مریدوں سے بڑھ کر رکھتا ہوں، بعد میں حضرت مولانا سے بیعت ہوگئے تھے۔

مدرسہ میں جمعیۃ الطلبہ کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا۔ یہ بات زیر بحث تھی کہ جلسہ کی صدارت کے لئے کس کو دعوت دی جائے، حضرت مولانا اسعد مدنی اور مولانا اخلاق حسین قاسمی کا نام منتخب ہوا۔ مولانا قاسمی اس وقت تک جمعیۃ علماء سے الگ نہیں ہوئے تھے، غالباً یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے، جلسہ دو دن کا تھا، پہلے دن استاذ محترم کے خلوص اور ہم لوگوں کی خوش قسمتی سے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے تینوں صاحبزادگان تشریف لائے۔ مولانا ارشد مدنی اس وقت جامعہ قاسمیہ گیا میں مدرس تھے، ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی اسجد میاں بھی آئے، مولانا ارشد میاں جوان رعنا تھے اور اسجد میاں بچے تھے۔ اس دن حضرت الاستاذؒ کی مسرت کا اندزہ نہیں لگایا جاسکتا تھا، انھیں گویا زندگی کی عظیم ترین مسرت حاصل ہوگئی تھی۔

حضرت الاستاذ کو جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ گہری وابستگی تھی، اس کے ہر پروگرام میں نہایت انشراح کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ان کا یہ تعلق انتہائی مخلصانہ تھا انھوں نے نہ کبھی عہدے کی خواہش کی اور نہ خود کو کبھی نمایاں کرنے کا قصد کیا وہ ہمیشہ خادمانہ کام کرتے رہے اور اسے اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے رہے، ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ جب جمعیۃ کے کسی پروگرام میں شریک ہوتے تو ان کے چہرے پر وہی مسرت اور طمانینت جھلکتی جو کوئی عبادت گذار اپنی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ جمعیۃ سے وابستگی میں ان کی کوئی ذاتی غرض کبھی نہیں رہی، وہ واقعی ان کی عبادت تھی جسے وہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے، جمعیۃ کے سلسلے میں جتنے اسفار انھیں کرنے پڑتے، سب اپنے ذاتی مصارف سے کرتے تھے جمعیۃ پر اس کا بار نہ ڈالتے،

جمعیۃ علماء کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز جس سے انھیں گہری وابستگی تھی بلکہ وہ ان کیلئے بمنزلۂ روح اور جان کے تھی وہ مدارس عربیہ ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری

زندگی مدارس میں گذاری

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ابتداءً آپ دارالعلوم مئو میں مدرس ہوئے ، وہاں غالبًا دوسال پڑھایا ، اس وقت ابتدائی کتابیں پڑھایا کرتے تھے ، لیکن تدریسی وتربیتی صلاحیت ولیاقت کا سب کو اعتراف تھا۔ مئو میں قیام کے دوران محدث الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمیؒ کی خدمت میں بھی نیازمندانہ حاضری دیتے تھے ، حضرت محدث کبیرؒ نے اپنی نگاہ مومنانہ اور فراست باطنی سے اسی وقت بھانپ لیا تھا کہ اس نوجوان فاضل سے بہت کچھ کام ہوگا۔ انھوں نے حضرت الاستاذ سے فرمایا تھا کہ ان شاء اللہ توقع ہے کہ تم سے بہت کام ہوگا۔ چنانچہ دیکھنے والوں نے بعد میں دیکھا کہ مولانا نے دین اور علم دین کے کتنے مضبوط قلعے کھڑے کردئے۔

دارالعلوم مئو کے بعد جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں مدرس ہوئے ، مولانا کی مدرسی کا سب سے تابناک دور یہی تھا۔ وہ بالکل یکسو ہوکر پڑھاتے تھے اور طلبہ کی تربیت کرتے تھے اس وقت تک مالیات کی فراہمی اور تعمیرات سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ مبارکپور میں انھوں نے کم وبیش دس سال تک پڑھایا ہے۔ وہاں سے ان کی مدرسی مشہور ہوئی پھر بعض ناموافق حالات کے باعث مبارکپور سے جونپور وہاں کے ایک قدیم ادارہ میں جونیم مردہ ہوچکا تھا یعنی مدرسہ قرآنیہ بڑی مسجد جونپور تشریف لے گئے ۔ مولانا تشریف لے گئے تو یہ نیم مردہ اچانک انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا طلبہ کی آمد دور دور سے شروع ہوگئی اور چند دنوں میں طلبہ کا ہجوم ہوگیا مگر مدرسہ اور جامع مسجد کی انتظامی کمیٹی کی کشمکش میں سے اندازہ ہوا کہ اس سے یکسو ہوکر کام کا کوئی دوسرا میدان تلاش کرنا چاہئے کہ وہ پہلے سے کسی کے تسلط میں نہ ہو ، چنانچہ راجے بی بی کی بنوائی ہوئی نامکمل مسجد جو لال دروازہ میں صدیوں سے ویران پڑی ہوئی اپنی خاموش نگاہوں سے سے کسی مردغیب کی منتظر تھی کہ آئے اور کارے بکند ، آخر وہ مردِ غیب مولانا محمد مسلم صاحب کی شکل میں اسے مل گیا۔ وہ مسجد جو صدیوں سے نمازیوں کو ترس رہی تھی اور گھاس پھوس اور خودرَو پودوں کی وجہ سے جنگل بنی ہوئی تھی ۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ بہت قلیل عرصہ میں علم دین کا لہلہاتا ہوا چمن زار بن گئی ، اس کی گھاس صاف کی گئی ، اس کے جنوبی وشمالی اور مشرقی برآمدوں میں دیواریں کھڑی کرکے حجرے بنادیئے گئے اور تعلیم شروع ہوگئی۔ قال اللہ وقال الرسول کی سامعہ نواز صدائیں گونجنے لگیں۔ مسجد کی روح زندہ ہوگئی۔ پانچوں وقت اذان ہونے لگی ۔ نمازیں پڑھی جانے لگیں ، حضرت مولانا جان کی بازی لگا کر اس کی آبادکاری میں لگ گئے ۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے خطرات آئے مگر ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے ، خود بھی لگے رہے اپنے رفقاء کو بھی لگائے رکھا ، دن رات ایک تڑپ تھی جو انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی ، مدرسہ کے اوقات میں سبق پڑھاتے دوسرے اوقات میں اہل خیر کے دروازوں کو کھٹکھٹاتے اور اس کارِ اہم کی جانب متوجہ کرتے ، مولانا احیاء العلوم مبارکپور میں جب تھے تو بہت خوش لباس تھے۔ کرتے ، پائجامے اور ٹوپی کی ایک خاص تراش اور وضع تھی جس کی نوک پلک خود درست کرتے تھے ، کپڑوں میں نہ کبھی شکن نظر آتی اور نہ میل کچیل ، جوتا تو اتنا خوبصورت اور سبک پہنتے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ، اور پھر پالش ایسی چمکدار اور تازہ کہ کبھی اس میں فرق نہیں آسکتا تھا۔ مگر لال دروازہ میں جامعہ حسینیہ قائم کرنے کے بعد ان کا حال یہ ہوا ، کہ کپڑے میلے ہورہے ہیں ، کچھ التفات نہیں ، بدن دھول اور غبار سے اٹ رہا ہے ، نہانے کی فرصت نہیں ، ایک ہی کپڑا کئی دن سے بدن پر ہے۔ پورا لباس شکن آلود ہے ، لیکن تبدیل کرنے کا خیال نہیں ۔ جوتوں پر ہفتوں سے پالش نہیں ہوئی ہے بدرنگ ہوئے جارہے ہیں ، مگر پرواہ نہیں۔ دل میں ایک جوش تھا ، جو انھیں

مسلسل حرکت میں رکھتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ مدرسہ دینیہ غازیپور...... جہاں میں پڑھاتا تھا...... غبار آلود، پراگندہ بال، گرد سے اٹے ہوئے اور بدرنگ جوتے پہنے ہوئے تشریف لائے، معلوم ہوا کہ چند گھنٹے رہیں گے پھر واپسی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کپڑے دیجئے دھلوادوں آپ خود بھی غسل کر لیجئے، جوتوں پر پالش کرادوں۔ فرصت نہ ہونے کا عذر کیا، مگر میں نے گستاخی کر کے انھیں روکا، کپڑے دھلوائے، غسل کرایا، غسل کے بعد فرمایا کہ تم نے اچھا کیا، ورنہ ابھی نہ جانے کتنے دنوں تک مجھے موقع نہ ملتا۔

مسجد کے شمالی حصہ میں زمین خریدی۔ اس پر مدرسہ کی عمارت بنوائی، اس کی تعمیر میں لگے تو اس میں ایسا انہماک اور شغف ہوا کہ خود ایک بہترین مہندس اور انجینیر بن گئے۔ تعمیر کے ایسے ایسے نقشے نکالتے کہ تجربہ کار ماہرین فن حیران رہ جاتے۔ وہ اپنے نقشے کے مطابق عمارت بنواتے اور ہر وقت کاریگروں کے سر پر سوار رہتے۔ تھوڑے خرچ میں انھیں بہترین عمارت بنوانے کا خوب سلیقہ آگیا تھا۔

لیکن ہم لوگوں کے لئے مولانا کی یہ دلچسپی سوہانِ روح تھی۔ اس کا اثر تعلیم وتدریس پر پڑ رہا تھا مجھے تعمیرات کے کاموں سے بغایت وحشت ہے۔ اسی وحشت کے باعث میں نے بار بار...... ان سے حد درجہ مرعوب ہونے کے باوجود...... کہا کہ یہ دلچسپی کم کر دیجئے اور تعلیمی مشغلہ برقرار رکھئے اس پر وہ مسکراتے اور فرماتے ”بہت سے پڑھانے والے تیار کر چکا ہوں اب دوسرا کام کر رہا ہوں“ فرماتے تھے تعمیر سے مجھے عشق ہو گیا ہے، ان کی یہ دلچسپی آخر تک برقرار رہی۔

جامعہ حسینیہ کی تعمیر کے ایک کافی حد تک مکمل ہو چکنے کے بعد بعض حالات کی وجہ سے حضرت مولانا اسعد صاحب مدنی نے مولانا کو دفتر جمعیۃ علماء میں بلالیا۔ وہاں کچھ دنوں کام کیا مگر انھیں اس کی فکر تھی کہ اپنے آبائی وطن بمہور ضلع اعظم گڈھ میں

ایک دینی درسگاہ قائم کریں۔ مکتب تو پہلے سے چل رہا تھا، مگر باقاعدہ عربی کی درسگاہ نہ تھی، حضرت مولانا مدنی سے اجازت لے کر وہ بمہور آگئے اور ستمبر ۱۹۸۶ء کی کسی تاریخ میں ایک عظیم الشان جلسہ کرا کے محدث الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی اور دوسرے اکابر کے ہاتھوں جامعہ رشیدیہ بمہور کا سنگ بنیاد رکھوایا، اور اسی تاریخ میں شیخوپور میں انھیں اکابر کے ہاتھوں مولانا ہی کے اہتمام میں مدرسہ شیخ الاسلام کی عمارتِ نَو کی بنیاد رکھی گئی۔

مولانا نے بمہور میں مدرسہ کی بغایت نفیس اور دیدہ زیب عمارت بنوائی۔ اور ابھی ۲؍سال قبل گاؤں کی پرانی مسجد کی تعمیر جدید کا منصوبہ بنا تو اس میں بھی دن رات ایک کر کے لگے رہے اور ایک حد تک اس کی تکمیل کرادی۔

اور یہ سب اس طور پر کرتے کہ خود کسی جگہ کوئی عہدہ قبول نہیں کرتے تھے۔ جامعہ حسینیہ میں سب کچھ انھیں کا کیا ہوا ہے، لیکن نہ وہ مہتمم تھے نہ صدر مدرس۔ جامعہ رشیدیہ میں بھی سب کچھ وہی کرتے تھے مگر کسی عہدہ کا نام یہاں بھی نہ تھا۔ مسجد کا کام کرتے رہے مگر اصل ذمہ دار دوسرے لوگ تھے، درحقیقت یہ سارے کام وہ اپنے دلی تقاضے اور اللہ کے واسطے کرتے تھے، اس سے ان کا دل اور ان کا ضمیر مطمئن تھا۔

مولانا کو جیسی دلچسپی جامعہ رشیدیہ سے تھی ویسا ہی تعلق مدرسہ شیخ الاسلام سے بھی تھا وہ دونوں جگہوں کی نگرانی کرتے تھے۔ مدرسہ شیخ الاسلام میں مجھے لانے والے مولانا ہی تھے، انھیں کے حکم سے اس دیہات میں بیٹھا ہوا ہوں، مدرسہ میں جب ضرورت ہوتی تو وہ تشریف لاتے مفید مشورہ دیتے اور مدرسہ سے کبھی کرایہ نہ لیتے۔

مولانا کو جس طرح اپنے بڑوں سے عقیدت وگرویدگی تھی اسی طرح اپنے

چھوٹوں سے بھی بہت محبت فرماتے تھے۔ مولانا کے سب شاگرد میری اس بات کی تائید کریں گے۔

حضرت الاستاذ کو اپنے تلامذہ سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کی تعلیم و تعلم سے لے کر ان کے نجی اور گھریلو معاملات تک میں مشفقانہ مشورے دیتے، ان کے مشورے بڑے مفید اور پختہ ہوتے، تلامذہ کے فارغ ہونے کے بعد ان کی صلاحیتوں کے بروئے کار لانے، انھیں نمایاں کرنے کی فکر کرتے، ان کے لئے مناسب جگہوں کا اہتمام کرتے، کسی شاگرد کو دین کی خدمت کرتے دیکھتے تو بے حد خوش ہوتے، اس کی حوصلہ افزائی فرماتے، غائبانہ اس کی تعریفیں کرتے، وقتاً فوقتاً از خود اس کے پاس تشریف لے جاتے، کام کے گُر بتاتے، میں ان کا ایک ادنیٰ شاگرد ہوں لیکن ہمیشہ ان کے الطاف وعنایات کا مورد بنا رہا۔ مدرسہ دینیہ میں مولانا تشریف لائے، ان کی آمد پر اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں ان سے درخواست کرتا کہ تبرکاً ایک دو سبق پڑھا دیجئے۔ کبھی گزارش کرتا کہ طلبہ کو نصیحتیں کر دیجئے، مولانا اسے خوشی سے قبول فرماتے۔ طلبہ کو نصیحتیں فرماتے۔ کبھی میں جامعہ حسینیہ پہونچتا تو اس وقت چونکہ مولانا کا مدرسہ کی مالیات یا تعمیرات سے شغف بہت عروج پر تھا، میں آتا تو اپنے اسباق میرے حوالہ کر دیتے اور مطمئن ہو کر چندے کی مہم پر نکل جاتے، میرا قیام ان کے حکم سے کئی کئی دن رہتا، اور ان کے اسباق پڑھاتا رہتا، طلبہ کے درمیان مجھ سے تقریریں کرواتے خود بھی سنتے اور خوش ہوتے، مدرسہ کا کوئی جلسہ، کوئی پروگرام ہوتا تو ضرور بلاتے اور حاضر ہوتا تو گہری سنجیدگی کے باوجود خوشی کے آثار چہرے پر دمکنے لگتے۔

جامعہ حسینیہ کو انھوں نے اپنے خون پسینے سے سینچا تھا۔ اسے پروان چڑھایا تھا مگر ایک وقت ایسا آیا کہ انھیں اپنے بڑوں کے حکم سے اسے چھوڑ دینا پڑا۔ آدمی کو اپنی اولاد سے جدا کر دیا جائے، اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے محروم کر دیا جائے تو

اس پر کیا گزرے گی۔ مگر مولانا نے غایت خلوص کی بنا پر یہ تکلیف دہ فیصلہ قبول کر لیا۔ اس وقت وہ بہت محزون خاطر اور دل شکستہ تھے، باوجود اپنی قوت قلبی کے جو کسی وقت اضمحلال کو قبول نہیں کرتی تھی ان پر افسردگی کا ایک عالم طاری تھا۔ اس وقت مدرسہ دینیہ تشریف لائے اور تین دن تک قیام فرمایا۔ اس وقت خلوت وجلوت کا ساتھی تنہا میں تھا۔ خوب کھل کر باتیں ہوتیں میں ان کے کرم وشفقت کی بنا پر باوجود مرعوبیت کے کچھ گستاخ ہو گیا تھا۔ میں نے انھیں کی غلطیاں گنواتا اور وہ کشادہ پیشانی سے سنتے، قبول کرتے اور اصلاح کا وعدہ کرتے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر کر چکا ہوں کہ مولانا کو اپنے اکابر سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کا تذکرہ چھڑ جاتا تو کسی طرح انھین سیری نہ ہوتی۔ میرا طبعی ذوق بھی یہی ہے، میں کبھی مجلس میں بزرگوں کا تذکرہ چھیڑ دیتا اور بے تکان ان کے احوال و واقعات اور اقوال بیان کرتا، کبھی گھنٹوں یہ سلسلۂ بیان جاری رہتا مگر مولانا پہلو نہ بدلتے بلکہ یکساں دلچسپی اور انشرح کے ساتھ سنتے، میں رکتا تو مزید کوئی بات چھیڑ کر سلسلہ دراز کر دیتے کبھی کبھی صراحۃً فرمائش کرتے کہ بزرگوں کے احوال و واقعات سناؤ اور میرا یہ حال ہوتا کہ ''دیوانہ را ہوئے بس است'' شروع ہو جاتا۔

ایک مرتبہ غازی پور میں وہیں کے ایک استاذ میرے محبوب دوست جناب قاری شبیر احمد صاحب...... جو از راہ ظرافت کبھی کبھی مجھے تذکرۃ الاولیاء کے نام سے یاد کیا کرتے تھے...... کے کمرے میں ہم لوگ موجود تھے۔ حضرت مولانا صدر مجلس تھے، کسی تقریب سے بزرگوں کا تذکرہ چھڑ گیا اور مین دیر تک اسی مبارک ذکر میں محو ومنہمک رہا۔ مولانا بھی اسی انہماک سے سنتے رہے، مولانا پان کھانے کے عادی تھے مگر اس وقت گفتگو کی محویت میں کسی کو پان کا خیال نہ رہا خود مولانا بھی بھولے ہی رہے، بہت دیر کے بعد میں خاموش ہوا تو فرمایا:

قاری صاحب! اتنی اچھی باتیں سنی ہیں اب تو پان کا استحقاق ہوگیا ہے، سب لوگ ہنس پڑے اور پان کا دور چل پڑا۔

جامعہ رشیدیہ میں دارالقرآن کا افتتاح ہوا تو اپنے شاگرد کو اس کیلئے بلوایا۔ وعظ کہلوایا مسجد کے سنگ بنیاد کی تقریب تھی تو سواری بھیج کر بلایا۔ افتتاحی وعظ کہلوایا سنگ بنیاد رکھوایا، غرض اپنے اس حقیر شاگرد پر نوازش وکرم کی بارش برساتے رہے۔ اب مولانا اچانک ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلدیئے تو تنہائی محسوس ہونے لگی ہے اور جب یہ باتیں یاد آتی ہیں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔

مولانا کا آبائی وطن مبارکپور سے چار، پانچ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک گاؤں بمھور رہے، بمھور اہل علم کی بستی ہے، مولانا کے والد مولوی محمد الیاس صاحب اصلاحی مرحوم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے تعلیم یافتہ تھے، نہایت خاموش اور سنجیدہ بزرگ تھے، حضرت مولانا ان کے تیسرے صاحبزادے تھے، دو بھائی مولانا سے پہلے تھے جناب محمد شمیم صاحب! جن کی وفات ابھی عید کے بعد ہوئی۔ دوسرے محمد محسن صاحب! جو ماشاءاللہ بقید حیات (۱) ہیں، تیسرے مولانا تھے۔ مولانا سے چھوٹے حافظ محمد عرفان صاحب، انکے بعد جناب محمد احسان صاحب اور سب سے چھوٹے میرے رفیق درس جناب مولانا محمد رضوان صاحب ہیں اور ایک بہن ہیں۔

مولانا کی پیدائش غالباً ۱۹۳۶ء یا اس کے آس پاس ہوئی ہے۔ ابتداءً اپنے نانیہال بلریا گنج میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد عربی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ذکاوت وذہانت سے خوب بہرہ ور تھے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کیلئے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ دورۂ حدیث شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ سے

---

(۱) اب وہ بھی مرحوم ہو چکے ہیں

پڑھنے کی نوبت نہ آئی کیونکہ ایک سال قبل حضرت کا وصال ہوگیا تھا اور انھوں نے اپنی جگہ فخر المحد ثین حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادی علیہ الرحمہ کو مقرر فرمادیا تھا۔ چنانچہ دورۂ حدیث کی تکمیل حضرت شیخ فخر الدین صاحب سے کی۔

مولانا کا نکاح ان کے ماموں کی صاحبزادی سے ہوا تھا۔ تین اولادیں ہوئیں۔ جناب مولانا مفتی محمد راشد صاحب، جو دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد عرصہ تک جامعہ حسینیہ جونپور میں بحیثیت مدرس ومفتی کام کرتے رہے اور اب دارالعلوم دیوبند میں شعبہ عربی کے استاذ ہیں۔ ذہانت وذکاوت میں اپنے والد کی یادگار ہیں، رد شیعیت کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں۔ جمعیۃ علماء اور خانوادہ مدنی کے ساتھ عشق وشیفتگی میں اپنے والد محترم کے صحیح جانشین ووارث ہیں۔ اللہ تعالیٰ علم وعمل میں ترقی بخشیں۔

دوسرے فرزند محمد زاہد سلّمہٗ، بلریا گنج میں دکان کرتے ہیں (۱) اور تیسرے فرزند محمد مجاہد سلّمہٗ، دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم ہیں۔ (۲)

اہلیہ کا وصال کئی سال قبل ہوگیا تھا۔ دوسرے عقد کیلئے ہمدردوں اور بہی خواہوں نے بہت زور دیا مگر قبول نہیں کیا۔

والد کے انتقال کے بعد بھائیوں میں جائداد اور مکان کا بٹوارہ ہوا تو مولانا نے مکان میں حصہ نہیں لیا بلکہ خالی زمین لی اور اپنے حصہ کا کچھ کھیت فروخت کیا اور مکان اچھا سا بنوالیا۔ چھوٹے بھائی مولانا محمد رضوان نے بھی یہی کیا۔ مولانا نے اپنے مکان کے ساتھ ان کا مکان بھی بنوایا۔ دونوں بھائی اور بوڑھی والدہ ساتھ رہتی تھیں۔ والدہ بہت عمر رسیدہ تھیں۔ دونوں بھائیوں کو خدمت کا خوب موقع ملا، وہ ہر تھوڑی تھوڑی دیر پر مولانا کو پکارتیں اور مولانا دوڑتے ہوئے ان کی خدمت میں

---

(۱) مفتی محمد راشد صاحب نے انھیں بھی دیوبند بلالیا ہے، وہیں دوکان کرتے ہیں۔

(۲) فراغت کے بعد یہ بھی بڑے بھائی کے پاس دیوبند میں ہی ہیں، دکان کرتے ہیں۔

جاتے، کام کچھ نہ ہوتا مگر مولانا اُف نہ کرتے، اسی سال بقر عید بعد ان کا وصال ہوا اور ڈیڑھ پونے دوماہ کے بعد مولانا بھی انھیں کی آغوش میں پہونچ گئے، شاید انھوں نے پکارا ہو، جیسے زندگی میں برابر پکارتی تھیں۔

مولانا کی ساری زندگی دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا دوسروں کی فلاح وبہبود کے لئے کیا۔ خود اپنے لئے اپنی دنیا کیلئے کچھ نہیں کیا وہ دنیا سے اس طرح اٹھے ہیں جس طرح بطخ پانی سے پر جھاڑ کر نکل آتی ہے، ان کا ترکہ بھی بہت مختصر ہے ان کے وارث بھی بہت کم ہیں۔ صرف تین بیٹے، جنس ونقد کی قبیل سے شاید ان کے پاس کچھ نہ رہا ہو۔

جس دن ان پر فالج کا اثر ہوا ہے۔ اسی روز مدرسہ کے ایک استاذ کو جنھیں مدرسہ کے حسابات لکھنے پر بھی لگا رکھا تھا مدرسہ کا پورا حساب سمجھایا اور ارشاد فرمایا کہ سب کچھ آپ سمجھ گئے، انھوں نے کہا ہاں۔ تو فرمایا کہ خدانخواستہ میں بیمار پڑ جاؤں تو آپ لوگوں کو حساب سمجھا لیں گے۔ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو کہا مجھے سمجھائیے۔ انھوں نے حسب منشاء سمجھا دیا، تو مطمئن ہوئے اور غالباً اس سے ایک روز پہلے مسجد جو زیر تعمیر ہے اس کے تمام حسابات مسجد کے ایک ذمہ دار کو بتا کر ان کے حوالہ کر دیا تھا۔

فالج کے حملے کے بعد دیکھا گیا تو ان کے جیب میں کل چودہ سو روپئے تھے معلوم ہوا کہ اس میں مدرسہ کے سات سو ہیں اور مسجد کے دو سو، اور باقی پانچ سو غالباً ترکہ ہے۔ اس مردِ خدا کی کل یہی دنیاوی کائنات تھی۔ مولانا کا شمار زمرۂ صوفیا میں نہیں ہوتا لیکن جس شان سے انھوں نے دنیا کو برتا ہے بلکہ اسے ترک کیا ہے وہ زاہدانِ باصفا کی یادگار ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت کرے، ان کی بشری لغزشوں سے درگذر فرمائے

عمل میں غلطی بہت ممکن ہے ہوئی ہو۔ لیکن نیت ہمیشہ دین اور علم دین کے فروغ اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود کی رہی ہے اور خدا تعالیٰ کے یہاں نیتوں پر ہی مدار ہے، اللہ تعالیٰ ان کی نیت کو قبول فرمائے اور روح ورضوان سے نوازے۔

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

☆☆☆☆☆☆☆

استاذِ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ ۲۲؍محرم ۱۴۱۴ھ کو منگل کے دن بیمار ہوئے۔ پھر انھوں نے ۲۹؍محرم کو منگل کے روز وفات پائی۔ وفات کے دن ان کے بڑے بھائی مرحوم محمد محسن صاحب نے بتایا کہ منگل ہی کے دن ان کی ولادت بھی ہوئی تھی، پھر ایسا ہوا کہ ایک ماہ تک ہر منگل کو خود بخود میری طبیعت بے کیف ہو جایا کرتی تھی، ایسی بے کیفی کہ سارا عالم اداس اور غم زدہ معلوم ہوتا تھا، شام تک یہی کیفیت مسلط رہتی، کئی ہفتے تک یہی عالم رہا۔ اسی دوران شش ماہی امتحانات شروع ہو گئے۔ منگل کے روز امتحان گاہ میں پہونچا تو وہی کیفیت تھی، اچانک غیر ارادی طور پر ایک مصرعہ زبان پر آیا۔ تھوڑی سی فکر کی تو شعر مکمل ہو گیا۔ میں شاعر نہیں ہوں۔ اور نہ کبھی کوئی شعر پورا کہہ پاتا، مگر آج کی بے کیفی شعر میں ڈھلنے لگی تو ڈھلتی چلی گئی۔ آرزوؔ لکھنوی نے کیا اچھی بات کہی ہے۔

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

آج کی بے کیفی شام تک نوحۂ غم کے سانچے میں ڈھلتی رہی۔ شام ہوئی تو ۲۷؍ اشعار کی ناتمام سی نظم تیار ہو چکی تھی، پھر طبیعت کا غبار چھٹ گیا۔ دوسرے دن بہت کوشش کی کہ چند اشعار اور ہو جائیں، تو نظم مکمل ہو جائے۔ لیکن نہیں ہوئے، یہ نظم یونہی پڑی رہی۔ اب اس کو شائع کرنے کا خیال عزیزم مولانا ضیاء الحق سلّمہٗ کو ہوا تو ارادہ ہوا کہ یہ تُک بندیاں کسی صاحبِ نظر کو دکھالی جائیں۔ رفیقِ محترم مولانا فضلِ حق صاحب عارفؔ خیرآبادی مدظلہٗ کی خدمت میں انھیں پیش کیا تو انھوں نے کچھ نوک پلک درست کر دئے اور مقطع کا ایک شعر اس میں بڑھا دیا۔ تاکہ نظم پر ناتمام ہونے کا داغ نہ رہ جائے۔

نالۂ غم:

بیادِ استاذِ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ

باغ ہے اجڑا ہوا، ساری فضا خاموش ہے
عندلیبِ خوشنوا شاید کوئی روپوش ہے
کیوں نہیں تھمتے ہیں آنسو آج آنکھوں سے مری
ناگہاں ٹوٹی ہے مروارید کی جیسے لڑی
کیوں فضا تاریک ہے، پُرہول منظر چارسو
مضطرب دل، دم گھٹا جاتا ہے آنکھوں میں لہو
میں ہی کیا؟ روتے ہیں فرقت میں زمین وآسماں
دیکھئے! آنکھیں ہیں کسکے غم سے خونابہ فشاں
کون ہے وہ جسکی فرقت سے یہ کل ناشاد ہیں
کس کے جانے سے یہ محوِ نالہ وفریاد ہیں
ہم نشینِ بے خبر کچھ بھی خبر ہوتی مری
کاش تیری آنکھ کو حاصل نظر ہوتی مری
کاش میرا درد تجھ پر بھی عیاں ہوتا ذرا
کاش تو بھی جانتا میں کیوں ہوا بے دست وپا
آ! بتاؤں میں تجھے میں چاک داماں کیوں ہوا
چشم خونابہ فشاں اور سینہ بریاں کیوں ہوا
تھا وہ پیکر لطف وشفقت کا سراپا عزم تھا
آبروئے دین ودانش یعنی شمعِ بزم تھا
قافلہ محوِ سفر تھا، سوئے منزل بے خطر
قافلہ سالار تھا اک مرد کامل باخبر
قافلہ والے تھے شاداں جانب منزل رواں
یک بیک انکے سروں پر چھایا نکبت کا دھواں
قافلہ سالار اچانک یوں جہاں سے چل بسا
خوابِ نوشیں سے یکا یک جیسے کوئی اٹھ گیا
کون تھا وہ قافلہ سالار مجھ سے سن ذرا
آہ! مولانائے مسلمؒ کیا نہیں تجھ کو پتا
کون مولانا؟ مرے استاذ عالی محترم
ذات تھی جن کی سراپا خیر وبرکت، مغتنم
وہ جنھوں نے میرے دل کو علم سے روشن کیا
ایک ویرانہ تھا جس کو رشکِ صد گلشن کیا
جن کی شہ پر دم بہ دم ہر ہر قدم بڑھتا گیا
پیرِ میخانہ کے ہاتھوں خم پہ خم ڈھلتا گیا
جنکے جانے سے میری دنیائے دل ہی لٹ گئی
ظلمتیں اتنی بڑھیں کہ روح میری گھٹ گئی
کتنے ذرے، جن کے پَرتو سے مہِ کامل بنے
بتکدے وحدانیت کے نور کے حامل بنے
خاک پر بیٹھے ہوؤں کو عزت ورفعت ملی
ان کے فیضِ علم سے عظمت ملی شہرت ملی

دین کے کتنے قلعے تعمیر وہ کرتے رہے
جہل کے اڈوں کو علم وفضل سے بھرتے رہے
لال دروازہ کی مسجد نوحہ خواں، ویران تھی
ایک مدت سے پڑی برباد تھی، سنسان تھی
ایک مردِ غیب کی تھی منتظر بے برگ وبار
اسکے معماروں کی روحیں مضطرب تھیں بیقرار
روح سجدوں کی خس وخاشاک میں تھی دلفگار
منبر ومحراب فرطِ غم سے تھے زار ونزار
پھر وہ مردِ غیب آیا اک طرف سے ناگہاں
بندھ گیا آمد سے اس کی ایک روحانی سماں
اس کا آنا تھا کہ یک دم چھٹ گئی گردِ ملال
ہوگئی پھر وہ زمیں سجدوں کی کثرت سے نہال
علم وفن کا ایک چشمہ پھر ہوا جاری یہاں
ذرہ ذرہ دین حق کا بن گیا ہے ترجماں
ہاں! وہی مردِ مجاہد ہم سے رُخصت ہوگیا
علم کا جادو جگا کر خلد میں جا سوگیا
ان کے اعجازِ کرم کا ہر طرف چرچا ہوا
دشت ودریا کوہ وصحرا قریہ قریہ جابجا

☆☆☆☆☆☆☆☆

(پہلی مرتبہ یہ مضمون مجلّہ ''المآثر'' مئو میں ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا، پھر دوبارہ اپریل ۲۰۰۴ء میں ضیاء الاسلام، شیخوپور میں شائع ہوا)

اندلس میں اسلام
اسلامی اندلس کی مکمل ومختصر اسلامی تاریخ
124 صفحات پر مشتمل، قیمت، =/40 روپئے
مصنف:۔ مولانا ضیاء الحق خیرآبادی صاحب
ناشر:۔ فرید بک ڈپو دہلی

مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقیؒ کاکوروی

وفات: ۲۳؍ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ مطابق ۴؍جون ۱۹۹۴ء

امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی علیہ الرحمہ کے نام اور کام سے ہندوستان کا کون پڑھا لکھا مسلمان ناواقف ہوگا، اللہ تعالیٰ نے گویا ناموسِ صحابہ کی پاسبانی کے لئے ان کا انتخاب فرمالیا تھا، مغلیہ حکومت کے زوال اور نوابان اودھ کے عروج کے زمانے میں شیعیت کے اثرات سنیوں کے گھرانے میں جذام کی طرح سرایت کر گئے تھے، شیعی افکار وعقائد کی چھاپ ہر طرف نظر آتی تھی۔ کتنے مقدس صحابہ کرام سے بدگمانیاں پھیل گئی تھیں شیعے کھلے عام تبرا کرتے تھے، امام اہلسنت آئے، تو حضرات صحابہ کرام کی عزت وناموس کی خوشبو دل وجان کی گہرائیوں میں بس گئی، سنیوں کے ایمان میں تازگی آئی، شیعیت افسردہ وپژمردہ ہوگئی، امام اہل سنت نے تحفظ ناموس صحابہ کو اپنا مشن بنایا۔ اس مشن کے لئے انھوں نے بہت سے رفقاء تیار کئے۔ اس کے لئے انھوں نے **دار المبلغین** کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، خاص اسی کیلئے ایک ماہانہ رسالہ ''**النجم**'' جاری کیا، محدث کبیر حضرت مولانا اعظمی سے بھی متعدد مقالات ومضامین لکھوائے، اور النجم میں شائع کئے۔

امام اہلسنت کے یہ رفقاء اور ان کے براہ راست تربیت یافتہ علماء جنھوں نے اپنی زندگی تحفظ ناموس کے لئے وقف کی آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے سب اٹھتے

چلے گئے، غالبًا اس کاروانِ عزیمت کا ایک بہادر سپاہی جو بعد میں سالارِ کارواں بنا۔ باقی رہ گیا تھا، وہ بھی ۲۳؍ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ مطابق ۴؍جون ۱۹۹۴ء کی درمیانی شب میں اپنا وقت پورا کر کے اپنے پروردگار کے حضور اسی قافلہ میں شامل ہوگیا، جس کے ارکان یکے بعد دیگرے آغوش رحمت الٰہی میں پہونچ چکے تھے۔ اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون

یہ امام اہلسنت کے برادر زادے اور مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ کے جلیل القدر صاحبزادے مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقی (**علیہ الرحمہ**) ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور حضرات صحابہ کرام کی معیت ورفاقت جنت میں نصیب فرمائے، آمین

مولانا مرحوم ۲۴؍شوال ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو اپنے آبائی وطن کاکوری ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور متوسطات تک تعلیم لکھنؤ اور مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ، مرادآباد میں حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، پھر اپنے عم محترم کے قائم کردہ ادارہ **دار المبلغین** سے منسلک ہوگئے۔ اور عرصہ دراز تک اس کی جاروب کشی سے لے کر اہتمام تک کی ذمہ داری کو پوری لگن اور خلوص کے ساتھ انجام دیا۔

مولانا مرحوم زبردست مبلغ اور خطیب تھے، ناموس صحابہ کے تحفظ کے لئے انھوں نے ہر طرح کے شدائد ومصائب کا خندہ وار استقبال کیا۔ ان کے دوسرے کارناموں میں اس خدمت کا مقام بہت بلند ہے۔ مولانا نے اپنی عمر کے آخری حصے میں کاکوری کے اندر ایک عربی مدرسہ بنام ''دارالعلوم فاروقیہ'' قائم کیا، اس کی مجلس شوریٰ نے ''امیر کارواں کی رحلت'' کے عنوان سے ایک مختصر سا کتابچہ شائع کیا ہے، اس میں مولانا کی محنت وکاوش کا تذکرہ کرتے ہوئے، لکھا گیا ہے کہ:

''وہ جسے ان کے مجاہدانہ اور سپاہیانہ دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور جس

کا ذکر وہ خود بھی بسا اوقات بڑے جوش وولولہ کے ساتھ کیا کرتے تھے، اور جسے بڑی امید کے ساتھ وہ اپنا ذخیرۂ آخرت، قرار دیتے تھے، وہ تحفظ ناموس صحابہ کی خاطر ان کی قربانیاں ہیں، امیر کارواں کی کتاب زندگی کا یہ روشن باب بہت طویل، بہت دلآویز، بہت ولولہ انگیز اور بہت عبرت خیز ہے، جس میں قید وبند کی صعوبتیں بھی شامل ہیں، غریب الوطنی کی داستانیں بھی، وقت کے جابر حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے تیور بھی ملتے ہیں اور بے بسی کے ساتھ خانۂ قید ہونے کے تذکرے بھی۔''

مولانا مرحوم بلند پایہ عالم اور بہترین خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ بے نفس اور سادہ مزاج تھے، طبیعت میں سادگی اس حد تک تھی کہ اس رتبہ کے عالم کیلئے اس کا تصور بھی مشکل ہے، سنا ہے کہ ان کے والد محترم بھی باوجود جامع العلوم ہونے کے اسی شان کے بزرگ تھے، ایک عام آدمی انھیں دیکھ کر یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ اس گدڑی میں کیا لعل چھپا ہوا ہے، میں نے پہلی بار انھیں اپنے وطن کے قریب ایک جلسہ میں دیکھا۔ نام تو بہت پہلے سے کان میں پڑا ہوا تھا، اور جیسا کہ دستور ہے، بڑے عالم وخطیب کا سراپا غائبانہ طور پر ذہن میں ذرا بھاری بھرکم بنتا ہے، ایسا ہی کچھ سراپا میرے ذہن میں بھی تھا، مگر جب ان کو دور سے کسی نے دکھایا تو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقی جن کا آوازہ گونج رہا ہے، یہی صاحب ہیں، تصورات کی عمارت منہدم ہوگئی۔ ان کی تقریر شروع ہوئی، تو بادل ناخواستہ سننا شروع کیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ میرا پورا وجود کان بن گیا ہے۔ اول سے آخر تک ان کی تقریر کے سیل رواں میں بہتا رہا، مدح صحابہ پر تقریر ہورہی تھی، ایسی شگفتہ، مدلل، واضح اور رواں تقریر تھی کہ ایک مدت گزر جانے کے بعد آج بھی سامعہ میں اس کی لذت وحلاوت محسوس ہوتی ہے۔

ناموس صحابہ کا یہ مجاہد، صبر وہمت کا پیکر، بے مثال خطیب ومبلغ ۸۳/سال کی عمر میں اپنی زندگی کے صفحات لپیٹ کر اس ذات کے حضور پہونچ گیا ہے، جس کی بارگاہ میں پیش کرنے کیلئے اطاعت وانقیاد اور تبلیغ وجہاد کی سوغاتیں تیار کرتا رہا تھا، کیا عجب کہ صحابہ کرام کی روحوں نے بڑھ استقبال کیا ہو کہ پروردگار! عالم آخرت میں قدم رکھنے والا ہمارا یہ سپوت، زندگی بھر ہماری عزت وناموس کے لئے لڑتا رہا۔ ہمارے دشمنوں سے بھڑتا رہا، آج یہ آپ کے قدموں میں ان زخموں، ٹیسوں، قید وبند کی مشقتوں، دشواریاں اور مصیبتوں کو لے کر حاضر ہوگیا، جنھیں وہ تیری رضا کے لئے تحفہ سمجھ کر بخوشی قبول کرتا رہا۔ خداوندا! اگر آپ ان زخموں کو، ٹیسوں کو، مشقتوں کو سند قبول عطا فرمادیں تو اس بندہ کی زندگی ٹھکانے لگ جائے! اور اللہ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ جن اصحاب رسول ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جنت کا وعدہ کر رکھا ہے، ان پر فدا ہونے والے کو بھی اللہ نے جنت کا پروانہ عطا فرمادیا ہو، بیشک رب شکور رحیم وحلیم سے اسی کی امید ہے۔

مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولانا عبدالعلی فاروقی عوام کے حلقے میں اپنی تقریر وخطابت اور خواص کے حلقے میں اپنے موقر جریدہ ماہنامہ ''البدر'' کی وجہ سے خوب متعارف ہیں، ان کے علاوہ مولانا مرحوم کے تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں صلبی یادگار ہیں، اور بہت سے تلامذہ اور دارالعلوم فاروقیہ کا کوری معنوی یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب میں برکت عطا فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا محمد عمر صاحب مبارکپوریؒ

وفات: ۱۳/اپریل ۱۹۹۵ء

خبر آئی، ایک ایسی خبر جس کے آنے کا اندیشہ پہلے سے تھا۔ ایسی خبر جس کا تعلق ہر اس شخص سے ہے، جس نے دنیا میں آنکھ کھولی ہے۔ لیکن اس کے آنے سے پہلے عموماً اس کی طرف التفات نہیں ہوتا، اور جب آجاتی ہے تو نہ جانے کتنی حسرتیں، کتنی ندامتیں، کتنی یادیں دل ودماغ کے نہاں خانوں میں تیزی سے گردش کرنے لگتی ہیں۔

یہ خبر ہمارے مشرقی اضلاع کی مشہور جگہ جو تعلیم وتعلم کی فراوانی اور علم وعلماء کی کثرت کے لحاظ سے معروف ہے۔ یعنی قصبہ مبارک پور سے آئی، خبر یہ تھی کہ حضرت مولانا محمد عمر صاحب مبارکپوری کا وصال ہوگیا۔ اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون

مولانا موصوف جوان نہ تھے، صرف بوڑھے بھی نہ تھے۔ بہت بوڑھے تھے، ان کے تمام ہمعصر دنیا سے جاچکے ہیں۔ ان کے شاگردوں اور تلامذہ کی بھی ایک خاصی تعداد بوڑھی ہوکر دنیا کو خیرباد کہہ چکی ہے۔ معمر ترین عالم تھے۔ اس لئے ایسا تو نہ تھا کہ یہ خبر غیر متوقع رہی ہو، تاہم ان سے مل کر، ان سے باتیں کرکے اور ان کی خوش مزاجی دیکھ کر یہ واہمہ بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ اب جلد ہی رُخصت ہوجائیں گے۔ اسی دن احیاء العلوم مبارک پور کا سالانہ جلسہ ہورہا تھا۔ اس میں ان کی صدارت کا اعلان تھا۔ ہم لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ مولانا اسٹیج پر رونق افروز ہوں گے۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ وہ کرسئ صدارت کو ترک کرکے پروانۂ مغفرت حاصل کرنے رب کریم کے حضور جانے کے لئے پابہ رکاب ہیں۔

مولانا محمد عمر صاحب علیہ الرحمہ کا تعلق اس دور سے ہے، جب کہ مبارکپور میں اہل حق کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور نے حق کی روشنی پھیلانے کے لئے ایک چراغ جلا رکھا تھا۔ حضرت مولانا شکراللہ صاحب مبارکپوری متوفی ۵/ربیع الاول ۱۳۶۱ھ اپنی مومنانہ فراست اور مجاہدانہ عزیمت کے ساتھ بدعت سے چومکھی لڑائی لڑ رہے تھے، اسی دور میں مولانا محمد عمر صاحب اس حلقہ میں داخل ہوئے۔ حضرت مولانا شکراللہ صاحب جو شخصیات کو پہچاننے اور ان کی صحیح خطوط پر تربیت کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ان کی خاص انداز میں تربیت فرمائی، انھیں پڑھایا۔ اور پھر یہ مظاہر علوم سہارن پور سے تعلیم کی تکمیل کرکے حضرت مولانا کے ساتھ جہاد زندگانی کے میدان میں اتر آئے، حضرت مولانا نے انھیں تعلیم وتدریس کے ساتھ وعظ وتقریر کے امر مہم پر مامور فرمایا۔ چنانچہ انھوں نے بڑی محنت سے پڑھانے جیسا پڑھایا بھی، اور وعظ وتقریر کا تو وہ ملکہ پیدا کیا کہ حسن خطاب کی وہ ایک علامت بن گئے تھے، طبیعت میں ظرافت تھی، اس لئے تقریر نہایت دلچسپ ہوتی تھی، اس کے ساتھ احادیث کے الفاظ اور عربی اشعار بکثرت یاد تھے۔ اور انھیں ایک خاص لہجے میں پڑھتے تھے، اور جب پڑھتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔ جو لوگ بالکل نہیں سمجھ سکتے تھے، وہ بھی چاہتے کہ یہ سلسلہ نہ ٹوٹے، سنا جاتا تھا کہ فراغت کے بہت بعد تک جب وہ سہارن پور پہونچ جاتے تو ان کے اساتذہ حدیث کی عبارت انھیں سے پڑھواتے تھے۔

مولانا باوصف ایک اچھے خوش بیان واعظ ہونے کے نہایت سادہ اور منکسر المزاج تھے، تصنع اور بناوٹ کا ادنیٰ سا شائبہ بھی ان کی سیرت کے کسی گوشہ میں نہ تھا، بے تکلف یار باش اور ظریف الطبع تھے۔ ادھر عرصہ سے طول عمر کے باعث ضعف

واضمحلال کا غلبہ تھا، لیکن اس حال میں بھی ان کی طبعی ظرافت اور علم سے دلچسپی باقی تھی، ضعف دماغ کی وجہ سے حافظہ میں ربط باقی نہ تھا، مگر جو کوئی صاحب علم پہونچ جاتا، اس سے علمی مسائل چھیڑ دیتے، حدیثیں پڑھتے، عربی کے اشعار سناتے۔

پھر کچھ طبیعت خراب ہوئی، مئو کسی ہسپتال میں لے جائے گئے، وہیں ۱۲؍ذی قعدہ مطابق ۱۳؍اپریل کی شب میں مولیٰ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت ومغفرت سے نوازے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ

وفات: ۱۴؍ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ (۱۵؍اپریل ۱۹۹۵ء)

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کا انتقال ہوگیا، سننے میں یہ ایک مختصر سی خبر تھی، لیکن ایسا محسوس ہوا، جیسے دل ودماغ پر سناٹا چھا گیا ہو، بے ساختہ لبوں پر انا للہ وانا الیہ راجعون کی ربانی تسلی جاری ہوئی، مگر ذہن وخیال منجمد ہوکر رہ گیا۔ مولانا وحید الزماں صاحب مر گئے؟ نہیں، میں مر گیا، دنیا مر گئی۔ اب کون بچا، صرف ایک ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ باقی ہے، ورنہ ہر ایک فنا کے گھاٹ اتر گیا۔ اس وقت کچھ ایسا ہی لگا ایک لمحہ کے لئے! وہ لمحہ بہت مختصر تھا، مگر بڑا جاں گداز تھا، وحشت اثر تھا، پھر فکر وخیال میں حرکت آ گئی، پھر دنیا حسب معمول چلنے لگی، سارا کاروبار زندگی، جو یک لخت بند ہوگیا تھا، معمول پر آ گیا۔ جیسے کچھ نہ ہوا ہو، وہی بھاگ دوڑ، وہی حرکت وعمل، وہی خورد ونوش، وہی غفلت وسرمستی! تو کیا واقعی کچھ نہیں ہوا؟ کوئی حادثہ نہیں ہوا؟

انسان بھی عجیب شئے ہے، ایک خبر سنتا ہے، غمزدہ ہو جاتا ہے، دنیا تاریک ہو جاتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے، کہ یہ غم ہمیشہ تازہ اور یہ دنیا ہمیشہ تاریک رہے گی، یہ زخم سدا ہرا رہے گا، لیکن وقت کی رفتار آگے بڑھ جاتی ہے، اور آدمی نئی چیزوں، نئے سامانوں، نئے قصّوں میں پچھلے حادثہ کو فراموش کر دیتا ہے، زخم کا صرف داغ باقی رہ جاتا ہے، درد کافور ہو جاتا ہے۔

مولانا وحید الزماں صاحب کی رحلت کی خبر سنی تو اچانک نبض دوراں رکتی ہوئی محسوس ہوئی، لیکن جب وہ رواں ہوئی تو میرے فکر وخیال کا دھارا یک بہ یک

پیچھے کی طرف مڑ گیا، مجھے وہ باتیں اور وہ زمانہ یاد آنے لگا، جس نے مولانا وحید الزماں صاحب کو ہم طالب علموں کے دل کی دھڑکن بنا دیا تھا۔ وہ ہمارے ذہن و دماغ پر، فکر و خیال بن کر چھا گئے تھے، میں نے انھیں اس وقت تک نہیں دیکھا تھا۔ مگر تصور میں ان کی تصویر کے خاکے بنایا کرتا تھا۔

میں عربی کی ابتدائی جماعت کا طالب علم تھا، اساتذہ تمرین کے لئے اردو سے عربی میں ترجمہ کرایا کرتے تھے، میں ایک کمزور طالب علم تھا، غلطیاں بہت ہوتی تھیں، اساتذہ کی ڈانٹ سنا کرتا تھا۔ مجھے تلاش تھی کہ کوئی ایسا لغت ملتا، جس کی مدد سے اردو کا ترجمہ عربی میں بخوبی کر سکتا۔ ایک کتاب ملی، مگر میں اس سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکا۔

پھر ایک دوسری کتاب چھوٹی سائز کی کسی قدر باریک کتابت والی میں نے اپنے ایک شفیق استاذ کے پاس دیکھی، اس پر نام ”**القاموس الجدید**“ لکھا تھا، الٹ پلٹ کر دیکھا، تو بہت اچھی معلوم ہوئی، مصنف کا نام مولانا وحید الزماں کیرانوی تھا۔ یہیں سے مولانا سے واقفیت کی بنیاد پڑی، اپنی استعداد کے بقدر اس سے استفادہ کرتا رہا، اس کی ضرورت اُردو عربی انشاء میں ہوتی تھی، اور مجھے اس سے مناسبت بہت کم تھی، اس لئے استفادے کی نوبت کم آتی تھی، پھر دار العلوم دیوبند سے مولانا کی ادارت میں ایک عربی مجلّہ ”**دعوۃُ الْحق**“ نکلنا شروع ہوا، طلبہ کی انجمن میں بھی وہ آتا تھا، خوبصورت، دیدہ زیب ٹائٹل، مدیر کے حسن ذوق کا آئینہ دار! ایک تو دار العلوم دیوبند سے عقیدت، دوسرے مدیر رسالہ کی عظمت، بڑے شوق سے اس کا حرف حرف پڑھا جاتا، گو کہ اس کا بڑا حصہ ہماری دسترس سے باہر ہوتا مگر شوق و محبت کی دنیا ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

پھر اچانک طبیعت کا رُخ بدلا، کہاں تو عربی انشاء و تکلم سے کوئی مناسبت نہ

تھی، اور کہاں اب یہ حال ہوا کہ ہمہ وقت اسی کی دھن رہنے لگی، ایک کتب خانہ والے سے فرمائش کی کہ دیوبند سے ”**القاموس الجدید**“ اردو سے عربی منگوا دیجئے، انھوں نے منگوائی ضرور، مگر اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ ضخامت بھی کچھ زیادہ تھی، جِلد اس کی نہایت خوبصورت، طباعت بے حد نظر فروز! بچپن کا زمانہ، حسن و زیبائش پر طبیعت فریفتہ، دیر تک اس کا حسن و جمال ہی دیکھتا رہا، اور خوش ہوتا رہا، لیکن یہ خوشی یک لخت کافور ہوگئی، جب بجائے اردو سے عربی کے دیکھا تو عربی سے اردو کا وہ لغت تھا، یا اللہ اب کیا کروں؟ مجھے تو اردو سے عربی میں ترجمہ کی مشق کرنی تھی۔ مگر اب کیا کرتا، اسی کو اتنا دہرایا کہ تقریباً پوری کتاب حفظ ہوگئی۔

پھر ۱۳۸۸ھ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے دیوبند پہونچا دیا، امتحان داخلہ مولانا وحید الزماں صاحب کے پاس تجویز ہوا، جاننے والے جانتے ہیں کہ دار العلوم کے امتحان داخلہ کا منظر قیامت صغریٰ کا نمونہ ہوتا ہے، نئے نئے طلبہ! دار العلوم دیوبند کی ہیبت اور اس کا جلال! اساتذۂ دار العلوم کی عظمت و شوکت! امید و بیم کی ایسی کشمکش ہوتی ہے کہ ان دنوں گردش ایام کا بھی پتہ نہیں چلتا، اب تو وہاں امتحانات داخلہ تحریری ہونے لگے ہیں، اس وقت تقریری امتحانات ہوتے تھے، دار الحدیث میں مختلف اساتذہ، تپائیوں کے حصار میں بیٹھے ہوتے، کتابیں ان تپائیوں پر رکھی ہوتیں، چپراسی طالب علم کا نام لے کر پکارتا، طالب علم بے چارہ ڈرا سہما حاضر ہوتا، کچھ دیر امتحان کی جانکنی میں مبتلا رہتا، پھر واپس ہو جاتا، اس کے بعد نمبر معلوم کرنے کی بے قراری ہوتی۔

اساتذہ مختلف رنگ طبائع کے تھے، بعض امتحان میں نرم ہوتے، ہر طالب علم چاہتا کہ اس کا امتحان انھیں کے پاس ہو، بعض اصول کے نہایت پابند، اور قواعد کو پوری طرح برتنے والے، ان کے پاس جانے سے ہر ایک گھبراتا اور کتراتا، ایسے

حضرات کے پاس کم ہی خوش قسمت کامیاب ہوتے۔

معلوم ہوا کہ اساتذۂ دارالعلوم میں امتحان کے باب میں بااصول لوگوں کی صف میں ممتاز ترین نام مولانا وحید الزماں صاحب کا ہے۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ میرا امتحان داخلہ مولانا ہی کے سپرد ہوا، میرے بعض پرانے رفقاء نے بہت محنت کی کہ میرا امتحان وہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو جائے، اور اس کے واسطے دو دو مرتبہ پکار کے باوجود مجھے حاضر نہیں ہونے دیا۔ مگر جب ان کی کوشش ناکام ہوگئی، اور بالآخر میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوگیا، امتحان کا انداز عجیب تھا، عبارت پڑھنے کا حکم دیا، فرمایا اس طرح پڑھئے کہ معلوم ہو کہ آپ نے کتاب کو سمجھا ہے، عبارت جیسی بن پڑتی تھی، پڑھ دی، حکم ہوا کتاب بند کرکے مطلب سمجھایئے، جس طرح ہوسکا اس کی بھی تعمیل کردی، پھر دیوان متنبّی کھولنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ ایک جگہ سے چند اشعار پڑھوائے، ترجمہ اور مطلب دریافت کیا، ایک لفظ پر تھوڑی سی بحث بھی ہوگئی۔ میں نے جو مطلب بتایا، مولانا نے اسے قبول نہیں کیا، میں مصر ہوگیا، مولانا سمجھا رہے تھے اور مجھ پر حماقت سوار تھی، میں اپنے بیان کئے ہوئے معنیٰ کیلئے دلائل دینے لگا۔ مولانا انھیں رد کررہے تھے، اور میں الجھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ بجائے ناراض ہونے کے مولانا خوش ہورہے ہیں، چہرہ پر بشاشت اور لہجہ میں شفقت بڑھتی جارہی ہے، آنکھوں میں تلطُّف کی ایک خاص چمک محسوس ہونے لگی، پھر ایک جگہ سے دس اشعار پڑھوائے، اور امتحان ختم ہوگیا۔ یہ سارا معاملہ بمشکل دس منٹ میں تمام ہوگیا، لطف کے جن الفاظ اور کرم کے جس لہجے میں مولانا نے واپسی کا حکم دیا، اسی سے اندازہ ہوگیا تھا کہ امتحان میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں ہے، چنانچہ جب نتیجہ معلوم کیا گیا تو پتہ چلا کہ صرف کامیابی کی سند ہی مولانا نے نہیں دی ہے بلکہ امتیازی نمبر عطا کئے ہیں۔

چند دنوں میں اسباق شروع ہونے والے تھے، مولانا اس زمانہ میں عربی تکلم وانشاء کے شائق طلبہ کو خود پڑھاتے تھے، اور اس کیلئے بڑی مشقت برداشت کرتے تھے، خود ہی اسباق تیار کرتے، اور انھیں اپنے خاص انداز میں پڑھاتے، انھیں اسباق کا مجموعہ بعد میں ’’القرأۃ الواضحۃ‘‘ کے نام سے متعدد اجزاء میں شائع ہوا، ان سے پڑھنے کی ہر طالب علم ہمت بھی نہیں کرتا تھا، کیوں کہ وہ جہاں خود لگن سے کام کرتے تھے، اسی طرح طلبہ سے بھی کام لیتے تھے، اس وقت انھوں نے تین درجے قائم کر رکھے تھے، صف اول، صف ثانی، صف نہائی، صف اول بالکل ابتدائی درجہ تھا، اس کی تعلیم کے لئے کبھی کبھی صف نہائی کے ممتاز طلبہ سے کام لیتے تھے، صف نہائی آخری درجہ تھا، اس میں شریک ہونے والے طلبہ عموماً عربی لکھنے اور بولنے پر بے تکلف قادر ہوجاتے تھے، نئے طلبہ عموماً صف اول میں داخلہ حاصل کر پاتے تھے، میں نے جرأت کی اور دفتر تعلیمات میں درخواست گزاری کہ میرا داخلہ صف ثانوی میں کرلیا جائے، حکم ہوا کہ مولانا سے اس پر منظوری لکھوا کر لاؤ، میں ڈرتے ڈرتے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، انھیں میرا امتحان یاد تھا، دیکھتے ہی پہچان گئے، اور میری درخواست پر ایسے کلمات تحریر فرمائے جو ہر اعتبار سے میری حیثیت سے بہت بلند تھے، اور آج بھی ان الفاظ کو سوچتا ہوں تو شرماتا ہوں کہ مولانا نے کیا حسن ظن ظاہر فرمایا اور میں کس پستی میں پڑا ہوا ہوں۔

صف ثانوی کے اسباق نماز مغرب کے بعد ہوتے تھے، چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز درسگاہ میں بیٹھتے ہی فرمایا کہ آج کل میں جس نے بھی کوئی سفر کیا ہو اس کی روداد کھڑے ہوکر عربی میں بیان کرے۔ قدیم طلبہ دو چار دن کے اندر مدرسہ میں حاضر ہوئے تھے اس غیر متوقع حکم سے سب سراسیمہ ہوگئے، ہم جیسے طالب علموں کے لئے مجمع عام میں اردو میں چند منٹ بولنا مشکل تھا، عربی میں اس

طرح بولنا تو اس وقت تک سوچا بھی نہ تھا، سب خاموش تھے۔ اور مولانا اسی حکم کو مکرر دہرا رہے تھے، ۷۰/ طلبہ کی جماعت تھی، زیادہ تر قدیم طلبہ تھے، چار پانچ جدید طالب علم تھے، میں سدا کا ناعاقبت اندیش، تھوڑا سا انتظار قدیم طلبہ کا کیا کہ وہ سال بھر مولانا کی صحبت میں مشق وتمرین سے مستفید ہو چکے تھے، اور میری جو کچھ مشق تھی بغیر کسی استاذ کے تھی، لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں سے کوئی کھڑا نہیں ہوا، تو میں نے ہمت کر ڈالی، دو روز پہلے سہارن پور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دی تھی، اسی سفر کی داستان کٹے پھٹے الفاظ میں اٹکتے بھٹکتے، ہکلاتے رکتے بیان کرتا رہا، اور اخیر میں بے اختیار میری زبان سے نکلا رَجَعْتُ مِنْهَا وَقْتَ الشَّامِ شام کے لفظ پر طلبہ کا ایک لطیف سا قہقہہ درسگاہ میں گونج گیا۔ میں بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محفل قہقہہ زار کیوں بن گئی، لیکن معاً مولانا کی گرجدار آواز سنائی دی، انھوں نے ہنسنے والوں کو تنبیہ کی اور بولنے والے کی حوصلہ افزائی فرمائی، مولانا کی گفتگو سے احساس ہوا کہ غلطی کیا تھی۔

مولانا کا دستور عموماً یہی تھا کہ وہ طالب علموں کی کمزوریوں اور غلطیوں پر زیادہ نظر نہیں رکھتے تھے، اور نہ ان پر بہت زیادہ زجر وتوبیخ کرتے تھے، اور نہ ان کی وجہ سے کسی کو حقیر سمجھتے تھے، وہ ان کی خفتہ صلاحیتوں پر نگاہ رکھتے تھے، انھیں بیدار کرنے کی تدبیریں کرتے، کمزوروں کو ہمت دلاتے، ہمت والوں کی حوصلہ افزائی کرتے، طالب علموں کو بے تکلف کر کے استفادے کی راہ کشادہ اور آسان کرتے، ان کے پاس جا کر ان کی باتیں سن کر، طالب علموں میں کام کی لگن، پڑھنے لکھنے کی دھن اور محنت وکوشش کی آگ بھڑک اٹھتی، کمزور سے کمزور طالب علم یہ سمجھ کر ان کے یہاں سے اٹھتا کہ میں بھی کچھ کر سکتا ہوں، وہ اس طریقہ سے طلبہ کو بہت جلد ترقی کی راہ پر لگا دیتے، نئے طلبہ جو ابتداءً دارالعلوم میں ڈرے سہمے رہتے، دبتے اور جھجکتے رہتے۔ مولانا ان کی جھجک بڑے خوبصورت انداز میں دور کرتے۔

تعلیم شروع ہو چکی تھی، ایک روز مجلسی گفتگو میں انھوں نے چند طلبہ کو ترغیب دی کہ بدھ کے روز شام کو سب لوگ اپنا اپنا کھانا لے کر ان کے کمرے میں پہونچ جائیں اور سب مل کر کھانا کھائیں، یہ چار پانچ طالب علم تھے، ہم لوگ ہر بدھ کو حاضر ہوتے، مولانا کے ساتھ کھانا کھاتے، کھانے کا سلیقہ سیکھتے، دسترخوان کے آداب کیسے برتے جاتے ہیں؟ مولانا ہمیں سکھاتے، اس نجی مجلس میں طلبہ بے تکلف ہوتے، اور مولانا سے قرب ومحبت کا احساس ہوتا، مولانا اس مجلسی گفتگو میں طلبہ میں ایک عجیب علمی وعملی لگن پیدا کر دیتے، مولانا بہت نازک مزاج تھے، مگر نہ جانے صبر وضبط کا کون سا پتھر اپنی نازک مزاجی پر رکھ لیتے کہ ہم لوگوں کے گنوار پن پر بھی کوئی تغیر نہ محسوس ہوتا، کھانے کے بعد مولانا خود چائے بناتے، نہایت نفاست کے ساتھ بڑے اہتمام کے ساتھ ہر ایک کو پلاتے، پینے کا طریقہ سکھاتے، اور لطف و عنایت کی باتیں کرتے جاتے۔

عصر کی نماز کے بعد تفریح کیلئے جاتے، دو چار طلبہ اس میں بھی ساتھ ہو جاتے، عربی میں گفتگو ہوتی، ساتھ والے طلبہ اس سے بہت فائدہ اٹھاتے، تفریح میں ساتھ جانے کی سعادت مجھے دو ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں حاصل ہوئی، البتہ مجلس طعام میں پابندی سے شرکت ہوتی۔

ایک بار مولانا کو اندازہ ہوا کہ پڑھنے لکھنے کے باب میں عموماً طلبہ میں سستی آ چلی ہے، اچانک خبر پھیلی کہ دارالحدیث میں مولانا طلبہ کو خطاب فرمائیں گے، بجلی کی طرح یہ خبر سارے دارالعلوم میں کوند گئی، غالباً مغرب بعد کا وقت تھا، جو جہاں سے اس خبر کو سنتا، وہیں سے دارالحدیث کی طرف پلٹ پڑتا۔ میں اب تک مولانا کے درس میں شریک ہوا تھا، جس میں زیادہ گفتگو عربی میں ہوتی، یا مجلس طعام میں جس میں

سب کو بولنے کی اجازت ہوتی، لیکن مولانا خطیب بھی ہیں، اس کی خبر نہ تھی، مولانا کا خطاب سننے کے لئے طلبہ بے تحاشا لپکے جا رہے تھے اس سے مولانا کی محبوبیت و مقبولیتِ بے حد کا اندازہ ہو رہا تھا اور یہ بات تو معلوم تھی ہی کہ مولانا کی مقبولیت احاطۂ دارالعلوم میں اکثر اساتذہ سے بڑھ کر ہے، لیکن آج کیا خاص بات ہے کہ طلبہ اس تیزی کے ساتھ لپکے چلے جا رہے ہیں، میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا، دارالحدیث میں پہونچا تو اس میں تِل رکھنے کی گنجائش نہ تھی، ایک دروازے پر کھڑے ہونے کی جگہ ملی، دیکھا کہ مولانا بھی تیزی سے چلے آ رہے ہیں۔ چہرے پر جوش کے خاص آثار دکھائی دے رہے ہیں، نگاہوں میں گرمی ہے، مولانا کے چلنے کا ایک خاص انداز تھا۔ سارا بدن سمٹا ہوا، پُر سکون ہوتا لیکن رفتار ہوا جیسی ہوتی، دائیں بائیں کوئی جنبش نہ ہوتی، حتیٰ کہ ہاتھوں میں بھی حرکت نہ ہوتی، تیر کی طرح چلتے، سیدھے تخت پر آ گئے، نہ کوئی تمہید نہ مقدمہ! آتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو، اس جوش اور روانی کے ساتھ بول رہے تھے کہ سننے والوں کی سانسیں سینوں میں اٹک اٹک گئیں، الفاظ کا زیر و بم، آواز کی گُھن گرج، خطابت کا ایسا طوفانی جوش میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پہاڑ کی بلندی پر سے پانی کا ریلا نہایت شدت کے ساتھ اتر رہا ہو اور اپنے ساتھ بڑی بڑی چٹانوں کو بہائے لئے جا رہا ہو۔ ٹھیک اسی طرح مولانا کا جوشِ خطابت، طبیعتوں کی سرد مہری، سستی و ناکارگی، بے حوصلگی و بے ہمتی کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے چلا جا رہا تھا، بمشکل پون گھنٹہ یہ خطاب ہوا تھا، لیکن سننے والوں کو محسوس ہوا کہ صدیوں کی گرانجانی ان پر سے اتر گئی ہو، دلوں میں حوصلہ کی حرارت بڑھ گئی، مقصد کیلئے انہماک اور دھن کا ولولہ جاگ اٹھا، دارالحدیث سے واپسی ہوئی تو ہر طالب علم بدلا ہوا نظر آیا۔

ایک بار خبر گرم ہوئی کہ ممالک عربیہ کے کچھ سفراء دارالعلوم کے معائنہ کے لئے آ رہے ہیں، ان کے استقبال کے لئے دارالحدیث میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا، یاد نہیں کتنے سفراء تھے مگر اسٹیج پر ایسا لگتا تھا کہ عربوں کی ایک دنیا اتر آئی ہو، ابتدائی کارروائی کے بعد صف نہائی کے ایک طالب علم کو تقریر کے لئے طلب کیا گیا، وہ آئے اور انھوں نے برجستہ فصیح و بلیغ عربی میں خالص عربی لب و لہجہ میں ارتجالاً تقریر کی، دارالعلوم کے سبھی اساتذہ و طلبہ اور اربابِ انتظام بے حد مسرور ہوئے، یہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی کاوش و کوشش کا ایک نمونہ تھا۔ یاد آتا ہے کہ کسی سفیر نے کچھ دیر تقریر کی، اخیر میں دارالعلوم دیوبند کے نامور مہتمم، ملک کے بے مثل خطیب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حکیمانہ انداز میں ایک بلیغ تقریر کی، یہ تقریر اُردو میں تھی، اس لئے معزز مہمان اس سے مستفید نہ ہو سکے، مہتمم صاحب کی تقریر ختم ہوئی، اور حضرت مولانا وحید الزماں صاحب ترجمہ کے لئے کھڑے ہو گئے، ایسا برجستہ، شستہ اور فصیح و بلیغ ترجمہ کیا، اور اتنی روانی اور خطیبانہ آہنگ کے ساتھ کیا کہ عام سامعین تو مبہوت تھے ہی عرب سفراء بھی مسحور ہو کر رہ گئے، ان کا حال یہ تھا کہ کبھی جھومنے لگتے، کبھی مولانا کا چہرہ تکتے، کبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھتے، بے ساختہ **سبحان اللہ** کی صدا بلند ہوتی، مولانا کا خطاب تھا کہ لحہ بہ لحہ اس کی قوت و جوشش بڑھتی جاتی تھی، آواز تھی کہ جادو جگا رہی تھی، شعلہ سا لپک رہا تھا، مضامین حضرت مہتمم صاحب کے نہایت بلند و بالا، ترجمہ عربی زبان میں، جس کی رزانت و جزالت کا جواب نہیں اور محو گل افشانی گفتار حضرت مولانا وحید الزماں صاحب! جن کی خطابت بے مثال! بس سماں بندھ گیا، تقریر ختم ہوئی تو تمام مہمان کھڑے ہو گئے اور ایک صاحب جو ذرا ممتاز تھے، بے اختیار بغل گیر ہو گئے، وہ کچھ کہہ رہے تھے غالباً مولانا کو داد دے رہے تھے۔

مولانا کو دارالعلوم سے عشق تھا، دارالعلوم کی تعلیم، اس کی تربیت میں کچھ

کمزوری اور کمی محسوس کرتے، تو بیتاب ہوجاتے، اور اپنے دائرۂ اختیار میں ہر ممکن کوشش اس کو دور کرنے کی کرتے، انھیں محسوس ہوا کہ طلبہ نماز میں کچھ سست ہورہے ہیں، گرمیوں کا موسم تھا، رات گئے دیر تک طلبہ پڑھتے رہتے، رات چھوٹی ہوتی، سوتے اور نوجوانی کی نیند! سوتے ہی رہ جاتے، فجر کی جماعت میں حاضری کم ہوگئی تھی، مولانا نے اسے محسوس کیا اور دارالاقاموں کا چکر لگانا شروع کردیا، مولانا وحید الزماں جس طوفانی وجود کا نام تھا۔ ممکن نہ تھا کہ جس طرف سے وہ گزر جائیں، کوئی بستر پر پڑارہ جائے، حالانکہ وہ نہ ڈانٹتے نہ مارتے، بس ان کی ہیبت، ان کا جلال اور ان کی محبت ایسی تھی کہ ہر ایک کو خوابِ راحت سے جگاتی، بستر استراحت سے اٹھاتی اور مسجد تک پہونچاتی چلی جاتی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے فجر کی نماز میں پچھڑ جانے والوں کو جگہ ملنی مشکل ہوجاتی، نہ جانے کیا جادو تھا ان کی شخصیت میں!

دارالعلوم دیوبند کا موضوع علمی و تعلیمی اعتبار سے قرآن وحدیث اور فقہ ہے، اور عملاً ایسے رجال کار تیار کرنا جو اسلام، ایمان اور احسان تینوں شانوں کے جامع ہوں تاکہ شریعت اسلامی کامل طور پر ان کی صورت وسیرت میں اور ظاہر و باطن میں جلوہ گر ہو، وہ عالم باعمل ہوں، اور دیکھنے والوں کے لئے دین اسلام کے حسن و جمال کے مرقع ہوں، ان کو دیکھ کر اللہ یاد آئے، وہ ایسے مرد مجاہد ہوں کہ اللہ کے نام پر، رسول ﷺ کے نام پر، دین و مذہب کے واسطے جان و مال کی بڑی سے بڑی قربانی دے کر، اپنے عجز و قصور کا اعتراف کریں، اور وہ ہر باطل سے پنجہ آزمائی کے لئے مستعد ہوں۔ بحمد اللہ دارالعلوم دیوبند ایسے رجال کار اور مردانِ راہ تیار کرنے میں کامیاب رہا۔ بالخصوص دارالعلوم کا قرنِ اول اور قرنِ ثانی اس سلسلہ کا عہد زریں ہے، اس دور میں اس نے ہمہ جہت علماء پیدا کئے، لیکن دارالعلوم پر ایک ایسی جہت سے اعتراض ہوتا رہا، جو دارالعلوم کا موضوع نہ تھا، وہ یہ کہ یہاں کے طلباء وعلماء عربی

انشاء پردازی اور عربی بولنے پر قدرت عموماً نہیں رکھتے، الزام یہ تھا کہ اتنے دنوں تک عربی پڑھنے پڑھانے کے باوجود اس زبان میں چند الفاظ بولنے ہوں یا کچھ لکھنا ہو تو یہ لوگ عاجز رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ندوہ نے پیش رفت کی تو یہ اعتراض اور نمایاں ہوگیا۔

دارالعلوم پر سے اس اعتراض کو جس نے اٹھایا، وہ مولانا وحید الزماں صاحب تھے، وہ جیسا کہ معلوم ہوچکا عربی زبان کے غیر معمولی قادر الکلام خطیب تھے، خالص عربی لب ولہجہ میں جب وہ محوکلام ہوتے تو اندازہ کرنا مشکل ہوجاتا کہ وہ ہندوستانی ہیں یا عربی! اس سے بڑھ کر ان کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے عجمی ماحول کو یکسر عربی میں تبدیل کردیا تھا، وہی جو کل تک عربی زبان کے حق میں گونگے تھے، آج ناطق وگویا ہوگئے، یہ ان کی تعلیم وتربیت کا کمال تھا کہ تھوڑی ہی مدت میں رنگِ میخانہ بدل گیا، آج دارالعلوم کے فیض یافتوں میں جہاں کہیں عربی تکلم وانشاء کا چرچا ہے، وہ سب انھیں کا بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض ہے۔

مولانا تعلیم وتربیت کے ساتھ اعلیٰ انتظامی صلاحیت رکھتے تھے، تھوڑے وقت میں بڑے سے بڑا کام کرڈالنا ان کے لئے معمولی بات تھی، انتظام کے ہر شعبہ پر ان کی گرفت یکساں ہوتی، جن دنوں وہ دارالعلوم کے معاون مہتمم تھے وہاں کا ہر شعبہ حسنِ انتظام کا آئینہ دار تھا۔

مولانا کی خوبیاں بیان کرنے کیلئے دفتر درکار ہے، لکھنے والے کی نگاہ قاصر ہے، قلم کوتاہ ہے، مولانا سے کچھ لوگ ناراض بھی رہے، مگر مولانا اپنی دھن کے پکے تھے، جس کو صحیح سمجھا، برملا کہا، اور صرف کہا نہیں، اسی راہ پر خود کو ڈال دیا، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، بشری خطاؤں اور غلطیوں سے درگزر فرمائے، آمین

☆☆☆☆☆☆

حضرت جی

حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلویؒ

وفات: ۱۰؍جون ۱۹۹۵ء

بستی نظام الدین دہلی سے دعوت وتبلیغ کی جو عظیم الشان تحریک اللہ کے ایک مقبول اور مخلص بندے حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں اٹھی، پھر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ امارت میں اس میں وسعت پیدا ہوئی اور گیرائی بھی!......ان کے اٹھ جانے کے بعد، ان کے رفیق کار، ہمہ دم مشیر وجلیس حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کے کاندھے پر اس عظیم ووسیع تحریک کی سربراہی کا بوجھ آیا، حضرت مولانا نے اپنی کم آمیزی، خاموشی اور یکسوئی کے باوجود جس حسن وخوبی سے، اس ذمہ داری کو نبھایا ہے، یہ بھی حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت کا ایک بلیغ نمونہ ہے۔

حضرت جی کا ۱۰؍محرم ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۰؍جون ۱۹۹۵ء کو وصال ہوگیا۔ یہ وصال کسی ایک فرد یا خاندان کا حادثہ نہیں ہے، بلکہ پوری ملت کا حادثہ ہے اللہ تعالیٰ کے نیک بندے دنیا میں رحمت وبرکت کے نزول کے باعث ہوتے ہیں، ان کی بندگی وطاعت، خدمت خلق میں ان کی سرگرمی ومحنت کوشی، اور دین اسلام کی اشاعت وتبلیغ میں ان کی سرفروشی اور جانفشانی ایسے عنوانات ہیں جن پر رحمت خداوندی مسلسل برستی ہے، اور ساری دنیا اس کے سائے میں چین پاتی اور اس سے مستفید ہوتی ہے۔ جب یہ ہستیاں اٹھ جاتی ہیں تو ان برکات وصلوات کا نزول رک جاتا ہے۔ پھر اگر دوسرے لوگ اس جگہ پر آتے ہیں اور ویسی ہی شان عبودیت پیدا کرلیتے ہیں تو برکات کی تجدید ہوجاتی ہے، ورنہ سلسلہ بند ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت جی کو جن اوصاف سے نوازا تھا، ان میں سب سے البیلی شان یہی تھی کہ تمامتر علم وفضل اور دنیاوی منصب ودولت کے اسباب وذرائع ان کے قدموں کے نیچے موجود تھے اس کے باوجود انھوں نے شاید دنیا کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، پوری زندگی ایک جگہ یکسو ہوکر دین، محض دین کے واسطے اپنی شخصیت کو مٹا ڈالا، حضرت جی وفاداری بشرط استواری کے نمونہ تھے، باجود خلاف طبع ہونے کے محض دین کے واسطے، صرف اللہ کیلئے لمبے لمبے اسفار کرتے، مختلف امراض وعوارض کے ہوتے ہوئے، مشقت اٹھاتے، ہر قسم کے لوگوں سے ملتے، انھیں نصیحت کرتے، اسلام کیلئے اور مسلمانوں کی ہدایت کیلئے جو تڑپ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب رحمہما اللہ کے سینے میں تھی، وہی حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کے سینے میں بھی تھی، البتہ وہاں پُر جوش وپُر شور تھی اور یہاں پُرسکون تھی، اندر اندر موجیں اٹھتی رہتی تھیں، مگر سطح بظاہر خاموش نظر آتی تھی لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ان کی لہریں اکناف عالم میں پھیل کر دنیا کی آخری سرحدوں سے ٹکرا رہی ہیں، حضرت جی دنیا سے چلے گئے، لیکن دین کے لئے ایک جذبہ، ایک لگن، ایک تدبر اور ایک انتظام دے گئے، اللہ تعالیٰ اخلاف کو اس کی حفاظت اور اس کی مزید ترویج واشاعت کی توفیق دے، اور دنیا کے بوجھ کو اتار پھینک جانے والے مسافر کو منزل کی راحت اور اس کا قرار نصیب فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب

وفات: ۳۰/ جون ۱۹۹۵ء

تقریباً ڈیڑھ سال قبل قصبہ گھوسی میں ایک مدرسہ کے جلسہ میں حاضری ہوئی، جونہی میں وہاں پہونچا اور ایک صاحب نے قیام گاہ تک پہونچایا، وہاں ایک صاحب کو دیکھا کہ نیم دراز ہیں، انھیں دیکھتے ہی میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مشہور شیخ طریقت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ دوبارہ دنیا میں آگئے ہیں، اور یہاں تشریف فرما ہیں، ہو بہو وہی شکل وصورت وہی آنکھ بند کرنے کا انداز، وہی سادگی وبے تکلفی، وہی طرز ادا، میں مبہوت سا ہو گیا، لیکن فوراً ہی غلط فہمی دور ہوگئی، یہ مولانا نہ تھے، مولانا کے بڑے صاحبزادے، اور خلیفہ مولانا اشتیاق احمد صاحب تھے، اسی انداز سے ملے، جو حضرت مولانا کا مخصوص مشفقانہ انداز تھا، وہی طرز تکلم، وہی انداز پذیرائی، اور جب تقریر سنی تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے حضرت مولانا ہی جلوہ افروز ہوں۔

خبر آئی کہ یکم / صفر ۱۴۱۶ھ مطابق ۳۰/ جون ۱۹۹۵ء کو کئی ماہ کی مسلسل علالت کے بعد لکھنؤ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مولانا مرحوم پر یرقان کا اثر تھا، کافی عرصہ تک الہ آباد میں علاج ہوتا رہا، پھر ان کے چھوٹے بھائی قاری مشتاق احمد انھیں لکھنؤ لے آئے، یہاں اہتمام سے علاج ہوا، مگر اللہ کی مشیت پوری ہوئی۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ صاحبزادۂ محترم کی ذات گرامی سے روحانیت کی وہی شمع فروزاں ہوگی، اور اس کی تابانی باقی رہے گی، جو حضرت اقدس مولانا محمد احمد صاحب

نے جلائی تھی، مگر اللہ کو منظور نہ تھا، چند ہی سال کے وقفے سے وہ بھی ابا حضور کی خدمت میں میں پہونچ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆

(بقیہ ص: ۲۴۷ کا)

کوئی بیمار ہو، کوئی پریشان حال ہو، کسی کو کوئی ضرورت ہو، مولانا نہایت بشاشت کے ساتھ خدمت کیلئے موجود ہوتے، خدمت کر کے انھیں روحانی تسکین ہوتی۔

مولانا ۳۔۴/ نومبر ۱۹۹۵ء کی درمیانی شب میں اس دنیا کو چھوڑ کر اللہ کے حضور پہونچ گئے، ایک مومن کے لئے آخرت بہر حال دنیا سے بہتر ہے۔ لیکن دنیا والوں کو ہدایت ورہنمائی کے چراغ بجھ جانے سے تاریکی کا احساس بڑھ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اللہ کا شکر ہے ان کے اخلاف میں علم دین کی شمع روشن ہے، مولانا عبید اللہ صاحب اسعدی مدظلہٗ انھیں کے فرزندِ گرامی ہیں۔ وہ علمی وفقہی حلقوں میں معروف ہیں۔

مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب بستوی

وفات: ۴؍نومبر ۱۹۹۵ء

مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب اس خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس کی دینی اور تعلیمی جدوجہد کے میدان میں ایک نمایاں تاریخ ہے۔ حضرت مولانا سید محمد جعفر صاحب نقوی علیہ الرحمہ اس باکمال قافلہ کے ایک رکن تھے جس نے پچھلے دور میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاص وللّٰہیت، جوش عمل اور جذبۂ جہاد کی یاد تازہ کردی تھی، اس قافلہ نے حضرت سید احمد شہید قدس سرہٗ کے فیض تربیت سے ملک کی خوابیدہ فضا میں ایک نئی ہلچل ڈال دی تھی، حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کے رفقاء کا جذبہ وجوش ٹھنڈا نہیں پڑا، جس کو جہاں موقع ملا، اس نے وہیں دینی وایمانی جدوجہد کا صور پھونکا، حضرت سید محمد جعفر صاحب کی پوری زندگی محض اللہ کے واسطے اور اللہ کے دین کے واسطے وقف رہی۔

مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب انھیں اسلاف کے خلف صالح تھے، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ تھے، اخلاص وتواضع کے پیکر تھے، فراغت کے بعد مولانا نے کچھ دنوں تدریس کی خدمت انجام دی، اس کے بعد وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شبلی لائبریری سے وابستہ ہوئے، اور کتاب اور کتب خانہ کی ترتیب وترقی ان کی زندگی کا موضوع بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس فن میں انھیں خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔

مولانا مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے، حق تعالیٰ کی طرف سے انھیں کتابوں اور علم کے شغف کے ساتھ خدمت وعمل کا جذبہ ملا تھا،

(بقیہ ص: ۲۴۶ پر)

مولوی ڈاکٹر سلطان الدین صاحب

وفات: ۲۹؍نومبر ۱۹۹۵ء

دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب کے برادر اصغر، حضرت محدث کبیر علیہ الرحمہ کے شاگرد اور ایک صاحب دل بزرگ تھے، غالبًا اکتوبر کے اوائل میں میں مجھے ان کا ایک خط ملا کہ میرے پاس پرانے علمی رسائل ہیں۔ انھیں میں مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کی لائبریری کو ہدیہ کرنا چاہتا ہوں، دستخط تھے ڈاکٹر سلطان الدین صاحب کے، یہ بزرگ میرے لئے اجنبی تھے، کچھ دنوں کے بعد میں اور ناظم مدرسہ مولانا محمد عارف صاحب عمری ان کے گھر حاضر ہوئے، موصوف نے اُندُرا کا پتہ دیا تھا، پوچھتے تلاش کرتے وہاں پہونچے، ملاقات ہوئی تو بہت نحیف ونزار پایا، بیحد بیمار، کہ تکلیف کی وجہ سے کروٹ لینا بھی دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ لیکن دماغ بالکل سلامت اور درست تھا، تعارف کرایا تو بے ساختہ رونے لگے، ''المآثر'' وجہ تعارف ہوا تھا، وہ المآثر کے قدردان تھے، باوجود ضعف کے اسے حرفاً حرفاً پڑھتے تھے، گفتگو شروع کی تو اول سے آخر تک محدث کبیر نور اللہ مرقدہٗ کا ذکر کرتے رہے، ان کے شاگرد تھے، ان کی شفقت ومحبت، ان کی علمی فنائیت، ان کا عالمانہ جلال وجمال، ان کا استغناء وتوکل، ان کا ورع وتقویٰ ہر ایک کا تذکرہ کرتے رہے، اور بات بات پر آب دیدہ ہوتے رہے۔ اور اپنی بیماری کا ذکر بہت کم کیا، صبر وشکر کے پیکر تھے، معلومات بہت وسیع تھیں، دینی امور میں بہت پُختہ تھے، افسوس کہ اس حالت میں ملاقات ہوئی، وعدہ کیا کہ ذرا صحت ہوئی، تو رسالے نکلوا کر میں

خود بھیجوں گا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا وقار عظیم ندوی کا خط آیا کہ والد صاحب کی علالت کا سلسلہ طویل ہوگیا ہے، ان کے حسب ہدایت تمام رسائل ومجلّات الگ کردیئے گئے ہیں، خود تکلیف کرکے آکر لے جائیں، میں مولانا محمد عارف صاحب عمری اعظمی کے ہمراہ حاضر ہوا تو اس وقت حالت پہلے سے بہتر تھی، حسب معمول وہی اللہ کا اور اللہ والوں کا تذکرہ تھا، حسن خاتمہ کیلئے دعا کی التجا تھی، آنکھوں میں آنسو اور دل میں درد کی فراوانی تھی۔

پھر خبر آئی کہ ۶/رجب ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۹/نومبر ۱۹۹۵ء کو ان کا وصال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، ان کی ملاقات سے طبیعت بہت متاثر ہوئی تھی، پرانے نمونے اٹھتے جارہے ہیں۔ خدا کرے ایسے لوگ اور بھی ہوتے رہے۔(۱)

☆☆☆☆☆☆☆☆

---

(۱) ڈاکٹر صاحب مرحوم، دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب علیہ الرحمہ کے چھوٹے بھائی تھے۔

ایک چہکتا بلبل خاموش ہے

(مولانا حکیم وصی احمد صاحب گورکھپوری علیہ الرحمہ)

وفات: ۱۰/رجب ۱۴۱۶ھ مطابق ۳/دسمبر ۱۹۹۵ء

۱۲/رجب ۱۴۱۶ھ کو مجھے علاج کے لئے بھیونڈی جانا تھا، میرے محبوب ومحبّ دوست جو ضعف وناتوانی کی آخری حدوں تک پہونچ چکے ہیں، لیکن ان کا عزم سفر ہر دم جواں رہتا ہے، ان کی بینائی کی کمزوری اور جسم کی ناطاقتی کے باعث میں نے انھیں سفر سے روک دیا تھا، یہ ہیں حاجی عبد الاحد صاحب معروفی! کسی تقریب سے ان کے سامنے گورکھپور کا ذکر آگیا، گورکھپور کا ذکر چھڑے اور بات حکیم وصی احمد صاحب تک نہ پہونچے، ممکن نہیں! میری طرح حاجی صاحب بھی حکیم صاحب کی محبت کے اسیر ہیں، مچل گئے کہ بھیونڈی سے واپس آجایئے، تو حکیم صاحب کی خدمت میں چلا جائے۔

میں ۱۲/رجب کو بھیونڈی کے سفر پر نکل گیا، ۱۴/کو علی الصباح پہونچا، وہاں دورانِ گفتگو کسی نے بتایا کہ حکیم وصی احمد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، میرے دل پر قیامت گزر گئی، کب ہوا؟ کیسے خبر ملی؟ ان سوالوں کا تسلی بخش جواب نہ ملا، بس یہ معلوم ہوا کہ بمبئی کے کسی اخبار میں یہ خبر چھپی تھی، میرا دل حسرت واندوہ میں ڈوب گیا، مرنا برحق ہے، جو اس دنیا میں آیا ہے جائے گا، مگر حکیم صاحب بھی اس طرح چل دیں گے اس کا وہم وگمان نہ تھا، جو دوسروں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر صحت اور زندگی

بانٹتا تھا، آج وہ خود بیماری کی راہ سے موت کی آغوش میں جا سویا۔ آہ! انسان کتنا فریب خوردہ ہے، ہر روز دیکھتا ہے کہ جانے والوں کا قافلہ پیاپے چلا جارہا ہے، لیکن اس کا دل جس سے اٹک جاتا ہے، اس کے بارے میں بھول کر بھی تصور نہیں کرتا کہ وہ بھی ایک دن چل دے گا، لیکن بالآخر فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور آدمی خود کو محرومیوں کے ہجوم میں کھڑا پاتا ہے۔

حکیم صاحب کو میں ایک مدت سے جانتا ہوں، ۱۹۷۶ء میں مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کی کتاب ''تذکرۂ علماء اعظم گڈھ'' شائع ہوئی، اس میں مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں، مجھے حضرت مصلح الامت سے عشق ہے، میں نے ان کا تذکرہ بار بار پڑھا، اتنی مرتبہ پڑھا کہ وہ مجھے ازبر ہو گیا، اس میں حکیم وصی احمد صاحب کی بھی ایک طویل تحریر ہے، نہایت دلآویز و نصیحت آمیز! یہی ان کے تعارف کی بنیاد ہے۔

عرصہ ہوا میں الہ آباد میں حضرت مصلح الامتؒ کی خانقاہ میں مجلس کے اندر بیٹھا تھا، میر مجلس اس وقت حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامؔی مرحوم تھے، دیکھا کہ ایک پستہ قد باوجاہت بزرگ تشریف لا رہے ہیں، رفتار میں ایک خاص وقار ہے، آہستہ آہستہ چل رہے ہیں، آنکھیں بڑی بڑی، ان پر موٹے شیشے کا چشمہ چڑھا ہوا، رنگ گندم گوں، شیروانی زیب تن، انھیں دیکھ کر تمام اہل مجلس بے ساختہ کھڑے ہو گئے، ان کی بھاری آواز گونجی **السلام علیکم**، مولانا جامی صاحبؒ نے بڑھ کر استقبال کیا، ان کو خصوصی جگہ پر بٹھایا، ان کے بیٹھتے ہی مجلس پر ایک نیا رنگ چھا گیا، انھوں نے نہایت شائستگی کے ساتھ بے تکلف گفتگو شروع کر دی، گفتگو جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی دلچسپ اور مرصع ہوتی گئی، تھوڑی دیر میں محسوس ہوا جیسے سامعہ ان کی گفتگو کی حلاوت میں ڈوب گیا ہو، میں نے چپکے سے جامی صاحب سے پوچھ لیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ حکیم وصی احمد صاحب گورکھپوری ہیں، بے اختیار حکیم صاحب کی وہ تحریر لوحِ ذہن پر جگمگانے لگی، یہ ان سے پہلی ملاقات تھی جو غالباً ۱۹۷۸ء میں ہوئی تھی۔

اس کے بعد عرصہ تک حکیم صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا، برسوں کے بعد ایک بار گورکھپور جانا ہوا، تو ایک بزرگ دوست کی معیت میں حکیم صاحب کے درِدولت تک رسائی ہوئی وہاں جا کر معلوم ہوا کہ میرے زمانۂ طلب علم کے دارالعلوم دیوبند کے نامور طالب علم مولانا حکیم محمد احمد صاحب انھیں حکیم صاحب کے فرزند ہیں، ان کے گھر پر ان کی مہمان نوازی، ان کی خاطر داری، ان کی تواضع و پذیرائی دیکھ کر دل اور مانوس ہوا، میں بزرگوں اور اہل اللہ کی محبت کا سدا کا زخمی ہوں، حکیم صاحب نے جیسے میرے دل کی نبض دیکھ لی ہو، میں بیٹھا اور انھوں نے بزرگوں کا تذکرہ چھیڑ دیا، اول تو حکایت لذیذ! پھر بیان حکیم صاحب جیسے شیوہ بیان کا، میں کھو گیا، اور جب اٹھا تو گہرا تأثر دل پر لے کر اٹھا۔

پھر تو تقریباً سالانہ حاضری ہونے لگی، بلکہ کبھی کبھی سال میں دو بار! کئی مرتبہ ان کا مہمان بننے کا شرف حاصل ہوا، مہمان نوازی کوئی ان سے سیکھے، ذائقۂ کام و دہن کا بھی سامان اور لذت سامعہ و روح کا بھی انتظام! حکیم صاحب کے دسترخوان پر کھانا بہت لذیذ ہوتا تھا، لیکن باتیں ان کی، اور خلوص ان کا لذیذ تر ہوتا تھا۔

حکیم صاحب بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، بچپن کا کچھ دور انھوں نے تھانہ بھون حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے سایۂ شفقت میں گزارا ہے، حکیم صاحب کے کوئی قریبی عزیز حضرت تھانوی کے متوسلین میں تھے، اور تھانہ بھون میں مع اہل وعیال کے مقیم تھے، حکیم صاحب انھیں کے واسطے سے تھانہ بھون پہونچے، حضرت

اقدس تھانویؒ کو بچوں سے بہت انس اور پیار تھا، حکیم صاحب بھی اس انس سے خوب سرفراز کیئے گئے، حکیم صاحب کو اس دور کے کچھ واقعات یاد تھے، انھیں سناتے تو ازخود رفتہ ہوجاتے۔

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور میں بھی طالب علمی کا دور گزرا رہے، دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہٗ، اور مولانا اعزاز علی صاحب علیہ الرحمہ کی عنایتوں سے سرفراز رہے، مظاہر میں بھی اکابر کے منظورِ نظر رہے، اس دور کا جب ذکر چھڑ جاتا تو حکیم صاحب کا حافظہ ابل پڑتا، گھنٹوں بیان کرتے رہتے، نہ خود اکتاتے، نہ سننے والا گھبراتا، اگر گھبراہٹ ہوتی تو اس کی کہ کہیں کوئی مریض نہ آجائے، جس کی وجہ سے سلسلۂ بیان تھوڑی دیر کے لئے سہی، منقطع ہوجائے اور ایسا بہت ہوتا، لیکن جیسے ہی مریض رخصت ہوتا حکیم صاحب پھر اسی طرح محو گل افشانی گفتار ہوجاتے۔

ایک سفر میں میرے بوڑھے دوست حاجی عبدالاحد صاحب معروفی بھی ان کی خدمت میں پہونچ گئے، پھر دونوں بوڑھوں میں ایسی مناسبت اور محبت پیدا ہوئی کہ حاجی صاحب کا اصرار بسا اوقات مجھے گورکھپور لے گیا۔

حکیم صاحب کی طالب علمی کا ذکر آیا تو لگے ہاتھوں ان کا ایک قصہ سن لیجئے جو انھوں نے ہمیں سنایا تھا، غالباً متوسطات کی تعلیم کا دور تھا، حضرت اقدس مدنیؒ کی خدمت میں کوئی شاعر حاضر تھے، مجلس میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ بھی موجود تھے، طلبہ پر رُعب دونوں بزرگوں کا بہت تھا، لیکن خصوصیت سے مولانا اعزاز علی صاحب سے طلبہ بہت ڈرتے تھے کیونکہ اصول وقواعد کے برتنے اور تنبیہ و مواخذہ میں ان کا ایک خاص مزاج وانداز تھا، ویسے وہ طلبہ پر مادر مشفق کی طرح مہربان بھی تھے، ان شاعر صاحب سے کسی نے حضرت مدنیؒ کا مزاج پا کر اشعار سنانے کی فرمائش کردی، وہ شعر سنانے لگے، کسی شعر پر حکیم صاحب جو کہ ایک طالب علم تھے، پھڑک گئے اور بے ساختہ منہ سے واہ واہ کی صدا نکل گئی، طالب علم کی یہ جرأتِ رندانہ اور وہ بھی ایسی ثقہ اور باوقار مجلس میں! کئی پیشانیوں پر شکنیں ابھر آئیں، مولانا اعزاز علی صاحب نے گرم نگاہوں سے گھورا، لیکن حضرت مدنیؒ کے ادب کی وجہ سے کچھ نہ بول سکے، مجلس برخاست ہوگئی، سبق کا وقت آیا، حکیم صاحب بھی درس میں حاضر ہوئے، اور چاہا کہ عبارت پڑھیں، بس مولانا اعزاز علی صاحب پھٹ پڑے، ان کے بولنے کا ایک خاص انداز تھا، جس کو زبان سے تو ادا کیا جاسکتا ہے، لیکن ضبط تحریر میں لانا بہت مشکل ہے، فرمانے لگے مولی صاحب مولی صاحب، آپ کو عبارت پڑھنے سے کیا کام، آپ تو داد دینے آئے ہیں، مولانا ایک جملہ مکرر سہ کرر دہراتے تھے، اور ہر دفعہ شروع میں دوبار مولی صاحب مولی صاحب ضرور کہتے، مولانا نے یہ جملہ اتنی بار دہرایا کہ حکیم صاحب پانی پانی ہوگئے، معافی چاہی، مولانا کو تربیت مقصود تھی، مقصد حاصل ہوگیا خفگی دور ہوگئی۔

بزرگوں کی صحبت کی برکت سے حکیم صاحب پر دینداری وتقویٰ کے آثار ہویدا تھے، وہ ظاہراً وباطناً دیندار تھے، صاحب ثروت تھے، مطب ان کا ذریعہ آمدنی تھا، جو خوب چلتا تھا، تعلیم وتدریس سے براہ راست تعلق نہ تھا، مگر دین اور اہل دین کی محبت دل میں خوب راسخ تھی، ان کے پورے گھرانے پر دین کا رنگ غالب ہے، انھوں نے اپنے بچوں کے حق میں بھی دین ہی کو مقدم رکھا، دو بیٹے تو باقاعدہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں اور جو مولوی نہیں ہیں وہ بھی ماشاء اللہ دینداری میں پختہ ہیں، میں نے ان کے گھرانے میں داڑھی منڈی ہوئی نہیں دیکھی، خواہ صاحبزادگان ہوں یا داماد! بعض مرتبہ بیٹوں اور دامادوں کا قران السعدین بھی دیکھا، ماشاء اللہ! انھیں دیکھ کر ناواقف یہ سمجھے کہ یہ گھر نہیں مدرسہ ہے، جہاں اتنی تعداد میں

علماءفروکش ہیں، یا خانقاہ ہے کہ پیر خانقاہ کی خدمت میں سالکین حاضر ہیں، اس منظر کو دیکھ کر دل پر خاص اثر ہوتا، یہ حکیم صاحب کی قلبی اور باطنی دینداری کا اثر تھا، ورنہ ہمارے زمانے میں بعض علماء کے گھرانوں میں خاصی تعداد میں بے ریش اور نمازوں کے ہضم کرنے والے مل جاتے ہیں،

حکیم صاحب نکاح وشادی کی رسوم کو اسی دینداری اور خدا پر توکل کے جذبہ سے بالکل بیخ وبن سے اکھاڑنے پر تلے رہتے، اپنے بچوں اور بچیوں کے نکاح میں کوئی خلاف سنت رسم نہ ہونے دی، اور نہ ایسی شادیوں میں شریک ہوتے، جہاں خلاف شرع رسوم کی پابندی ہوتی، اس طرح کی دعوتوں سے بھی احتراز کرتے، مجلس نکاح میں شرکت کر لیتے، مگر بارات کے عنوان سے جو دعوت کھلائی جاتی اس سے اجتناب کرتے، اور اس سلسلے میں وہ کسی کی پرواہ نہ کرتے۔

اس سلسلہ میں وہ یہاں تک پختہ تھے کہ بڑی سے بڑی نسبتوں کو ٹھکرا دیتے، انھیں اپنی اولاد کے دنیوی مستقبل سے زیادہ اخروی مستقبل کی فکر رہا کرتی تھی۔ ویسے یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے محض اللہ کے واسطے جب اونچی نسبتوں کو ٹھکرایا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے بہتر انتظام فرما دیا۔

ایک روز بڑے لطف سے انھوں نے ایک صاحبزادی کے نکاح کی داستان سنائی، میں نے جب یہ داستان سنی اسی وقت تہیہ کر لیا تھا کہ اسے کسی وقت لکھ کر شائع کر دوں گا، خیال تھا کہ حکیم صاحب کو دکھا لوں گا، ان کی تصدیق اور نظر ثانی کے بعد اس کی اشاعت ہوگی۔ لیکن کیا پتہ تھا کہ وہ اتنی جلدی آنکھیں موند لیں گے، اور مجھے ان کے تذکرے کے ضمن میں یہ ایمان افروز داستان سنانی پڑے گی۔

فرمانے لگے کہ گورکھپور میں ایک بڑے عہدہ دار جو مسلمان تھے، عرصہ سے تعینات تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، اور اسی صوم وصلوٰۃ کی پابندی کی وجہ سے حکیم صاحب کے مطب اور علاج کے واسطے سے ان کے روابط حکیم صاحب سے ہوئے، جو وقت گزرنے کے ساتھ پختہ ہوتے گئے، انھیں معلوم تھا کہ حکیم صاحب کی ایک بچی اب نکاح کی عمر کو پہنچ چکی ہے، ایک دن وہ بہت خوش خوش آئے اور ضلع کے ایک بڑے عہدہ دار کلکٹر یا نائب کلکٹر کے صاحبزادے کا پیغام لے کر آئے اور کہا کہ لڑکا بڑا تعلیم یافتہ ہے، اونچی ملازمت پا چکا ہے، اس کے ساتھ لڑکی کا رشتہ ہو جائے تو لڑکی کی زندگی ٹھکانے لگ جائے، حکیم صاحب نے غور سے ان کی بات سنی اور بہت خوشی کا اظہار فرمایا کہ آپ نے میری لڑکی کی فکر رکھی، لیکن صاحب بات یہ ہے کہ میں اپنی لڑکی کی شادی اپنی برادری میں کروں گا، برادری سے باہر نہیں کروں گا، وہ صاحب چونکے انھوں نے کہا کہ میں تحقیق کر چکا ہوں، جس برادری کے آپ ہیں اسی برادری کے وہ بھی ہیں، حکیم صاحب نے کہا جی نہیں ان کی اور میری برادری ایک نہیں ہے، میں ایک ملا آدمی ہوں، میں بھی نماز پڑھتا ہوں میرے بچے بھی نماز پڑھتے ہیں، میرے چہرے پر داڑھی ہے، میرے گھرانے کا ہر چہرہ باریش ہے، اور جہاں آپ میری بچی کا نکاح کرنا چاہتے ہیں، وہ گھرانا دین سے دور ہے، سنت سے دور ہے، وہ میری برادری میں نہیں ہے، اس کو سن کر وہ مایوس ہوئے لیکن انھوں نے حکیم صاحب کو سمجھایا اور اس نکاح کے فوائد بتائے، پھر اصرار کیا، اور اتنا اصرار کیا کہ حکیم صاحب نے بادل ناخواستہ ہاں کہہ دی، وہ صاحب لڑکے کے باپ کو لے کر آئے تا کہ بات پختہ ہو جائے، گفتگو ہوئی، حکیم صاحب نے کہا کہ رشتہ ہونے کیلئے ایک شرط ہے، اگر وہ آپ کو منظور ہو تو خیر ورنہ اس بات کو یہیں دفن کر دیجئے، فرمایا کہ میرے گھر بارات نہیں آئے گی، میں اس رسم کی شریعت میں گنجائش نہیں پاتا، ان صاحب نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ بغیر بارات کے شادی کیسی؟ حکیم صاحب نے بتاکید مکرر فرمایا کہ بغیر بارات کے ہی نکاح ہوگا، میرے دروازہ پر خانۂ خدا (مسجد)

موجود ہے، آپ بچے کو لے کر یہاں آجایئے، نماز پڑھئے، نماز کے بعد میں نکاح پڑھادوں گا جیسا وقت ہوگا، اس کے لحاظ سے کچھ خاطر مدارات کردوں گا، کھانے کا وقت ہوگا تو ماحضر پیش کردوں گا، کوئی اور وقت ہوگا تو چائے پلادوں گا، یہ بات ان صاحب کی کسی طرح سمجھ میں نہیں آرہی تھی، وہ حکیم صاحب کو بارات پر قائل کرنا چاہ رہے تھے اور حکیم صاحب اپنی رائے پر پختہ تھے، جو صاحب درمیان میں تھے، انھوں نے بچے کے باپ کی طرف سے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ حکیم صاحب! آپ جیسا فرماتے ہیں ویسا ہی ہوگا، حکیم صاحب نے پھر تاکید کردی کہ میرے پاس بارات ٹھہرانے کی جگہ نہیں ہے، اسے نہ لایئے گا، پھر تاریخ مقرر ہوگئی وہ صاحب باہر نکلے تو اپنے ساتھی سے بولے، ارے! بارات آئے گی، حکیم صاحب پر اس وقت مولویت سوار ہے، جب بارات آجائے گی تو دروازے کی عزت کا خیال کریں گے، بھلا کوئی آئی ہوئی بارات کو پلٹا تا ہے، اس وقت غبارے کی سب ہوا نکل جائے گی، وہ بیچارے نہیں سمجھ سکے کہ حکیم صاحب کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔

وہ تاریخ آگئی، حکیم صاحب اپنے مطب میں مریضوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی گیارہ بارہ بجے کا عمل رہا ہوگا، ایک شخص دوڑتا ہوا آیا کہ دروازے پر بارات آئی ہے، نوشہ کے والد آپ کو بلارہے ہیں، حکیم صاحب نے کہا کہ میرے دروازے پر بارات نہیں آئے گی، وہ کہیں اور کی بارات ہوگی، اس شخص نے باصرار تمام کہا کہ نہیں، وہ آپ ہی کے دروازے پر آئی ہے، حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ میں باہر نکلا تو سو آدمیوں کی بارات تھی، دولہا سر پر پگڑی باندھے، ایک بڑے گھوڑے پر سوار ہے، گھوڑا قدم قدم اچھل رہا ہے، اور دولہا کے سر پر چھتر چھایا ہے، جو برابر گردش میں ہے، دولہا کے والد بھی ہمراہ ہیں اور وہ درمیانی واسطہ بھی موجود ہیں، انھوں نے پوچھا کہ حکیم صاحب بارات کہاں ٹھہرے گی، اس وقت

حکیم صاحب کے مکان سے کچھ فاصلہ پر کسی بھنگی کے یہاں شادی کا اہتمام تھا، وہ لوگ اپنی حیثیت کے لحاظ سے خیمہ وخرگاہ لگائے ہوئے تھے، باجہ مسلسل بج رہا تھا، حکیم صاحب نے اسی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ہمارے یہاں ایسی جو بارات آتی ہے، وہ اس جگہ ٹھہرتی ہے، ان لوگوں نے سمجھا کہ حکیم صاحب کی رائے تبدیل ہوگئی ہے۔ اب نہ صرف یہ کہ بارات قبول ہے بلکہ اس کے لوازمات باجہ وغیرہ کا بھی انتظام کر رکھا ہے، بارات آگے بڑھ گئی، اور حکیم صاحب اپنے مطب میں جاکر حسب معمول پھر مریضوں کی مسیحائی میں لگ گئے، بارات بڑی شان سے بھنگیوں کے شامیانے تک پہونچی، بھنگیوں نے جب اپنے آقاؤں کو دیکھا تو ایک دم باجا بجانا روک کر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے کہ حضور ادھر کہاں نکل آئے، ان صاحب نے کہا کہ کیا یہ حکیم صاحب کا شامیانہ نہیں ہے، بھنگیوں نے کہا نہیں حضور! یہاں ہم غریبوں کی بارات آنے والی ہے، اب تو یہ لوگ بہت چراغ پا ہوئے اور ادھر ہی سے بارات واپس لے گئے، حکیم صاحب خبر تک لینے نہیں گئے، بعد میں وہ ''واسطہ درمیاں'' بہت خفا ہوئے حکیم صاحب نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ میں اپنی برادری سے باہر اپنی بچی کا نکاح نہ کروں گا۔

ادھر تو یہ ہوا، ادھر گھر کے لوگ بھی حکیم صاحب پر ناراض ہوئے کہ اتنا اچھا رشتہ محض بارات کی وجہ سے رد کردیا، حکیم صاحب کچھ جواب نہ دیتے، بس اللہ سے دعا کرتے کہ بارالٰہا! میں نے صرف دین کے واسطے یہ رشتہ کاٹا ہے، آپ کو قدرت ہے آپ اس کا نعم البدل عطا فرما دیجئے۔

اس کے بعد کی داستان سننے کے لائق ہے، ایک دو ہفتہ حکیم صاحب نے گھر والوں کی ناراضگی میں گزارا، ایک روز صبح کے وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، حکیم صاحب نے فون اٹھایا اور پوچھا کون؟ ادھر سے آواز آئی، وصی اللہ الہ آباد، حکیم صاحب

فرماتے ہیں کہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ہوں گے، کیونکہ حضرت کو ٹیلیفون وغیرہ سے کیا مناسبت؟ میں نے پوچھا کون وصی اللہ؟ ادھر سے آواز آئی آپ نہیں جانتے کہ پوچھ رہے ہیں اتنے میں انھوں نے پہچان لیا، عرض کیا حضرت؟ فرمایا ہاں جی! حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ اس آواز سے میرے اوپر لرزہ طاری ہوگیا، میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا حضرت کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ مولوی عبدالمجید (مالک اسرار کریمی پریس الہ آباد) کے یہاں سے آپ کو فون کر رہا ہوں، آپ کی وہ بچی ہے نا جو مجھے ابا کہتی تھی، اس کا نکاح کہیں طے تو نہیں کیا ہے، میں نے کہا نہیں حضرت! حضرت نے فرمایا میں نے اس کا ایک مناسب رشتہ دیکھا ہے آپ آجایئے، اگر پسند ہوجائے تو عقد ہوجائے۔

حضرت اقدس گورکھپور کے زمانۂ قیام میں عرصہ تک حکیم صاحب کے مکان پر رونق افروز رہے تھے، اس کی وجہ سے حضرت کے ساتھ ان کا تعلق بالکل خاندان جیسا تھا، تفصیل آگے آرہی ہے۔

حکیم صاحب مسرت سے بے تاب ہوگئے، اہل خانہ سے فرمایا کہ اب تمہاری بچی کا نکاح میں نہیں، دنیا کے نہیں دین کے بادشاہ کریں گے، پھر انھوں نے ساری تفصیل بتائی، اہلیہ پر فرحت ومسرت کا ایک کیف چھا گیا، حکیم صاحب نے شکرانے کی نماز پڑھی۔ پھر صاحبزادی سے اجازت لی کہ حضرت اقدس کو اختیار کامل ہے، جس سے چاہیں، جتنی مہر پر چاہیں اور جب چاہیں نکاح کردیں، اس کے بعد اپنے بڑے بھائی حاجی ولی محمد صاحب کو لے کر الہ آباد حاضر خدمت ہوئے، حضرت بہت مسرور ہوئے، دوسرے دن مجلس مبارک میں جو روزانہ ارشاد واصلاح کے سلسلے میں منعقد ہوتی تھی، نکاح پڑھا دیا، یہ رشتہ نہایت بابرکت ثابت ہوا، اور ماشاءاللہ ہر اعتبار سے بہتر اور بڑھ چڑھ کر!

حکیم صاحب نے اپنے تمام بچوں اور بچیوں کے نکاح میں یہی طریقہ اختیار کیا، رکاوٹیں اور دشواریاں ضرور سامنے آئیں، مگر مردِ مومن کی عزیمت، قلبی قوت، اور اللہ پر توکل واعتماد کے سامنے سب غبار بن کر اڑ گئیں۔

حکیم ساحب باوجودیکہ مطب میں مشغول رہے، اور یہ مشغولیت ایسی ہے کہ اس میں پڑ کر آدمی کسی دوسرے کام میں خاطر خواہ حصہ نہیں لے سکتا، بالخصوص جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے دستِ شفا بھی بخشا ہو اور وہ مردِ خلیق بھی ہو، حکیم صاحب ان دونوں ان دونوں صفات میں درجۂ کمال پر تھے، اس لئے خیال بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کسی اور علمی ودینی کام میں وقت دے سکیں گے، مگر حق تعالیٰ نے ان کے وقت اور ان کے مال میں برکت رکھی تھی، گورکھپور سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ بھٹنی نامی ہے، وہاں کے ایک مدرسہ کی نظامت وسرپرستی فرمائی اور بہت کامیاب طریقے پر اس کو چلایا، ان کے دور میں اس مدرسہ کو بہت ترقی ہوئی، خصوصیت کے ساتھ حفظ قرآن میں وہ بہت معروف ہوا، وہاں کے پڑھے ہوئے حفاظ اب بھی ممتا ہیں، بھٹنی کی راہ نہایت دشوار گزار ہے، لیکن حکیم صاحب وہاں جاتے اور اس کی خدمت انجام دیتے، اور یہ سارا کام حسبۃً للہ کرتے، تنخواہ تو خیر کیا لیتے، اپنے اور اپنے رفقاء کے کھانے پینے کا انتظام بھی الگ کرتے، بعد میں اس مدرسہ کو حاسدین کی نظر لگ گئی، اور حکیم صاحب اس سے یکسو ہوگئے، کیونکہ حکیم صاحب کشمکش اور نزاع سے گریزاں رہتے تھے، وہاں سے علیٰحدگی کے بعد گورکھپور شہر میں دارالعلوم گورکھپور کے نام سے ایک مدرسہ قائم ہوا، اس کے ارکان تاسیسی میں حکیم صاحب شریک غالب تھے، میرے استاذ محترم حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی اس مدرسہ کے مہتمم ہیں اور حکیم صاحب کے فرزند اکبر مولانا حکیم محمد احمد صاحب حضرت الاستاذ کے دست وبازو ہیں۔

ادھر برسوں سے حکیم صاحب بیمار چل رہے تھے، ریڑھ کی ہڈی میں کوئی

تکلیف تھی، جس کی وجہ سے کمر جھکانے سے معذوری ہوگئی تھی، بینائی بھی بہت کمزور ہوگئی تھی، لیکن اللہ کا یہ بندہ صبر ورضا کا پیکر تھا، جب بیٹھے ہوتے، اور گھنٹوں بیٹھے رہتے تو کسی کو احساس تک نہ ہوتا کہ کسی تکلیف میں مبتلا ہیں، قویٰ کمزور ہوگئے تھے، مگر حافظہ جگمگاتا رہا، بلبل ہزار داستان کی طرح مجلس میں چہچہاتے رہتے، ملکۂ بیان سے اللہ نے خوب نوزا تھا، منہ سے پھول جھڑتے رہتے، مختلف موضوعات پر گفتگو فرماتے، بزرگوں کے احوال، دینی معلومات، سیر وتفریح کی باتیں، پرندوں اور ہرنوں کے شکار کی داستانیں اور ان کے متعلقات کی حکایتیں سب گفتگو میں آتیں، بیماری وتکلیف کے احوال کم بیان کرتے، میں نے ان سے مطب اور علاج ومعالجہ کی باتیں بہت کم سنی ہیں، ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے، فرماتے کہ اب بڑھاپے میں بیماری کے علاوہ اور کیا ہوگا، صحت کی تمنا فضول ہے، اب تو جانے کا وقت آیا ہے، اس وقت میں اگر قویٰ جواب نہ دیں گے تو اور کیا ہوگا، ہاں خاتمہ بالخیر کی دعا خود بھی کرتے، اور دوسروں سے بھی کراتے، غرض ان کی باغ وبہار شخصیت ہمہ دم مست وسرشار رہتی۔

اسی سال بقرعید سے پہلے گورکھپور حاضری ہوئی تھی، ہم کئی افراد تھے، حاجی عبدالاحد صاحب معروفی بھی تھے، وہ بھی حکیم صاحب کی ملاقات کے شوق میں ساتھ ہولئے تھے، عصر کی نماز حکیم صاحب کی مسجد میں پڑھی معلوم ہوا کہ حکیم صاحبِ صاحب فراش ہیں، نماز کے بعد حاضری ہوئی، وہ گھر کے اندر نماز پڑھ رہے تھے، نماز سے فارغ ہوئے تو صاحبزادگان ان کو سہارا دیتے ہوئے باہر لے آئے، تکلیف اور ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ قدم اٹھ نہیں رہے تھے، ہم لوگوں نے گزارش بھی کی تھی کہ اندر ہی تشریف رکھیں، ہم لوگ صرف مل کر واپس ہوجائیں گے، مگر حکیم صاحب کی محبت وشفقت اور ان کی تواضع نے اس کو گوارا نہیں کیا، سخت تکلیف اٹھا کر باہر تشریف لائے اور پھر نہ کسی تکلیف کا اظہار کیا، نہ کچھ شکایت وفریاد! بیٹھتے ہی ایسا محسوس ہوا، جیسے حسب معمول ہوں، ہم لوگوں کے آنے کی خوشی میں برمحل اشعار پڑھتے رہے، اور اپنی روانگی کے وقت کے قریب آجانے کی اطلاع دیتے رہے، حاجی صاحب سے خوب لپٹ کر ملے، اس وقت کئی اشعار بہت بلند پایہ پڑھے تھے، مگر افسوس کہ مجھے کوئی شعر یاد نہ رہ سکا۔

کافی دیر تک بیٹھے رہے، مسرت وشادمانی ان کے نورانی چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھے م، ولانا حکیم محمد احمد صاحب نے بتایا کہ شعبان سے طبیعت خراب ہے، ڈاکٹروں نے تشخیص غلط کردی تھی، علاج سے نقصان ہوا، نہ جانے کتنی تکلیف جھیلی تھی حکیم صاحب نے، مگر لب نا آشنائے حرف شکایت تھے، بات بات پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کے شکریے میں میں ڈوبے جارہے تھے۔

یہ کیفیت خاصان خدا کی ہوتی ہے، اور کیا شبہہ کی حکیم صاحب خاصان خدا میں سے تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ سے بیعت تھے۔ عارف باللہ حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ کے ہمدرس رفیق تھے، اور ایک سعادت تو حکیم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایسی بخشی جس پر ہزار سعادتیں قربان ہوں، وہ یہ کہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ مسلسل ۶ ؍ماہ یا اس سے زائد حکیم صاحب کے گھر پر فروکش رہے، اور اس عرصہ میں ان کا کاشانہ علوم ومعرفت کی تجلی گاہ بنا رہا، حضرت مصلح الامتؒ نے جب اپنا آبائی وطن فتحپور تال نرجا چھوڑا تو گورکھپور تشریف لے گئے، سال بھر مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کے یہاں قیام رہا، وہاں بعض حاسدین کی طرف سے کچھ ناگواریاں پیدا ہوئیں تو حضرت نے حکیم صاحب کے مکان پر قیام فرمایا، یہاں حضرت بہت خوش رہے، حکیم صاحب اور ان کے بڑے بھائی حاجی ولی محمد صاحب اور گھر والوں نے

خدمت کا حق ادا کردیا، بعد میں حضرت علاج کے لئے الہ آباد تشریف لے گئے اور علاج کی نزاکتوں اور دوسرے دینی مصالح کے باعث الہ آباد کو اپنا مستقر قرار دیا۔

یہ داستانِ لذیذ حکیم صاحب نے اپنے قلم سے تحریر فرمادی ہے، جو تذکرۂ علمائے اعظم گڈھ میں چھپی ہے، وہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

حکیم صاحب طبیب حاذق تھے، اللہ تعالیٰ نے دستِ شفا عطا فرمایا تھا، مطب خوب چلتا تھا، کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے نسخوں سے بڑا بڑا علاج کرتے تھے، میں برسہا برس سے تنفس کی شکایت میں مبتلا تھا، جاڑے اور برسات میں ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق اسنوفیلیا بڑھ جایا کرتا تھا، ایک بار میں نے حکیم صاحب سے اس کا تذکرہ کیا، انھوں نے مجھ سے کچھ سوالات کئے پھر فرمایا کہ آپ کوئی دوا نہ کریں، بس انڈے کی کچی زردی نکال لیں اور اسے دو تولہ شہد میں اچھی طرح پھینٹ دیں اور اسی کو نہار منھ چاٹ لیا کریں، میری لئے یہ شیریں دوا، داروئے تلخ کے حکم میں تھی، کیونکہ کچے انڈے کی زردی میں ایک خاص طرح کی بو ہوتی ہے جو مجھے برداشت نہیں ہوتی، نہار منھ میٹھا کھانا میرے لئے بڑا صبر آزما مرحلہ ہے، لیکن میں نے طے کرلیا کہ یہ نسخہ استعمال کروں گا، پہلے دن استعمال کیا تو دن بھر طبیعت متلاتی رہی، دوسرے دن بھی یہی کیفیت رہی، سخت مجاہدہ کرکے دس بارہ روز تک میں نے یہ نسخۂ کیمیا استعمال کیا، میرا خیال ہے کہ اس کے بعد سے مجھے یہ شکایت نہیں ہوئی، یہ کئی برس پہلے کا قصہ ہے، درمیان میں ایک مرتبہ شدت کی کھانسی ہوئی جو تین ماہ مسلسل رہی، خون کی جانچ کرائی، شبہ اسی مرض کا تھا، مگر بحمد اللہ اسنوفیلیا حالت اعتدال پر تھا۔

حکیم صاحب کی وفات بھی مردِ مومن کی وفات تھی، بیمار تو عرصہ سے تھے ہی، لیکن حالت مرض میں بھی نماز کا بڑا اہتمام تھا، جس دن ان پر بے ہوشی طاری ہوئی

اس رات عشاء کی نماز اول وقت ادا کرلی، اور تین بجے شب میں دماغ پر فالج کا اثر ہوا، یہ ۶/ رجب ۱۴۱۶ھ کی شب کی بات ہے، میرے دوست جناب مولانا قاری عبدالجلیل صاحب مظاہری امام وخطیب جامع مسجد گورکھپور، حکیم صاحب کی بیماری اور وفات کی تھوڑی سی تفصیل اپنے اطلاعی خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اسی شب میں حکیم وصی احمد صاحب مرحوم کو ۳/ بجے دماغ پر فالج کا اثر ہوگیا، صدر اسپتال میں انھیں داخل کردیا گیا، مستقل بے ہوشی رہی، دو یوم ہسپتال میں رہے، سینیئر ڈاکٹروں کی زیر نگرانی علاج ہوتا رہا، لیکن درمیان میں کوئی افاقہ نہیں ہوا، لوگ مایوس ہوکر گھر لے آئے، احقر بھی درمیان میں ہاسپٹل اور گھر عیادۃً حاضر ہوتا رہا۔ پانچویں شب میں (یعنی ۱۰/ رجب ۱۴۱۶ھ مطابق ۳/ دسمبر ۱۹۹۵ء بروز یکشنبہ) ۸/ بجے اللہ کو پیارے ہوگئے، **إنا للہ وإنا إلیہ راجعون**
>
> حکیم محمد احمد صاحب کا فون آیا کہ والد صاحب اس دنیا میں نہیں رہے، اطلاع ملتے ہی احقر پہونچا، حکیم صاحب مرحوم ہم لوگوں کو فراق کا غم دے کر ہمیشہ ہمیش کے لئے چلے گئے، پہونچنے پر دیکھا کہ حکیم صاحب مرحوم اپنے مخصوص حجرے میں جہاں ہمیشہ عوام وخواص کے لئے روحانی وجسمانی معالج بن کر بیٹھتے اور دربار لگا رہتا، آج اسی جگہ ایک مسہری پر لیٹے ہوئے ہیں۔ لبوں پر ہلکا سا تبسم!''

واقعی یہ مردِ مومن کی موت تھی، مومن کے لئے موت وصل حبیب کا پیام ہے، علامہ اقبال نے اس موت کی اپنے مخصوص انداز میں خوب ترجمانی فرمائی ہے۔

نشانِ مردِ مومن باتو گویم   چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

میں تم کو مرد مومن کی پہچان بتاؤں، جب موت آتی ہے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے

آگے لکھتے ہیں کہ:

> ’’سوگواران ہر چہار طرف گھیرے کھڑے ہوئے ہیں، تعلق رکھنے والے حضرات کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری ہے، دوسرے دن صبح ۹ ربج کر ۲۰ رمنٹ پر نارمل اسکول کے میدان میں دہلی مرکز تبلیغ کے ایک بزرگ میاں جی محراب نے نماز جنازہ پڑھائی، نماز جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد ۳ رہزار تھی، حاجی عبدالاحد صاحب کا سلام و پیام بنام حکیم صاحب رہ گیا‘‘

حکیم صاحب میں خوبیاں بہت تھیں، بشریت کے تقاضے سے کمزوریاں بھی رہی ہوں گی، مگر میری نگاہ نے ان میں صرف خوبیاں ہی دیکھیں، قابل اتباع اور لائق تقلید! اب حکیم صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے، تو ان کی باتیں، ان کی ادائیں، ان کی گرم جوش محبت، ان کی مہمان نوازیاں، ان کی عنایتیں اور مہربانیاں سب یاد آئیں گی، موجودہ دور میں ایسے لوگ عنقا ہیں۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مولانا محمد امانت اللہ صاحب معروفیؒ

وفات: یکم رذی قعدہ ۱۴۱۶ھ

راسخینِ فی العلم کی تعداد ہر دور میں قلیل رہی ہے، مگر ہمارے دور میں تو شاید انھیں انگلیوں پر شمار کرلیا جائے، ایسے وقت میں جب کوئی عالم! ٹھوس علم والا اٹھ جاتا ہے تو محرومی کا احساس بڑھ جاتا ہے، علماء اٹھتے ہیں، تو علم کا خزانہ اٹھ جاتا ہے، ادھر چند برسوں سے علماء کا وہ طبقہ جن کا شمار اکابر میں ہوتا ہے مسلسل تیزی سے اٹھتا جارہا ہے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ **محدث کبیر**، حضرت مولانا عبدالجبار صاحبؒ **شیخ الحدیث** جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد، حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی، حضرت مولانا منت اللہ صاحبؒ رحمانی امیر شریعت بہار، حضرت مولانا عبدالستار صاحب معروفیؒ شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء اور حضرت مولانا انعام الحسن صاحب رئیس التبلیغ اور دوسرے اکابر کس تیزی سے اٹھتے چلے گئے۔ ابھی ایک کا ماتم پورا نہیں ہوتا ہے کہ دوسرا تازہ زخم لگ جاتا ہے۔ ان حضرات کی وفات پر نظر جاتی ہے، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم کی ایک دنیا اجڑ گئی۔ یہ حضرات وہ تھے کہ ان کی وجہ سے علم و عمل اور روحانیت وتقویٰ کی دنیا میں رونق تھی، ان کی زندگیاں زہد وورع، امانت ودیانت اور اتباع سنت وشریعت کی معتبر مثالیں تھیں، ان کے علم میں خشیت الٰہی کی چمک دمک، اور اخلاص کا نور تھا۔ ان کے پاس بیمار انسانیت کا مداوا تھا۔ ان کی بارگاہ میں جذبۂ علم وعمل، للٰہیت اور اللہ ورسول کے ساتھ وفاداری کی سوغات ملتی تھی، اب یہ بارگاہیں سونی ہوگئیں۔ علم کی دنیا میں سناٹا

ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ کوئی بڑا عالم چلا جاتا ہے، تو ہماری نگاہیں دوسرے عالم پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ ہم اپنے دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ ابھی فلاں صاحب موجود ہیں، مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھ بھی بند ہو جاتی ہے، اور آدمی گھبرانے لگتا ہے، بہت سے حضرات کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں محسوس ہوتا کہ یہ بھی جلد ہی رخصت ہو جائیں گے، مگر خبر پھیلتی ہے کہ فلاں نماند!

کون کہہ سکتا تھا کہ مولانا امانت اللہ صاحب بھی یکا یک بزم علم کو خالی کر دیں گے، ابھی تو پڑھا رہے تھے، ابھی تو مصروف مطالعہ تھے، ابھی تو لوگوں کے جھگڑے چکا رہے تھے، اچانک یہ کیا ہوا کہ محفل میں سناٹا چھا گیا، مجلس بکھر گئی، درسگاہ خالی ہو گئی، کتابوں کو اٹھانے والا ہاتھ گر گیا، مطالعہ کرنے والی آنکھ بند ہو گئی، فیصلہ لکھنے والا قلم رُک گیا۔

مولانا امانت اللہ صاحب کی شہرت عام نہ تھی، دور والے انھیں کم جانتے تھے، وہ جس حیثیت کے انسان تھے، انھوں نے کبھی خود کو اس حیثیت میں پیش نہیں کیا، اپنے کو ہر جگہ پیچھے رکھا، شہرت کا موقع آیا تو دوسروں کو آگے بڑھا دیا اور خود کسی گوشے میں رُوپوش ہو گئے، خدمت کرنی ہوئی تو لپک کر آگے آ گئے، خدمت لینی ہوئی تو کہیں نظر نہ آئے، انھوں نے اپنا تعارف خود نہیں کرایا، تو آج مشکل پیش آ رہی ہے کہ ان کا تعارف کیونکر کرایا جائے۔

راسخین فی العلم کی اگر فہرست تیار کی جائے، تو وہ خواہ کتنی ہی مختصر ہو، اس میں مولانا امانت اللہ صاحب کا نام ضرور ہوگا۔ نامور نہ سہی، مگر متبحر عالم تھے، استاذ العلماء تھے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے شاگرد رشید محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ کے عقیدت کیش و معتمد، جمعیۃ علماء مئو کے صدر نشیں، بوریائے

فقر پر بیٹھ کر شاہانہ دماغ رکھنے والے، بے شمار تلامذہ کے استاذ، اور بکثرت علماء و مدارس کے سرپرست و رہنما یکم/ ذی قعدہ ۱۴۱۶ھ کو حیات دنیوی کی ناپائیدار زنجیروں کو توڑ کر اپنے خالق و مالک کے حضور پہونچ گئے۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون۔**

مولانا کا جسم کمزور تھا، وہ لاغر اندام تھے، ادھر چند سالوں سے بیماری کے حملے کچھ زیادہ ہی ہو رہے تھے، عمر بھی ستّر کے قریب پہونچ رہی تھی، مگر روح بڑی توانا تھی، اپنے روزانہ کے مشاغل و معمولات میں چاق و چوبند تھے، تعلیم و تدریس انتظام و اہتمام اور قومی و ملی کاموں میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے، جس دن اچانک مرض الموت کا حملہ ہوا، اس روز بھی تین گھنٹے تک طالب علموں کو پڑھایا۔ پھر انھیں ایک قریبی مقام گھوسی جانا تھا، جہاں ایک تعلیمی ادارے کے منتظمین عرصہ سے نزاع و خلاف میں مبتلا ہیں، ان کے جھگڑے کا تصفیہ کرانا تھا اس کا انھیں اتنا اہتمام تھا کہ کھانے کا وقت ہو گیا تھا، گھر والوں کا اصرار تھا کہ کھانا کھا لیں تو جائیں، مگر انھوں نے انکار کر دیا کہ پہونچنے میں دیر ہو جائے گی۔ مولاناؒ وہاں تشریف لے گئے، میٹنگ مکمل ہوئی، مغرب کی نماز کے بعد مولانا فیصلہ لکھ رہے، یا اسے سنا رہے تھے کہ اچانک پیغامِ اجل آ گیا، دفتر ہستی کے اوراق لپٹنے لگے دماغ کی کوئی رگ شق ہوئی، اور مولانا بے ہوش ہو گئے، علاج کی ممکن تدبیریں کر لی گئیں، محبین و متعلقین نے صحت و بقا کی دعائیں کیں، مگر ''**اجلٌ مسمی**'' کی گھڑیاں پوری ہو چکی تھیں، ذیقعدہ کی پہلی تاریخ آئی، جمعرات کا سورج اوپر چڑھ رہا تھا اور علم کا یہ روشن چراغ آخری لَو دے رہا تھا، بالآخر علم و عرفان کی خوشبو میں رچی بسی یہ جان، اور ادب و تواضع سے سجی سنوری روح اپنے پروردگار اور ارحم الراحمین خالق کردگار کے حضور، عمر بھر کی بے قراری سے نجات حاصل کر کے، سکون و قرار کی دنیا میں جا پہونچی۔

مولانا سے تعارف:

راقم الحروف جب دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھا، اور یہ بات ۱۳۸۸ھ (۱۹۶۸ء) کی ہے، تو چونکہ مطالعہ کتب کا مجھے کچھ زیادہ شغف تھا۔ اس لئے درس سے خالی اوقات کا زیادہ تر حصہ دارالعلوم کے وسیع وعریض کتب خانہ میں بسر کرتا تھا، طلبہ کے مطالعہ کے لئے اس میں ایک الگ شعبہ ہے۔ اس کے بوڑھے منتظم، جو ابھی حال میں ۱۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ کو اللہ کو پیارے ہوئے ہیں۔ اس وقت وہ بڑھاپے کے باوجود بہت مستعد اور متحرک تھے۔ وہ مطالعہ کے لئے طلبہ کو کتابیں بھی دیتے تھے، کیا پڑھنا چاہئے، اس کی رہنمائی بھی کرتے تھے، طالب علموں اور کتابوں کے سلسلے میں ان کا حافظہ نادرۂ روزگار تھا، پہلی ہی ملاقات میں طالب علم کا پورا تعارف حاصل کر لیتے، اور پھر کبھی نہ بھولتے، اور کتابوں کے نام اور ان کی جگہیں تو انھیں اس طرح یاد تھیں کہ کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ کتابیں الماری میں نہیں، ان کے دماغ میں رکھی ہوئی ہیں، جس کتاب کا نام لیجئے دیر نہیں لگتی، فوراً بتاتے کہ ہے یا نہیں ہے؟ اور اگر نہیں ہے، تو کس کے پاس ہے؟ یا سرے سے کتب خانہ میں ہے ہی نہیں، اور اگر ہے تو کہاں ہے؟ اس بوڑھے منتظم کی انگلی ٹھیک اسی جگہ پڑتی، جہاں وہ کتاب ہوتی، دم اخیر تک وہ اس خدمت میں مصروف رہے، مگر کبر سنی کی وجہ سے اخیر میں حافظہ کچھ کمزور ہو گیا تھا، بہت عرصہ کے بعد دو تین سال پہلے ان سے ملا تو بعض باتیں انھیں یاد نہ آسکیں، یہ تھے مولوی محمد حنیف صاحب مرحوم! اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (اس کتاب مولوی صاحب موصوف پر تفصیلی مضمون ملاحظہ فرمائیں)

ان سے میرے تعلقات استوار ہو گئے تھے وہ مزے میں آکر کبھی کبھی خوب باتیں کرتے تھے، ایک روز کہنے لگے کہ میں کتب خانے میں اس کام پر ۳۰/ سال سے ہوں، اس تیس سال کے عرصہ میں پڑھنے والے، کتابوں میں فنا ہونے والے

اور کتب خانے کو سب سے زیادہ استعمال کرنے والے تین طلب علم ملے، اور اتفاق ہے کہ تینوں اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں، بلکہ دو تو بھائی، ایک امانت اللہ، دوسرے نعمت اللہ! (اور تیسرے خود حضرت الاستاذ مدظلہ کا نام لیا تھا، جو انھوں نے ازراہ تواضع ذکر نہیں کیا۔ ضیاء الحق خیرآبادی)

یہ دونوں بزرگ پورہ معروف کے رہنے والے ہیں، اس وقت یہ قصبہ ضلع اعظم گڑھ میں تھا، اب ضلع مئو میں ہے، یہ دونوں نام میرے سامعہ اور حافظہ میں موجود تھے، مگر عظمت کا کوئی نشان دل پر نہ تھا، اس دن ان کی عظمت کا پہلی بار احساس ہوا۔

میں جب سلسلۂ تدریس میں منسلک ہوا، تو مولانا مرحوم سے ملاقات اور تعارف کا شرف حاصل ہوا، مولوی محمد حنیف صاحب نے جیسا بتایا تھا ویسا ہی پایا، علم ومطالعہ کے شیدائی، کوئی کتاب ہاتھ میں آجاتی، تو ایسا محسوس ہوتا، جیسے کوئی کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہو، مطالعہ میں انھیں اس درجہ انہماک ہوتا کہ گرد وپیش سے بے خبر ہو جاتے، ایک خود فراموشی کا عالم ہو جاتا، اس وقت دائیں بائیں شور وغل ہوتا رہتا، تو بھی ان کے مطالعہ اور انہماک میں خلل نہ پڑتا، ان کے مطالعہ کی شان دیکھ کر حضرات متقدمین کی یاد تازہ ہو جاتی، جن کے یہاں تعلیم وتعلم اور درس ومطالعہ سے بڑی کوئی دولت نہ تھی، یہ کیفیت اسی وقت ہو سکتی ہے، جب کہ علم اور کتابوں سے شغف عشق کی حد تک پہونچا ہوا ہو، اور یہ جنونِ عشق اعصاب پر چھا گیا ہو، مولانا کا ہر شاگرد اور ان کے قریب رہنے والا ہر شخص اس بات کی شہادت دے گا کہ انھیں کتابوں سے ایسا ہی عشق تھا، کبھی کتب خانے میں کھڑے ہی کھڑے کتاب دیکھنے لگتے، اور گھنٹوں گزر جاتے، مگر شاید انھیں پاؤں کے دکھنے اور تکان کا بھی احساس نہ ہوتا، ڈوب کر پڑھتے تھے اور جواہر پاروں اور خزف ریزوں کی کامل شناخت رکھتے

تھے، چنانچہ ہر کتاب اور ہر مصنف کے بارے میں وہ منصفانہ رائے رکھتے تھے، وہ اپنی وسعتِ مطالعہ اور دقتِ علم کے باعث حضرات مدرسین و اہل علم کو اس سلسلے میں مفید مشورے دیتے تھے، ایک صاحب درس جن کو پہلی مرتبہ حدیث شریف کی مشہور اور دورۂ حدیث کی اہم کتاب ترمذی شریف پڑھانے کو ملی تھی، انھوں نے مولانا سے دریافت کیا کہ اس کے لئے کن کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے، تو مولانا نے اور کتابوں کے ساتھ امام غزالیؒ کی ''احیاء علوم الدین'' کے مطالعہ کا بھی مشورہ دیا، وہ صاحب فرماتے ہیں کہ پہلے تو مجھے اس کا کوئی ربط ترمذی شریف سے معلوم نہ ہوا، تاہم مولانا کے مشورے کی تعمیل میں اسے بھی مطالعہ میں رکھا، اس کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا کا یہ مشورہ کس قدر مفید اور برمحل تھا۔

نظر کا رسوخ:

کثرتِ مطالعہ اور فکر صائب کی وجہ سے ان کی نظر ہمیشہ گُر کی بات اور مطلب کی تہ تک پہونچ جاتی تھی۔ اور اس میں ان کو نہایت پختگی اور رسوخ حاصل ہوجاتا تھا۔ عرصہ دراز سے مدارس عربیہ کے نصاب میں تبدیلی کا شور وغُل وقفہ وقفہ سے اٹھتا رہتا ہے۔ مولانا اپنے علم اور تدریسی تجربہ کی روشنی میں اس بات پر مضبوطی سے قائم تھے کہ درسِ نظامیہ میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کرنی چاہئے، علم کی استعداد جیسی اس سے پیدا ہوتی ہے، اور ہوسکتی ہے، دوسرے کسی مروج نصاب میں اس کی صلاحیت نہیں ہے۔

ایک بار ان سے اسی موضوع پر بات میری گفتگو ہورہی تھی، انھوں نے فرمایا کہ ایک جگہ کئی اصحاب علم اور ارباب درس جمع تھے، تبدیلیٔ نصاب پر گفتگو ہورہی تھی بعض لوگ شدت سے درس نظامیہ (جو دارالعلوم دیوبند اور اس سے متعلق مدارس میں رائج ہے) کی ناکارگی پر اصرار کررہے تھے، میں خاموشی سے سن رہا تھا، کچھ

حضرات نے فرمائش کی کہ آپ بھی کچھ کہئے، میں نے کہا کہ میرے سامنے ایک بات ہے، اسے آپ حضرات سن لیں، پھر جو چاہیں فیصلہ کریں۔

درس نظامیہ کا سب سے بڑا مرکز دارالعلوم دیوبند ہے، اور تبدیلیٔ نصاب کا اولین داعی اور نئے نصاب کی پہلی تجربہ گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ہے، یہ دونوں متوازی نصاب ہیں، دونوں کو پڑھ پڑھ کر علماء تیار ہوتے ہیں، دونوں نصاب سے علم کی استعداد پیدا ہوتی ہے، لیکن میرا تجربہ ہے کہ ندوہ کے فارغ التحصیل عالم کو درس نظامیہ کی کتابیں پڑھانے کو دیدی جائیں، تو وہ چند قدم نہیں چل سکتا، ناکام ہوجائے گا، اس کے برخلاف اسی جیسی ذہانت وذکاوت کا عالم جو دیوبند سے فارغ ہو، اگر اسے ندوہ کا نصاب پڑھانے کو دیدیا جائے، تو وہ اول سے آخر تک تمام کتابیں باطمینان پڑھالے گا، اور انشاء اللہ ندوی عالم سے اچھا پڑھائے گا۔ اسی لئے ندوہ آج تک فاضلین دیوبند سے بے نیاز نہیں ہوسکا، اور دارالعلوم دیوبند کو آج تک اپنی پوری مدت میں کسی ندوی عالم کی ضرورت نہیں پیش آئی، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ندوہ اپنے نصاب کے باعث آج تک خود کفیل نہیں بن سکا، اور دارالعلوم روز اول سے نہ صرف یہ کہ خود کفیل ہے، بلکہ دوسروں کی بھی کفالت کررہا ہے، یہ میرا تجربہ ہے، آگے آپ لوگوں کو اختیار ہے، اسے سن کر سب خاموش ہوگئے،

دو متضاد خصوصیات:

ذوق مطالعہ اور تشنگیٔ علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انھیں حسن انتظام اور اعلیٰ مدبرانہ صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ وہ ایک طویل عرصہ تک مدرسہ اشاعت العلوم پورہ معروف کے ناظم اور صدرالمدرسین رہے، عموماً جو لوگ مدرسوں کا اہتمام سنبھالتے ہیں، ان کا علمی وتدریسی پہلو کمزور ہوجاتا ہے، بلکہ اکثر تو درس وتدریس سے بالکل کٹ کر رہ جاتے ہیں، اور جو حضرات علمی شغف اور تدریس کے اندر ممتاز

ہوتے ہیں ان میں انتظامی صلاحیت مضمحل ہوجاتی ہے، لیکن مولانا میں یہ دونوں صلاحیتیں پورے طور سے بہم تھیں، وہ تدریس کے اعتبار سے بھی مدرسہ کی جان تھے۔ چنانچہ ان کے تلامذہ ان کی تدریسی صلاحیت ولیاقت پر متفق ہیں۔، اور انتظامی اعتبار سے بھی وہ مدرسہ کی روح رواں تھے، تعلیمی اور تعمیری دونوں اعتبار سے انھوں نے مدرسہ کو آگے بڑھایا۔

محبوبیت ومقبولیت:

اللہ تعالیٰ نے محبوبیت ومقبولیت سے بھی نوازا تھا، ان کی شخصیت بڑی دلنواز تھی، دلنوازی کا سب سے بڑا عنصر تواضع وخاکساری ہے، یہ عنصر مولانا کے خمیر میں داخل تھا، ہر چھوٹے کو بڑا بنا کر رکھتے تھے، ان کی خاکساری بے ساختہ تھی، بلا تصنع تھی، حالی مرحوم نے ایسے ہی لوگوں کو سامنے رکھ کر کہا ہے۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

اور یہ واقعہ ہے کہ آدمی جب اپنے کو چھوٹا بنا کر رکھتا ہے، بڑائی کے اظہار اور نمایاں ہونے کے اضطراب سے محفوظ رہتا ہے، تو خود بخود اس کی اہمیت ووقعت دلوں میں جگہ بناتی چلی جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: من تواضع للہ رفعه الله (مشکوٰۃ شریف کتاب الآداب، باب الغضب بحوالہ شعب الایمان للبیهقی) جو اللہ کے واسطے تواضع اور پستی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلندی عطا فرماتے ہیں۔ مولاناؒ اس حدیث کے نمونہ تھے، میں ان کا شاگرد نہیں ہوں، لیکن شاگردوں کی پچھلی صف کا آدمی ہوں۔ اس لحاظ سے میں نے ہمیشہ انھیں اساتذہ ہی کے زمرہ کی قابل احترام شخصیت سمجھا، اور ہمیشہ اسی نظر سے میں نے انھیں دیکھا، اور جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اسی تصور سے حاضر ہوا، مگر میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ ہمیشہ یہی احساس ہوا کہ وہ اپنے کو اس قدر دبانا چاہتے ہیں کہ ملنے والے کا قد اونچا رہے، لیکن ظاہر ہے کہ دراز قامت انسان بیٹھ بھی جائے، تب بھی، بونے سے اونچا ہی رہے گا، یہ اور بات ہے کہ ان کے پاس بیٹھ کر، ان کی دلنواز باتیں سن کر ان کا بے تکلفانہ برتاؤ دیکھ کر ان سے اپنی باتیں کہہ کر بونے پن کا احساس ختم ہو جاتا تھا

پورہ معروف:

مولانا کا مولد ومنشاء سابق ضلع اعظم گڈھ اور حالیہ ضلع مئو کا ایک مردم خیز قصبہ پورہ معروف ہے، یہ قصبہ مسلمانوں کی بڑی آبادی پر مشتمل ہے، آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت قدیم آبادی ہے، اس میں کئی محلے ہیں، جو ایک دوسرے سے فاصلہ پر آباد ہیں، اب آبادی کے پھیلاؤ کی وجہ سے یہ فاصلے سمٹتے جا رہے ہیں، پرانا پورہ، محلّہ بلوہ، محلّہ بانسہ، محلّہ پارہ وغیرہ قدیم محلے ہیں، یہ قصبہ شہر مئو سے بجانب شمال ومغرب نو، دس کلومیٹر کے فاصلہ پر ٹونس ندی کے شمالی کنارے پر آباد ہے، یہاں کے تمام مسلمان پارچہ بافی کی صنعت سے متعلق ہیں، اور ماشاء اللہ خوشحال ہیں، دین اور علم دین، علماء ومشائخ اور بزرگوں سے اس قصبہ کا بہت گہرا ربط ہے، مسلمانوں کے کم گھر ایسے ہوں گے جس میں کوئی فرد عالم یا حافظ یا قاری نہ ہو، مولانا محمد عثمان صاحب معروفی مدظلہٗ نے مشاہیر پورہ معروف میں لکھا ہے کہ:

> پورہ معروف میں علماء کی جو کثرت ہے اس تناسب سے تو موجودہ زمانے میں کسی بھی آبادی میں اتنے اہل علم موجود نہ ہوں گے، اس چھوٹے سے قصبہ میں، اس وقت مشکل سے ایک ہزار مسلم گھر ہوں گے جس میں علماء دین کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہے، اور تقریباً اسی تعداد میں حفاظِ قرآن بھی موجود ہیں، قراء ومجودین بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں، اور مجموعی طور پر علماء وقراء وحفاظ کی جو تعداد ہے اس کی دوگنا سے کم حجاج کرام کی تعداد نہ ہوگی۔ (ص:۱۳۰)

یہ رپورٹ ۱۳۹۶ھ (۱۹۷۶ء) کی ہے، بیس سال میں یہ تعداد نمایاں طور پر بڑھی ہے، اب تو کئی سو علماء ہوں گے، اور اسی تناسب سے حفاظ اور قرّاء کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے، یہ علماء زیادہ تر دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور کے فیض یافتہ ہیں، یہاں کے علماء کی ایک بڑی تعداد ملک کی نامور درسگاہوں میں درس و تدریس اور فیضان علم دین میں مشغول ہے، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور میں یہاں کے نامور اہل علم مرجع علماء واہل کمال ہیں، دارالعلوم دیوبند میں مولانا نعمت اللہ صاحب مدظلہٗ ہیں جو وسعت مطالعہ، وسعت نظر اور بے تکلفی و سادگی میں ممتاز ہیں، اور مظاہر علوم سہارنپور میں استاذ محترم حضرت مولانا زین العابدین صاحب مدظلہٗ ہیں، جو اپنے حفظ واستحضار اور زہد و تقویٰ میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، ان حضرات سے فضل و کمال کا ایک جہاں روشن ہے۔ اس کے علاوہ یوپی، بہار، آسام، بنگال، مہاراشٹر اور کشمیر تک پورہ معروف کا فیضانِ کرم پھیلا ہوا ہے، ہر جگہ یہاں کے علماء مصروفِ درس وافادہ ملیں گے، مولانا محمد عثمان صاحب معروفی ۱۹۷۶ء ہی کی اطلاع دیتے ہیں کہ:

> تادم تحریر جامعہ عربیہ مفتاح العلوم، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، دارالعلوم ندوۃ العلماء، جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد اور عربی کالج رنگیا آسام میں شیخ الحدیث کے عہدۂ جلیلہ پر پورہ معروف ہی کے علماء کرام فائز ہیں اور درس قال اللہ وقال الرسول دے رہے ہیں۔ ص: ۱۴

جس ترتیب سے آپ نے مدرسوں کے نام پڑھے ہیں، اسی ترتیب سے ان شیوخِ حدیث کے اسماء گرامی بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

۱......حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مدظلہٗ، جواب دارالعلوم دیوبند میں ممتاز اساتذۂ حدیث میں ہیں۔

۲......حضرت مولانا زین العابدین صاحب مدظلہٗ جو گجرات، بنارس اور حیدرآباد میں اس منصب کو رونق بخشنے کے بعد اب مظاہر علوم سہارنپور میں شعبۂ تخصص فی الحدیث کے مشرف (نگراں و رہنما) ہیں۔

۳......حضرت مولانا عبدالستار صاحب معروفی علیہ الرحمہ، المتوفی ۱۴۱۴ھ

۴......حضرت مولانا عبدالجبار صاحب معروفی علیہ الرحمہ، المتوفی ۱۴۰۹ھ

۵......حضرت مولانا عبدالودود صاحب معروفی مدظلہٗ

پورہ معروف میں دو ممتاز تعلیمی ادارے ہیں، جو عرصۂ دراز سے علم دین کی خدمت کر رہے ہیں، اور جن کی آغوشِ فیض سے مشاہیر علماء سارے ملک میں علم کی سوغات تقسیم کر رہے ہیں، ان میں قدیم ادارہ مدرسہ معروفیہ ہے، جو محلّہ بلوہ میں ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں قائم ہوا۔ اور جس نے قصبہ میں گویا علم دین کی بنیاد رکھی، دوسرا ادارہ محلّہ پارہ میں اشاعت العلوم ہے، یہ مدرسہ ۱۳۵۶ھ میں قائم ہوا جس نے گویا علم و دینداری کو وسعت بخشی، ان دونوں اداروں کی بڑی خدمات ہیں، پورہ معروف کے سبھی علماء کرام ابتداءً انھیں دونوں مدرسوں کے فیض یافتہ ہیں۔

ان مدرسوں کے بعد اور بھی بعض ادارے وجود میں آئے، پورہ معروف میں اب بھی ماشاء اللہ علم دین کے حاصل کرنے کا رجحان غالب ہے، خالص دنیاوی علوم یا خالص دنیادارانہ ماحول ابھی وہاں قبولیت نہیں پاسکا ہے، اللہ کرے یہ رنگ باقی رہے۔

مولانا امانت اللہ صاحب اسی مردم خیز سرزمین اور عطر بیز ماحول میں ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) میں پیدا ہوئے، مولانا کا گھرانہ ایک دیندار گھرانہ تھا، بڑے ہوئے تو مدرسہ اشاعت العلوم کی آغوشِ فیض میں پہونچادئے گئے، علم کا شوق تو قسام ازل نے ان کی سرشت میں داخل کردیا تھا، مولانا کو ابتدائی اساتذہ بھی ایسے

باکمال ملے، جنھوں نے علم کی محبت اور اس کا سلیقہ دل میں راسخ کردیا، پھر ان کی زندگی علم کے لئے یکسو ہوکر رہ گئی، صلاحیت اچھی ہو، اور ساتذہ اچھے مل جائیں، تو نورٌ علیٰ نورٌ کا معاملہ ہوتا ہے، مدرسہ اشاعت العلوم میں دو باکمال استاذوں کے فیضانِ نگاہ سے ان کی علمی نشو ونما ہوئی۔ یہاں ان دونوں بزرگوں کا قدرے ذکر خیر کردینا بے محل نہ ہوگا، کہ طالب علم کی علمی زندگی، اور اس کے کمالات، اساتذہ ہی کے فیضِ نظر کا نتیجہ ہوتے ہیں، یہ دو بزرگ حضرت مولانا عبدالحی صاحب مئوی اور حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب کوپا گنجی تھے، رحمهما الله تعالي

حضرت مولانا عبد الحی صاحب نوراللہ مرقدہٗ:

شہر مئو، جو پہلے ایک قصبہ تھا، اس کی آغوش میں بیک وقت علم وفضل کے تین آفتاب وماہتاب پرورش پا رہے تھے، ابھی یہ علمی افق پر ہلال بن کر طلوع ہو رہے تھے، مگر نگاہیں ان پر اٹھ رہی تھی کہ آگے چل کر بدرِ کامل بنیں گے، ابھی وہ ذرے تھے مگر ان کی تابانی بتا رہی تھی کہ یہ ذرے آفتاب بن کر رہیں گے۔ یہ تین طالب علم حبیب الرحمٰن، عبداللطیف اور عبدالحی تھے، تینوں ہم سبق تھے، تینوں ذکاوت وذہانت کے پتلے تھے، تینوں ایک آدھ سال کے فرق سے ہم عمر تھے، سولہ سال کی عمر تک تینوں ساتھ رہے، یہ ۱۳۳۵ھ کا زمانہ تھا، پھر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی محدث جلیل تو اپنے شفیق استاذ حضرت مولانا عبد الغفار صاحب علیہ الرحمہ کے ساتھ گورکھپور چلے گئے، اس کے بعد یہ تینوں ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں یکجا ہوئے، مگر وہاں موسمی بخار کا ایسا زور ہوا کہ مولانا عبدالحی صاحبؒ اور مولانا عبد اللطیف صاحبؒ بیمار ہوکر وطن واپس آگئے، اور دارالعلوم مئو میں تعلیم میں مشغول ہوگئے، کچھ دنوں کے لئے مینڈھو ضلع علی گڈھ بھی گئے، مگر وہاں کی تعلیم سے طبیعت مطمئن نہیں ہوئی۔ اس لئے دارالعلوم مئو میں آکر یکسوئی سے طلب علم میں لگ گئے،

اسی وقت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے نامور اور بلند رتبہ شاگرد مولانا کریم بخش سنبھلیؒ دارالعلوم مئو میں شیخ الحدیث تھے، ان سے بخاری شریف اور دورۂ حدیث کی دوسری کتابوں کی تکمیل کرکے ۱۳۴۱ھ میں سندِ فراغت حاصل کی۔

فارغ ہونے کے کچھ ہی دنوں کے بعد آپ مدرسہ معروفیہ پورہ معروف میں صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لائے، یہاں آپ نے ۱۳۴۲ھ سے ۱۳۵۵ھ تک مسلسل علم کا فیضان جاری رکھا۔ مولانا محمد عثمان صاحب معروفی لکھتے ہیں کہ:

> یہی زمانہ پورہ معروف میں علمی عروج اور تعلیمی حیثیت سے خیرالقرون کا تھا، یہاں آپ نے جلالین شریف، مشکوٰۃ شریف تک مولانا نذیر احمد صاحب خیرآبادی (۱) کو تعلیم دی، جس نے آپ سے کچھ پڑھ لیا، وہ کسی لائق ہوگیا، آپ کی علمی استعداد اس قدر ٹھوس تھی، جیسے معلوم ہوتا تھا کہ ہر فن کی کتابیں آپ کو ازبر ہوں۔

ان کے مائدۂ علم سے استفادہ کرنے والوں میں علم وفن کے اساطین نظر آتے ہیں، شاگردوں کی عظمت سے استاذ کی عظمت کا نشان ملتا ہے، ان کے تلامذہ میں حضرت مولانا عبدالجبار صاحب علیہ الرحمہ شیخ الحدیث شاہی مرادآباد، سید القراء شیخ التجوید حضرت مولانا قاری ظہیرالدین صاحب معروفی علیہ الرحمہ (۲)، مولانا نذیر احمد صاحب خیرآبادیؒ، صدر المدرسین مدرسہ منبع العلوم خیرآباد اور مولانا محمد سلیمان صاحب خیرآبادی مدظلہٗ (۳) ہیں۔

---

(۱) مولانا نذیر احمد صاحب پر تفصیلی مضمون اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) حضرت قاری ظہیرالدین صاحب ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے، فن تجوید وقرأت سے انھیں عشق تھا۔ استعداد نہایت اعلیٰ تھی، اس فن کے گویا امام تھے، فن قرأت کا مشہور متن، ''شاطبیہ'' تقریباً انھیں ازبر تھا، اور اسے اس سوز سے اور والہانہ انداز میں پڑھتے تھے کہ سننے والے جھوم جھوم جاتے تھے، اور جب اس کی تشریح کرتے تو خود سراپا کیف بن جاتے اور پوری مجلس کو سرشار کردیتے، بہت صاحبِ فیض بزرگ تھے، ۱۹۸۳ء میں وفات پائی۔

(۳) بہترین عالم دین، زبردست خطیب، اعلیٰ درجہ کے ذہین وذکی، خیرآباد کی سکونت ترک کرکے، مالیگاؤں میں بستی بسالی، آج کل مدرسہ اشاعت العلوم اکل کوا مہاراشٹر میں شیخ الحدیث ہیں، (۱۹؍رمضان ۱۴۲۰ھ کو وفات پاگئے)

مولانا محمد عثمان صاحب معروفی جوان کے اخیر دور کے تلامذہ میں ہیں لکھتے ہیں کہ:

> طریقۂ تعلیم آپ کا بالکل جداگانہ تھا، صرف کتاب پڑھادینا اور اس کو رٹانے کے آپ قائل نہ تھے، بلکہ بطور خود کتابوں کے حل کرنے کی استعداد طلبہ میں پیدا کرتے تھے، روزانہ پچھلا سبق سن کر آگے درس دیتے، اور سبق پڑھنے والے کے لئے لازم ہوتا کہ وہ دوران سبق ہر غلطی کو خود درست کرلے، جب تک عبارت کی غلطی ٹھیک نہ ہوجاتی، سبق آگے نہ بڑھتا، مولانا غلطی کی نشاندہی کرکے خاموش بیٹھے رہتے، ہر طالب علم کے لئے مطالعہ لازم تھا۔ (مشاہیر پورہ معروف ص: ۳۸)

تعلیم کا یہ طریقہ علمی وذہنی استعداد پیدا کرنے کیلئے ضروری بھی ہے اور مفید بھی! لیکن یہ طریقہ استاذ کے لئے بڑا صبر آزما ہے، طالب علم نے کوئی غلطی کی، استاذ نے اس کو بتادیا، یہ استاذ کے لئے بہت سہل ہے، لیکن پھر طالب علم اپنے دماغ اپنے ذہن اور اپنی قوتِ فکر سے کبھی کام نہ لے گا اور اس کی استعداد تباہ ہوکر رہے گی، اور مولانا کا طریقہ، خود استاذ کے لئے تو ایک مشکل ترین عمل ہے، مگر طالب علم کچھ دنوں میں خود اپنی غلطی ڈھونڈ نکالتا ہے۔ عجلت پسند استاذ اس طریقے پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا، حقیقت یہ ہے کہ استاذ کو بڑا صاحب ظرف وتحمل ہونا چاہئے۔ مذکورہ بالا طریقہ پر قائم رہنا بالخصوص ذہین وذکی استاذ کیلئے ''صبر ایوب'' کے مصداق ہے، اساتذہ اس باب میں افراط وتفریط کا شکار ہوجاتے ہیں، یا تو بالکل نرم بن کر طالب علم کی ہر غلطی خود درست کردیتے ہیں، یا ان کی غلطیوں پر جب انھیں سمجھنے میں دیر لگتی ہے، تو بے تحاشہ غصہ کرتے ہیں، زدوکوب کرتے ہیں۔ کتنا حلیم وہ استاذ ہوگا جو طالب علم سے خود اس کی غلطی تلاش کرائے اور اس پر حلم وتحمل سے کام لے اور شفقت کی نگاہ

رکھے۔ یہی استاذِ کامل کی شان ہوتی ہے۔

مولانا کی تعلیم کا یہ طریقہ ان کے تلامذہ میں بھی منتقل ہوا، چنانچہ مولانا امانت اللہ صاحبؒ کے تلامذہ کی شہادت ہے کہ وہ بھی اسی طریقہ پر کاربند تھے۔

مولانا عبدالحی صاحبؒ نہایت سنجیدہ اور کم گو انسان تھے، مولانا محمد عثمان صاحب لکھتے ہیں کہ:

> پابندیٔ وقت میں آپ بے مثال تھے، بولتے کم تھے، تقویٰ طہارت اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ فرشتے رشک کریں۔ ص: ۳۹

احتیاط وتقویٰ اور پابندیٔ وقت کا یہ اثر تھا کہ مدرسہ کے اوقات اور اس کے حقوق کا حد درجہ اہتمام فرماتے، وقت سے کچھ پہلے ہی درسگاہ میں آکر بیٹھ جاتے اور چھٹی ہونے کے بعد ہی درسگاہ سے باہر قدم نکالتے، ایسا نہ ہوتا کہ وقت ہوگیا، طلبہ درسگاہ میں حاضر ہوگئے، اور استاذ محترم ہیں کہ دوسرے مشاغل، گپ شپ میں، کھانے پینے، چائے نوشی یا اخبار بینی میں مشغول ہیں، اس صورت حال میں طلبہ کاہل اور بدذوق ہوجاتے ہیں۔ مولانا جب وقت سے پہلے درسگاہ میں آجاتے تو پھر کس طالب علم کی مجال ہے کہ پیچھے رہ جائے، مولانا کا رُعب اور اثر بھی بہت زیادہ تھا۔

جمعرات کو اپنے مکان مئو تشریف لے جاتے، مگر جانے سے پہلے اس کا کوئی اثر یا کوئی تمہیدی کارروائی نہ ہوتی، بڑے اطمینان سے پڑھاتے رہتے، اور جب چھٹی ہوجاتی، تو اٹھتے، اور پیدل مئو تشریف لے جاتے، اور پھر سنیچر کو ٹھیک مدرسہ کے وقت پر پہونچ آتے، اس نظم وضبط اور احتیاط وتقویٰ نے طلبہ کے سامنے ایک مثالی زندگی پیش کردی تھی، چنانچہ ان کے تلامذہ میں یہ اوصاف، نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔

مدرسہ اشاعت العلوم میں: مولاناؒ ۱۳؍سال تک مدرسہ معروفیہ میں

پڑھاتے رہے، ۱۳۵۵ھ میں، پورہ معروف میں کچھ اختلافات ہوئے، مولانا نے اختلاف سے دل برداشتہ ہوکر مدرسہ معروفیہ کی مدرسی ترک کردی، اس وقت محلّہ پارہ میں مدرسہ اشاعت العلوم قائم ہوا، وہاں کے لوگوں نے مولانا کو باصرارِ تمام دعوت دی، مولانا نے اسے منظور فرمالیا، اور ۷؍سال تک یعنی زندگی کے دمِ اخیر تک مدرسہ اشاعت العلوم میں علم دین کی خدمت کی، ۱۳۶۳ھ میں مولانا کا وصال ہوا۔ اس وقت مولانا کی عمر چالیس، پینتالیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ (۱)

مولانا امانت اللہ صاحب ان کے دوراخیر کے تلامذہ میں تھے۔

حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ:

دوسرے استاذ حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ تھے، مولانا اصلاً کوپاگنج کے رہنے والے تھے، ابتدائی تعلیم کوپاگنج میں حاصل کی، دوسال جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں متعلم رہے، اور جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد سے ۱۳۵۸ھ میں فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوگئے، اور خاصانِ خدا جیسی زندگی بسر کی، مولانا عبدالحی صاحبؒ کے انتقال کے بعد منتظمین کی درخواست پر مدرسہ اشاعت العلوم میں تشریف لائے۔ اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے، پورہ معروف میں ہی مکان بنالیا تھا۔ نہایت متقی اور فرشتہ صفت بزرگ تھے۔

راقم الحروف جب جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں زیرِ تعلیم تھا، تو مولانا پابندی سے سالانہ امتحان لینے تشریف لایا کرتے تھے، ہم طلبہ ان کی بزرگی اور تقویٰ سے بہت متاثر تھے، وہ تھوڑی دیر بھی بیکار نہ بیٹھتے، ہمہ وقت کام میں مشغول رہتے، ان کے تمام اوقات اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی، ذکر و شغل اور دوسرے ضروری کاموں سے معمور رہتے تھے، مولانا محمد عثمان صاحب معروفی تحریر فرماتے ہیں کہ:

چھوٹا بڑا کام جو اپنے ذمہ لیتے، اس کو مکمل کرکے چین لیتے، بہت جفاکش اور محنتی تھے، اوقات کی پابندی کا بڑا اہتمام کرتے تھے، فرصت کے اوقات گھر کا کام بھی بہت زیادہ کرتے تھے، تقویٰ وطہارت میں بے مثال تھے، سادگی اور بے تکلفی آپ کی طبیعت ثانیہ تھی، ہر شخص پر یکساں آپ کا رُعب غالب رہتا تھا، طلبہ ومدرسین آپ کا بے حد احترام کرتے تھے، جب مدرسہ میں آجاتے تو سناٹا چھا جاتا، اپنے ماتحتوں کی کڑی نگرانی رکھتے تھے، خلافِ شرع امور پر سخت برہم ہوتے تھے، زبان میں قدرے لُکنت تھی، اس وجہ سے بہت عمدہ انداز میں تقریر نہیں کرسکتے تھے، بایں ہمہ آپ کے خلوص وسچائی نے وہ کام کیا، جو اچھے اچھے مقرر نہیں کرسکے، کم وبیش ۲۷؍سال اشاعت العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں، آپ کے شاگردوں میں اچھے اچھے اہل علم پیدا ہوئے، جو مختلف اداروں میں تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۲۰؍ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۳ھ مطابق ۲۲؍ جولائی ۱۹۷۳ء کو آپ کی وفات ہوئی، بعد نماز ظہر انسانوں کے زبردست ازدحام میں مدرسہ اشاعت العلوم کے جانب مغرب مقبرہ میں سپردِ خاک کئے گئے، تقریباً ساٹھ سال عمر تھی۔ (مشاہیر پورہ معروف)

مولانا امانت اللہ صاحبؒ کے کچھ احوال:

مولانا امانت اللہ صاحبؒ محلّہ پارہ کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، ابتدائی عربی کی تعلیم متوسطات تک مذکورہ بالا دونوں بزرگوں سے حاصل کی، پھر ایک سال مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں رہے، دوسرے سال دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور یہاں دوسال رہ کر ۱۳۶۹ھ میں تعلیم کی تکمیل کی، دارالعلوم دیوبند میں

ان کے شوق علم اور ذوق مطالعہ کا جو حال تھا، اس کا اعتراف آپ مولانا محمد حنیف صاحب مرحوم کی زبان سے سن چکے ہیں، اس کثرتِ مطالعہ نے وہاں ان کا بڑا اعتبار قائم کردیا تھا، شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب علیہ الرحمہ جو طلبہ کی تعلیمی حالت پر گہری نظر رکھتے تھے، ان سے بہت خوش رہتے تھے۔

مدنی دارالمطالعہ:

دارالعلوم دیوبند میں صوبہ یوپی کے طلبہ کا ایک عظیم الشان کتب خانہ ''مدنی دارالمطالعہ'' کے نام سے موجود ہے، جس سے طلبہ استفادہ کرتے ہیں، اس کے ابتدائی محرکین اور مؤسسین میں حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ انجان شہیدی المتوفی ۱۳۹۵ھ اور مولانا محمد عثمان صاحب معروفی مدظلہٗ کے ساتھ مولانا مرحوم کا بھی نام شامل ہے بلکہ مولانا کی جدوجہد اور کاوش کا اس میں خاص دخل تھا۔ مدنی دارالمطالعہ کی طرف سے ایک قلمی رسالہ ماہنامہ ''آزاد'' مولانا اور ان کے رفقاء نے جاری کیا، جب تک مولانا دارالعلوم میں زیر تعلیم رہے، وہ نکلتا رہا، اور مولاناؒ کے قلم سے اس میں سنجیدہ اور علمی مضامین شائع ہوتے رہے، بعد میں مولاناؒ نے تصنیف وتالیف کی طرف توجہ نہیں دی، مطالعہ وتدریس اور قومی وملی کاموں کے لئے یکسو ہوکر رہ گئے، البتہ ان کی زندہ تصانیف بہت ہیں، یعنی ان کے تلامذہ جنھوں نے ان سے فیض حاصل کیا، تربیت پائی، اور اب وہ تعلیم وتدریس، اور تصنیف وتالیف کے میدانوں میں سرگرمِ عمل ہیں۔

مولاناؒ اپنے تلامذہ پر بہت شفیق تھے، صرف زمانۂ طالب علمی تک نہیں، بلکہ فراغت کے بعد بھی اپنے تلامذہ پر نظر رکھتے، انھیں فکر رہا کرتی کہ یہ جماعت علم دین کی خدمت میں لگی رہے، مناسب جگھوں پر ان کو تعلیم کیلئے بھیجنا، ان کی ضروریات اور تقاضوں کا لحاظ رکھنا، انھیں مفید مشوروں سے نوازنا، ان کی مشکلات کو دور کرنے کا

اہتمام کرنا، ان سب امور کی وہ فکر رکھتے، دور نزدیک کے جن مدارس کو استاذ کی ضرورت ہوتی، وہ مولانا مرحوم کے پاس پہونچتے، اور مولانا کسی مناسب آدمی کو متعین کردیتے، اس طرح ملک کے بیشتر حصوں میں مولاناؒ کے تلامذہ و متعلقین پھیلے ہوئے ہیں۔

ان کے مشورے بڑے صائب ہوتے تھے، ان کے تلامذہ و متعلقین کو ان پر بڑا اعتماد تھا، وہ اپنے خاص اور نجی معاملات تک میں ان سے مشورہ لیتے، اور بہت شرح صدر کے ساتھ ان کے مشوروں پر عمل کرتے، ان کے چھوٹے بھائی، جو علم کے سمندر ہیں یعنی مولانا نعمت اللہ صاحب! انھوں نے فرمایا کہ علمی ودینی معاملات میں بھی، اور دنیاوی امور میں بھی ان کا ذہن ہمیشہ تہہ کی بات نکال لاتا تھا۔ اور دونوں طرح کے معاملات میں تجربہ کے بعد ان کی رائے کی صحت ظاہر ہوجاتی تھی، اسی لئے مولانا نعمت اللہ صاحب نے اپنے کو تمام معاملات میں ان کی رائے کا پابند کر رکھا تھا، اور بقول مولانا موصوف وہ ان کے ساتھ چھوٹے بھائی کا نہیں، بلکہ بیٹے جیسا معاملہ کرتے تھے۔

محدثِ جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ سے انھیں گہرا تعلق تھا، وہ اہتمام سے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، حضرت بھی ان سے خصوصی برتاؤ رکھتے تھے، مسائل ومعاملات میں ان کی رائے معلوم کرتے اور اسے اہمیت دیتے، حضرت اقدسؒ کی وفات کے بعد ان کی یادگار میں مجلّہ ''المآثر'' جاری ہوا تو بہت مسرور ہوئے، اسے حرفاً حرفاً پڑھتے، اور اس کی توسیعِ اشاعت کی فکر کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑی خوبیوں سے نوازا تھا، ان کے جانے سے علمی حلقہ میں ایک خلا سا محسوس ہورہا ہے، وہ بہت دنوں تک یاد کئے جائیں گے۔

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

ان کے باقیات صالحات میں مدرسہ اشاعت العلوم اور ان کے کثیر التعداد تلامذہ ہیں، ان دونوں کا فیض جب تک جاری رہے گا مولانا کی روح کے لئے اجر وثواب کا سلسلہ قائم رہے گا۔

مولانا کی تدفین مدرسہ اشاعت العلوم کے پیچھے قبرستان میں ہوئی۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کو جگہ ملی ان کے فرشتہ صفت استاذ حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کے پہلو میں، استاذ سے خصوصی ربط وتعلق کی بات ہے کہ مرنے کے بعد ان کے جوار میں جگہ ملی۔

حق تعالیٰ ہر دو حضرات کی اپنی مہربانی سے بخشش فرمائے، اور ان کے چمن کو پھلتا پھولتا اور زمانے کو معطر کرتا رکھے۔ آمین

.................☆☆☆☆☆☆☆.................

ایک محسن کی یاد

(مولوی محمد حنیف صاحب دیوبندیؒ)

وفات: ۱۹؍ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ

دار العلوم دیوبند سے ایک طالب علم کا خط آیا، اس کے آخر میں اس نے ایک غیر معمولی خبر کو معمولی انداز میں لکھا، اس کیلئے وہ خبر معمولی ہے، لیکن میرے لئے غیر معمولی! اس نے لکھا کہ: ''۱۹؍ذی الحجہ (۱۴۱۶ھ) کو دار العلوم دیوبند کے ایک فرد مولوی محمد حنیف صاحب محرر کتاب خانہ کا انتقال ہوگیا۔''

بظاہر کتنی سرسری خبر ہے، لیکن اس نے میرے حافظہ میں مدفون بھولی بسری یادوں کا ایک خزانہ کھول دیا۔ مولوی محمد حنیف صاحب دار العلوم دیوبند کے عظیم الشان کتب خانہ میں شعبہ مطالعہ کے نگراں تھے، اس شعبہ میں طلبۂ دار العلوم اپنے خالی اوقات میں کتب خانہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ طلبہ کو ان کی مطلوبہ کتاب نکال کر دینا۔ انھیں رجسٹر پر درج کرنا، مطالعہ کرنے والوں کی نگرانی کرتے رہنا کہ وہ ان کتابوں پر کوئی ناروا تصرف نہ کریں، پھر انھیں بحفاظت واپس لینا، یہ کام مولوی محمد حنیف صاحب کیا کرتے تھے۔

میں جب دار العلوم میں طالب علم تھا۔ اس وقت دار المطالعہ صبح کے اوقاتِ تعلیم میں ۱۲؍بجے تک اور بعد نمازِ ظہر اذان عصر تک کھلا رہتا تھا، طلبہ ان اوقات میں عموماً درس میں مشغول ہوتے تھے، وہی طلبہ دار المطالعہ میں آتے تھے، جن کا کوئی

گھنٹہ کسی اتفاقی وجہ سے کسی دن خالی ہوگیا ہو، اس وقت کچھ شوقین طلبہ مطالعہ کیلئے اس شعبہ میں جمع ہوجاتے تھے، ایسے طلبہ کی تعداد کچھ زیادہ نہ ہوتی، اس وجہ سے مولوی صاحب مرحوم کا تعارف طلبہ کے حلقہ میں کم رہا، وہ گمنام ہی رہے، لیکن گمناموں میں بھی بعض اوقات بڑا اخلوص اور پیار ملتا ہے۔

مولوی صاحب مرحوم ایسے ہی ایک گمنام تھے، جن میں، میں نے بڑا اخلوص اور بیکراں محبت پائی، اس لئے میرا دل ان کی عظمت سے معمور ہے، وہ میرے محسن تھے، میں ہمیشہ ان کا شکر گزار رہا، میں ان کے حالاتِ زندگی سے واقف نہیں ہوں۔ کس خاندان سے ان کا تعلق ہے؟ کب پیدا ہوئے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ کہاں پڑھا اور کیا پڑھا؟ دارالعلوم دیوبند میں کب ملازم ہوئے؟ یہ سب کچھ میں نہیں جانتا، میں انھیں صرف اتنا جانتا ہوں جتنا میں نے انھیں برتا ہے، اور اس برتنے کی مدت بھی زیادہ نہیں ہے، لیکن اسی مدت میں انھوں نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، اور جس خلوص ومحبت سے میری دلجوئی کی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ چند سطریں ان کے نام پر نذر کروں، شاید اس تحریر کے ذریعے ان کی محبت وشفقت کا کچھ حق ادا ہوجائے۔ یا کوئی ایسی بات قلم سے نکل جائے، جو کسی جویائے راہ کیلئے رہنما بن جائے۔

میں شوال ۱۳۸۸ھ میں دارالعلوم دیوبند پہونچا، امتحان داخلہ اور داخلہ کے ابتدائی مرحلوں سے گزر کر جب قدرے اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا، ابھی اسباق شروع نہیں ہوئے تھے، تو مجھے شوقِ مطالعہ اور کتابوں کا ذوقِ تجسس دارالعلوم کے کتب خانہ میں لے گیا۔ اس وقت مجھے مطالعہ کتب کا شوق نہیں، جنون تھا۔ گو کہ میں کمزور تھا۔ مگر یہ جنون مجھے ہر اس جگہ لئے لئے پھرا جہاں جہاں، کتابوں کے ملنے کی توقع ہوتی، میں دارالعلوم کے دارالمطالعہ میں ایک روز جا پہونچا، کتابوں کا جنگل دیکھ کر خوشی سے میری طبیعت جھوم اٹھی، کہ یہاں جنونِ مطالعہ کی تسکین کا سامان

موجود ہے، میں اس میں لگی ہوئی فہرست (کیٹلاگ) دیکھنے لگا۔ اور گھنٹوں کھڑا دیکھتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک نظر کتابوں کے نام پر پڑ جائے، پھر مطالعہ کیلئے کسی کتاب کا انتخاب کروں۔

دارالعلوم دیوبند جانے سے پہلے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں پڑھتا تھا، وہاں تعلیمی مضامین میں مجھے گو کہ کچھ زیادہ صلاحیت نہ تھی۔ لیکن ادب عربی کے بعد منطق سے خصوصی دلچسپی تھی، میرے ذہن ودماغ میں منطق کے مباحث عموماً گردش کیا کرتے تھے، اس موضوع پر درسی کتابوں کے علاوہ دوسری کتب کا بھی مطالعہ کیا کرتا تھا۔ بالخصوص منطق کی حمایت ومخالفت میں جو مضامین اور کتابیں ملتیں انھیں ضرور پڑھتا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کے مقالات کا وہ حصہ منطقی مباحث پر مشتمل ہے اسے بار بار پڑھا، انھوں نے اپنے مقالات میں علامہ قطب الدین رازی کی کتاب شرح مطالع کا ذکر بہت اہتمام سے کیا ہے، نیز انھیں کے مقالات میں علامہ ابن تیمیہؒ کی کتاب'' **الرد علی المنطقیین** '' کا ذکر بھی پڑھا تھا۔ مجھے ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ مبارکپور کے کتب خانہ میں یہ دونوں کتابیں موجود نہ تھیں، دارالعلوم کے کتب خانہ میں رسائی ہوئی تو فہرست میں یہ دونوں مل گئیں، میں نے غایت شوق میں نگران کتب خانہ مولوی محمد حنیف صاحب سے کہا کہ ذرا شرح مطالع نکال دیجئے۔ نام سنتے ہی ان کی پیشانی پر بل آگیا، سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا، ایک مسکین اور شرمیلا طالب علم، گردن میں پرانے طرز کا رومال لپیٹے، بہت معمولی سوتی کرتا اور مِل کی بنی ہوئی چارخانے کی لنگی پہنے، سر پر مئو والی مخصوص کشتی نما ٹوپی رکھے کھڑا ان سے شرح مطالع کی فرمائش کر رہا تھا۔ چہرے بشرے پر ذہانت کی پرچھائیاں بھی نہ تھیں، عمر بھی اٹھارہ سال کے قریب پہونچی تھی، انھوں نے کڑک کر پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ جلالین کی جماعت میں داخلہ ہوا ہے، اچھا

جدید ہو؟ جی ہاں۔ منطق کی کون سی کتاب پڑھی ہے؟ سلم اور ملاحسن پڑھی ہے، قاضی مبارک اور حمداللہ بھی پڑھ چکے ہو؟ جی نہیں، پھر شرح مطالع کیا سمجھو گے؟ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے، میں گھبرا گیا، میں نے سوچا یہ موقع ہاتھ سے جانا چاہتا ہے، میں نے ہمت کی، اور لپک کر ان سے کہا کہ صاحب کتاب دیدیجئے، انھوں نے پھر ڈانٹا کہ سمجھو گے؟ اب میں نے بھی تیور بدلے، آپ کو اس سے کیا مطلب؟ آپ کتاب دیجئے، پہلے وہ گرم ہوئے، لیکن پھر نرم پڑ گئے، اور مجھے سمجھانے لگے، دیر تک سمجھاتے رہے، مگر میری آتش شوق تیز تر ہوتی رہی، بالآخر انھوں نے سپر ڈال دی، کہنے لگے میں عرصۂ دراز سے یہاں کام کر رہا ہوں، مگر کسی نے یہ کتاب نہیں مانگی، اچھا لاتا ہوں، یہ کہہ کر وہ سیڑھی سے اوپر ریلنگ پر چڑھ گئے اور کتاب نکال کر لے آئے، اسے خوب جھاڑا پونچھا، رجسٹر پر درج کیا، مجھ سے دستخط لیا اور کتاب میرے حوالے کر کے نگرانی کرنے لگے کہ میں پڑھتا بھی ہوں، یا صرف ورق گردانی کرتا ہوں۔

یہ تھا مولوی صاحب مرحوم سے میرا پہلا سابقہ جو لڑائی سے شروع ہوا، اور ان کی شفقت و محبت تک پہونچا، مولوی صاحب ایک مشتِ استخواں تھے، لاغر بدن، پستہ قد، آنکھوں پر باریک کمانی کی عینک، آواز مہین مگر کراری، بڑھاپا بال بال پر نمایاں، مگر متحرک، جہاں کسی نے کوئی کتاب مانگی، اگر پہلے سے واقف ہیں، تو بجلی کی سی تیزی سے اٹھتے، اور مطلوبہ کتاب بلا تأمل نکال کر دے دیتے، اور اگر اس سے واقف نہیں ہیں، تو اس سے الجھتے، اس کا مبلغِ علم معلوم کرتے، جدید ہو یا قدیم، پوچھتے، انھیں اس کے معیار سے اونچی کتاب معلوم ہوتی، تو اسے مطالعہ کی ترتیب بتاتے کہ پہلے فلاں فلاں کتاب پڑھو، پھر اسے پڑھنا وغیرہ۔ اس طرح وہ مطالعہ کرنے والوں کی رہنمائی کرتے، بہت سے ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے، اور

ایسے بھی ہوتے جو جھنجھلاتے، چڑھتے، تیوری چڑھاتے، مگر مولوی صاحب اپنی دُھن کے پکے تھے۔

کسی طالب علم کو کوئی کتاب خود سے نکالنے نہیں دیتے، طلبہ الماریوں کے قریب کھڑے ہو کر کتاب کے نام دیکھتے رہتے، اور مولوی صاحب انھیں دیکھتے رہتے، جہاں کسی کا ہاتھ کسی کتاب کی طرف بڑھتا، وہ تڑپ کر اٹھتے اور ان کے پہونچنے سے پہلے ان کی آواز اس کے کانوں تک پہونچ جاتی، ہاں ہاں کتاب کو ہاتھ نہ لگاؤ، تمھیں کون سی کتاب چاہئے، طلبہ ان کی اس ادا سے خوب واقف تھے، اس لئے ہر طالب علم اپنے ہاتھ کو محتاط ہی رکھتا، کیونکہ مولوی صاحب پھر دیر تک تنبیہ کرتے رہتے اور طالب علم خفیف ہوتا رہتا، اگر ایسا وہ نہ کرتے، تو کتب خانے کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

ابتداءً میرے ساتھ بھی یہی معاملہ رہا، لیکن چونکہ میں روزانہ پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا رہا، اور بکثرت کتابیں ان سے طلب کرتا رہتا، پہلے تو انھوں نے بیک وقت کئی کئی کتابیں مانگنے پر ٹوکا، مگر جب دیکھا کہ اس لڑکے کی بے دماغی ان کے اصول و ضوابط کی آہنی رکاوٹوں سے ہارنے والی نہیں ہے، تو خود انھوں نے سِپر ڈال دی، انھوں نے اس کے بعد مجھے خصوصی اجازت مرحمت فرمادی تھی، کہ تم جو چاہو کتاب نکال سکتے ہو، کچھ دنوں کے بعد رجسٹر میں درج کرانے کی پابندی بھی ہٹادی تھی، مجھے دیکھ کر بعض اور طلبہ نے بھی جرأت کرنی چاہی، لیکن انھوں نے تنبیہ کر کے اور سمجھا کر انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا، انھوں نے مہربانی فرما کر میرے لئے کتب خانے کا ایک گوشہ متعین کر دیا تھا کہ میں وہیں بیٹھا کروں، اس جگہ کسی کو بیٹھنے نہیں دیتے تھے، وہ جگہ ایسی تھی کہ نوادرات کی الماریوں کی وجہ سے وہاں کچھ آڑ سی ہو گئی تھی، کتب خانہ میں آنے جانے والوں کی نگاہ وہاں نہیں پڑتی تھی، ایسے

طالب علموں کو جو پڑھنے سے زیادہ گفتگو کے عادی تھے۔ انھیں میرے پاس جانے سے روک دیتے اور اگر اتفاق سے میں خود کبھی کسی سے گفتگو شروع کر دیتا، تو دو چار منٹ برداشت کرتے، لیکن اس کے بعد ان کی ناصحانہ تنبیہ شروع ہو جاتی۔

میں جس درجہ میں پڑھتا تھا اس میں صرف تین کتابیں زیر درس تھیں، صبح کے ابتدائی دو گھنٹوں میں جلالین شریف ہوتی، تیسرے گھنٹے میں میبذی ہوتی، چوتھا گھنٹہ خالی تھا، اس میں خوشخطی کی تمرین کیا کرتا، شام کے دونوں گھنٹے ہدایہ اخیرین کے لئے تھے۔

جلالین شریف حضرت مولانا محمد سالم صاحب پڑھاتے تھے، ان کا دستور تھا کہ وقت ہوتے ہی پانچ منٹ کے اندر دارالتفسیر میں تشریف لے آتے تھے، اگر پانچ منٹ گزر گئے اور مولانا نہیں پہونچے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب تشریف نہیں لائیں گے۔ کہیں سفر میں گئے ہوں گے یا اور کوئی ضروری مشغولیت ہوگی، اس کے بعد طلبہ کچھ تو وہیں درسگاہ میں مذاکرہ و مطالعہ میں لگ جاتے، کچھ لوٹ آتے، میں سیدھا بھاگ کر کتب خانہ میں پہونچ جاتا، میبذی حضرت مولانا قمرالدین صاحب گورکھپوری کی خدمت میں پڑھتا تھا۔ وہاں ناغہ کا کوئی سوال نہ تھا، خوشخطی کی تمرین بعض دوستوں کی ترغیب سے اختیار کر لی تھی، مگر مجھے اس سے کوئی مناسبت نہ تھی، کچھ دنوں تک اس کو نباہتا رہا، لیکن چند دنوں کے بعد اپنے استاذ محترم حضرت منشی امتیاز احمد صاحب علیہ الرحمہ سے اجازت لے کر اس شعبہ سے اپنا نام میں نے خارج کرالیا، اب یہ گھنٹہ کتب خانہ کیلئے مستقل ہو گیا۔

شام کے دونوں گھنٹوں میں ہدایہ اخیرین کا درس تھا۔ حضرت مولانا اختر حسین صاحب علیہ الرحمہ جو مدرسہ میں ’’میاں صاحب‘‘ کے نام سے معروف تھے، پڑھاتے تھے، میاں صاحب نہایت متقی اور باخدا انسان تھے، اس وقت وہ نائب

ناظم تعلیمات تھے، ان کے درس میں بڑی برکت تھی، جتنا سبق کوئی دو گھنٹے میں پڑھاتا، اس سے زیادہ وہ ایک گھنٹے میں پڑھاتے تھے، چھٹی سے آدھ گھنٹہ پہلے ان کا سبق مکمل ہو جاتا، میں اس وقت بھی بھاگ کر کتب خانہ پہونچ جاتا۔ مولوی صاحب بھی منتظر ہی ہوتے، میری کثرتِ حاضری کی وجہ سے وہ بہت مانوس ہو گئے تھے، اور بڑی رعایت کرتے تھے، کبھی کبھی باتیں بھی کرتے، خوش رہتے تو اپنے پچھلے تجربات بھی بتاتے، ان کی باتوں سے مطالعہ کا شوق بڑھتا، اور بڑی ہمت ملتی، حوصلہ بیدار ہوتا۔

ایک روز بارہ بجنے کے بعد بھی میں کتب خانہ میں بیٹھا رہ گیا، وہ بھی کسی کام میں مشغول تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب فارغ ہوئے تو دروازہ بند کرنے لگے، پھر انھیں کچھ خیال آیا تو پلٹ کر دیکھا کہ میں ابھی تک کتاب دیکھے جا رہا ہوں۔ ڈانٹنے لگے کہ تمہاری وجہ سے کیا میں یہیں پڑا رہوں، چلو باہر چلو، میں تو دروازہ بند کر دئے ہوتا، مگر تم یاد آ گئے پھر مسکرانے لگے، اور فرمایا کہ میں کتب خانے میں اس کام پر ۳۰؍ سال سے ہوں، اس تیس سال کے عرصہ میں کتب خانے کو سب سے زیادہ استعمال کرنے والے تین طالب علم ملے، اور اتفاق ہے کہ تینوں اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں، بلکہ دو تو بھائی تھے، ایک امانت اللہ، دوسرے نعمت اللہ! (اس کی مزید تفصیل اسی کتاب میں مولانا امانت اللہ صاحب کے تذکرے میں ملاحظہ فرمائیں) اور تیسرے تم ہو، اس وقت ہم تینوں کا ضلع اعظم گڈھ تھا، اب مئو ضلع میں آ گئے ہیں۔

مجھے ان کی بات سے بے حد مسرت ہوئی، اور بڑا حوصلہ ملا۔ اور مطالعہ کے شوق میں مزید مہمیز ہوئی۔ اس طرح وہ پڑھنے والے طالب علم کا دل بڑھایا کرتے تھے، اس کے بعد اکثر وہ میری رعایت میں وقت ختم ہونے کے بعد بھی بیٹھے رہتے۔ جب زیادہ دیر ہونے لگتی، تو حکماً اٹھا دیتے،

مولوی محمد حنیف صاحب مرحوم کو دارالعلوم کے کتب خانے سے عشق تھا، وہ ہر وقت کتابوں کی دیکھ بھال کیا کرتے، انھیں جھاڑتے پونچھتے رہتے، اسی عشق کا نتیجہ تھا کہ ان کے لوحِ دماغ پر ہر ہر کتاب کا نام ثبت تھا، اور یہ کہ وہ کس جگہ رکھی ہے، اس کی جلد کا رنگ کیا ہے، کتنی ضخیم ہے، جہاں کسی نے کوئی کتاب طلب کی، وہ نہ فن پوچھتے، نہ کتاب کا نمبر پوچھتے، سیدھے متعلقہ الماری کے پاس پہونچتے، اور ان کی انگلیاں ٹھیک اسی کتاب پر پڑتیں جو مطلوب ہوتی، اس میں کبھی تخلف نہیں دیکھا، جب میں نے ان سے شرح مطالع طلب کی، اور حجت وتکرار کے بعد وہ دینے پر آمادہ ہوئے، تو حالانکہ انھیں اس کتاب کے نکالنے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی، مگر وہ سیڑھی پر چڑھ کر ٹھیک اسی کتاب کو نکال کر لے آئے۔

دارالعلوم دیوبند سے واپسی کے بعد پھر ان سے ملاقات کی نوبت بہت کم آئی، دو سال قبل دارالعلوم حاضری ہوئی، اور کتب خانہ میں جانا ہوا، تو کتب خانہ کا وہ بوڑھا عاشق ملا۔ دارالمطالعہ کی جگہ اب تبدیل ہوگئی ہے۔ مولوی محمد حنیف صاحب بھی تھک ہار چکے تھے، کمزوری کا ان پر غلبہ تھا۔ حافظہ کی گرفت بھی ڈھیلی ہوگئی تھی۔ ان کے ساتھ ایک معاون لگا دیا گیا تھا۔ تعارف کے بعد پہچان گئے۔ اور پھر وہ دیر پچھلے دور کو یاد کرتے رہے، اور کتب خانہ اور اس کے متعلقات پر باتیں کرتے رہے، لیکن اب باتوں میں کرارا پن نہ تھا۔ اضمحلال جھلکتا تھا، بہت سی باتیں حافظہ سے محو بھی ہوچکی تھیں۔ غالباً اسّی سے زائد عمر بھی ہوچکی تھی۔

بالآخر کتابوں کی خدمت کرتے کرتے اس جاں نثار اور باوفا بوڑھے نے ۱۹/ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ کو زندگی کے سفر سے کمر کھول دی، اور رب کریم کے حضور بامید مغفرت حاضری دیدی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کی تُربت کو ٹھنڈا رکھے اور ان کے احسانات کا اجر عطا فرمائے۔

مولوی صاحب کی شخصیت کچھ معروف نہ تھی، زندگی انھوں نے دارالعلوم کے کتب خانے اور طلبہ کی خدمت میں صرف کردی۔ خود شاید کبھی کتاب کا مطالعہ نہیں کرتے تھے۔ مگر مطالعہ کرنے والوں کی خوب مدد کرتے تھے، ان کے بقول ۱۳۸۸ھ میں انھیں یہ خدمت انجام دیتے ۳۰/سال ہوچکے تھے، یہ ان کا ندازہ تھا، ہوسکتا ہے کہ کچھ کم وبیش مدت رہی ہو، اب ۱۴۱۶ھ کے خاتمہ پر روح نے ان کے جسم کا ساتھ چھوڑا، تو وہ اس خدمت سے سبکدوش ہوئے، اس طرح کل مدت تقریباً ۵۸/سال ہوئی۔ نصف صدی سے زائد اس عرصہ میں نہ جانے کتنے مشاہیر اہل علم اور بڑے علماء کی خدمت کا انھیں شرف حاصل ہوا ہوگا۔ اور یہ خدمت بھی اس وقت، جب یہ مشاہیر، ابھی علم کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے، اور اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے کتب خانے کے دارالمطالعہ میں بے نام آتے تھے، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے نہ جانے کتنوں کی علمی رہنمائی کی ہوگی۔ کتنوں کو حوصلہ بخشا ہوگا، ان کا خاموش عمل، علماء کی علمی ترقیوں میں ایک مؤثر عامل رہا ہے، دارالعلوم کا کتب خانہ سدابہار ہے، اب ان کی جگہ پر دوسرے کام کرنے والے آگئے ہوں گے، لیکن جن قلوب پر انھوں نے اپنی شخصیت اور اپنے احسانات کے نقش چھوڑے ہیں، وہ انھیں کبھی بھلا نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک پیکرِ وفا نہ رہا

(مولوی مولیٰ بخش انصاری غازیپوریؒ)

وفات: ۴؍جولائی ۱۹۹۶ء

ایک شخص، جو کبھی ایک مخصوص حلقے میں نامور تھا۔ مگر پھر بے نام ہو گیا، ایک دور تھا کہ اہل جنوں کی محفل میں اس کی شہرت عام تھی، مگر وہ اہل جنوں ہی اٹھ گئے، اور وہ گمنام ہو کر رہ گیا، اس کے جاننے والے بہت تھے، مگر آہستہ آہستہ وہ حجاب و مستوری کی وادیوں میں گم ہوتا چلا گیا۔ کبھی وہ شعلۂ جوالہ تھا۔ پھر وہ راکھ کا ایک ڈھیر ہو گیا۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ کی لوحِ مزار پر ایک شعر لکھا ہوا دیکھا تھا۔ اب بھی معلوم نہیں وہ شعر اس پر ہے، یا زمانے کے ہاتھوں نے ان کی یاد کی طرح اس شعر کو بھی مٹا دیا۔ شعر یہ تھا ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم   خاک ہو گئے، انتہا یہ ہے

جس طرح مجاہد ملت پر یہ شعر صادق آتا ہے، اسی طرح اس شخص کے حق میں بھی چسپاں ہوتا ہے، فرق ہے تو رُتبہ اور مقام کے اعتبار سے! مجاہد ملت عالم تھے، رہنما تھے، سپہ سالار تھے، اور یہ شخص عالم نہ تھا، رہنما اور لیڈر نہ تھا، ایک سپاہی تھا، ایک رضا کار تھا۔ لیکن جوش و جذبہ کی جو آگ وہاں دہک رہی تھی، وہی آگ یہاں بھی دہک رہی تھی، انجن کے چھوٹے اور بڑے ہونے کا فرق تھا۔ لوگوں نے ناموروں میں بڑائی کو منحصر سمجھ رکھا ہے، حالانکہ گمناموں بھی مرتبہ کی بلندیاں ملتی ہیں،

یہ غازی پور میں پیدا ہوا، یہیں پلا بڑھا، کاروبار کے سلسلے میں کبھی مونگیر رہا، کبھی شاہجہاں پور گیا۔ لیکن خمیر غازی پور ہی کا تھا۔ زمانے کے سرد و گرم کو خوب چکھا، ملک و ملت کے کارناموں میں اپنی بساط سے زیادہ حصہ لیتا رہا، اپنے کاروبار کو، اپنی شخصیت و ذہانت کو اپنی قوم اور اپنی ملت کے لئے لٹاتا رہا، قلاش اور مفلس ہوا، مگر خوئے وضع داری اور مذاقِ وفاداری میں فرق نہیں آنے دیا۔ غیروں کے ظلم سہے، اپنوں کی کج ادائیاں اور بے وفائیاں دیکھیں۔ مگر کیا مجال کہ اس کی خودداری میں خلل آتا۔ وہ عجیب مرد تھا۔ نام اس کا مولیٰ بخش تھا۔ انصاری کا لاحقہ اس نے اپنے قلم سے لگایا تھا، مولوی کا لقب اسے علماء کی ایک جماعت نے دیا تھا۔ وہ خود کو مولیٰ بخش انصاری لکھتا تھا، دوسرے لوگ اسے مولوی مولیٰ بخش انصاری لکھتے تھے۔ لیکن بے تکلف دوستوں میں، اور ان کے اثر سے ہم چھوٹوں میں بھی وہ صرف ''مولیٰ صاحب'' تھے۔ ۴؍جولائی ۱۹۹۶ء مطابق ۱۷؍صفر ۱۴۱۷ھ بروز جمعرات ساڑھے آٹھ بجے شب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ پیدا ۱۹۰۱ء میں ہوئے تھے، کتنی طویل عمر پائی؟ آج میں ان کی کچھ یادیں لکھنے بیٹھا تو خیالات کا ہجوم امنڈ آیا۔ اور کہاں سے شروع کروں، کچھ سمجھ میں نہ آیا، تو یونہی لکھنا شروع کر دیا۔ اور تمہید بنتی چلی گئی۔

میں نے جب مولیٰ صاحب کو دیکھا، تو ان کی ناموری کا دور ختم ہو چکا تھا۔ یہ زمانہ ۱۳۹۳ء کا تھا۔ یادش بخیر! میں اس سال مدرسہ دینیہ غازی پور میں مدرس ہو کر پہونچا تھا، جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی اس کے مہتمم تھے۔ مولانا مشتاق احمد صاحب مرحوم اس کے صدر مدرس تھے، ان دونوں کے ساتھ ایک اور شخصیت سے ملاقات ہوئی، بوٹا سا قد، مختصر ساجثہ، ہڈیوں کا ڈھانچہ جس پر جھریوں سے بھری کھال منڈھی ہوئی، پوست ہی پوست، گوشت برائے نام، عمر ظاہر ہے کہ ۷۳ سال تو ہو ہی چکی تھی۔ چھوٹا سا چہرہ، اس پر مختصر سی سفید داڑھی، مارکین کا کرتہ، مارکین کا

شلوار نما پاجامہ، مارکین ہی کی دوپلی ٹوپی، منہ میں کچھ دانت ندارد کچھ موجود اور جو موجود تھے، وہ بھی ندارد ہونے کے لیے تیار، تھے تو بقدِ مختصر، اور بوڑھے، مگر حرکت و عمل اور سعی و کاوش میں جوانوں سے بڑھ کر، طبیعت میں بے حد پھرتی، کاہلی اور سستی کا دور دور تک نشان نہ تھا، ہر کام کے لئے مستعد اور تیار! عزیز صاحب سے بے حد اخلاص اور محبت، جب بلاتے تو صرف ''عزیز بابو'' کہتے، دن بھر میں مدرسہ کا ایک چکر ضرور لگاتے، اور کبھی اس سے زیادہ! اور ضرورت ہوتی تو بار بار آتے، اور اس سے بھی زیادہ ضرورت ہوتی تو ہمہ وقت حاضر! مدرسہ میں ملازم نہ تھے، مدرسہ کے عہدہ دار نہ تھے، مگر مدرسہ دینیہ کا ان کے بغیر تصور نہ تھا، صرف مدرسہ نہیں، عزیز صاحب کا بھی تصور ان کے بغیر نہ تھا، مدرسہ کو ضرورت ہو تو وہ دل و جان سے حاضر! عزیز صاحب کو ضرورت ہو تو وہ ہمہ تن موجود! انھیں نہ بھی ضرورت ہو، تب بھی خیریت معلوم کرنے لئے بے چین، یہ تھے مولیٰ صاحب!

میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مدرسہ دینیہ سے ان کا تعلق کب سے تھا؟ کیونکہ ان کو الگ کر کے مدرسہ کا تصور کبھی ہوا ہی نہیں کہ کبھی سوال پیدا ہوتا کہ ان کا تعلق کب سے ہے، اور عمر بھی ان کی وہ تھی، کہ جب مدرسہ دینیہ قائم ہوا تو یہ جوان تھے، مدرسہ دینیہ پر اب تک تین دور گزرے ہیں، پہلا دور مولانا عمر فاروق صاحب علیہ الرحمہ کا تھا، وہی اس مدرسہ کے بانی تھے، دوسرا دور مولانا ابوالحسن صاحب علیہ الرحمہ کا تھا، ان کے بعد تیسرا دور ان کے فرزند جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی کا ہے۔

مولانا عمر فاروق صاحبؒ کے دور کا حال تو میں نہیں جانتا لیکن مولانا ابوالحسن صاحبؒ کے دور میں، مدرسہ دینیہ سے اور مولانا مرحوم سے انھیں بہت گہری وابستگی رہی، وہ مولانا کے دست راست بن کر مدرسہ کا کام حسبۃً للہ کرتے رہے، مدرسہ کی تعمیر و ترقی کیلئے جدوجہد کرتے، غازی پور جیسے شہر میں مسلکِ اہل حق کا مدرسہ چلانا، ایک بڑا دشوار کام تھا، بالخصوص جب کہ اس کا تعلق جمعیۃ علماء ہند سے ہو، کیونکہ غازی پور میں اہل بدعت کا غلبہ ہے، فصیحی خاندان وہاں دینی وجاہت کے اعتبار سے چھایا رہا ہے، اور اس خاندان کے بڑے بڑے اکابر رضاخانی مسلک کے تھے، وہاں مشہور مدرسہ چشمۂ رحمت پر بھی اہل بدعت ہی کا غلبہ تھا، گوکہ اس کے بعض علماء نرم مسلک بھی رکھتے تھے، مگر اکثریت رضاخانیوں کی ہی تھی، یہ لوگ اپنی رضاخانیت میں سخت متشدد تھے، بریلویوں کے بعد وہاں رافضیوں کا گروہ تھا، ان دونوں سے کچھ بچے تو غیر مقلد تھے، علماء دیوبند کے ماننے والے بس چند گھر، بلکہ چند افراد تھے، اور ان چند میں بھی سیاسی اعتبار سے زیادہ تر لوگوں کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جس طرح رضاخانیوں میں اپنے مسلک کے تئیں شدید تعصب پایا جاتا ہے، اور اپنے علاوہ دوسروں کو کافر سے کم ماننے والے نہیں، یہی حال مسلم لیگ کا بھی تھا کہ وہ اہل جمعیۃ کو جو کانگریس سے تعلق رکھتے تھے، کسی طرح مسلمان باور کرنے کیلئے تیار نہ تھے، اور مدرسہ دینیہ اور مولانا ابوالحسن صاحبؒ کا براہ راست تعلق جمعیۃ علماء ہند سے تھا، پھر غازی پور کے بریلوی جو مسلم لیگی بھی تھے، تشدد کی دو وجہیں ان میں جمع تھیں، کیسے اس مدرسہ کو برداشت کر لیتے، لیکن مولانا ابوالحسن صاحب اپنے مسلک اور وضع کے پُختہ تھے، اپنے چند رفقاء کار کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے، ان کے رفقاء مولانا محمد اسلم صاحب علیہ الرحمہ، مولانا مشتاق احمد صاحب علیہ الرحمہ اور مولوی مولیٰ بخش انصاری صاحب علیہ الرحمہ اور چند دوسرے حضرات تھے، مخالفتیں ہوتی رہیں، رکاوٹیں ڈالی جاتی رہیں، مدرسہ دینیہ کبھی پھیلتا، کبھی سمٹتا، یہ چھوٹی سی جگہ میں کام کرتا رہا، اسے بدنام کیا جاتا، دشواریاں بہت تھیں، مگر مولیٰ صاحب! مدرسہ دینیہ کے ساتھ وابستہ رہے۔

اس کے لئے دیہات مارے مارے پھرے، اس کے چندے کے

چندے کیلئے مختلف شہروں میں گئے۔ ان کو علماءِ دیوبند سے محبت تھی، مسلکِ حق سے عشق تھا۔ ان کا ظاہر وباطن یکساں تھا۔ جو دل میں ہوتا، وہی زبان پر ہوتا، مدرسہ دینیہ کو سمجھتے تھے کہ یہاں سے مسلکِ حق کی اشاعت ہوگی۔ اسی کے واسطے سے علماء حق کی آمدورفت رہے گی، اس لئے وہ سب کچھ قربان کرکے، اپنے ننگ وناموس سے بے نیاز ہوکر اس میں لگے رہے، اور یہ سب کام وہ محض اللہ کے واسطے کرتے رہے، ناموری کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا، کہ رضا کار سپاہی، گمنام ہی ہوا کرتا ہے، مدرسہ کے واسطے سے انھوں نے کوئی مالی منفعت بھی نہیں حاصل کی۔

ہندوستان کی آزادی سے پہلے اور اس کے بعد مدرسہ کی مخالفت شدت سے ہوتی رہی، اس میں کچھ اور اسباب کا بھی دخل تھا۔ مدرسہ محدود پیمانے پر چلتا رہا۔ پھر غالباً ۱۹۶۶ء میں مولانا ابوالحسن صاحب علیہ الرحمہ کا انتقال ہوگیا، اب اس کے اہتمام کی ذمہ داری ان کے جواں سال اور حوصلہ مند فرزند جناب عزیزالحسن صاحب صدیقی کے ہاتھوں میں آئی، عزیز صاحب کی نصرت سب سے زیادہ مولیٰ صاحب نے کی، انھیں باپ جیسی شفقت سے نوازا، عزیز صاحب کا تعارف خود غازی پور میں نہ تھا۔ اس کے قرب وجوار میں، قریبی اضلاع اور شہروں میں نہ تھا، مولیٰ صاحب انھیں ساتھ لئے ہر جگہ پھرے، غازی پور میں، بنارس میں، مئو میں، کوپاگنج میں، ہر جگہ ان کو متعارف کرایا۔ ماشاء اللہ خود عزیز صاحب میں ذاتی لیاقت وصلاحیت، قومی وملی ہمدردی، خدمتِ خلق کی لگن اور ترقی کی استعداد بہت تھی، وہ جمعیۃ علماء کے مخلص کارکن تھے، غازی پور میں جمعیۃ علماء کی سرگرمیاں ان کے دم سے نہ صرف زندہ رہیں، بلکہ بہت حد تک ان میں اضافہ ہوا۔ مدرسہ جمعیۃ علما کی چھاؤنی بن گیا۔ لیگ کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ بریلویت بھی آپس میں الجھ کر ننگی ہو رہی تھی۔ اب مدرسہ دینیہ کے لئے میدان صاف ہو رہا تھا۔ عزیز صاحب کی حوصلہ مندی اور تیز گامی نے

بہت جلد مدرسہ کو شہر اور قرب وجوار کے لئے مرکزِ توجہ بنادیا۔ عزیز صاحب مدرسہ کی ترقی کے لئے نئے نئے پروگرام بناتے، اور ان کو رُو بعمل لاتے رہے، ان کی ان اسکیموں میں جس شخص نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مناسب مشورے دیئے، ہر ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا۔ ان کی طرف سے دفاع کیا، وہ یہی بوڑھا سپاہی تھا۔ انھیں کسی کسی مسئلے میں عزیز صاحب سے اختلاف بھی ہوتا، مگر اپنی رائے پر ہمیشہ عزیز صاحب کی رائے کو غالب رکھتے، وہ چاہتے تھے کہ غازی پور میں دین اور علم دین کا کام آگے بڑھتا رہے اس کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ کھڑی ہو۔ ان کو اس سلسلے میں اتنی لگن تھی کہ ان کے صاحبزادے مولانا ابوبکر صاحب جب دیوبند میں زیر تعلیم تھے، اس وقت پروگرام بنا کہ رمضان شریف میں چندہ کیلئے کسی کو بمبئی بھیجا جائے، طے ہوا کہ مولانا حکیم بشیرالدین صاحب کوپاگنجی علیہ الرحمہ، جو مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے خلیفہ تھے، اور ہمدرد میں بحیثیت حکیم ملازم تھے، انھیں بمبئی بھیجا جائے، اور ان کے ساتھ کوئی اور بھی جائے، مولیٰ صاحب نے دیوبند میں مولانا ابوبکر صاحب کے پاس لکھا کہ تم امتحان کے بعد غازی پور نہ آؤ، وہیں سے بمبئی چلے جاؤ۔ صاحبزادے نے لکھا کہ سال بھر گھر سے باہر رہا ہوں، اب تو گھر آنے کو جی چاہتا ہے۔ بمبئی چلا جاؤں تو پورا رمضان بھی باہر ہی گزر جائے گا۔ صاحبِ عزیمت باپ نے جواب دیا کہ بیٹے! دین کے کام کیلئے قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے، تم گھر نہ آؤ، وہیں سے بمبئی چلے جاؤ۔ چنانچہ نوجوان بیٹا وہیں سے مدرسہ کے کام کے لئے بمبئی چلا گیا۔

۱۳۹۳ھ میں عزیز صاحب کی دعوت پر میں مدرسہ دینیہ پہونچا، اس وقت مدرسہ میں پرائمری کی تعلیم کے علاوہ چند بچے درجۂ حفظ میں اور اس سے کم، درجاتِ عربی میں تھے، مجھ سے پہلے کوپاگنج کے ایک مدرس تھے، وہ اس سال مستعفی ہوکر چلے

گئے تھے۔ مولانا مشتاق احمد صاحب صدر مدرس تھے، ان کی انتظامی مصروفیات زیادہ تھیں، ایک مدرس مولوی جلال الدین صاحب درجۂ فارسی کے استاذ تھے، مولانا ابوبکر صاحب مدرس ہوکر ڈابھیل جا چکے تھے، درجۂ حفظ میں ایک استاذ حافظ محمد الیاس صاحب تھے۔ میں پہونچا، تو عربی درجات شرح جامی تک تھے، مگر کسی درجہ میں دو تین طالب علم سے زیادہ نہ تھے۔ مدرسہ کی مالی حالت اب کچھ اچھی ہو رہی تھی، میرے دوست حاجی عبد الاحد صاحب معروفی ناظمِ مالیات تھے، وہ بڑی جد وجہد اور لگن کے ساتھ فراہمیٔ مال میں لگے ہوئے تھے، مدرسہ کے مہتمم، صدر مدرس اور مولیٰ صاحب نے میرے اوپر بہت اعتماد کیا، بحمد اللہ اسی سال طلبہ کی تعداد بڑھ گئی۔ تعلیم کا معیار بلند ہوا۔ دوسرے سال عربی پنجم کی جماعت تیار ہوئی، وہ آٹھ دس طلبہ پر مشتمل تھی، اور طلبہ جب دیوبند پہونچے تو مدرسہ دینیہ کا ایک معیار قائم ہوا۔ میں نے چار سال مدرسہ کی خدمت کی، مولیٰ صاحب روزانہ مدرسہ میں تشریف لاتے، بیٹھتے، مشورے دیتے، حوصلہ بڑھاتے، محبت کرتے، ان کا ہم لوگوں کو انتظار رہتا۔

میرے پہونچنے کے دو سال کے بعد عزیز صاحب نے مدرسہ دینیہ میں فضلاء مدارس کے لئے ایک تربیت گاہ کا منصوبہ بنایا، جس میں نئے فارغین کو تعلیم وتدریس اور تبلیغ کے لئے تربیت کر کے تیار کیا جائے۔ منصوبہ بڑا مشکل تھا۔ اس کے لئے جیسی شخصیت کی ضرورت تھی، اس کا دستیاب ہونا آسان نہ تھا۔ طلبہ کو پڑھا لینا تو آسان ہے، مگر علماء کو تربیت دینا بہت دشوار ہے۔ اس کے لئے کسی عظیم شخصیت کی ضرورت تھی، اور اس کا تلاش کرنا گویا عنقا کو تلاش کرنا تھا۔ لیکن عزیز صاحب کی حوصلہ مندیوں اور عزائم کے سامنے یہ رکاوٹیں، یہ دشواریاں کچھ بھی نہ تھیں، ان کا کندھا اتنا مضبوط تھا کہ اس پر ہر بار ہلکا معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے ''دائرۃ التربیت'' کے نام سے اس کا آغاز کر دیا۔ اس کے لئے آدمی کی ضرورت ہوئی، تو ایک بہت ذہین وفطین اور صاحب علم ومطالعہ شخصیت جناب قاری شبیر احمد صاحب در بھنگوی کا انتخاب ہوا۔ ان سے میری گہری دوستی دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ میں قائم ہو چکی تھی۔ میرے آنے کے بعد وہ ایک مرتبہ غازی پور تشریف بھی لا چکے تھے، عزیز صاحب، اور مولیٰ صاحب کی ان سے خوب ملاقات تھی، دونوں ان کی صلاحیتوں کے، وسعتِ مطالعہ اور وفور علم کے معترف ومداح تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ قاری صاحب گو کہ نابینا ہیں، لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث فردِ فرید ہیں۔ چنانچہ ان کو بلایا گیا، وہ تشریف لائے، میرا معاملہ قاری صاحب کے ساتھ ایک جان دو قالب کا تو تھا ہی اس ایک جان میں ایک اور جان ضم ہوئی، وہ تھی مولیٰ صاحب کی جان! مولیٰ صاحب ہر پروگرام میں شریک رہتے، اپنی نجی باتوں میں بھی مشورے لیتے۔ اہل محبت کی ایک پوری جماعت اکٹھا ہو گئی تھی۔ سب ایک دوسرے پر اعتماد کرتے تھے، ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے، عزیز صاحب حالانکہ مہتمم تھے، مدرسہ کے سربراہ تھے، مگر وہ ہمیشہ دوستوں کی طرح رہے، عہدہ اور منصب کا شاید انھیں کبھی خیال بھی نہ آتا تھا۔ یہی کیفیت مولانا مشتاق احمد صاحب کی بھی تھی، مولیٰ صاحب کا تو کوئی عہدہ نہ تھا، بس وہ کچھ نہ تھے مگر سب کچھ تھے، ان کے بغیر ہر ایک میں کمی محسوس ہوتی تھی، وہ نہ ہوں، تو مجلس سونی لگتی تھی۔ ان کا نام کسی منصب پر نہ تھا، مگر کام ہر جگہ تھا۔

جب انتخاب کا ان دونوں میں سوال آیا   تو ہم نے کام لیا اور نام چھوڑ دیا

''دائرۃ التربیت'' تو ایک خواب تھا۔ اس خواب میں قاری صاحب کو تشریف لانا تھا، وہ آئے، اور ایک ہی سال میں وہ خواب بکھر گیا، لیکن اس کی تعبیر قاری صاحب کی صورت میں قائم رہ گئی۔ اب مدرسہ ترقی کر رہا تھا، عزیز صاحب نے اپنی حوصلہ مندی سے بنارس کمشنری کے اضلاع کے مدارسِ عربیہ پر مشتمل ایک وفاق قائم کیا۔ جس کے ماتحت بنارس، جونپور، غازی پور، بلیا کے عربی مدارس کو یکجا کیا گیا۔

اجتماعی امتحان کا نظم کیا گیا۔ اس کے خوشگوار نتائج بھی نکلے، مدرسہ کی شہرت عام ہوئی، اسے مرکزیت حاصل ہوئی، اساتذہ میں اضافہ ہوا۔ طلبہ کی تعداد بڑھی، محفل جمتی چلی گئی۔

ابھی یہ محفل جمی ہی تھی کہ ایک شدید تقاضے کے تحت مجھے الہ آباد جانا پڑا۔ الہ آباد میں بھی میرے چار سال گزرے، مگر میں جسمانی طور پر وہاں تھا، اور میرے قلب وروح کا مرکزِ نگاہ غازی پور تھا۔ اس دوران نظامتِ تعلیم کی ذمہ داری میرے اوپر رہی۔ اور میں ہر دوتین ماہ پر غازی پور آتا تھا۔ اب یہاں اساتذہ میں اور بھی کچھ مخلصین جمع ہوگئے تھے۔ مولانا عبد الرب صاحب اعظمی، مولانا صفی الرحمٰن صاحب قاسمی دربھنگوی، مولانا حبیب اللہ صاحب قاسمی مدھوبنی، مولیٰ صاحب ان سب پر محبت کی شبنم چھڑکتے رہے، چار سال کے بعد میری واپسی ہوئی، اب مدرسہ خاصا ترقی کر چکا تھا۔ مدرسہ دینیہ کی پُرانی عمارت طلبہ واساتذہ کے لئے تنگ پڑ رہی تھی، عزیز صاحب کی جدجہد سے دریائے گنگا کے عین ساحل پر ایک پُرانی وسیع و عریض بلڈنگ میاں پورہ میں وقف ہوئی۔ یہ بلڈنگ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کی تھی جو مشہور قومی رہنما ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاریؒ کے داماد تھے، ڈاکٹر انصاری مرحوم کی بھتیجی زہرہ بیگم ان کی رفیقۂ حیات تھیں، زہرہ بیگم نے تمام ورثہ کی اجازت سے اسے مدرسہ دینیہ کے نام وقف کر دیا۔ مدرسہ میں وقف ہونے کے بعد اس کا نام شوکت منزل رکھ دیا گیا۔ اب عربی شعبہ شوکت منزل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں مدرسہ دینیہ کو تعلیمی اعتبار سے بڑا عروج حاصل ہوا۔ یوپی کے اضلاع مشرقی مدارس میں اس کا خاص وقار قائم ہوا۔ بڑے اچھے اچھے طلبہ یہاں سے تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند گئے۔ اور آج ان میں سے بہتیرے تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کی فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔

ان ایام میں مولیٰ صاحب کی قلبی خوشی اور مسرت قابلِ دید رہتی تھی، وہ ہر وقت ہشاش بشاش رہتے تھے۔ ان کی دلی مراد پوری ہو رہی تھی، مدرسہ میں طلبہ کو پڑھتے اور اساتذہ کو پڑھاتے دیکھ کر ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہتا، وہ اس وقت بڑھاپے میں جوان نظر آتے تھے وہ دین کے باب میں بڑے مخلص تھے۔

یہ سلسلہ چار سال پھر متواتر قائم رہا۔ مگر اس ماحول کو پانچویں سال میں نظر لگ گئی کچھ غلط فہمیاں، کچھ بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ مولیٰ صاحب کو اس کا بڑا دکھ ہوا تھا انھوں نے بہت کوشش کی کہ بدگمانیاں دور ہو جائیں۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوئے، مدرسہ کے مہتمم کی طبیعت کچھ بدلی بدلی محسوس ہوئی۔ مجھے ایسے لگا کہ مجھ سے دوری بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اگر مدرسہ دینیہ میں رہنے پر اصرار کرتا تو بدمزگی کا دائرہ پھیلتا، میرا ذہنی طور پر عرصہ سے، جب سے میں نے تدریس کے لئے مدرسہ میں قدم رکھا ہے، یہ عہد ہے کہ نزاع کسی سے نہیں کرنی ہے، خواہ اس کے لئے عزت وجاہ اور راحت وآرام کی کتنی ہی قربانی دینی پڑے۔ مولیٰ صاحب اور دوسرے احباب و مخلصین مجھے بہت روکتے رہے، مگر میں نے پانچواں سال پورا کر کے مدرسہ دینیہ سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ میری علیٰحدگی کا صدمہ مولیٰ صاحب کو بہت ہوا۔ مگر وہ بھی مجبور تھے، اب ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے، میرے ہٹنے کے بعد کے بعد مدرسہ دینیہ میں بکھراؤ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ عزیز صاحب نے اس بکھراؤ کو بہت روکنا چاہا مگر وہ قابو نہ پا سکے، مولانا عبد الرب صاحب بھی چلے گئے۔ تاہم مولیٰ صاحب کو تسلی تھی کہ قاری شبیر احمد صاحب اور مولانا صفی الرحمٰن صاحب موجود ہیں۔ لیکن طلبہ کی تعداد کم ہوگئی، تو انھوں نے حفظ کا بھی ایک درجہ شوکت منزل میں منتقل کر دیا۔ مگر دھاگا ٹوٹ چکا تھا، دانے بکھر رہے تھے۔ تین چار سال کے اندر قاری شبیر احمد صاحب اور مولانا صفی الرحمٰن صاحب بھی علیٰحدہ ہو گئے۔ حاجی عبد الاحد صاحب بھی

معذور ہو کر خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اب نئے لوگ آ گئے، مگر مدرسہ کی بہار نہ لوٹ سکی، مولیٰ صاحب شکستہ دل ہو گئے۔ تاہم ان کو عزیز صاحب سے قلبی محبت تھی۔ جگری لگاؤ تھا۔ وہ ان کے ساتھ لگے رہے۔

پھر وہ صاحبِ فراش ہو گئے، اور تقریباً چھ سال تک فرشِ علالت سے نہیں اٹھے، میرا دل مدرسہ دینیہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اسے جوڑنے کی کوشش کی، چنانچہ اسی جذبہ سے متعدد بار وہاں حاضری دی، مگر نہیں جُڑ سکا۔ ہاں مولیٰ صاحب کی خدمت میں حاضری ہوتی رہی، وہ معذور ہو چکے تھے، کمزوری بیحد تھی، اٹھنے بیٹھنے سے بالکل مجبور تھے، مگر دل و دماغ تازہ تھے، پہونچ جاتا تو خوش ہوتے، بہت سی باتیں ہوتیں، مگر مدرسہ دینیہ کے موضوع پر ہم لوگ کبھی بات نہ کرتے کہ یہ میرے بھی دل کا زخم تھا، اور ان کے دل کا بھی!

انھوں نے وصیت کی تھی کہ میں مرجاؤں تو میرے غسل کا سارا کام مولانا عبدالرب صاحب کی نگرانی میں انجام دیا جائے اور جنازہ کی نماز یہ خاکسار پڑھائے یہ بات انھوں نے بار بار دہرائی تھے۔ اور انھیں ہم سے ہم کو ان سے جو محبت تھی، اس پس منظر میں یہ وصیت کچھ انوکھی نہ تھی۔ مگر ان کا انتقال ہوا، اور نہ مجھے اطلاع مل سکی، اور نہ مولانا عبدالرب صاحب کو۔ ان کا انتقال جمعہ کی شب میں ہوا۔ بعد نماز جمعہ جنازہ کی نماز ہوئی، اور اپنے آبائی قبرستان کٹھولیا میں دفن ہوئے، سنیچر کے روز مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کے استاذ اور میرے عزیز مولوی حافظ عزیز الحق سلّمہٗ مدرسہ آئے، میں نے انھیں مئو مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی کی خدمت میں بھیجا تھا، وہ جمعہ کو گئے تھے، انھوں نے آ کر بتایا کہ مولانا سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ غازی پور گئے تھے، مولانا ابوبکر صاحب کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ ان کے جنازہ میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے، عزیز موصوف نے تو یہ خبر سرسری طور پر سنا دی، مگر میرا پورا وجود جھنجھنا اٹھا۔ دل پر بجلی سی گر پڑی، سب کاموں سے دل اچاٹ ہو گیا، اسی وقت ایک گاڑی منگوائی، اور اسے لے کر جہانا گنج گیا۔ مولانا عبدالرب صاحب جہانا گنج کے باہر ایک زمین کی احاطہ بندی میں مصروف تھے، وہ بھی بے خبر تھے، انھیں اطلاع دی، وہ سمجھے کہ میں جنازہ میں شرکت کے لئے جا رہا ہوں۔ مگر جب میں نے بتایا کہ وہ تو دفن بھی ہو چکے تو انھیں بھی شدید جھٹکا لگا۔ پھر نہ گھر گئے، نہ انھوں نے کپڑے تبدیل کئے، جس حالت میں تھے، گاڑی پر بیٹھ گئے۔ اور ہم لوگ مولیٰ صاحب کے گھر پر حاضر ہوئے، مولانا ابوبکر صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ بہت معذرت کرتے رہے کہ ٹیلیفون سے اطلاع کی کوشش کی گئی، مگر کامیابی نہ ملی۔ اللہ کی جو مشیت تھی پوری ہوئی۔ ان کے لئے بہت دعائے مغفرت کی، ایصالِ ثواب کیا، وفات کی چوٹ دل پر لئے ہوئے واپس آئے، ان کے دل میں محبت کا سمندر تھا، ان کی محبت کا چراغ ہمیشہ ہمارے دلوں میں جلتا رہے گا۔ رہے نام اللہ کا

مدرسہ دینیہ غازی پور سے میرا پرانا ربط ہے، وہاں میری طاقت اور امنگوں کے ۱۳ر سال بیتے ہیں۔ اس کا ذکر آ گیا تو بے اختیار داستان پھیلتی چلی گئی، اور میں نے یہ جانا کہ مدرسہ دینیہ کا تذکرہ درحقیقت مولیٰ صاحب ہی کا تذکرہ ہے۔ ہم لوگوں کے وہاں سے جانے کا مولیٰ صاحب کو بہت قلق تھا۔ انھیں محسوس ہوتا تھا کہ مدرسہ کی روح نکل گئی، اور اب تو حالات نے تصدیق کر دی کہ واقعی جو اس کی اصل روح تھی، جس پر اس کی اساس تھی، وہ نکل گئی۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مدرسہ دینیہ تعلیم و تدریس کے اعتبار سے، فکر و خیال کے لحاظ سے، اسلوب و انداز کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کا پیرو بلکہ مبلغ تھا، جمعیۃ علماء کی چھاؤنی تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کے نہ جانے کتنے منصوبے مدرسہ دینیہ میں بنے ہیں، مولانا سید احمد ہاشمی صاحب کی تربیت کا آغاز یہیں سے ہوا۔ اور بالآخر وہ جمعیۃ

علماء ہند کی نظامت علیا تک پہونچے، خود جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی عرصہ تک مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے ممبر رہے، عزیز صاحب جمعیۃ کی شناخت بن گئے تھے، اور جمعیۃ ان کی علامت! وہ خود ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ ایک صاحب کے گھر ان کا جانا کسی ضرورت سے ہوا۔ ان کے ساتھ ایک دو آدمی اور تھے، ان صاحب کے بچے کو گھر میں بھیجا کہ ابا کو بلا دو، صاحبِ خانہ گھر سے ہنستے ہوئے نکلے، اور کہنے لگے کہ بچے نے گھر میں جا کر آپ لوگوں کا جو تعارف کرایا، وہ عجیب ہے، اور صاحبان کو تو جو کہا وہ کہا، عزیز صاحب کے بارے میں اس نے کہا کہ اور جمعیۃ علماء آئے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ دار العلوم دیو بند اور جمعیۃ علماء ہند کے لئے عزیز صاحب کے دل میں ایسا ہی جذبۂ فنائیت تھا، یہ دونوں ادارے تو خیر ادارے ہیں، خود مولانا اسعد مدنی صاحب کی ذات سے ایسا والہانہ تعلق تھا کہ میں گو کہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کا بے انتہا معتقد ہوں، لیکن مولانا اسعد صاحب کے حق میں عزیز صاحب کی حد تک کبھی نہ پہونچ سکا۔

اس لحاظ سے مشرقی یوپی میں مبارک پور کا جامعہ عربیہ احیاء العلوم، جہاں میری تعلیم وتربیت ہوئی ہے اور غازی پور کا مدرسہ دینیہ جہاں میری تدریس وتعلیم کے تعلق کے ۱۳؍سال بسر ہوئے ہیں۔ تقریباً مماثل تھے، دونوں دار العلوم دیو بند کے نقیب، دونوں جمعیۃ علماء ہند کی چھاؤنی!

لیکن جس مدرسہ کا یہ حال رہا ہو، اس کا مسلک ومشرب اتنا واضح اور نمایاں رہا ہو، اور یہی اس کا امتیاز واختصاص رہا ہو، کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ اب وہی مدرسہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ضمیمہ بن گیا ہے، اور اس کا مہتمم جمعیۃ کے کیمپ سے اٹھ کر رابطہ کمیٹی کے اسٹیج پر پہونچ گیا ہے، جو فکر وعمل کے اعتبار سے جمعیۃ سے بہت دور اور جماعتِ اسلامی سے ہم آغوش ہے۔ وفاداریاں تبدیل ہوگئیں، صرف اشخاص سے نہیں، دکھ کی بات یہ ہے کہ نظریۂ وعقیدہ میں تبدیلی کا احساس ہو رہا ہے، اشخاص وافراد سے تعلق ٹوٹتا جڑتا رہے، یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے، لیکن فکر ونظر سے بھی وفاداری تبدیل ہو جائے، یہ بات حیرت کی ہے وہ بھی جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی کے حق میں۔

بہر حال جو ہونا تھا ہوا۔ اور ایسے وقت میں ہوا کہ مولیٰ صاحب بسترِ علالت پر تھے، بے بس تھے، ذہن ودماغ پر نسیان اور فراموشی کا غلبہ تھا۔ اور اب دنیا سے چلے بھی گئے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور مدرسہ دینیہ کے حال پر رحم فرمائے، ساتھ ہی جامعہ عربیہ احیاء العلوم بھی سخت دعاؤں کا محتاج ہے، کیونکہ وہ بھی ایسی انتظامیہ کے نرغے میں ہے، جس کو شاید اس کی تعمیر سے زیادہ تخریب سے دلچسپی ہے،

مولیٰ صاحب بڑے جذبے اور لگن بلکہ دُھن کے آدمی تھے، ابتداء میں ان کو ماحول دیندارانہ مل گیا تھا، ان کی زبان سے میں اکثر حکیم محمد یوسف صاحب غازی پوری کا ذکر سنا کرتا تھا، ان کی گفتگو سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ طبیب ہونے کے ساتھ صاحب علم اور مخلص متدین شخص تھے، ان کی محبت سے وہ بہت متاثر تھے، بڑی عقیدت سے ان کا ذکر کرتے تھے، ان کے علاوہ اور بھی کچھ علماء کا نام لیا کرتے تھے، جن کے نام میرے حافظے میں محفوظ نہیں ہیں۔ ان حضرات کی صحبت میں انھیں دین سے محبت پیدا ہوئی، خود دیندار تھے، اپنے باصلاحیت بیٹے مولانا ابو بکر صاحب کو دینی تعلیم اس زمانے میں دلوائی، جب وہ سخت تنگدستی اور غربت کا شکار تھے، پہلے حفظ کرایا، پھر عربی تعلیم دلوائی۔ مولانا موصوف بتا رہے تھے کہ جب وہ مبارکپور میں زیرِ تعلیم تھے، تو والد صاحب کی تنگدستی اور پھر عزیمت کا عالم یہ تھا کہ مئو تک تو کسی سواری سے پہونچتے، اور وہاں سے حالانکہ مبارکپور تک کا کرایہ ۱۲؍آنے یعنی ۷۵؍ پیسے سے زیادہ نہ تھا، مگر اس خیال سے کہ وہ پیسے بچیں اور مولانا کے خرچ کے لئے

دئے جاسکیں، وہ مئو سے مبارکپور تقریباً چالیس بیالیس رکلومیٹر سائیکل سے جایا کرتے تھے۔

غازی پور میں شیعوں کی تعداد بھی خاصی ہے، ان کی شرارتوں کے ردعمل میں اہلِ سنت بھی سرگرم عمل رہتے تھے، اس سلسلے میں مولیٰ صاحب بھی ہمیشہ پیش پیش رہے، امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی علیہ الرحمہ غازی پور تشریف لاتے، ان کی تشریف آوری میں مولیٰ صاحب کا نمایاں حصہ ہوتا۔ ردِّ شیعیت ہی کے جذبے کا اثر تھا کہ انھوں نے اپنے بڑے بیٹے کا نام محمد فاروق اور چھوٹے بیٹے کا نام ابوبکر رکھا، اور اسی وقت یہ بھی تجویز کرلیا تھا کہ ان کی اولادوں کے نام وہی رکھیں گے جو حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے بیٹوں کے نام تھے، چنانچہ فاروق بھائی کے یہاں فرزند پیدا ہوا، تو اس کا نام عبداللہ رکھا۔ جو ماشاء اللہ عالمِ دین ہیں اور مولانا ابوبکر صاحب کے یہاں فرزند پیدا ہوا تو اس کا نام عبدالرحمٰن رکھا،

مولیٰ صاحب کے جذبۂ دینداری کا اثر تھا کہ وہ وقت کے مشہور شیخ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی خدمت میں پہونچے، اور ان کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے حضرت مولانا کو ایک بار خط لکھا، اور اپنے کچھ احوال ذکر کئے۔ منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی لکھی کہ مجھے رسمی پیری مریدی سے بہت وحشت ہے۔ مولانا نے اس پر لکیر کھینچ کر.......... جیسا کہ ان کا دستور تھا.......... لکھا ”الحمد للہ“ اس بات سے میں بہت متاثر ہوا۔ میں جانتا تھا کہ مولانا پیری مریدی کرتے ہیں، میں سوچتا تھا کہ مولانا اس پر ناراض ہوں گے۔ مگر جب مولانا نے اس پر الحمدللہ لکھا تو میرے دل میں ان سے بڑی عقیدت پیدا ہوئی، اور میں انتظام کر کے فتح پور ان کی خانقاہ میں پہونچا، حضرت سے اپنا تعارف کرایا، حضرت سے بیعت کی درخواست کی، جو قبول ہوئی۔ حضرت نے پوچھا کہ یہاں قیام کے بارے میں کیا ارادہ ہے، میں نے عرض کیا کہ حضرت گھر کہہ آیا ہوں کہ شام تک لوٹ آؤں گا۔ آپ نے فرمایا کہ جو وعدہ کیا جاتا ہے، اسے پورا کیا جاتا ہے، جاؤ۔

مولیٰ صاحب کہتے ہیں کہ میں ہونے کو تو بیعت ہوگیا، اور حضرت نے کچھ پڑھنے کے لئے بھی بتادیا، مگر مجھ پر اور میرے دل پر اس وقت کوئی اثر معلوم نہیں ہوا میں سوچتا تھا کہ میرا دل کتنا پتھر ہے کہ اتنے بڑے شیخِ طریقت کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میرا دل ذرا بھی نرم نہیں ہوا۔ فتح پور سے کوپا گنج تک پیدل آنا تھا۔ جیسے ہی آبادی سے باہر نکلا، دل کا رنگ بدلا۔ بے اختیار اس میں ایک گداز پیدا ہوا، پہلے ضبط کیا۔ مگر قابو نہ ملا۔ آنکھیں برسنے لگیں، اور گھر تک چلا آیا، مگر آنسوؤں کی بوچھار کم نہ ہوئی۔ کئی روز تک یہی کیفیت رہی۔ دل دُھل دُھلا کر بے غبار ہوگیا۔ جیسے گرد آلود فضا میں موسلا دھار بارش ہوتی ہے، اور فضا بالکل صاف وشفاف ہوجاتی ہے۔

اس کے بعد سے مولیٰ صاحب کی دینی زندگی میں بڑی استقامت پیدا ہوگئی، سحر خیزی لازمۂ زندگی بن گئی۔ جماعت کی نماز کا اہتمام قابل رشک تھا، علی الصباح تلاوت کی پابندی کرتے تھے، کبھی کبھی کہا کرتے کہ جب تلاوت کے ذوق میں کبھی کمی آجاتی ہے تو حضرت شاہ صاحبؒ کے رسالہ ”تلاوت قرآن“ کا مطالعہ کرلیتا ہوں، پھر ذوق ہفتوں تازہ رہتا ہے۔

مولیٰ صاحب کو کتابوں، بالخصوص دینی کتابوں کے مطالعہ کا خاص ذوق تھا، اکثر کتابوں کے مطالعہ میں مستغرق رہا کرتے تھے۔ غازی پور میں ان کی ایک چھوٹی سی دکان تھی، اس میں بھی بیٹھے کتابیں پڑھا کرتے، ان کے اس ذوق سے دکانداری کو نقصان ہوتا، مگر وہ اپنے حال میں مست تھے۔

دہلی سے ایک پرچہ ”مولوی“ نکلا کرتا تھا۔ پچیس برس تک اس کے خریدار

رہے، اس میں دینی مضامین کے علاوہ زیادہ تر دینی کتابوں کے اشتہار رہا کرتے تھے، مولیٰ صاحب، اپنی وسعت کے مطابق دینی کتابیں پڑھا کرتے، ان کا حافظہ بھی اچھا تھا، بڑھاپے میں تو تمام اعضاء کی طرح وہ بھی کمزوری کا شکار ہو گیا تھا۔ مگر جوانی اور کہولت میں کافی اچھا تھا۔ دینی معلومات خوب ہو گئے تھے۔ ایک دن علماء کے ایک حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس میں حکیم محمد یوسف صاحب بھی تھے، معلومات اور مطالعہ کی بات چل پڑی۔ حکیم صاحب مرحوم نے فرمایا کہ مولیٰ بخش نے مولوی پرچہ کا عرصۂ دراز تک مطالعہ کیا ہے، اور ان کو دینی علم وافر مقدار میں حاصل ہو چکا ہے۔ اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ انھیں مولوی کا لقب دیا جائے، تمام حاضرینِ مجلس نے اس کی بخوشی تائید کی۔ اس دن سے ان کے لئے مولوی کا لقب تجویز ہوا۔

ایک زمانے میں مومن انصار تحریک کا بڑا عروج تھا۔ مولیٰ صاحب اپنے مزاج کے مطابق اس میں بھی نمایاں حصہ لیتے رہے۔ تحریک کے مشہور رہنما جناب عبدالقیوم صاحب انصاری کے دست راست رہے، لیکن بعد میں ان پر کچھ ایسی افتادیں پڑیں کی بالکل یکسو ہو گئے تھے۔

مولیٰ صاحب عملی انسان تھے، زندگی کے کسی مرحلے میں ان پر سستی اور ناکارگی نہیں آئی۔ تنگدست ضرور رہے، اور اس لئے رہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور اوقات کو قوم وملت کے مفاد میں جھونکتے رہتے تھے، لیکن بہت غیور تھے، کسی خدمت کی منفعت انھوں نے نہ چاہی اور نہ قبول کی۔ کم سہی، ضرورت کے بقدر نہ سہی، لیکن اپنے ہاتھوں کے کسب سے گھر کا کام چلاتے رہے۔ وہ کپڑا سینا خوب جانتے تھے، اس کی تراش خراش سے بخوبی واقف تھے، شیروانی کے بہترین کاریگر تھے، بہت عمدہ سیتے تھے، اگر چاہتے تو اس راہ سے بہت کچھ کمائی کرتے، مگر ان چیزوں کو بطور مقصد

انھوں نے کبھی نہیں برتا۔

مولیٰ صاحب کی طبیعت میں عجلت تھی، جس کام کا منصوبہ بناتے، اسے جلد سے جلد انجام دینے کی کوشش کرتے، راستہ تیز چلتے، باتیں تیز کرتے، سائیکل تیز چلاتے، غرض ان کے ہر کام میں تیزی نمایاں رہتی۔ البتہ نماز اطمینان سے پڑھتے۔

معصوم ذات صرف انبیاء کرام **علیھم السلام** کی ہے۔ ان کے علاوہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی معصومیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ انسان عموماً غلطیوں کا پُتلا ہوتا ہے، لیکن اگر اس کے دل کا حال درست ہے، جذبہ اور نیت راہِ راست پر ہے، تو غلطیاں ہلکی ہو جاتی ہیں۔ اور اسے ان کا احساس جلد ہو جاتا ہے، ان سے نکلنے کی توفیق بھی میسر آجاتی ہے۔ مولیٰ صاحب کا قلبی حال جیسا کہ برسہا برس کی معیت ورفاقت سے ظاہر ہوا۔ بہت اچھا تھا۔ وہ اللہ کے لئے، اللہ کے دین کے لئے مخلص تھے، اس کے لئے انھوں نے بہت سے دنیاوی نقصانات سہے تھے، ان پر کبھی کبھی اعتراض ہوتا تھا۔ کبھی ان کی عاجلانہ طبیعت کی وجہ سے، اور کبھی کسی اور وجہ سے، لیکن یہ بات بلاشبہ تھی، کہ ان کی طبیعت میں کھوٹ نہ تھا۔ نفاق کی پالیسی سے وہ بہت دور تھے، جو کچھ صحیح جانا، اسے مضبوط پکڑا، اور اس میں کسی کی پرواہ نہیں کی۔ جس سے ناراض ہوئے، کھل کر ناراض ہوئے، اور جس سے راضی ہوئے علی الاعلان ہوئے۔ مزاج میں بہت سادگی تھی، ہمیشہ موٹا جھوٹا کپڑا پہنا، عموماً مارکین کا کرتا اور پاجامہ پہنتے اور اسی کی ٹوپی بھی ہوتی، جوانی میں شیروانی بھی پہنتے تھے، لیکن میں نے کبھی ان کے بدن پر نہیں دیکھی۔ چند برس کے عرصہ میں وہ کئی مرتبہ گرے، ایک مرتبہ گھر میں کچھ صفائی کررہے تھے، کہ اسٹول سے گر گئے۔ کوئی ہڈی مضروب ہوگئی، عرصہ تک صاحبِ فراش رہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب نہ اٹھیں گے، مگر ماشاء اللہ پھر اٹھ گئے اور پھر وہی چستی اور تیزی لوٹ آئی، ایک مرتبہ دوٹرکوں کے درمیان سائیکل سے

تیزی سے گزرنا چاہتے تھے کہ ٹکرا گئے اور بہت زیادہ چوٹ آ گئی، غالباً اس موقع پر بھی پر کوئی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ پھر بہت دنوں تک نہ اٹھ سکے۔ لوگ کہتے تھے کی بڑھاپے کی چوٹ ہے، اب نہ اٹھ سکیں گے۔ مگر اللہ نے فضل کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

اِدھر پانچ چھ برس کے عرصے میں بڑھاپے کے ضعف نے بستر پر ڈال دیا تھا۔ بظاہر کچھ زیادہ تکلیف نہ تھی، مگر ضعف گھلاتا چلا جا رہا تھا۔ مولانا ابوبکر صاحب اس دوران مستقل ان کی خدمت میں حاضر رہے، اور بڑی جانفشانی کے ساتھ ان کی خدمت کی، ایسے مریضوں کی تیمارداری، جو اٹھنے، بیٹھنے اور حوائجِ ضروریہ میں بھی دوسرے کے محتاج ہو کر رہ جائیں، بہت مشکل امر ہے۔ مولانا موصوف نے یہ بے نظیر خدمت انجام دی اور ان کے ساتھ ان کے بیٹے، بھتیجے اور بھائی بھی شریک رہے بوڑھے، معذور باپ کی خدمت بڑی سعادت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت انھیں بخشی۔

ان کا نام ان کے والدین نے مولیٰ بخش تجویز کیا تھا۔ یہ ایک نیک فال ہے، انھیں مولیٰ، بخش دے گا۔ انشاء اللہ

اے اللہ! آپ بوڑھوں، کمزوروں پر رحم فرماتے ہیں۔ آپ کے اس بندے نے معذوری کا ایک طویل زمانہ صبر و شکر کے ساتھ بسر کیا ہے، آپ اس کے ساتھ رحم و کرم اور بخشش کا معاملہ فرمائیے، اور ان سے راضی ہو جائیے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ

نقوش و تأثرات

وفات: ۱۴؍جولائی ۱۹۹۶ء

قاضی اطہر صاحب کی وفات ہوگئی۔ علماء و صلحاء کے ایک جم غفیر نے ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ ان کیلئے دعائے مغفرت کی پھر ان کو قبر میں اتارا۔ جو ایک مومن کیلئے جنت میں پہونچنے کا پہلا دروازہ ہے، ان کا جسد عنصری بستر خاک پر زمین کی چادر اوڑھ کر سو گیا، اور ان کی روح؟! کیا عجب کہ حق تعالیٰ کی مہربانیوں نے، اس کے استقبال کیلئے، ان لوگوں کی روحوں کو بھیج دیا ہو، جنھیں زمانے نے بھلا دیا تھا۔ مدتوں کے بعد قاضی جی نے انھیں یاد کیا، وہ ماضی کی اندھیری وادیوں میں گم ہو گئے تھے، قاضی جی نے ان کا پتہ ڈھونڈ نکالا۔ تاریخ ان کے حق میں گونگی ہو رہی تھی، قاضی جی نے اسے زبان عطا کی، ان میں صحابہ بھی ہیں، تابعین بھی ہیں، تبع تابعین بھی ہیں، امراء و سلاطین بھی ہیں، مشائخ و صالحین بھی ہیں، غزاۃ و مجاہدین بھی ہیں، فقہاء و محدثین بھی ہیں۔ لیکن یہ سب گمنام ہو چکے تھے، انھیں پہچاننے والا کوئی نہ تھا، ان کے جسم زمین میں مدفون تھے اور ان کے ناموں اور کارناموں کے پُرزے پُرزے بکھر کر تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں دب گئے تھے، قاضی جی نے ان بوسیدہ اوراق کو جمع کیا، جہاں جہاں ان ناموں کی خوشبو ملی، وہاں وہاں پہونچے، ان کے کارناموں کو دبی دبائی تاریخ سے نکالا اور انھیں روشنی میں لائے، عرب و ہند کے تعلقات دور

قدیم سے ہیں، اجمالاً اتنا سب جانتے ہیں، لیکن ان کی تفصیلات کیا ہیں؟ ہندوستان سے عرب کون پہونچا، عرب سے ہندوستان کون لوگ آئے! تعلقات کس کس نوعیت کے رہے؟ ان کے اثرات ایک دوسرے پر کیا کیا مرتب ہوئے، اس کی عہد بعہد تفصیلی داستان قاضی جی نے اللہ جانے کہاں کہاں سے اکٹھا کی؟ کس طرح انھوں نے تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کی جستجو کی، پھر انھیں کس جانکاہی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کیا، عہد رسالت سے عہد بنوعباس تک کتنے گمشدہ اوراق تھے، جنھیں انھوں نے ڈھونڈھا، انھیں پڑھا، پھر انھیں مرتب کیا، تاریخ کا تسلسل جو ٹوٹ ٹوٹ جا رہا تھا، اسے کیسے کیسے جوڑا؟ سچ پوچھئے تو انھوں نے کئی صدیوں کو زندہ کیا، ناموروں کا تو سب نام لیتے ہیں، لیکن جو بے نام ونشان ہو چکے تھے، قاضی صاحب ان کی تلاش میں نکلے، اور بقول مرحوم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نوراللہ مرقدہٗ:

> ’’قاضی صاحب اس بے آب وگیاہ صحراء میں تنہا چلے، اور جب لوٹے تو باغ وبہار کا پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے‘‘

تو جن بزرگوں کو انھوں نے علم وتحقیق کی روشنی میں پایا، اور ان کے ناموں کو انھوں نے زندہ کیا۔ خدائے مہربان کے لطف وکرم سے امید تو یہی ہے کہ ان بزرگوں نے بڑھ کر قاضی جی کا استقبال کیا ہوگا۔ ان کے مرحبا اور خوش آمدید سے قاضی صاحب جھوم اٹھے ہوں گے کہ دنیا میں جو خون جگر جلایا تھا۔ مغز دماغ کو پگھلایا تھا، جوانی ہی میں آنکھوں کی روشنی بڑی حد تک کھوئی تھی اور زندگی کے تعیش کو ٹھکرایا تھا آج اس کا ’’اجر غیر ممنون‘‘ مل رہا ہے، جن ناموں کو انھوں نے تلاش کیا تھا، آج ان شخصیتوں کے درمیان رضوان خداوندی سے نہال ہو رہے ہوں گے، یا اللہ آپ کے فضل سے ہم یہی امید رکھتے ہیں، بیشک آپ ہی امیدوں اور آرزوؤں کے ملجا وماویٰ ہیں۔

قاضی جی ابھی کل تک ہمارے درمیان میں تھے، اپنی علمی وتحقیقی شخصیت کے ساتھ اپنے باغ وبہار وجود کے ساتھ! وہ بڑے تھے، بہت بڑے تھے، مگر اپنے چھوٹوں سے بہت محبت کرتے تھے، انھیں شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، انھیں پڑھنے لکھنے کی تاکید کرتے تھے، جب وہ تھے، تو انھیں ڈھونڈھنا نہیں پڑتا تھا، وہ بڑی آسانی سے مل جاتے تھے، جب چاہتے تھے، ان سے ملاقات ہو جاتی، جو پوچھنا ہوتا ان سے پوچھ لیتے، اور وہ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے بتا دیتے، وہ اپنے گھر میں دستیاب تھے، وہ جلسوں اور مجمعوں میں دستیاب تھے، انھیں ہم لوگ تشریف لانے کی زحمت دیتے تو بڑی بشاشت سے قبول کرتے، اور بغیر کسی عذر اور بغیر کسی شرط کے آتے، ان کا مل جانا ہم چھوٹوں کیلئے کتنا آسان تھا۔ لیکن اب ان کی تلاش ہو رہی ہے، تو بھی نہیں ملتے، ان کی کتابیں ملتی ہیں۔ ان کے مقالات ومضامین ملتے ہیں۔ ان کی یاد ملتی ہے، لیکن خود قاضی صاحب کہاں ہیں؟ وہ تو ان روحانیوں میں پہونچ گئے ہیں، جن کی تلاش میں وہ ماضی کے اندھیروں میں علم وجستجو کی شمع جلا کر نکلے تھے، شمع تو اب بھی روشن ہے، لیکن شمع کا روشن کرنے والا انھیں روحانیوں میں شامل ہو گیا۔

نہیں! میں انھیں اپنے حافظے میں تلاش کر رہا ہوں۔ اپنے ذہن ودماغ میں ڈھونڈتا ہوں، انسان کا وجود ناسوتی یا وجود خارجی ختم ہو جاتا ہے، لیکن اس کا وہ وجود جو ذہنوں میں سمایا ہوا ہوتا ہے وہ باقی رہتا ہے۔ جب تک وہ ذہن ودماغ میں موجود ہے، اس کے پردوں پر جگمگاتا ہوا وہ وجود باقی ہے۔ قاضی اطہر صاحب میرے ذہن ودماغ میں موجود ہیں، جب سے ذہن کو شعور وآگہی حاصل ہوئی، میں انھیں جانتا ہوں، قاضی صاحب سے شناسائی اتنی ہی پرانی ہے، جتنی اپنے شعور وادراک سے!

قاضی جی اس وقت بمبئی رہتے تھے، وہ ہمارے علاقے کے رہنے والے تھے

، مبارکپور ہمارے گاؤں سے کل ۹ رکلومیٹر کے فاصلے پر ہے، یہ فاصلہ ہی کیا ہے؟ تاہم اس فاصلے کو بھی باہمی قرابت داریوں نے باقی ہی کب رہنے دیا ہے؟ پس قاضی صاحب گویا ہمارے گھرانے ہی کے ایک فرد تھے، میرا شعور جب بیدار ہونا شروع ہوا تو اپنے اطراف میں اپنے گاؤں میں، جن لوگوں کا نام بار بار سننے میں آیا، ان میں ایک نام قاضی جی کا بھی تھا۔ اور یہ نام بطور خاص اسلئے بھی آتا تھا کہ کچھ ہی مدت پہلے گاؤں میں کسی مسجد کیلئے چندے کا زور وشور تھا، اس وقت چندے کا یہ طور بن گیا تھا کہ اس کیلئے ولولہ انگیز ترغیبی نظمیں لکھی جاتیں اور کچھ لوگ انھیں خوش الحانی سے پڑھتے، جس کے گھر چندہ ہوتا، اس کا نام بھی اس نظم میں آتا، کافی مجمع ساتھ ہوتا، اس طرح رقم کی فراہمی میں بڑی آسانی ہوتی۔

بعض اوقات نظم پڑھنے والے پارٹیوں میں تقسیم ہوجاتے، اس طرح مسابقہ کی ایک صورت ہوجاتی، یہ پارٹیاں اپنے اپنے پسندیدہ شعراء سے رابطہ رکھتیں، اور ہر روز تازہ نظمیں لکھوا کر پیش کرتیں، ہمارے یہاں بھی دو پارٹیاں ہوگئی تھیں، ایک پاٹی استاذ محترم حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مبارکپوریؒ اور حضرت مولانا قاضی اطہر صاحبؒ سے رابطہ رکھتی، اور دوسری پارٹی مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی املویؒ سے تعلق رکھتی، میرے والد صاحب اس وقت شاعری کرتے تھے، مولانا آزاد رحمانی کے ساتھ والد صاحب کی بھی نظمیں ہوا کرتی تھیں، اس تقریب سے بار بار قاضی جی کا ذکر گھر میں آتا تھا۔ واقفیت کی بنیاد تو یہیں سے پڑی۔

پھر جب حروف شناسی کا وقت آیا اور مجھے ہر لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کا جنون طاری ہوا، تو گھر میں موجود میں کاغذات اور کتابوں کو ہمہ وقت الٹتا پلٹتا رہتا، اس وقت ایک چھوٹا سا رسالہ ''افادات حسن بصری'' کے نام سے ملا۔ یہ قاضی جی کی پہلی تحریر تھی جسے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، میں نے اپنی بساط بھر اسے بار بار پڑھا، حضرت حسن بصریؒ سے تو عقیدت ہوئی ہی، قاضی جی بھی دل میں گھر کر گئے۔ اس وقت قاضی جی بمبئی سے ماہنامہ ''البلاغ'' نکالا کرتے تھے، والد صاحب اس کے خریدار تھے، اس میں ان کا مضمون ''مطالعات وتعلیقات'' کے عنوان سے پابندی سے شائع ہوا کرتا تھا، اس میں قاضی جی اپنا حاصل مطالعہ اور اس کے نتائج بڑے دلآویز انداز سے لکھا کرتے تھے، ''البلاغ'' کا مجھے شدت سے انتظار رہتا، اور ہاتھ میں آتے ہی، پہلے وہی مضمون پڑھتا۔

اسی دوران قاضی صاحب کی عربی تصنیف ''رجال السند والهند'' چھپ کر آئی۔ والد صاحب حالانکہ عربی تعلیم پائے ہوئے نہیں تھے، لیکن قاضی جی کے نام کی وجہ سے، اس کتاب کو گھر لائے، نئی چھپی ہوئی کتاب! میں دیکھتے ہی فریفتہ ہوگیا، میں اس وقت مکتب میں پڑھتا تھا، عربی کیا سمجھتا، مگر دیر دیر تک اس کتاب کو ہاتھ میں لئے الٹتا پلٹتا رہتا، قاضی جی کے نام کو غور سے دیکھا کرتا، اسی وقت میں نے والد صاحب سے پوچھا تھا کہ قاضی کیا چیز ہے؟ اور کیا ان کا نام صرف اطہر ہے؟ یہ سوال اسلئے کیا تھا کہ ہمارے عرف میں اس طرح کے ناموں کے اول و آخر میں محمد یا احمد لگا ہوا ہوتا ہے، والد صاحب نے بتایا کہ ان کا نام عبدالحفیظ ہے، اطہر ان کا تخلص ہے، لیکن یہ تخلص اتنا مشہور ہوا کہ لوگ نام کو بھول گئے۔ بعد میں قاضی جی نے شاعری چھوڑ بھی دی تھی، مگر تخلص نے اصل نام کی جگہ لے لی۔

بیچارے حسرت موہانی کا نام فضل الحسن تھا، مگر وہ حسرت کے نام سے ایسا مشہور ہوئے کہ انھیں خود کہنا پڑا،

؎

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے
کوئی کہتا ہی نہیں **فضل الحسن**

کچھ یہی حال قاضی صاحب کا ہوا۔ مبارکپوری بھی گویا نام کا جز بن گیا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ آدمی جب بڑا اور مشہور ہوجاتا ہے، تو اس کے نام کے ساتھ اس کا

وطن بھی شہرت پا جاتا ہے۔

عربی کی اس کتاب نے قاضی جی کی عظمت میرے دل میں کئی گنا بڑھا دی، یہ کتاب اتنی مدت تک عقیدت کے ساتھ میرے ہاتھ میں رہی کہ اب تک اس کا سراپا میری آنکھوں میں بسا ہوا ہے۔

۱۹۶۴ء (۱۳۸۴ھ) میں مجھے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں پہونچا دیا گیا۔ چند ماہ گزرے تھے کہ مدرسہ میں ایک صاحب نظر آئے۔ قدرے پستہ قامت، رنگ سانولا، ہلکے بادامی رنگ کی شیروانی زیب تن اور اسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی سر پر، گلے میں ہلکے تولیہ جیسا رومال، آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ، بدن خوب معطر، فضا میں خوشبو بکھیرتے ہوئے تیزی سے چلے آرہے ہیں، انھیں دیکھ کر ایک طرف سے ناظم مدرسہ مولانا عبدالباری صاحبؒ اٹھ رہے ہین، دوسری طرف سے کچھ اساتذہ اور طلبہ بھی ان کی طرف لپکے جارہے ہیں، وہ ہر ایک کو مسکرا کر سلام کررہے ہیں، یا سلام کا جواب دے رہے ہیں، مصافحہ کررہے ہیں، خیریت پوچھ رہے ہیں، میری عمر اس وقت ۱۳/سال سے کچھ متجاوز تھی، بچوں میں میرا شمار تھا میں نے ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ بتایا کہ قاضی اطہر صاحب ہیں۔ میرے ذہن میں ''افادات حسن بصری'' ''البلاغ'' اور ''رجال السند والہند'' کے صفحات جگمگانے لگے، میں نے دیکھا کہ اتنی بڑی شخصیت ہونے کے باوجود کسی کو ان سے ملنے میں جھجھک نہیں محسوس ہوتی اور نہ ان کو کسی سے سلام اور مصافحہ کرنے میں کوئی تکلف ہوتا، میں ڈرا سہا تھا۔ ذرا ہمت ہوئی تو میں بھی آگے بڑھا، اور مصافحہ کرنے کیلئے ہاتھ بڑھایا، قاضی صاحب نے بڑے التفات سے جواب دیا اور ہاتھ کی پوری گرفت کے ساتھ مصافحہ کیا اور فرمایا یغفر اللہ لنا ولکم، مجھ سے کہا کہ تم بھی کہو، پھر پوچھا مزاج شریف؟ میں نے آہستہ سے کوئی جواب دیا، فرمایا کہو الحمدللہ پھر دیکھتا ہوں کہ جو بھی طالب علم ان سے ملتا ہے اس کو یہی کلمات تلقین کرتے ہیں، اس کی خیریت دریافت کرتے ہیں، اور اس کے لئے ازراہ تفنن مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں، کسی سے کہتے ہیں مزاج شریف! کسی سے پوچھتے ہیں مزاج معلیٰ! کسی سے فرماتے ہیں مزاج مبارک! گفتگو ذرا جلدی جلدی کرتے ہیں، باتوں باتوں میں آداب ملاقات سکھاتے جاتے ہیں، سلام خوب کرتے ہیں، بات کرکے ہٹتے ہیں، تو سلام کرکے ہٹتے ہیں، کچھ دور جاکر کوئی بات یاد آتی ہے اور پلٹ کر آتے ہیں تو پہلے پورا سلام کرتے ہیں، تب جو بات کہنی ہے، کہتے ہیں، وہ طالب علموں کو سلام کا عادی بناتے تھے، ان سے ملاقات کے بعد پہلا سبق یہی حاصل ہوا۔

بمبئی سے وطن تشریف لاتے تھے تو ایک ماہ یا اس سے زیادہ قیام کرتے تھے، اس دوران اگر سفر نہ ہوتا، تو روزانہ ایک دو دفعہ مدرسہ میں ضرور تشریف لاتے، حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب علیہ الرحمہ ان کے استاذ تھے، ان کی خدمت میں بڑے احترام سے حاضر ہوتے، بمبئی سے ان کے لئے کوئی ہدیہ لاتے، اکثر عمدہ قسم کا قلم لاتے، مفتی صاحب بہت خوش ہوتے۔

ایک بار ان کے آنے پر مفتی صاحب نے بعض اساتذہ اور طلبہ کو اپنے کمرے میں بلالیا، غالبًا قاضی صاحب اس وقت حج کے سفر سے لوٹے تھے، ساتھ میں ان کے بڑے صاحبزادے مولانا خالد کمال بھی تھے، وہ اس وقت مدینہ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، اساتذہ میں کیا باتیں ہوئیں، صف نعال میں بیٹھنے والا طالب علم کیا جان سکتا ہے لیکن دیکھا کہ قاضی صاحب کھڑے ہوکر خطبہ پڑھ رہے ہیں، اس کے بعد کچھ فرمانے لگے، قاضی جی کی آواز بلند نہ تھی، ذرا تیز رفتاری سے بولتے تھے، اسلئے بہت غور سے کان لگانا پڑتا تھا، وہ طلبہ کو خطاب کررہے تھے کہ عربی لکھنا اور بولنا سیکھو، اب دنیا کے مختلف ممالک کے تعلقات بڑھ رہے ہیں، دنیا سمٹتی جارہی ہے عالم

عرب قریب آتا جارہا ہے ، ہمارے مدارس میں عربی زبان دین کو سمجھنے کیلئے اور پڑھانے کے لائق بننے کے لئے ضرور حاصل کی جاتی ہے ۔ لیکن لکھنے اور بولنے کی مزاولت نہیں ہوتی ، اس کی کوشش کرو ۔ قاضی صاحب میں ظرافت بھی تھی ، وہ رودادِ سفر سنا رہے تھے ، اسی میں انھوں نے موجودہ عربی انداز گفتگو کو بھی ذکر کیا ۔ پہلی مرتبہ انھیں کی زبان سے سننے میں آیا کہ اہل عرب نے تکلم میں زبان کو اس حد تک بدل دیا ہے کہ انھیں **أقول لک** کہنا ہوتا ہے ، تو **أگل لک** کہتے ہیں ، اور یہ سنایا کہ بعض قبائل ’’کاف‘‘ کا تکلم ’’چ‘‘ سے کرتے ہیں ، حرم میں متعدد لوگوں کو سنا کہ وہ لبیک کہنے کے بجائے **لبیچ اللھم لبیچ** کہتے ہیں ، ہم لوگ اس پر خوب ہنستے تھے ، مولانا خالد کمال نے سنایا کہ عربی بولنے کی مشق نہیں ہوتی ہے ، تو کیسی کیسی مضحکہ خیز غلطیاں ہوتی ہیں ، اس کا نمونہ وہاں ظاہر ہوا ۔ مولانا مودودی مدینہ یونیورسٹی تشریف لے گئے ، ان کی کتابوں کے عربی ترجمے اس وقت ہوچکے تھے ، اور ان کی شہرت پھیل رہی تھی ، بعض عرب طلبہ ان سے ملنے آئے ، تو کسی نے ان سے پوچھ دیا کہ شیخ آپ کب تشریف لائے ، تو انھیں کہنا تھا کہ **جئتُ أمس** ، میں کل آیا ، تو فرماتے ہیں کہ **جئتُ غداً** ، **غداً** آنے والے کل کو کہتے ہیں ، طلبہ بے ساختہ مسکرا پڑے ، یہ دونوں حضرات زور دے رہے تھے کہ عربی بولنے اور لکھنے کی مشق کرو

میرے دل میں یہ بات جم گئی ، چنانچہ میں نے اس کیلئے باقاعدہ کوشش کرنی چاہی ، مگر مدرسہ میں اس وقت جو ماحول تھا اس میں اس کوشش کے آگے بڑھنے اور اس کے نشو ونما پانے کے سامان نہ تھے ، میرے جی میں بار بار یہ بات آئی کہ میں ان سے استفادہ کروں ، مگر میں اتنا چھوٹا اور حقیر تھا کہ جی کی بات جی میں ہی رہ گئی ۔ نہ کبھی ان سے کہنے کی ہمت ہوئی اور نہ کسی اور سے ! میں نے اپنے طور پر محنت کی ٹھان لی ۔ عربی سوم کا سال جس میں کافیہ قدوری وغیرہ کتابیں ہوتی ہیں ، تو یونہی

سوچتے سوچتے گزر گیا ۔ اس کے بعد دوسرے سال مقامات حریری درس میں تھی ، اس سال عربیت کا سودا دل میں پورے طور پر سما چکا تھا ۔ قاضی صاحب بمبئی سے تشریف لائے ، تو میں ہمت کرکے ان کے گھر پہونچ گیا ، اور ان سے اپنے شوق کا اظہار کیا ۔ قاضی صاحب بہت خوش ہوئے ، انھوں نے بہت حوصلہ افزائی کی ، بڑی بشاشت سے فرمایا کہ فجر کے بعد مقامات حریری لے کر آجاؤ ، میں اسے خاص طور سے پڑھادوں گا ، ایک ماہ کے قریب ان کا قیام تھا ، میں ہر روز فجر کی نماز کے بعد کتاب لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتا ، کتاب کا کچھ حصہ میں مدرسہ میں پڑھ چکا تھا ۔ مگر انھوں نے ابتداء سے پڑھانا شروع کیا ، اور بالکل نئے انداز سے ، وہ ایک لفظ کا معنیٰ بتاتے ، پھر اس کے مترادفات بتاتے ، ان مترادفات میں اگر کوئی لطیف اور دقیق فرق ہوتا ، تو اسے ذکر کرتے پھر اس لفظ کے اصول وفروع بیان کرتے ، اس سے الفاظ کی جتنی شاخیں نکلتیں وہ بتاتے ، ان کا محل استعمال بتاتے ، جہاں جہاں معنیٰ میں تبدیلی ہوتی ، اسے ذکر کرتے ، اس کے اضداد کو بتاتے ، غرض اس لفظ کی پوری نسل اور اس کے متعلقات کو تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ، ہر ایک کا مفہوم سمجھاتے ، محل استعمال بتاتے ، آدھ گھنٹہ میں بمشکل دوسطر سبق ہوتا ، میرا حافظہ بحمد اللہ اچھا تھا ، اور مناسبت بھی خوب تھی ، ان کا لفظ لفظ یاد ہوجاتا ، کم وبیش ایک ماہ سبق کا یہ سلسلہ چلا ، اس کا ایک بڑا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ نئے انداز سے مطالعہ کرنے کا سلیقہ آگیا ۔ میں نے عربی لغات کی آٹھ ، دس کتابیں قدیم وجدید جمع کرلیں ، اور ایک ایک لفظ کو ہر ہر لغت میں مفصل دیکھتا ، اس طرح الفاظ وتعبیرات کا ایک بڑا ذخیرہ میرے ذہن میں محفوظ ہوگیا ۔

قاضی صاحب کے اس ایک ماہ کے درس نے اور ان کی علمی گفتگو نے علم و تحقیق کی کئی نئی راہیں دکھائیں ، ذہن ودماغ میں وسعت پیدا ہوئی ، اگر میں انھیں

راہوں پر چلتا رہتا، تو شاید عربی زبان کے ماہروں میں میرا بھی شمار ہو جاتا، اور علمی تحقیقات کی دنیا میں پچھلی صفوں میں شاید میری بھی جگہ نکل آتی، مگر میں تو دوسری ہی راہ پر نکل گیا، اب میں نرا مدرس ہوں، یا کچھ تھوڑا بہت وعظ کہہ لیتا ہوں، اور باقی کچھ یاد نہ رہا۔

میرے اس تلمذ نے مجھے قاضی صاحب سے قریب کر دیا۔ دوسرے سال جب وہ تشریف لائے تو کچھ پڑھنے کی نوبت تو نہ آئی، مگر گاہے گاہے، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتا تھا۔

قاضی صاحب کتابوں کے بڑے عاشق تھے، بڑے اہتمام اور حفاظت سے کتابیں رکھتے، ہر کتاب کی جلد پر بانسی کاغذ چڑھا ہوا ہوتا، انھیں بند الماریوں میں محفوظ رکھتے، جن میں ہمیشہ قفل لگا رہتا، مشہور تھا کہ وہ اپنی کتابیں نہ کسی کو مطالعہ کیلئے لے جانے دیتے، نہ کسی کو چھونے دیتے، واقعی اگر کوئی کتابوں کی حفاظت کرنا چاہے، تو اس کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا، ناگزیر ہے، ورنہ کتابیں بڑی آسانی سے سرقہ (چوری) ہو جاتی ہیں، اور کتنے ستم ظریف شاید اسے گناہ بھی نہیں سمجھتے، بہرحال قاضی صاحب اپنی کتابوں کی بڑی حفاظت کرتے تھے، وہ کبھی کبھی بتاتے تھے کہ انھوں نے کس محنت و مشقت کے ساتھ غربت و افلاس کے دور میں ایک ایک پیسہ جوڑ کر یہ سرمایہ جمع کیا ہے، انھوں نے اس کی داستان اپنی خود نوشت آپ بیتی ’’قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک‘‘ میں تحریر فرما دی ہے، کچھ تو ان کا فطری ذوق تھا اور کچھ یہ محنت و مشقت کی کمائی تھی، جان سے بڑھ کر کتابوں کی حفاظت کرتے تھے۔ بعض اہل علم ان کی کتابوں سے استفادہ کرنے آتے، تو انھیں وہیں بیٹھ کر مطالعہ کی اجازت ہوتی، اس کمرے سے باہر کتاب لے جانے کی گنجائش ہرگز نہ ہوتی۔

مجھے جب ذرا قرب ہوا، اور قاضی صاحب نے میرے شوق مطالعہ کو دیکھا، تو بعض کتابیں از خود الماری سے نکال کر عطا فرماتے، بعض اہم کتابوں کی نشاندہی کرتے، تو انھیں مدرسہ کے کتب خانے سے نکال کر پڑھتا، فقہ اللغہ ثعالبی کی، اور کتاب الاضداد ابن بشار انباری کی، اسی زمانے میں، انھوں نے مطالعہ کیلئے عطا فرمائی تھی، اس کے علاوہ بہت سے عربی جرائد و مجلّات، جو ان کے یہاں بکثرت آیا کرتے تھے، اور بعض کتابیں، جن کے نسخے ان کے یہاں زائد تھے، انھوں نے عطا فرمائے۔ اس وقت طلبہ کی انجمن **جمعية الطلبه** کا کتب خانہ میرے انتظام میں تھا، وہ رسائل اور وہ کتابیں میں نے اس کتب خانہ میں داخل کر دی تھیں، کتابوں کے سلسلے میں قاضی صاحب کو جتنا سخت اور کھردرا لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا، مجھے اس سے سابقہ نہیں پڑا، ویسے میں اس سلسلہ میں محتاط ہی رہتا تھا، یوں بھی مجھے سوال کرنے میں حجاب بہت ہے، انتظار ہی کرتا رہتا ہوں، قاضی صاحب نے کتابوں کے سلسلے میں جو مہربانی فرمائی، از خود فرمائی، میں نے شاید کبھی کوئی کتاب ان سے مانگی نہیں، طبیعت کا اب بھی یہی رنگ ہے۔

مبارکپور سے میں دارالعلوم دیوبند چلا گیا، اس کے بعد قاضی صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ عرصہ تک بند رہا، چار پانچ سال کے بعد جب میں غازیپور مدرسہ دینیہ میں بصیغۂ مدرسی پہونچا تو پھر اس سلسلہ کی تجدید ہوئی، قاضی صاحب اسی شفقت و عنایت سے پیش آتے رہے، پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ بمبئی ترک کر کے مستقلاً مبارکپور میں مقیم ہو گئے، تو اطراف و نواح کے جلسوں، اور مدرسوں میں بار بار ملاقات کے مواقع ملے، خود مدرسہ دینیہ میں جب کوئی جلسہ یا تقریب ہوتی تو قاضی صاحب ضرور بلائے جاتے، ان کی کرم نوازی کی ایک مثال یاد آ رہی ہے۔

ایک بار خیرآباد میں جلسہ تھا، صدارت حضرت قاضی صاحب کی طے تھی، قاضی صاحب وعدہ کے نہایت پابند تھے، جب کسی بات کا وعدہ کر لیتے، تو اسے ضرور

پورا کرتے، عین جلسہ کے دن ان کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی، مگر تشریف لائے، جلسہ کے اسٹیج پر بھی آئے اور آتے ہی اعلان کر دیا کہ میرے بجائے اس جلسہ کے صدر عزیزم مولوی اعجاز احمد ہوں گے، میں معذرت کرنی چاہی، تو فرمایا کہ چھوٹوں کو چاہئے کہ بڑوں کے سامنے کام کرنا سیکھ لیں۔

وعدہ کی پابندی کا ذکر آیا، تو یہ بھی عرض کر دوں کہ وہ خطوط کے جواب بھی پابندی سے دیتے تھے، ایسا کبھی تجربہ نہیں ہوا کہ، انھوں نے خط کا جواب نہ دیا ہو، ایک دن فرمانے لگے کی مولوی خط کا جواب دینے میں کوتاہ ہوتا ہے، لیکن خط کا جواب بھی اخلاقی ذمہ داری ہے، جیسے سلام کا جواب دینا ضروری ہے، کوئی مخاطب ہو تو اس کی بات سننا اور اس کا مناسب جواب دینا اخلاقی فریضہ ہے، اسی طرح خطوط کے جواب تحریر کرنا بھی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں طلبہ نے اپنی انجمن کا جلسہ طے کیا، اس کی صدارت کیلئے کسی عالم کو بلانا زیرِ غور تھا۔ میری تجویز پر بچوں نے قاضی صاحب کو دعوت دینی طے کی، ایک طالب علم دعوت نامہ لے کر ان کے گھر گیا، قاضی صاحب طلبہ سے بہت خوش رہتے تھے، دعوت قبول کی جلسے کے دن تشریف لائے، صدارت فرمائی، طلبہ کی تقریریں سنیں، ان کی جرأت گفتار، بے ساختہ انداز تقریر، تنوع موضوعات اور ان کے حسن انتظام سے بہت متاثر ہوئے، کھل کر بچوں کی اور مدرسہ کے اساتذہ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ مدرسہ کے حق میں چند کلمات تحریر فرما دیں، فرمایا ضرور لکھوں گا، مگر گھر پر جا کر اطمینان سے لکھ کر ڈاک سے بھیج دوں گا، میں نے عرض کیا کہ ڈاک کا لفافہ پتہ لکھ کر آپ کے بیگ میں ڈال دوں، فرمایا نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں لکھ کر بھیج دوں گا، مجھے اندیشہ تھا کہ گھر جا کر دوسری علمی مشغولیتوں میں کہیں ذہول نہ ہو جائے، لیکن مزید کچھ عرض کرنا گستاخی سمجھا، اسلئے خاموش رہا، مگر شاید دس دن نہیں گزرے تھے کہ قاضی صاحب کی تحریر ڈاک سے آپہونچی، قاضی صاحب محقق عالم تھے، معائنہ کی تحریریں عموماً سرسری اور رسمی ہوتی ہیں، لیکن قاضی جی نے اس غیر علمی مضمون کو علم و تحقیق کے گل بوٹوں سے مزین کر دیا ہے۔

قاضی صاحب کو ان کا علم بڑا مستحضر تھا، اک ذرا چھیڑیئے، پھر دیکھئے کہ سطحِ سمندر جو ساکن تھی، اچانک اس میں کیسا تموج پیدا ہوتا ہے، شیخوپور میں تشریف فرما تھے، کسی نے اس علاقے کی تاریخ کے متعلق کچھ سوال کر دیا، پھر جو قاضی صاحب نے معلومات کے موتی بکھیرنے شروع کئے، تو سننے والوں کو حیرت ہوگئی، میں نے عرض کیا کہ آپ نے گویا ہر جگہ کی ایک ایک اینٹ الٹ کر دیکھی ہے، اور اس سلسلے میں معلومات کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔

قاضی صاحب حقیقی معنوں میں صاحب تحقیق تھے، وہ بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اور اپنے کام کی باتیں چن لیا کرتے تھے، وہ فن کی بنیادی کتابوں پر نگاہ رکھتے تھے، کثرت مطالعہ اور ذوق تحقیق نے ان میں ایسا ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ کارآمد اور زائد باتیں خود بخود ممتاز ہوتی چلی جاتیں۔ ان کی کتابیں پڑھئے تو ان کی دیدہ ریزی، اور کدوکاوش نیز وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، وہ ایسی جگہوں سے اپنے مطلب کی بات اخذ کرتے ہیں، جہاں تک عام ذہنوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ قاضی صاحب کی آخری تصنیف ”خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت“ ہے اصل کتاب ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی تصنیف کے لئے تقریباً سو کتابوں سے کام لیا گیا ہے، اور کوئی کتاب کمتر درجے کی نہیں ہے سب اعلیٰ سطح کی کتابیں ہیں، قاضی صاحب نے علم و تحقیق کا ایک معیار قائم کیا، اور اس سے نیچے کبھی نہیں اترے، سہولت پسندی کا ان کے یہاں گزر نہ تھا، کم درجے

کے حوالے پر وہ راضی نہ ہوتے تھے، اس لئے ان کی کتابیں، خود مرجع و مصدر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

قاضی صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز طلب علم سے کیا، اور اس کا اختتام بھی اسی پر ہوا، پوری زندگی طلب علم میں مصروف رہے اور ساتھ ہی نشر علم میں بھی لگے رہے، انتقال سے ایک آدھ روز پہلے ان کی مختصر تصنیف ''خواتین اسلام'' پریس سے آئی تھی، وہ طالب علموں کو اس کی ترغیب بھی دیتے رہتے تھے، اور اسی جذبہ سے انھوں نے اپنی طالب علمانہ زندگی کی داستان ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں جمع کی ہے، کہ ایک معمولی بچہ ناسازگار ماحول اور ناخوشگوار حالات میں گھرا ہوا تھا، مگر اپنی غیر معمولی محنت و مشقت کی بدولت وہ نہ صرف کامیاب و بامراد نکلا، بلکہ دوسروں کے لئے مشعل راہ بن گیا۔

قاضی جی کی ہمیشہ یہ خواہش رہا کرتی تھی کہ علماء کی نئی نسل پڑھنے لکھنے اور علم و تحقیق میں لگی رہے، کسی کے بارے میں انھیں معلوم ہوتا کہ اس نے کوئی تحقیقی یا تصنیفی کام کیا ہے، یا کسی ایسے کام کا اس کا ارادہ ہے، تو اس کی بہت حوصلہ افزائی فرماتے مشورے دیتے، اس کے پیچھے اس کی تعریفیں کرتے، میرے دوستوں میں مولانا عبد الرب صاحب اعظمی، جو قصبہ جہانا گنج کے رہنے والے ہیں، قاضی صاحب کو اس قصبہ سے خاص تعلق تھا، یہاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے، وہ برابر مولانا عبدالرب صاحب کو کچھ لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

میں نے تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد تدریس کے میدان میں قدم رکھا، تو اس کیلئے بالکل یکسو ہوگیا، تصنیف و تالیف اور تحریر و انشاء سے مجھے نہ پہلے کوئی مناسبت تھی نہ اب ہے، اس لئے اس کی طرف نہ کبھی التفات ہوا، اور نہ کبھی اس کا قصد کیا، بارہ چودہ سال تک بجز ایک دو رسالوں کے اور کچھ نہیں لکھا، اس کے بعد کسی تقاضے کے تحت کبھی کبھی کچھ لکھنا پڑا، قاضی صاحب ملتے تو ضرور پوچھتے کہ کچھ لکھ رہے ہو یا نہیں؟ میں عذر کرتا کہ تدریس کی مشغولیت میں لکھنے کا موقع نہیں ملتا، وہ تدریس کی تحسین کرتے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرماتے کہ ابھی جوان ہو، یہی محنت کا زمانہ ہے، دونوں کاموں کو جمع کر سکتے ہو، بڑھاپے میں کچھ نہ ہو سکے گا، تدریس کے ساتھ کچھ نہ کچھ تصنیف کا بھی سلسلہ رکھو۔

قصبہ بھتری ضلع غازی پور میں جمعیۃ علماء کی ایک کانفرنس تھی، اس میں قاضی صاحب تشریف لائے تھے، میرے ساتھ ایک ذی استعداد نوجوان عالم بھی تھے، جو مدرسہ دینیہ میں اس وقت مدرس تھے، قاضی صاحب سے ان کا تعارف ہوا، وہ ایک دن قاضی صاحب کے ساتھ رہے، انھوں نے اندازہ کرلیا کہ یہ عالم باصلاحیت ہیں، کسی وقت ان کو دیکھا کہ وہ ذکر بالجہر میں مشغول ہیں، قاضی صاحب نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ زمانہ علم میں پختگی پیدا کرنے اور مطالعہ میں انہماک کا ہے، ان سے کہو کہ تحقیق و مطالعہ کا اہتمام کریں، انھوں نے ذکر کی نفی نہیں کی، لیکن ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اس انہماک میں کہیں علم سے نہ رہ جائیں۔

ایک بار مجھ سے انھوں نے اپنے ذوق و مزاج کے مطابق، لیکن ذرا زور دے کر پوچھا کہ آج کل کچھ لکھ رہے ہو؟ میں قاضی صاحب کی مہربانیوں کی وجہ سے کچھ گستاخ سا ہوگیا تھا، اس کے جواب میں، میں نے ایسی بات کہہ دی، جو مجھے نہیں کہنی چاہئے تھی، اب بھی سوچتا ہوں، تو ضمیر ملامت کرتا ہے، میں نے بے تکلفی میں کہہ دیا کہ جی لکھ رہا ہوں، پوچھا کہ کیا؟ میں نے عرض کیا کہ خطوط! اس وقت میں طلبا کی تعلیم و تربیت سے متعلق بکثرت خطوط لکھا کرتا تھا، بعض طلبہ کچھ اشکالات لکھ لکھ کر بھیجتے تھے، ان کے جواب خاصے مفصل دیا کرتا تھا، وہی بات پیش نظر تھی اور میں نے کہہ دی، ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا، فرمایا یہ کیا چیز ہے؟ میں یہی پوچھتا ہوں؟

کوئی علمی و تصنیفی کام کرو، محنت سے بچنے کے لئے یہ سب حیلے بہانے ہیں، پھر دیر تک سمجھاتے رہے، میں بہت شرمندہ ہوا اس کے بعد پھر کبھی میں نے ایسی بے تکلفی کی گفتگو قاضی صاحب سے نہیں کی۔

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ سے قاضی صاحب کے بہت گہرے روابط تھے، ان کے متعلق جتنے معلومات قاضی صاحب کو حاصل تھے، کم لوگوں کو حاصل رہے ہوں گے۔ حضرت کے انتقال سے، وہ بہت متاثر ہوئے تھے، حضرت کی وفات کے ایک سال کے بعد جب صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہٗ نے ان کی یادگار میں مجلّہ المآثر جاری کیا، اور اس کا تحریری کام میرے سپرد کیا، اور اس میں میرے مضامین مسلسل آنے لگے تو قاضی صاحب کو بہت خوشی حاصل ہوئی، وہ اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے، ایک تو یہ کہ حضرت کے علوم و معارف کی خدمت کے لئے ایک سہ ماہی علمی و تحقیقی مجلّہ حضرت ہی کے مدرسہ سے جاری ہوا۔ انھیں خوشی تھی کہ اس طرح حضرت محدث اعظمی کے علوم اور ان کی کتابیں زندہ رہیں گی، دوسرے اس کی خوشی تھی کہ ان کا یہ ادنیٰ تلمیذ اب ایسی راہ پر لگ گیا ہے، جس میں طوعاً نہ سہی کرہاً ہی قلم ہاتھ میں لینا پڑے گا، اس کے بعد جب بھی ملاقات ہوتی خوشی کا اظہار فرماتے، اور میرے احباب سے بھی میرے مضامین اور میرے قلم کی تحسین فرمایا کرتے۔

میں نے حضرت اقدس محدث جلیل کے حالات زندگی لکھنے کا ذکر کیا، تو فرمایا کہ لکھو اور اس سلسلے میں جتنی مدد مجھ سے ہو سکے گی میں کروں گا۔ میں بھی جانتا تھا کہ حضرت اقدس کے سلسلے میں معلومات کا سب سے بڑا ذخیرہ اب قاضی صاحب ہی کے پاس ہے، ایک مجلس میں کچھ باتیں میں نے دریافت کیں، تو بڑے اطمینان سے مفصل طور پر حالات بتائے، اور فرمایا کہ جب لکھو گے، تو بہت سی جگہوں پر

ضرورت محسوس کرو گے، اس وقت پوچھتے رہو گے، تو بتاتا رہوں گا۔

اب افسوس ہو رہا ہے، تدریس کی مشغولیت تو خیر ایک کارآمد اور ضروری مشغولیت ہے، لیکن اس کے علاوہ بعض لایعنی مشاغل میرے اوپر مسلط ہو گئے ہیں، اور کچھ یہ بھی ہوا کہ پچھلا سال زیادہ تر علالت کی نذر ہو گیا۔ پورا ایک سال بیت گیا، اور میں اس سلسلے میں ان سے استفادہ نہ کر سکا، اب کیا عرض کروں کہ کیسا جی مسوستا ہے، معلومات کا خزانہ زیر زمین دفن ہو گیا۔

اسی مجلس میں، میں نے عرض کیا کہ آپ کے نام حضرت اقدس کے بہت خطوط ہوں گے۔ انھیں اجازت دیں تو المآثر میں شائع کر دیا جائے۔ انھوں نے فرمایا کہ خطوط کافی تعداد میں ہیں، کچھ میرے نام اور کچھ مولوی خالد کمال کے نام۔ پھر انھوں نے سب نکالے، ان کے نام سترّ کے قریب خطوط تھے، اور پندرہ بیس مولانا خالد کمال کے نام! انھوں نے سب میرے حوالے کر دیئے، میں نے اس کی ایک قسط مرتب کی، اور ان سے عرض کیا کہ بعض خطوط میں بعض اشخاص کے تعارف اور بعض اشارات کی توضیح کی ضرورت ہے، یہ بات میں نے اس وقت عرض کی تھی جب وہ بہت بیمار تھے۔ اور اعظم گڈھ کے ایک نرسنگ ہوم میں زیر علاج تھے، فرمایا کہ گھر پر آجانا، میں لکھوا دوں گا، میں تو نہ جا سکا، اپنے ایک عزیز طالب علم کو بھیج دیا، وہ اس پر حواشی لکھ کر لے آئے۔ انھوں نے کہلوایا کہ جس شمارہ میں یہ خطوط چھپیں مجھے ضرور بھیجنا، لیکن کیا پتہ تھا کہ جس شمارہ میں مکاتیب کی پہلی قسط شائع ہو گی، اسی میں ان کی وفات کی اطلاع بھی چھپے گی۔

شعبان ۱۴۱۶ھ میں میرے بہت عزیز قریب دوست مولانا عبد الرب صاحب اعظمی سے ایک ماہانہ رسالہ نکالنے کی گفتگو آئی، یہ بات ہم لوگوں کے درمیان چار پانچ ماہ قبل بھی آئی تھی۔ مگر اس کے بعد خاموشی ہو گئی تھی، شعبان میں پھر

اس کا ذکر آیا، اور بات طے ہوگئی کہ ایک دینی اور عام فہم رسالہ جامعہ عربیہ انوار العلوم جہانا گنج کی طرف سے نکالا جائے، ہم دونوں ٹھہرے نا تجربہ کار! خیال ہوا کہ کسی اپنے بڑے کی رہنمائی حاصل ہوجائے، تو کام آسان ہوجائے، اب ہم لوگوں کیلئے مرکز نگاہ صرف قاضی اطہر صاحب کی ذات گرامی تھی، وہ خوش بھی ہوں گے، حوصلہ افزائی بھی کریں گے، مضامین ومقالات بھی عنایت فرمائیں گے، اس طرح رسالہ کا ایک معیار ووقار قائم ہوجائے گا، اور اہل علم حضرات متوجہ ہوں گے، چنانچہ یہ درخواست قاضی جی کی خدمت میں پیش کی گئی، وہ اس منصوبے سے خوش تو بہت ہوئے، اور تعاون کا وعدہ بھی فرمالیا، لیکن غالباً انھیں تردد تھا کہ ماہانہ رسالہ کو ہر وقت مضامین کی ضرورت ہے، قاضی صاحب کے بقول ماہنامہ کا پیٹ بھرنا بڑا اہم کام ہے۔ لیکن انھوں نے تردد کا اظہار زیادہ اہمیت سے نہیں کیا کہ کہیں ہم لوگوں کی طبیعت ٹوٹ نہ جائے، وہ ہمیشہ اپنے چھوٹوں کا دل بڑھایا کرتے تھے۔ ان کی منظوری حاصل کرلی، تو رمضان شریف میں مولانا عبدالرب صاحب کی مسلسل محنت اور کاوش سے اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آگیا۔ قاضی صاحب نے اس کا معیار، اس کی کتابت وطباعت سب کو پسند کیا، تاہم انھیں تردد باقی رہا، وہ بار بار تاکید کیا کرتے تھے کہ مضمون نگاروں کو تیار کرو ان سے مضامین لکھواؤ، ہم لوگوں کو اطمینان تھا کہ بحمد اللہ ہمارے دوستوں میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ، جو معیاری مضامین لکھ سکتے ہیں، جب کئی شمارے نکل چکے، تب قاضی صاحب کا تردد، دور ہوگیا انھوں نے اپنے مضامین بھی عنایت فرمائے، جو ماہنامہ انوار العلوم کے کئی شماروں میں شائع ہوئے۔ بعد میں وہ بار بار خوشی اور اطمینان کا اظہار فرماتے رہے کہ اب انشاء اللہ پرچہ جاری رہ سکے گا۔ اس سلسلے میں وہ مفید مشورے دیتے، رسالہ کو پاکر خوش ہوتے، اسے پڑھتے، دعائیں دیتے، انھوں نے کبھی کوئی لفظ ایسا نہیں کہا جس سے ہم

لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوتی۔

۶/ ماہ تک ان کی سرپرستی میں یہ رسالہ شائع ہوا، ساتویں ماہ جولائی کا رسالہ تیار تھا، صرف پریس میں جانا باقی تھا کہ قاضی صاحب سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، اور رسالہ کی پیشانی پر جہاں حضرت قاضی صاحب کا نام جگمگایا کرتا تھا، اندھیرا چھا گیا، اور کتابت شدہ اداریہ کو ہٹا کر قاضی صاحب کا ماتم کرنا پڑا۔

قاضی صاحب کی بینائی کمزور تھی، میں نے جب سے انھیں دیکھا، ان کی آنکھوں پر ہمیشہ تیز پاور کا موٹے شیشے والا چشمہ ہوتا تھا، اور اس پر بھی لکھنا پڑھنا ہوتا تو آنکھ کے بالکل قریب لے جاکر پڑھتے، ہم لوگ دیکھتے تو بڑا ترس آتا، مگر وہ اسی طرح ہمیشہ کام میں لگے رہتے۔

قاضی صاحب کی عام صحت اچھی رہی، اخیر میں بیمار رہنے لگے تھے، عمر بھی بہت ہوگئی تھی، اسّی سے متجاوز تھے، گھٹنوں میں درد رہتا تھا، کھانسی بھی آیا کرتی تھی، پھر ناک سے خون رسنے لگا تھا، اس کا علاج آپریشن تھا، مگر وہ آپریشن کیلئے تیار نہ تھے، فرماتے تھے کہ آپریشن کرنے کے لئے بے ہوش کیا جاتا ہے، کیا معلوم اسی حالت میں موت آجائے، اور عین وقت پر کلمہ پڑھنے کا بھی موقع نہ ملے، وہ ہومیو پیتھ علاج کراتے رہے، ان کے صاحبزادے حاجی ظفر مسعود صاحب آپریشن کے لئے اصرار کرتے مگر وہ انکار کردیتے، میں نے عرض کیا کہ آپریشن کرالیجئے، اس سے جلد نجات ہو جائے گی، تو شفقت کے لہجے میں خفا ہونے لگے، لیکن بالآ کر اعظم گڈھ میں آپریشن کرایا، اور بحمد اللہ اس سے افاقہ ہوگیا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اعظم گڈھ کے ایک نرسنگ ہوم میں بیمار ہوکر آگئے ہیں، ہم کئی دوستوں کا قافلہ ان کو دیکھنے کے لئے پہنچا، قاضی صاحب سو رہے تھے، حاجی ظفر مسعود صاحب نے جگایا، تو جس طرح وہ اٹھنے کی کوشش کررہے

تھے اسے دیکھ کر دل گھبرا گیا، ضعف ونقاہت کی وجہ سے صورت پہچانی نہیں جارہی تھی بڑی مشکل سے بیٹھے ہم لوگ اصرار کرتے رہے کہ آپ لیٹے رہیں، مگر نہ مانے، بیٹھنے کے بعد باتیں کررہے تھے، تو الفاظ صاف سمجھ میں نہیں آرہے تھے، منہ خشک تھا، تھوک نہیں بن رہا تھا، معلوم ہوا کہ اعضاء رئیسہ سب متاثر ہیں، تھوڑی دیر کے بعد بشاش ہوگئے، ان پر بیماری کی کوئی گھبراہٹ نہیں تھی، تھوڑی دیر گزری تھی کہ ان کے منہ سے علم وتحقیق کے موتی بکھرنے لگے، محسوس نہیں ہورہا تھا کہ ہم کسی انتہائی کمزور ونحیف مریض سے گفتگو کررہے ہیں۔

دوسرے روز قاضی صاحب گھر چلے گئے، کچھ دنوں کے بعد گھر پر حاضری ہوئی، تو کمزوری اور گھٹنوں کے درد کی شکایت کررہے تھے، لیکن لہجہ شکوہ کا نہ تھا، شکر کا تھا، فرمارہے تھے کہ میری جتنی عمر ہوگئی ہے، اس کے لحاظ سے اچھا ہوں، اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے کہ اس نے مجھے بہت ڈھویا ہے، اب تھک گیا ہے، آخر کتنا ڈھوئے گا۔ اسی طرح باتیں کرتے رہے، کیا معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہوگی۔ شاید اس پر دو ایک ماہ گزرا ہوگا، میں مئو ''المآثر'' کے دفتر میں تھا کہ اطلاع آئی کہ قاضی صاحب نہیں رہے، دل ڈوبنے لگا، بعد نماز ظہر جنازہ کی نماز تھی، مبارکپور اور مضافات کے علاوہ بھیرہ ولید پور، خیرآباد، جہاناگنج، پورہ معروف، بھور، شیخوپور، بلریاگنج، بنارس اور غازی پور سے علماء وصلحاء اور عوام کا جم غفیر جمع ہوگیا تھا، مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی نے نماز جنازہ پڑھائی، اور اس خاکسار نے ایک بڑے مجمع میں تعزیتی کلمات کہے، صدمے کی وجہ سے دل اور زبان کا ربط ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔

قاضی صاحب کی زندگی طالب علموں کے لئے مثالی زندگی تھی، اس سے بہت سا سبق سیکھا جاسکتا ہے، ان کی آپ بیتی ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک''

طالب علموں کو اور نوجوان علماء کو بہت غور سے پڑھنی چاہئے، وہ اس کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> خوداعتمادی اور خودسازی کی یہ طویل داستان ان عزیز طلبہ کی تشجیع وتشویق اور ہمت افزائی کے لئے لکھی گئی ہے، جو بہترین ذہن ودماغ لے کر دارالعلوموں اور جامعات کی لق ودق اور شاندار عمارتوں میں جاتے ہیں تاکہ وہاں کے بہترین تعلیمی وتربیتی نظام کے ماتحت لائق وفائق اساتذہ کی توجہ سے علم حاصل کریں.........مگر عام طور پر ان کو اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے ساتھ نالائقی اور بدنامی کی سند ملتی ہے...........ایسے طالب علموں کو ہم جیسے چھوٹے مدرسوں کے طلبہ سے سبق لے کر اپنے بلند مقاصد میں کامیابی کی جدوجہد کرنی چاہیئے، میں نے اپنی طالب علمی کی یہ کہانی خودستائی اور خودنمائی کے لئے نہیں لکھی ہے۔ عزیز طلبہ اس تحریر کو اس نقطۂ نظر سے نہ پڑھیں بلکہ اس کو پڑھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

ان کا یہ ارشاد بار بار پڑھنے اور لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔

''میرے محدود وسائل اور مخصوص حالات قرب وجوار کے بڑے مدرسوں میں جانے کے حق میں بالکل نہیں تھے، بڑی مشکل سے ایک سال باہر رہنا نصیب ہوا، اس کے باوجود حوصلہ کی بلندی اور تحصیل علم کی دھن کا یہ حال تھا کہ جامع ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سودا ہر وقت سر میں سمایا رہتا تھا بلکہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی مگر میں نے اپنے ذوق وشوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسہ کو جامع ازہر، جامع زیتون، جامع قرطبہ، مدرسہ نظامیہ، **مدرسہ مستنصریہ** بنالیا، اور وطن میں ہی رہ کر خدا کے فضل وکرم، اساتذہ کی شفقت ومحبت اور اپنی محنت و

عزیمت سے بہت کچھ حاصل کیا، اس دور میں مجھ پر عجیب سرمستی اور شوریدگی چھائی رہتی تھی، ہروقت بغداد و بخارا، اندلس وغرناطہ، اور عالم اسلام کی قدیم مشہور درسگاہیں اور ان کے اساتذہ و تلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں ان کے حسنات و برکات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا۔

طالب علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق و شوق ہو تو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا ہو سکتا ہے، اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر چھوٹا ہی رہے گا''

حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے قاضی صاحب کی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کریں، اور ان کی خدمات کو قبول فرمائیں، اور انھیں **اعلیٰ علیین** میں جگہ عطا فرمائیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(بقیہ ص: ۳۳۷ کا)

حق تعالیٰ انھیں روح و ریحان سے نوازے اور ان کے تلامذہ و خلفاء کو انھیں اوصاف وخصوصیات سے سرفراز فرما کر ان کے فیض کو عام و تام فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆

فقیہ ملت حضرت مولانا **مفتی محمود حسن صاحب** گنگوہی علیہ الرحمہ

وفات: ۱۷؍ربیع الآخر ۱۴۱۷ھ مطابق ۳؍ستمبر ۱۹۹۶ء

مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، جانشین شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ، فقیہ الامت، نمونۂ سلف، کاروانِ اکابر کے رکن رکین، سالکِ راہ طریقت، شیخ العلماء، استاذ الافاضل حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ ایک عرصہ کے ضعف و علالت کو اپنے دوش ناتواں سے اتار کر اور اس دنیا کے آلام واحزان کو پھینک کر اپنے وطن اور ملک سے دور جنوبی افریقہ میں، اپنے پیدا کرنے والے کے حضور پہونچ گئے، إنا للہ و إنا إلیہ راجعون

۱۷؍ربیع الآخر ۱۴۱۷ھ مطابق ۳؍ستمبر ۱۹۹۶ء دوشنبہ کا دن گزار کر رات کے غالباً پونے بارہ بجے کا عمل تھا کہ اللہ کی یاد میں بسا ہوا یہ روحانی وجود، زیور علم سے سجا ہوا یہ نورانی پیکر اور اخلاق حمیدہ کے حسن سے جگمگاتا ہوا یہ ''نفس مطمئنہ'' **یاأیتها النفس المطمئنة إرجعي إلیٰ ربک راضیةً مرضیةً** (اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کے حضور لوٹ جا، تو بھی اس سے خوش ہو اور وہ بھی تجھ سے خوش ہو۔ سورہ الفجر) کے نغمۂ سرمدی سے مست و سرشار ہو کر **فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی** (میرے بندوں میں داخل ہو جا اور پھر میری جنت میں داخل ہو جا۔ سورہ الفجر) کے زمرے میں جا داخل ہوا۔ (انشاءاللہ) **رحمه الله وغفر له وأدخله فی عبادہٖ وأدخله جنتهٗ**

حضرت مفتی صاحب عرصہ سے بیمار تھے، کبھی صحت ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، کبھی ضعف و نقاہت اور علالت کا غلبہ ہو جاتا تھا، مگر باطنی اور روحانی فیضان

جاری تھا۔ کبھی علاج کیلئے کبھی معتقدین ومتوسلین کے اصرار پر اسفار بھی ہوتے تھے، اور جہاں پہونچتے اللہ اللہ کرنے والوں کی بابرکت جماعت اکٹھا ہو جاتی، حضرت مفتی صاحب ان مقدس اور پاکیزہ نفوس کے زمرہ کے بلند پایہ فرد تھے، جنھوں نے پہلے خود علم وعمل اور طریقت وروحانیت کے نور کو اپنے سینوں میں جذب کیا، اور پھر بہتوں کو اس نور سے جگمگا دیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کی تعبیر میں حضرت مفتی صاحب کی ذات گرامی اور ان کی صحبت کیمیا اثر ''کبریت احمر'' کی مصداق تھی، جہاں طالبین وسالکین علم وتفقہ کا بہتا ہوا دریا بھی پاتے تھے اور سلوک وطریقت کی شاداب وآباد دنیا بھی انھیں ملتی تھی، یہ ''قران السعدین'' ہمارے اکابر دیوبند کی خصوصیت رہی ہے، ؎

درکفے جام شریعت درکفے سندانِ عشق

ایک طرف شریعت اور علم دین کی دیکھ بھال، اور دوسری طرف عشق الٰہی کی سرمستی وخود فراموشی! ان دونوں کا جمع کرنا، رحمت خداوندی کا خاص عطیہ ہے۔

حضرت مفتی صاحب میں یہ دونوں خصوصیتیں موجود تھیں، وہ ایک طرف متبحر عالم، نکتہ رَس فقیہ ومفتی، نہایت حاضر جواب مناظر، کامیاب واعظ ومبلغ تھے، تو دوسری طرف ان کی راتیں سوز وگداز سے پُر تھیں، ان کا قلب محبت الٰہی اور عشق نبوی کا مرکز ومظہر تھا، وہ حدیث بھی پڑھاتے تھے، اور صاحب حدیث سے نسبت بھی رکھتے تھے، ان دونوں خصوصیتوں کے جامع ہونے کی وجہ سے حضرات اہل علم کا رجوع ان کی طرف بہت تھا، اور حق تعالیٰ نے ان کے فیض کو بہت عام فرمایا۔

حضرت مفتی صاحب زہد واتقاء، بے نفسی وتواضع اور جود وسخا کے ایک نادر نمونہ تھے اور اس کے ساتھ ذہانت وذکاوت اور قوت حافظہ میں بھی اپنی نظیر آپ تھے درحقیقت وہ اس دورِ ظلماتی میں اللہ کے نور تھے، اللہ کی بُرہان تھے، ان کے اٹھ جانے سے علم کی برکتوں کا ایک بڑا حصہ اٹھ گیا۔

(بقیہ ص: ۳۳۵ پر)

شیخ عبد الفتاح ابوغُدّہ علیہ الرحمہ

وفات: ۹؍شوال ۱۴۱۷ھ

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ: **إن اللہ لا یقبض العلم إنتزاعاً ینتزعهٗ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء الخ**

(بخاری شریف، **باب کیف یقبض العلم من کتاب العلم**)

اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھاتے کہ بندوں کے سینوں اور دل ودماغ سے اسے محو کردیں، بلکہ اس طرح اٹھاتے ہیں کہ علماء کو وفات دیدیتے ہیں۔

حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے فتح الباری میں اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر بیان کی تھی۔ چنانچہ مسند احمد اور طبرانی میں حضرت ابوامامہؓ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے دوران ارشاد فرمایا کہ علم حاصل کرلو، قبل اس کے کہ اسے اٹھالیا جائے۔ ایک اعرابی نے سوال کیا کہ علم کیسے اٹھے گا؟ تو آپ نے فرمایا: علم کا ختم ہونا یہ ہے کہ حاملین علم یعنی علماء ختم ہوجائیں، (فتح الباری ج: ۱ ص: ۲۶۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جوں جوں علماء اس دنیا سے رُخصت ہوتے جائیں گے، علم بھی رُخصت ہوتا جائے گا۔ اِلا یہ کہ بعد والوں نے اس علم کو کماحقہٗ حاصل کرلیا ہو، اس صورت میں ایک عالم کے جانے کے بعد اس کے تلامذہ کے ذریعہ وہ علم زندہ رہے گا گویا علم کی اصل زندگی اور اس کی حقیقی بقا یہ نہیں ہے کہ اس کے نقوش وآثار کاغذ اور اوراق پر باقی رہیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ علماء کے سینوں میں

محفوظ ہو، اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی عالم اپنے سینے کا تمام علم کاغذ کے حوالے نہیں کرسکتا۔ علم کا بڑا حصہ تو اس کے سینے کی امانت ہوتا ہے۔ کاغذ میں تو اپنی کچھ معلومات درج کرسکتا ہے، مگر اپنی علمی بصیرت، دقیقہ رسی، فہم ونظر کا صحیح رویہ، ذوقِ سلیم اور روشن وجدان خشک صفحات میں کیسے ودیعت کرسکتا ہے، اس کیلئے تو انسانی دل ودماغ کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ کتابوں اور صحائف کی کثرت اور دفاتر واوراق کے طول وعرض کے باوجود خبر یہی دی جارہی ہے کہ عالم اٹھا تو علم بھی اٹھ گیا، اور واقعہ یہی ہے کہ علم کا مخزن ''سفینہ'' نہیں ''سینہ'' ہے، اسلئے کسی کتاب کو کبھی عالم نہیں کہا گیا وہ تحصیل علم کا صرف ایک ذریعہ ہے، باقی علم تو علماء ہی سے حاصل ہوتا ہے، اور جب علماء نہ ہوں گے، یا علم کیلئے صرف کتاب کی طرف رجوع کیا جائے گا، تو نتیجے میں بجائے علم کے جہل حاصل ہوگا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ: **حتیٰ إذا لم يبق عالماً إتخذ الناس رؤساً جهالا فسئلوا فافتوا بغير علمٍ فضلوا واضلوا**۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا، تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے۔ ان سے سوال کیا جائے گا اور وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

ظاہر ہے کہ علماء کے ختم ہونے کے بعد کتابیں تو ختم نہ ہوں گی۔ البتہ ان کا مطالعہ بغیر عالم اور استاذ کے کیا جائے گا یہ لوگ ان پڑھ نہ ہوں گے، پڑھے لکھے ہوں گے، لیکن بے استادے ہوں گے، علماء کی صحبت سے محروم ہوں گے، تو کتابیں پڑھ کر بھی علم کی صفت سے مہجور و بے نصیب ہی رہیں گے۔ جاہل کا اطلاق ایسے پڑھے لکھوں پر بھی بحکم حدیث ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ علماء کی فراوانی تھی، ان سے علم حاصل کرنے والوں کی بھی

بہتات تھی، حصول علم کیلئے خود کو کھپانے والے، اس کے لئے خونِ جگر جلانے والے، شبہائے دراز کو آنکھوں میں کاٹ دینے والے، طول طویل پُر مشقت راستوں اور منزلوں کو قطع کرنے والے اور علم ہی کو مقصد زندگی بنالینے والے بکثرت تھے، اسلئے ایک عالم اگر اٹھ جاتا تھا، تو گو وہ ایک علمی خسارہ ہوتا تھا، لیکن علم کی بے شمار قندیلیں، جو اسی عالم کے نور علم سے منور ہوتی تھیں، اس خسارہ کی تلافی کردیتی تھیں۔

لیکن ہم انحطاط علم وفضل اور زوال ذوق وشوق کے جس دور میں ہیں، جبکہ دل ودماغ کے بجائے شکم اور نفس نے مرکزی اہمیت حاصل کرلی ہے، علم کے بجائے تجارت اور سوداگری پیشہ بن چکی ہے۔ جہاں آدمی کے جسم وجان کو اس وقت تک حرکت ہی نہیں ہوتی، جب تک وہ الفاظ وحروف کے پس منظر میں دولت دنیا کی توقعات کا مشاہدہ نہیں کرلیتا۔ آج کی دنیا میں علم نہ آخرت کیلئے ہے، نہ خود علم کیلئے، بلکہ صرف جاہ ومال کیلئے ہے، ایسے وقت میں جب کوئی واقعی عالم اٹھ جاتا ہے، تو دیر تک سوچنا اور دور تک دیکھنا پڑتا ہے کہ علم کی جو مقدار اس عالم کے ساتھ چلی گئی ہے، اس کا کوئی وارث وامین ہوا یا نہیں؟ اور بسا اوقات فکر معطل اور نظر شَل ہوجاتی ہے، اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

پُرانے علماء ایک ایک کرکے اٹھتے جارہے ہیں۔ چند سالوں میں اہل علم کی صفوں میں بڑا خلا پیدا ہوا ہے، متعدد علماء بساطِ حیات سے رُخصت ہوئے۔ ہر ایک کی وفات سے علم کا دائرہ سکڑتا رہا۔ تاہم ۹؍ شوال ۱۴۱۷ھ کو علم کا جو ستون گرا ہے، اس نے احساسِ محرومی کو کچھ اور ہی بڑھا دیا ہے، یہ شخصیت اپنے مولد ومقام اور وطنیت کے اعتبار سے ہندوستانی نہ تھی، لیکن ہندوستانی علماء سے انھوں نے اتنا گہرا تعلق رکھا، اور ان کی اتنی قدردانی کی کہ ان کی وفات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہی درمیان کا کوئی بڑا عالم گزر گیا ہے۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ پیدا تو اسی دور میں ہوئے تھے، پلے بڑھے بھی اسی دور میں تھے اسی دور کے جامعات وکلیات میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن ان کے ذوق تحقیق، شوق علم، انتھک محنت وکاوش، اصابت رائے، وفور معلومات اور اس پر تواضع ومسکنت، علم واہل علم کے ادب واحترام، بے نفسی وللّٰہیت، تقویٰ وطہارت اور دیانت وامانت کو دیکھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خیر القرون کے دور کے کوئی بزرگ ہیں۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری علیہ الرحمہ نے محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ کی وفات پر تعزیتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ”صحابہ کا قافلہ جارہا تھا، اس میں سے شاہ صاحب پیچھے رہ گئے تھے“ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کا جب تصور آتا ہے تو ایسا ہی احساس پیدا ہوتا ہے کہ اگلے محدثین کے قافلہ کا ایک فرد، ان کا نمونہ بن کر اس دور میں آگیا تھا۔

شیخ اصلاً ملک شام کے مشہور شہر حلب کے رہنے والے تھے، وہ دیندار گھرانے کے فرد تھے، بچپن ہی سے دینی مزاج بنا ہوا تھا، تحصیل علم میں لگے تو بڑے انہماک اور لگن کے ساتھ لگے، اور اس کے ساتھ ورع وتقویٰ اور اکابر واساتذہ کے ادب واحترام میں بھی ترقی کرتے رہے۔

ان کے ایک استاذ شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء کی شہادت سنئے! شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ کے استاذ ہیں، اور ایسے استاذ ہیں کہ شاگرد واستاذ کی عمر میں تفاوت کم ہے۔ شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء نے جس مدرسہ میں تدریس کی ابتداء کی تھی، اس سے شیخ ابوغدہ فارغ ہوچکے تھے، لیکن شیخ مصطفیٰ نے تدریس فقہ کا ایک نیا انداز اختیار کیا تھا۔ شیخ ابوغدہ باوجود وہاں سے فراغت کے پابندی سے ان کے درس میں حاضر ہوتے تھے۔ اس وقت سے عمر کے اخیر لمحے تک استاذی

وشاگردی کا یہ مقدس رشتہ برقرار رہا۔ یہ ایک طویل مدت ہے، شیخ ابوغدہ کی ولادت ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ اگر ۲۰ر سال کی عمر میں شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے ہوں، تو ۶۰ر سال کی مدت ان سے تعلق کی ہوئی۔ اس ۶۰ر سالہ ربط وتعلق کے متعلق استاذ محترم شہادت دیتے ہیں کہ:

> ”میں گواہ ہوں کہ اس لمبی مدت میں جب سے انھیں میں نے جانا ہے، میں نے ان کے اندر کوئی قابل مواخذہ بات نہیں پائی، نہ ان کے ورع وتقویٰ میں، نہ علمی ادب وسلوک میں، نہ وفاداری واخوت میں، نہ ان کی فضیلت اور صدق وامانت میں، بلکہ میں نے یہ دیکھا کہ وہ ان تمام صفات میں مخلص اور متواضع علماء کے اخلاق کے حامل ہیں، جو ہر دنیاوی ترغیب پر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اپنے نفس کا ہمیشہ احتساب کرتے رہتے ہیں۔ (مجلّہ ”الداعی“)

یہ ایک ذمہ دار استاذ کی شہادت ہے، جن سے ان کا شاگردانہ تعلق عنفوانِ شباب سے تھا، اتنی طویل مدت تک، جس میں طالب علمی کا زمانہ بھی شامل ہے اور پھر وہ دور بھی ہے، جب خود شیخ آسمان علم وفضل کے بدرِ منیر بن کر چمک رہے تھے، اور بڑے بڑے اساطین علم کی گردنیں ان کے سامنے جھک رہی تھیں۔ اس پورے دور میں استاذ کے ساتھ ایسا نیازمندانہ تعلق کہ استاذ اس کا اعتراف کرنے بلکہ شہادت دینے پر اپنے آپ کو مجبور پائے، یہ سیرت وکردار کی وہ بلندی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق ہی سے پہونچا جاسکتا ہے۔

ہمارے اس دور میں علم کی قلت کے باوجود دعاوی کی بڑی کثرت ہے، جن لوگوں نے علم کے نام پر چند حروف پڑھ لئے وہ لمبے لمبے دعوے ہانکنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں، بالخصوص غیر مقلدیت کی بلا نے اس کو زیادہ ہوا دی ہے، جو حضرات اس بلا سے

متاثر ہیں، خواہ وہ عربی ہوں یا ہندی، ان کی تحریرات طویل وعریض دعوؤں سے لبریز نظر آتی ہیں، اور دعوے بھی بالکل سطحی! اور دلیلیں تو بس ایسی ہوتی ہیں کہ دعویٰ کے کسی جُز پر بیٹھیں یا نہ بیٹھیں، زبردستی انھیں دلیل کے نام پر پیش کردیا جاتا ہے، تعلّی ہی تعلّی! عقل وفکر کا افلاس اور ادب وسلیقہ کی یتیمی! اس دور میں یہ تماشا عام ہے،

لیکن شیخ کی تحریریں پڑھ جایئے، ان کی اعلیٰ تحقیقات کا مطالعہ کرلیجئے، نہ کہیں بلند بانگ دعوے ملیں گے نہ کسی چھوٹے بڑے عالم کے ادب واحترام میں کوئی کمی محسوس ہوگی، سراپا تواضع وفنائیت، کامل ادب واحترام، آپ ان کی جو بھی تحریر پڑھیں گے، حلاوت ودلسوزی اور خیرخواہی کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کرتی جائے گی، اور خلوص وللّٰہیت کا نور دلوں کو روشن کرتا ہوا محسوس ہوگا۔ وہ کسی کی غلطی پر تنبیہ بھی کرتے ہیں، تو اس میں بھی کبھی جادۂ ادب سے منحرف نہیں ہوتے۔

وہ عرب علماء میں غالباً واحد شخص ہیں، جنھیں ہندوستانی علماء اور ان کی خدماتِ علم سے بے حد دلچسپی تھی، صرف یہی نہیں کہ انھیں دلچسپی تھی، بلکہ اس سلسلے میں وہ بڑی معلومات رکھتے تھے، چنانچہ وہ ہندوستان وپاکستان کے متعدد علماء کی خدمت میں بغرضِ استفادہ حاضر ہوئے اور بغیر کسی جھجھک اور تکلف کے استفادہ کیا اور نہایت ممنون ومشکور ہوئے، اور اپنی کتابوں میں اپنی ممنونیت کا بار بار اظہار کیا۔

بالخصوص محدثِ جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ قدس سرہٗ سے انھیں بہت گہرا تعلق تھا، بلکہ ان کے ساتھ انھیں والہانہ محبت تھی۔ انھیں اپنا باقاعدہ استاذ تسلیم کرتے تھے، اور محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کا نام سن کر آبدیدہ ہوجاتے، حضرت کی وفات کے بعد ایک مرتبہ تشریف لائے، تو بار بار ان پر گریہ طاری ہوتا تھا، حضرت کے فرزندِ رشید مولانا رشید احمد الاعظمی سے انھوں نے ایک مرتبہ فرمایا کہ آپ لوگ کتنے بھائی ہیں، ؟ انھوں نے کہا کہ دو، شیخ نے فرمایا کہ نہیں، ایک تیسرا میں بھی ہوں۔

پچھلے علماء میں انھیں سب سے زیادہ وابستگی حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی علیہ الرحمہ سے تھی، مولانا کی بیش قیمت تصانیف جو ہندوستان میں لیتھو پریس میں چھپتی رہی ہیں، آج کے ذوق کے لحاظ سے وہ مخطوطات میں گویا شامل ہوگئی ہیں، شیخ نے ان کی متعدد تصانیف پر ازسرنو تعلیقات وحواشی لکھے، اور جدید طرز پر بہترین طباعت کے ساتھ شائع کیا، اس طرح مولانا کی کتابیں شیخ کی کوششوں سے عالم عرب میں عام ہوئیں، اور ان لوگوں نے مولانا کی قدر وقیمت پہچانی۔ غرض شیخ علیہ الرحمہ اس دور میں پچھلے دور کا ایک نمونہ تھے، جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ دور کے علماء ربانیین کی شان کیا رہی ہوگی۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ علمائے احناف میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے، تفقہ کے ساتھ علم حدیث کے زبردست محقق اور ماہر تھے۔ حدیث اور اس سے متعلق علوم پر ان کی نظر بہت گہری اور وسیع تھی، متعدد کتابیں، ان کی تحقیق اور بلند پایہ حواشی وتعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ ان کے تعلیقات کیا ہوتے ہیں؟ علم ومعلومات کی جوئے رواں! کہ طالب علم پڑھتا جائے، اور سیراب وسرشار ہوتا جائے، عبارت فصیح وبلیغ، معانی بلند، ترتیب دلپذیر اور اسلوب دلآویز!

آپ کو امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی فقہ پر عبور اور شرح صدر تھا، اور ان کی طرف سے محققانہ دفاع کرتے تھے۔

وفات سے کچھ دنوں پہلے آنکھوں کا آپریشن کرایا تھا، لیکن وہ آپریشن موافق نہ آیا، اس کے بعد صحت دمبدم کمزور ہوتی گئی، گردوں نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا، ۹/ شوال ۱۴۱۷ھ (سعودی تقویم) بروز اتوار صبح کے وقت حضور حق سے بلاوا آگیا، سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ایک بڑے مجمع نے نمازِ جنازہ ادا کی جس میں سعودی اور شام کے علماء صالحین، اور حکومت کے عمائدین بھی شریک تھے۔ پھر

بادشاہی حکم سے ان کا جنازہ بذریعہ طیارہ مدینہ منورہ لایا گیا۔ مسجد نبوی میں دوبارہ نماز جنازہ ادا کی گئی، وہاں بھی بڑا مجمع تھا۔ پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں ”جنت البقیع“ کے مرقد مبارک میں، جہاں اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے برگزیدہ بندوں کے اجسام مدفون ہیں، انھیں مقدسین کے درمیان شیخ کے جسدِ خاکی کو بھی پہونچادیا گیا۔ حق تعالیٰ ان کی روح مبارک کو اعلیٰ علیین میں انھیں بزرگوں کی رفاقت سے سرفراز فرمائیں۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پیکر صدق وصفا

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نوراللہ مرقدہٗ

وفات: ۲۳؍ربیع الآخر ۱۴۱۸ھ (۲۸؍اگست ۱۹۹۷ء)

یہ بندہ آثم، ان سطور کا راقم، تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ۱۳۸۸ھ میں دارالعلوم دیوبند حاضر ہوا۔ اس سال ضلع فتح پور ہسوہ کے بھی چند طالب علم دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے تھے، کئی ایک سے صاحب سلامت ہوئی۔ ایک صاحب سے خصوصی تعلقات پیدا ہوئے۔ وہ طبیعت ومزاج کے لاابالی تھے، کسی سے کم متاثر ہوتے تھے، لیکن ایک شخصیت کا نام کبھی کبھی لیتے تو دل کی گہرائیوں سے عقیدت ومحبت کی خوشبو اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ نام ان کا مرکزِ عقیدت تھا، بتاتے تھے کہ میں انھیں کے مدرسے سے پڑھ کر آیا ہوں۔ یہ نام تھا حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی کا، (علیه الرحمة والرضوان)

طالب علمی کا دور تھا۔ کسی نام کی کیا اہمیت ہوتی! بس اگر نام تھا تو اپنے اساتذہ کا، اور یہ صاحب تو باندہ کے تھے، دور کا ضلع، گمنام بستی، کوئی خاص اہمیت نہیں ہوئی، ہوں گے کوئی بزرگ! دیوبند میں تو ایک سے ایک بزرگ، بڑے عالم، صاحب کمال بکھرے پڑے ہیں، کسی اور کی طرف توجہ کیوں ہوتی؟

طالب علمی کا دور آہستہ آہستہ کھسکتا رہا۔ مدرسی کا دور آیا، اب دور و نزدیک سے یہ نام ذرا اہمیت کے ساتھ کانوں میں پڑنے لگا، پھر ۱۳۹۷ھ میں بصیغۂ مدرسی

مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد خانقاہ عارف باللہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ میں حاضری ہوئی، وہاں یہ نام بار بار کانوں میں پڑتا رہا، یہاں معلوم ہوا کہ وہ ایک خاص شان کے بزرگ ہیں، انتہائی نیک نفس، بے حد متواضع، بہت پڑھانے والے بلکہ گھول کر پلا دینے والے!

ایک دن فجر کی نماز کے بعد مسجد میں دیکھا کہ لوگ ایک طرف بڑھے جا رہے ہیں اور کسی سے مصافحہ کر رہے ہیں، جس سے لوگ مصافحہ کر رہے ہیں وہ ہجوم میں گم ہے، اور لوگ ہیں کہ اشتیاق میں بڑھے جا رہے ہیں، میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ کون صاحب ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ مولانا صدیق صاحب ہیں۔ نام سنتے ہی بے اختیار ان کی طرف قدم اٹھ گئے، ذرا ہجوم کم ہوا تو میں نے بھی مصافحہ کا شرف حاصل کیا۔

ایک نورانی چہرہ، سفید داڑھی، اس میں قدرے سیاہ بال، آنکھیں بڑی بڑی شب بیداری کے اثر سے مخمور سی، نگاہیں جھکی ہوئی بلکہ گردن ہی تواضع سے خمیدہ۔ سر پر پنچ کلیا ٹوپی، لمبا کرتا، موزوں قد، گورا رنگ، خاموش خاموش سے، مصافحہ کیا اور قدرے توجہ سے کیا، پھر لوگوں کے ہجوم میں باہر تشریف لائے اور آہستہ آہستہ خانقاہ شریف کی طرف بڑھنے لگے اور لوگ روک روک کر مصافحہ کرتے رہے، میں بھی پیچھے قدم بہ قدم تھا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ میری پہلی ملاقات ہے، مجھ سے کچھ انھیں واقفیت نہ ہوگی، ایک نوجوان اور گمنام مدرس کو وہ کیا جانتے ہوں گے، مگر کچھ دور چلنے کے بعد جب خانقاہ شریف قریب آئی اور لوگوں کا ہجوم کم ہوا، تو اچانک پیچھے متوجہ ہوئے، اور اس گنہ گار کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو قدرے ہٹ گئے اور آہستہ آہستہ کچھ فرمانے لگے میں نے بغور سننے کی کوشش کی، فرما رہے تھے کہ آج کل بہت سخت ضرورت ہے کہ دین کی خدمت کی جائے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی صلاحیتیں

بخشی ہیں، پڑھانے کی، تقریر کرنے کی، لکھنے کی، وغیرہ آپ اپنی سب صلاحیتیں دین کی خدمت کے لئے لگا دیجئے۔

میں حیرت میں پڑ گیا کہ میں تو انھیں اپنے سے ناواقف سمجھتا تھا اور یہ اتنے واقف نکلے کہ اپنے حسن ظن سے کئی توقعات بھی انھوں نے اس خاکسار سے باندھ رکھی ہیں۔ میں نے سعادت کے کانوں سے یہ بات سنی مگر میری بے مائیگی اور ناکارگی نے مجھے پست ہی رکھا، پھر وہ خانقاہ میں تشریف لائے، مگر بالکل خاموش، جہاں بیٹھتے نہایت ادب سے بیٹھتے، جس سے بات کرتے ادب ہی سے بات کرتے، ہر ایک کو اپنے سے بڑا اقرار دئے ہوئے،

ع

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا　　خاکساری اپنی کام آئی بہت

کی تصویر بنے ہوئے۔

یہ پہلی ملاقات تھی، اس کے بعد الہ آباد میں بار بار ملاقاتیں ہوئیں۔ اس وقت بکثرت اسفار شروع ہو چکے تھے، اسی تقریب سے الہ آباد بہت کثرت سے آنا ہوتا تھا اور آتے تو عجیب شان سے، اور ٹھہرتے تو عجیب انداز سے، اور پھر روانہ ہوتے تو اس کا بھی ایک انوکھا انداز ہوتا، ہر جگہ ان کی تواضع، بے نفسی اور فنائیت کا رنگ غالب رہتا۔

الہ آباد میں خانقاہ عالیہ وصی اللہی شریف کے سامنے ایک مختصر سی دکان میں حافظ محمد سرور صاحب کا تجارتی کتب خانہ ہے۔ حافظ صاحب موصوف حضرت مولانا کے شاگرد ہیں، عموماً رات کے کسی حصے میں مولانا تشریف لاتے، کسی اور کو تکلیف نہ دیتے، اپنے اسی شاگرد کا دروازہ کھٹکھٹاتے، یا اگر انھیں پہلے سے آمد کی اطلاع ہوتی تو خود ہی منتظر ہوتے، ضرورت ہوتی تو انھیں کے یہاں روکھی پھیکی کھا کر ان کے کتب خانہ میں، جو کتابوں سے بالکل بھرا ہوا ہوتا کتابیں اِدھر اُدھر سمیٹ کر تھوڑی

سی جگہ نکال لیتے ، اور رومال بچھا کر سرہانے ایک تکیہ رکھتے اور بے تکلف پاؤں سمیٹ کر سوجاتے ، سونا کیا ہوتا سونے کا نام ہوتا ، ادھر سوئے ادھر اٹھے اور وضو کرکے نیت باندھ لی، صبح فجر کی نماز میں لوگوں سے ملاقات ہوتی اور پھر کسی بھی سواری سے وہ سائیکل ہو یا موٹر سائیکل منزل کی طرف نکل جاتے ، کبھی ایسا ہوتا کہ وقت کم ہے، ٹرین پکڑنی ہے یا بس سے سفر کرنا ہے، اپنی نماز اول وقت میں پڑھی، جھولا اٹھایا، رکشہ پر بیٹھے اور اسٹیشن چل دیئے ، فجر کی نماز کے بعد معلوم ہوتا کہ حضرت مولانا آئے تھے، حافظ سرور کے یہاں رات کو رہے، اور فجر سے پہلے روانہ ہوگئے۔

ایک روز مغرب کے بعد کچھ طلبہ آئے اور انھوں نے بتایا کہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب ریلوے اسٹیشن پر ملے تھے، انھوں نے آپ کو سلام کہا ہے، اور فرمایا ہے کہ میں نے سلّم کی ایک شرح لکھی ہے۔ اس کے بعد آؤں گا تو اس کا مسودہ لے کر آؤں گا، مولانا اسے دیکھ لیں، تو اسے شائع کرادوں گا۔

میں نے تفصیل پوچھی تو بتایا کہ وہ ٹکٹ لینے کے لئے لائن میں کھڑے تھے، میں نے کہا کہ تم لوگ جب موجود تھے، تو یہ خدمت تم لوگوں نے کیوں نہیں انجام دی ؟ کہنے لگے کہ ہم لوگوں نے بہت کوشش کی مگر حضرت راضی نہ ہوئے ۔ فرمایا کہ میرے ساتھ لگے رہو اور باتیں کرتے رہو۔ اسی دوران دریافت کیا کہ مولانا کیا پڑھاتے ہیں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں فلاں کتابیں اور اسی میں سلّم کا بھی ذکر آیا۔ اسی پر فرمایا کہ میں نے سلّم کی شرح لکھی ہے۔

میں حیرت میں پڑ گیا کہ مولانا کس قدر متواضع ہیں ۔ میرے پوچھنے پر طلبہ نے بتایا کہ سامان ساتھ میں کچھ نہ تھا، صرف ایک جھولا کپڑے کا تھا، جس میں شاید ایک جوڑا کپڑا تھا، ایک مصلیٰ تھا اور ایک لوٹا تھا، پاؤں میں جوتے نہ تھے چوڑے تسمہ

کے ہوائی چپل تھے اور عام مسافروں کی طرح تنِ تنہا ٹکٹ لے رہے تھے، طلبہ نے اصرار کیا تو بھی اجازت نہ دی، البتہ ان کی خاطر یہ کیا کہ اپنے ساتھ لگالیا اور افادات فرماتے رہے۔

اور ذرا، یہ بھی تواضع اور بے نفسی دیکھیں کہ ایک کہنہ مشق مدرس ، جس نے نہایت محنت وکوشش سے اساتذۂ فن کے پاس علم حاصل کیا ہے اور بہترین استعداد بہم پہونچائی ہے پھر عرصہ سے اسی مشغلہ میں لگا ہوا ہے، اس نے فن منطق کے جامع مگر مشکل ترین متن کی شرح لکھی ہے، اور دکھانے کو کہہ رہا ہے ایک نوآموز مبتدی طالب علم کو! اور یہ بات ازراہِ تصنع نہ تھی، اور نہ از قبیل حوصلہ افزائی تھی، بلکہ واقعی یہی ان کا مزاج تھا کہ وہ خود کو چھوٹوں سے چھوٹا سمجھتے تھے۔

کوئی بھی بڑا، اپنے کو اپنے درجہ پر رکھتے ہوئے ، چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس کے سامنے خود کو جھکا لیتا ہے۔ لیکن حضرت مولانا میں شائبۂ تصنع نہ تھا، ان کا ہر ہر انداز پکارتا تھا کہ وہ اپنے کو کچھ نہیں سمجھتے۔

بات مولانا کے کہنہ مشق مدرس ہونے کی آ گئی ہے تو سنئے کہ مولانا ہر فن کی چھوٹی چھوٹی بڑی تمام کتابیں پڑھائے ہوئے تھے اور اخیر تک پڑھاتے رہے ، ابتدائی فارسی سے کر بخاری شریف تک شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جسے مولانا نے بار بار نہ پڑھایا ہو۔ پڑھانا حضرت مولانا کا خاص ذوق تھا، اس کے لئے کسی وقت کی قید نہ تھی اکثر اسفار ہوتے رہتے تھے ، لمبے لمبے اسفار ہوتے ، دن رات چلتے رہتے ، لیکن ابھی مدرسہ میں تشریف لائے اور فرماتے کہ فلاں سبق ہوگا ۔ کہاں کا آرام اور کہاں کی چائے پانی وغیرہ۔ جب تک طلبہ درس گاہ میں حاضر ہوتے ، آپ مطالعہ کر لیتے پھر اس طرح درس گاہ میں بیٹھ جاتے ، اور کتاب پر جھک جاتے جیسے اور کوئی کام نہ ہو، یہ وقت خواہ دن کا ہو یا رات کا، قبل فجر ہو یا بعد فجر ہو، قبل مغرب ہو

یا بعد عشاء ہو، اور ایک مجلس میں ایک نہیں کئی کئی اسباق پڑھاتے۔

صبح فجر کی نماز سے پہلے سفر میں جانا ہے، حکم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے فلاں فلاں سبق ہوگا، طلبہ میں ہلچل مچ جاتی، کتابیں لے لے کر آجاتے، کبھی دو سبق پڑھاتے کبھی تین سبق پڑھاتے، پھر جوں ہی فجر کا وقت ہوتا، اپنی جماعت کر کے روانہ ہوجاتے۔

ایک مرتبہ کئی رفقاء کے ساتھ خدمت والا میں حاضری قبل عصر ہوئی۔ نماز عصر کے بعد مسجد ہی میں بیٹھ گئے، معلوم ہوا کہ آج ہی سفر سے واپس تشریف لائے ہیں۔ طلبہ فن بلاغت کی مشکل ترین کتاب ''مختصر المعانی'' لے کر آگئے۔ تین چار صفحے پڑھے، وہ اٹھے تو فن منطق کی کتاب قطبی کے طلبہ آگئے، دو تین صفحے انھیں پڑھائے، اس کے بعد طلبہ کوئی اور کتاب لا رہے تھے کہ مولانا نے فرمایا کہ مہمان آگئے ہیں، اب اس کا سبق بعد نماز عشاء ہوگا۔

پھر عشاء کے بعد کوئی اور مشغولیت آگئی لیکن سبق ناغہ نہیں ہوا۔ فرمایا کہ اس وقت عبارت پڑھ لو، پھر پورے انہماک کے ساتھ پوری تصحیح کے ساتھ عبارت پڑھوائی، مولانا کے یہاں تصحیح عبارت کا خاص اہتمام تھا، مجال نہیں کہ طالب علم غلط عبارت پڑھ کر نکل جائے۔ مولانا تو بعد میں پہلے طلبہ ہی اس غلط خواں طالب علم پر ٹوٹ پڑتے، مولانا سبق میں بہت اختصار سے بولتے، زائد تقریر بالکل نہ کرتے البتہ کوئی اصلاحی اور تذکیری پہلو آجاتا تو وہاں ذرا ٹھہر کر تفصیل فرماتے، تاکہ طلبہ کی تربیت ہو، اتنا مختصر بولتے کہ بعض اوقات شبہہ ہوتا کہ طلبہ اس مختصر سی بات کو کیا سمجھیں گے، مگر یہ مولانا کی برکت تھی، کرامت تھی کہ ذی استعداد طلبہ آپ کی خدمت میں تیار ہوتے تھے، اخیر کے برسوں میں مولانا اکثر بیمار رہتے تھے، مسلسل شب وروز کے اسفار نے صحت پر برا اثر ڈالا تھا، کئی طرح کی بیماریاں تھیں، گردن

میں تکلیف، دورانِ سر، قلب کا عارضہ، گھٹنوں میں درد اور ہر تکلیف ایسی کہ شہ زوروں کو بستر علالت پر لٹادے، مگر مولانا ان سب عوارض کے باوجود نہ ہارے، نہ بستر پر لیٹے، سبق کا وقت ہوا، سخت چکر آرہا ہے خود سے اٹھیں تو گر جائیں، مگر پڑھانے کے لئے بیٹھ گئے ہیں، اور پڑھا رہے ہیں، میں نے ایک بار دیکھا کہ پڑھایا اور پڑھاتے ہی بے ساختہ لیٹ گئے، مجھے شبہہ ہوا کہ شاید غشی طاری ہوگئی، مگر معلوم ہوا کہ دورانِ سر شدید ہوگیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اب آرام کریں گے مگر جس کی لغت میں آرام کا لفظ ہی نہ ہو وہ آرام کیا جانے، پانچ منٹ بعد دیکھا تو پھر سبق کا جوش وخروش اور وہی ناؤ ونوش۔

مولانا کو تعلیم دینے کا ایسا ذوق تھا کہ گو ان کے ساتھ دوسرے مشاغل بھی لگے ہوئے تھے مگر ان سب پر یہی ذوق غالب تھا۔ وہ ایک شیخ طریقت بھی تھے، ان کے یہاں تعویذات لینے والوں کا بھی ہجوم رہا کرتا تھا۔ اسفار اتنے ہوا کرتے تھے کہ ان کے تصور سے بھی طبیعت کو ہراس آتا ہے، مہمانوں کی کثرت رہا کرتی، یہ سب کچھ تھا، مگر پڑھانا ان سب پر غالب تھا، اتنے کثیر مشاغل کے باوجود نہ جانے کتنے اسباق روزانہ پڑھایا کرتے تھے، میں نے تحقیق تو نہیں کی مگر اندازہ ہے کہ عموماً سات، آٹھ اور بعض اوقات دس دس، بارہ بارہ اسباق پڑھاتے تھے، اور یہ اخیر وقت کا معمول تھا، ابتدائی دور میں جب ان کی شہرت زیادہ عام نہیں ہوئی تھی، اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنا پڑھاتے رہے ہوں گے۔

آخری دن جب وہ مرض الوفات سے دوچار ہوئے ہیں، باوجودے کہ سخت تکلیف میں تھے، عرق النساء کی تکلیف شدید تھی، اس کے ساتھ دوسرے عوارض بھی زوروں پر تھے مگر پڑھا رہے تھے، سلّم العلوم کا سبق پڑھا کر فارغ ہوئے تھے اور بخاری شریف کے درس کے لئے وضو کر رہے تھے اسی وقت بیماری کا حملہ ہوا، جس

میں ان کی وفات ہوئی۔

تعلیم و تعلم کا یہی ذوق تھا جو انھیں ہندوستان کے طول و عرض میں مدارس کے اندر کھینچتا رہتا تھا، مروجہ جلسوں سے انھیں مناسبت نہ تھی، لیکن مدارس کی دعوت پر مشقت اٹھا کر سفر کرتے تھے، میں نے دیکھا ہے کہ حضرت کی گاڑی چلی جارہی ہے، راہ میں مدرسہ نظر آیا، گاڑی روکی، مدرسہ میں گئے، کوئی ملا، یا نہ ملا، کھڑے ہوئے، ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور چل دئے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک آبادی کے پاس سے گزر رہے تھے، قریب کے رفقاء سے پوچھا کہ یہاں کوئی دینی مدرسہ ہے؟ بتایا گیا کہ ہے، آپ نے فرمایا، وہاں چلو، تشریف لے گئے دعا کی اور فوراً واپس ہو گئے، مدرسہ والوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیسی عظیم شخصیت آئی، اور خاموشی سے ان کے لئے دعا کر کے چلی گئی۔

ایک بار ایک طویل سفر میں یہ بندہ حقیر حضرت کے ہمرکاب تھا، حضرت نے ازراہ عنایت ساتھ میں بیٹھا لیا اور باتیں کرنے لگے، طبیعت کھلی ہوئی تھی، میں نے بھی نشاط دیکھا تو گستاخی سوجھی، عرض کی کہ حضرت مدرسے تو بہت چل رہے ہیں، تعلیم و تعلم کا کام جیسا بھی ہو رہا ہے، مگر کثرت سے ہو رہا ہے، البتہ احسان و سلوک کا کام مردہ ہوتا جارہا ہے، خانقاہی نظام اور تربیت و اصلاح کا اہتمام نہ ہونے کے برابر ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت کو جو مقام بلند عطا فرمایا ہے، اگر اس کی طرف آپ توجہ فرمائیں تو یہ کام ازسرنو زندہ ہو جائے گا۔ لیکن آپ بھی پڑھانے ہی میں لگے ہوئے ہیں۔

فرمایا کہ مجھ کو پڑھانے ہی کا زیادہ ذوق ہے، اسی سے زیادہ مناسبت ہے، میں خاموش ہو گیا مگر مجھے اطمینان نہیں ہوا، میں سوچا کرتا تھا کہ مولانا کو عامۃ الناس ہی نہیں، اہل علم اور خواص کے حلقہ میں بھی بڑی مقبولیت و محبوبیت ہے۔ اگر وہ اس

طرف متوجہ ہوں تو پچھلی خانقاہوں کی روح زندہ ہو جائے مگر مولانا یکسوئی کے ساتھ پڑھانے میں ہی منہمک ہیں، میں یہ بھی سوچتا تھا کہ مولانا کو دین کا جیسا درد ہے اور مسلمانوں کی جیسی بہی خواہی ان کے قلب میں ہے وہ بالکل ظاہر ہے مگر اس کے باوجود وہ مدارس اور تعلیم کا جو اس قدر اہتمام کر رہے ہیں ضرور ان کے سامنے کوئی بڑی بات ہے، وہ بڑی بات سوچنے سے سمجھ میں بھی آتی ہے لیکن دل میں خیال آتا تھا کہ کبھی حضرت مولانا ہی اس بات کو ظاہر فرماتے تو کچھ اور بات ہوتی۔

لیکن یہ بات بہت مشکل تھی مولانا اپنے متعلق زبان کھولیں یہ ایک دشوار امر تھا، اول تو انھیں فرصت بالکل نہیں تھی، دوسرے اپنے متعلق نہ خود کچھ بتاتے تھے، اور نہ کسی اور کو مدح کرنے کی اجازت دیتے تھے، فناء نفس کے اس مقام پر تھے کہ غالباً انھیں اپنا وجود سرے سے نظر ہی نہیں آتا تھا۔

میں نے چند سال پہلے عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہؒ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے علوم کے شارح و ترجمان **مولانا عبد الرحمن جامیؒ** کے حالات (ذکر جامی) کے نام سے لکھے تھے، حضرت مولانا کو جامی صاحب سے بہت تعلق تھا دونوں بزرگوں نے ایک ساتھ مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں کئی سال تک پڑھایا تھا، جامی صاحب سن وسال اور فراغت میں حضرت مولانا سے سابق تھے اس لئے حضرت مولانا ان کا بہت احترام کرتے تھے، اور الہ آباد جب بھی تشریف لے جاتے، ان سے ضرور ملتے تھے اور ان کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے مولوی محی الدین سلّمہٗ اور ان کی صاحبزادیوں کا بہت زیادہ اپنی اولاد کی طرح خیال کرتے تھے، میں نے جب یہ سوانح مرتب کی تو حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، مولوی محی الدین سلّمہٗ بھی ساتھ میں تھے، حضرت سے اس کا ذکر کیا تو بہت خوش ہوئے، میں نے انھیں مسودہ کا وہ حصہ سنایا جو فتح پور کی تدریس سے متعلق تھا، حضرت

مولانا نے اس کے لئے بہت وقت دیا، سنا اور خوب روئے اور پھر کھلے، اس وقت کے بعض حالات بیان کئے، اور بات ختم کرتے کرتے میں نے عرض کردیا کہ جامی صاحب نے فتح پور چھوڑا تو حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں پہونچ گئے، آپ نے بھی اسی وقت وہاں سے علیٰحدگی اختیار کی تو آپ نے کیا کیا، اس پر حضرت مولانا ذرا کھلے اور بیان فرمایا:

> یہ آزادی کے بعد کا دور تھا۔ میں نے تعلیم حاصل کرنے کے زمانے میں بہت محنت کی تھی ہر ایک کتاب سمجھ کر پڑھی تھی، دل میں یہ شوق تھا کہ اونچی اونچی کتابیں طلبہ کو پڑھاؤں گا، مگر جب فتح پور میں تھا جب ہی معلوم ہوا کہ باندہ کے بعض علاقوں میں ارتداد پھیل گیا ہے، کئی بستیوں کے لوگ مرتد ہوگئے ہیں، جب یہ بات میں نے سنی تو بڑا صدمہ ہوا، اس وقت دل میں یہ بات بیٹھی کہ اگر میں اونچی کتابیں پڑھانے کے لئے جگہیں تلاش کرتا رہوں اور خاص میرے حلقے میں ارتداد پھیلے، اور مسلمان جہنم میں گرنے لگیں تو میری اس تعلیم وتدریس سے کیا فائدہ؟ پھر میں نے ان علاقوں میں آنا جانا شروع کیا۔ اس سلسلے میں بہت سی دشواریاں سامنے آئیں، جن لوگوں نے ارتداد پھیلایا تھا، انھوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، یہاں تک کہ میری ان کوششوں کو فساد کا رنگ دے کر اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو تک پہونچایا، نہرو نے تحقیقات کی، وہ خود آئے جب ان کے سامنے پوری صورت حال آئی تو انھوں نے میری کوششوں کی تائید کی، غرض اس جدوجہد میں کئی سال گزر گئے، اللہ کا فضل ہوا کہ بہت سے لوگ بلکہ اکثر لوگ دین اسلام کی طرف واپس آگئے۔
>
> اب میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس بلا کا مستقل سدّ باب ہونا چاہئے میں نے دیکھا کہ یہ سب کھیل مسلمانوں کی دین سے جہالت اور ناواقفی کی بنا پر کھیلا گیا ہے، دل میں یہ بات آئی کہ اس کا مستقل اور پائیدار علاج یہی ہے کہ مدارس اور مکاتب قائم کئے جائیں اور ان میں مسلمانوں کے بچوں کو لاکر پڑھایا جائے، میرے پاس وسائل تو تھے نہیں، میں اپنے گاؤں میں بیٹھ گیا، اور یہاں اللہ تعالیٰ نے مدرسہ کی یہ صورت بنادی۔

بس اتنا فرما کر حضرت خاموش ہوگئے، میں نے پوچھا بھی مگر مدرسہ کی جدوجہد، اس کی ابتدائی تعمیر وتاسیس اور اس سلسلے کی کاوشوں کے سلسلے میں حضرت نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

یہاں سے یہ راز کھلا کہ حضرت اقدس بچوں کی تعلیم کا اتنا اہتمام کیوں کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ بچے تعلیم کی راہ سے دین کے حلقے میں آجائیں اور اس میں انھیں استقامت حاصل ہوجائے، اور پھر ان کے ذریعہ سے دینی تعلیم اور دینی اعمال واخلاق عام ہوں، اور اس میں شبہہ نہیں حضرت کا یہ فیصلہ بہت کامیاب رہا، وہی باندہ جس کے جغرافیہ سے بھی اہل علم حضرات ناواقف تھے، علم وفضل کا ایک زبردست مرکز بن گیا ہے اور ہندوستان کا کون سا صاحب علم ایسا ہوگا جو وہاں اس مردِ درویش کی وجہ سے نہ گیا ہو۔

مولانا کے قلب مبارک میں تبلیغ دین اور اشاعت علم دین کی جو لگن بلکہ تڑپ تھی وہ ہمہ وقت انھیں بے چین ومضطرب رکھتی تھی، وہ کہیں آرام سے بیٹھ نہیں سکتے تھے، اس سلسلے میں ان کے مجاہدے اتنے زیادہ ہیں کہ انھیں دیکھ کر اور سن کر حیرت ہوتی ہے اور ان کی توجیہ بجز خاص توفیق الٰہی اور رحمت خداوندی کے اور کچھ نہیں ہوسکتی، اپنی جگہ پر ہوتے تو وقتاً فوقتاً بلکہ بعض ایام میں روزانہ طلبہ کو کسی وقت نصیحت فرماتے، انھیں دین کی طرف متوجہ فرماتے کہ یہ سچے دین دار ہوں گے تو اس کا اثر

بہت زیادہ ہوگا۔ باہر سے آنے والوں کا مجمع تو ہمیشہ رہتا ہی تھا، اگر کسی عالم دین کا ورود ہوتا، تو ان سے فرمائش کرتے کہ کچھ بیان فرمادیں اور اصرار سے بیان کرواتے، اور اس بیان میں خود بھی تشریف رکھتے، آج سے دس سال قبل ایک بار خدمت اقدس میں حاضری ہوئی، اس وقت میں نے **امام محمد بن حسین الآجری المتوفیٰ ۳۶۰ھ** کے ایک رسالہ ''**اخلاق العلماء**'' کا ترجمہ کیا تھا اور وہ شائع ہوا تھا، میں نے وہ رسالہ حضرت کی خدمت میں پیش کیا تو تقریباً آدھ گھنٹہ تک اسے پڑھتے رہے اور پھر عشاء کے بعد تمام طلبہ اور اساتذہ کو روک کر اس کے مضامین سناتے رہے۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ! یہ تواضع! اور یہ افادہ کی لگن!

اس خاکسار کی حاضری حضرت کی خدمت میں پہلی مرتبہ ۱۳۹۸ھ میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی کی رفاقت میں ہوئی، ساتھ میں الہ آباد کے امانت علی صاحب، حافظ محمد سرور صاحب اور انیس بھائی تھے، یہ قافلہ جب ہتھورا مدرسہ میں پہونچا تو حضرت مولانا کی مسرت قابل دید تھی، اس وقت حضرت کی شہرت دور دراز علاقوں میں عام نہیں ہوئی تھی، اس لئے ہجوم بھی کم تھا اور پھر جامی صاحب کے ہونے کی وجہ سے حضرت نے گویا اسباق کے علاوہ اور کام سے خود کو فارغ کرلیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد طلبہ واساتذہ کے مجمع میں جامی صاحب کا بیان رکھا، مولانا جامی صاحب عام انداز میں وعظ وبیان کے عادی نہ تھے، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے ملفوظات سناتے اور درمیان درمیان میں مختصر سی تشریح فرماتے جاتے، یہی بیان ہوتا، مگر مؤثر ہوتا۔

رات میں اس خاکسار کو حکم دیا کہ تم بھی بیان کرو، تو میں تو سناٹے میں آگیا، میری ہمت جواب دینے لگی، اس وقت میں وعظ وتقریر کا زیادہ عادی بھی نہ تھا اور ان

اکابر کے سامنے ایک طفل مکتب کیا زبان کھولتا۔ بہت معذرت کی مگر قبول نہ ہوئی غرض تعمیل حکم میں بیان کرنے کے لئے بیٹھ گیا، بیان میں بالکل خلاف توقع بہت اچھے مضامین آگئے۔ اس تقریر کی بہت تحسین کی گئی، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ بڑے میاں کا تصرف ہے ورنہ یہاں کچھ نہیں ہے۔ دعا اور توجہ انھوں نے کی اور داد وتحسین کا لطف اس ہیچ پوچ کو حاصل ہوا۔

دوسرے دن حضرت نے پروگرام بنایا کہ علاقہ کے چند گاؤں کا دورہ کیا جائے، اور ان جگہوں میں وعظ وبیان ہو، مگر حضرت مولانا جامی صاحب نے وقت نہ ہونے کے باعث معذرت کی، تو فرمایا کہ کم از کم باندہ شہر میں ایک وعظ ہوجائے، مولانا جامی صاحب اس کے لئے آمادہ ہوگئے۔

چنانچہ ہم لوگ حضرت مولانا کی معیت میں رات کے وقت عشاء سے کچھ پہلے باندہ پہونچے، حضرت نے انتظام کررکھا تھا۔ اعلان بھی خوب ہوا تھا۔ چنانچہ ایک بڑی مسجد میں اچھا خاصا مجمع اکٹھا ہوگیا اور کچھ دیر حضرت مولانا جامی صاحب نے وعظ فرمایا، اور دیر تک اس بے ہنر نے مشق کی۔

اس موقع پر حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ ایک ہفتہ مجھے وقت دیجئے، میں باندہ کے دیہاتوں میں آپ کا وعظ کراؤں گا، میں نے حضرت کے حکم کی بنا پر وعدہ بھی کرلیا تھا۔ پھر بہت دنوں تک حضرت اس وعدے کی یاد دلاتے رہے، مگر خود حضرت کی مشغولیات اتنی بڑھتی چلی گئیں کہ یہ وعدہ وعدہ ہی رہ گیا، کبھی مدرسہ میں کسی تقریب سے عوام الناس کا مجمع زیادہ ہوتا تو حضرت اس موقع سے فائدہ اٹھاتے اور وہاں پر موجود کسی باہر کے عالم سے وعظ کہلواتے، حضرت کی موجودگی میں جو وعظ ہوتے ان کا رنگ ہی نرالا ہوتا، ایک مرتبہ ختم بخاری شریف کی تقریب تھی، بخاری شریف کا آخری سبق پڑھانے کے لئے جامعہ مظاہر علوم سہارن پور کے شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد یونس صاحب جون پوری تشریف لائے تھے، قسمت کی خوبی تھی کہ اسی وقت اپنے دوستوں حضرت مولانا عبدالرب صاحب اعظمی اور برادر عزیز بدر عالم جہانا گنجی کی معیت میں یہ خاکسار بھی پہونچ گیا، ظہر کے بعد ہم لوگ پہونچے تو وہاں بڑی ہماہمی دیکھی، معلوم ہوا کہ کل ختم بخاری شریف کا پروگرام ہے، ہم لوگوں کا ارادہ علی الصباح لوٹنے کا تھا، حضرت مولانا سے ملاقات ہوئی تو بہت خوش ہوئے، پروگرام دریافت فرمایا، ہم لوگوں نے بتادیا، فرمایا کہ کل نو بجے ختم بخاری شریف ہے، ہم لوگوں کو وقت میں تنگی محسوس ہورہی تھی، حضرت نے شیخ کے پاس کہلوایا کہ ان لوگوں کو صبح سویرے واپس ہونا ہے، اگر اجازت ہو تو فجر کے بعد بخاری شریف ختم کرنے کا اہتمام کرلیا جائے، یہ پیغام شیخ کے پاس بھیجا اور پھر خود ہی تشریف لے گئے، میں اس وقت کسی طرف نکل گیا تھا، مجھے تلاش کرکے بلوایا اور اس مسئلہ پر غور ہونے لگا، حضرت شیخ مدظلہٗ نے ازراہِ لطف فرمایا! اسے جانے دیجئے اس کے جانے کے بعد ہی بخاری شریف کا درس ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت والا! یہ نہیں ہوسکتا اگر آپ بعد ظہر درس دیں گے تو بھی انشاء اللہ درس میں شریک ہوکر ہی ہم لوگ جائیں گے۔ حضرت اقدس خوش ہوگئے، پروگرام درس کا اپنی جگہ برقرار رہا، ہم لوگوں نے اپنا نظام تبدیل کرلیا۔

مغرب کی نماز ہوئی، اور حضرت نے شیخ کے پاس پیغام کہلوایا کہ آج عوام کا مجمع بہت ہے، اگر اجازت ہو..........قربان جایئے حضرت کی تواضع پر کہ خود سب کچھ ہیں، لیکن شیخ تشریف لائے ہیں تو اب ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی کام نہ ہوگا ....تو مولانا ابوالبرکات صاحب ندوی اور..........اعجاز احمد تشریف لائے ہیں، ان سے کچھ بیان کروادیا جائے، حضرت شیخ نے فرمایا کہ یہی تو میری بھی خواہش ہے، چنانچہ اعلان ہوگیا اور بعد نماز عشاء مولانا ابوالبرکات صاحب ندوی

اور خاکسار کا بیان ہوا۔

یہ تو مدرسہ میں مولانا کا حال تھا۔ مدرسہ کے باہر جب سفر میں تشریف لے جاتے تو نہ کہیں آرام سے بیٹھتے اور نہ اپنی تکان کا خیال فرماتے، تھوڑے سے وقت میں کئی جگہ تشریف لے جاتے اور ہر جگہ وہاں کے مناسب وعظ فرماتے، اس بندۂ حقیر کو بھی متعدد دفعہ سفر میں ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، عموماً جب وقت میں گنجائش ہوتی تو اپنے ساتھ اس حقیر بندہ کی بھی تقریر کرواتے۔

ایک بار دوست پور مدرسہ دعوت الحق کے جلسے میں بندہ شریک تھا، حضرت کا بھی پروگرام تھا، حضرت ابھی تشریف نہیں لائے تھے، منتظمین نے مجھ سے تقریر کی فرمائش کی، میں نے تقریر کی، جوں ہی تقریر کرکے میں فارغ ہوا حضرت اقدس تشریف لائے، آتے ہی بغیر تمہید کے اسٹیج پر تشریف لائے اور بلا تاخیر تقریر شروع کردی، یہ کشف تھا یا توارد کہ تقریر کے لئے میں نے جس آیت کی تلاوت کی تھی، حضرت نے بھی اسی کی تلاوت فرمائی اور نہایت مؤثر وعظ فرمایا، وعظ سے فارغ ہوکر فرمایا کہ وقت میں گنجائش ہو تو میرے ساتھ چلئے، یہ حکم میرے لئے عین سعادت تھا، ایک دوسرے گاؤں میں کھانے کا انتظام تھا وہاں تشریف لے گئے، خود تو کیا کھاتے ساتھیوں کو کھلایا اور جیپ پر سوار ہوگئے، صبح صادق کے قریب فیض آباد پہونچے، سب سے کہا کہ سو جاؤ اور خود تہجد میں لگ گئے، فجر کی نماز کے قریب جگایا، جامع مسجد میں نماز ادا کی گئی، نماز کے بعد مجھے حکم دیا کہ وعظ کہئے، میں کانپ گیا مگر تعمیل حکم سے چارہ نہ تھا۔ اتنی دیر جب تک وعظ ہوتا رہا بیٹھے رہے پھر کچھ اور قیام کرکے آگے روانہ ہوئے، اس روز دن بھر میں پانچ چھ تقریریں کیں۔

بس ایک لگن تھی، دھن تھی کہ مسلمانوں کے کانوں میں دینی باتیں پڑجائیں، اس کے لئے وہ ہمہ وقت مضطرب رہتے تھے، سفر میں ہوتے تو ان کے لئے دن

رات کا فرق مٹ جاتا، گاڑی میں جتنی دیر سو لیتے بس وہی سونا ہوتا، باقی مسلسل عمل وحرکت میں ہوتے البتہ جو خادم ان کے ساتھ ہوتا یا خدام ہوتے ان کی راحت کا بہت اہتمام فرماتے، منزل پر پہونچتے ہی ان کی راحت کا انتظام کر دیتے، فرماتے کہ جتنی دیر میں یہاں ہوں آرام سے سو رہو، اس کے باوجود کہ وہ تھک کر چور ہو جاتے مگر آپ کی زبان پر حرف تکان نہ آتا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر کو جن کی ہدایت کو قیامت تک کیلئے ہدایت قرار دیا ہے، ان آخری پیغمبر کو قرآن مجید میں خطاب کر کے امر فرمایا ہے **فإذا فرغت فانصب وإلیٰ ربک فارغب** (سورہ الم نشرح، آیت ۷، ۸) جب تم کار تبلیغ سے فرصت پاؤ تو اپنے آپ کو تھکاؤ اور اپنے رب کی طرف رغبت سے آؤ، یعنی دعوت وتبلیغ کے عوامی اور عمومی کام سے فارغ ہو کر یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کے حضور میں تنہا کھڑے رہو، حمد ومناجات، تضرع وزاری اور دعا وعبادت میں لگو، کھلی بات ہے کہ یہ امر جب نبی کے لئے ہے تو وارثین نبی کے لئے بھی یہی حکم ہوگا۔

حضرت اقدس کو اس آیت پر عمل کرتے خوب دیکھا، حضرت کو عبادت کا خاص ذوق تھا، نماز باجماعت کا اہتمام تھا، سفر میں ہوتے تو رفقاء کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرتے، نماز نہایت خشوع اور اطمینان سے ادا کرتے، نماز کی حلاوت محسوس ہوتا تھا کہ..........انھیں حاصل ہے۔

اشراق، اوابین وتہجد کے بہت پابند تھے، کسی بھی مشغولیت میں ہوں، وقت ہو جانے پر بغیر کسی کسل کے یہ نوافل ادا فرماتے، سفر عموماً آپ کا رات بھر ہوتا، صبح صادق سے پہلے منزل پر پہونچتے، رفقاء تھک کر چور ہو جاتے، وہ آرام کی فکر میں ہوتے اور حضرت کو دیکھا جاتا تو کسی گوشہ میں ہاتھ باندھے مناجاتِ رب میں مشغول ہیں۔

بنارس مظہر العلوم میں جلسہ تھا۔ میں اس وقت غازی پور میں مدرس تھا، شوق تھا کہ حضرت کو غازی پور لاؤں، بنارس حاضر ہوا، امیدوار اور بھی تھے، لیکن حضرت کو محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچنا تھا، میری درخواست منظور ہوگئی، کیونکہ غازی پور راستے میں ہے، ایک بجے کے بعد گاڑی وہاں سے نکلی غازی پور پہونچے تو صبح صادق ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا اور لوگ تو سونے کے انتظام میں لگ گئے اور حضرت مسجد کے ایک گوشہ میں تہجد میں مشغول ہو گئے۔

اس طرح کے متعدد واقعات میرے سامنے پیش آئے، حضرت اقدس نہایت جید حافظ اور قاری بھی تھے، سفر میں جب گاڑی پر بیٹھے ہوتے، یا پیدل راستہ چلتے ہوتے تو مسلسل زیر لب تلاوت جاری رہتی۔

ایسے ہی خاص خاص روزوں کے بہت پابند تھے، عرفہ کا روزہ، عاشورہ کے روزے، پندرہ شعبان کا روزہ بہت پابندی کے ساتھ رکھتے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ تین شخصوں سے بہت محبت فرماتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص وہ ہے کہ **قوم ساروا لیلتهم حتیٰ إذا کان النوم أحب إلیهم مما یعدل بهٖ فوضعوا رؤوسهم فقال یتملقنی ویتلوا آیاتی** (مشکوٰۃ شریف، بحوالہ ترمذی ونسائی شریف باب **فضل الصدقه**)

اللہ تعالیٰ جن تین آدمیوں سے محبت فرماتے ہیں، ان میں سے ایک شخص وہ ہے، کہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ رات بھر چلا، پھر جب ان کو نیند ہر اس چیز سے پیاری اور محبوب ہوگئی، جو اس کے برابر ہو سکتی ہے، اور انھوں نے اپنے سر بستروں پر رکھ لئے، تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ آدمی علیحدہ کھڑے ہو کر میری خوشامد کرنے اور میری آیات کی تلاوت میں لگ گیا۔

حضرت مولانا اس حدیث کے ہو بہو نمونہ تھے، کتنے ہی تھکے ہوئے ہوں، مبتلاء آزار ہوں، رات بھر جگے ہوں، مگر اخیر رات میں ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ ان کے ہاتھ پروردگار کے سامنے بندھے ہوئے ہیں اور زبان مشغول تلاوت ہے، اس کے لئے سفر حضر کی کوئی قید نہ تھی۔

جاڑے کا موسم تھا، ہم چار پانچ لوگ حضرت کے ساتھ ایک کمرے میں آدھی رات کے بعد سوئے تھے پروگرام یہ تھا کہ سویرے اٹھ کر اپنی فجر جماعت سے ادا کر کے بس پکڑنی ہے، میری آنکھ کھلی تو فجر کا وقت ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ پورا قافلہ سو رہا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ جگاؤں یا نہ جگاؤں، پھر فیصلہ کیا کہ نہیں جگاؤں گا، ان کا سونا دوسروں کے جاگنے سے افضل ہے ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک صاحب کی آنکھ کھلی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، ان کے ہڑبڑانے سے حضرت مولانا بھی جاگ گئے، جاگنا تھا کہ بجلی کی تیزی سے بستر سے الگ ہوگئے اور اس نیت سے کہ ابھی بس اڈے جانا ہوگا، سب کے سامان سمیٹے اور فوراً مسجد چلے گئے، ہم لوگ بھی ذرا عجلت میں استنجاء ووضو سے فارغ ہو کر پہونچے تو دیکھا کہ حضرت مولانا ایک گوشے میں اطمینان سے نوافل پڑھ رہے ہیں، مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے وقت میں کتنی برکت ہے!

بہترین بندہ وہ ہے، جو اپنے خالق کی بھی عبادت کر لے اور اس کے بندوں کی بھی خدمت کر لے، حدیث شریف میں ہے کہ: **الخلق عيال الله فاحب الخلق إلى الله من أحسن إلىٰ عيالهٖ** (مشکوٰۃ شریف، **باب الشفقة والرحمة على الخلق** بحوالہ شعب الایمان) تمام مخلوق اللہ کی عیال ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب تر مخلوق وہ ہے جو اس کے عیال کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

حضرت مولانا کا پورا وجود اور پوری زندگی اس حدیث کی عملی تفسیر تھی، وہ سراپا رحم وکرم تھے، محبت وشفقت تھے، ہمہ تن خدمت وہمدردی تھے، پیکر سلوک وعنایت تھے، کسی کا کوئی کام ہو کیسا ہی کام ہو بس یہ ہے کہ دائرۂ شریعت میں ہو وہ مولانا کا کام ہے۔ کسی نے مدد چاہی اور مولانا اس سے زیادہ اہتمام سے اس کام میں لگ گئے۔ اس میں کسی مذہب وملت کی تفریق نہ تھی، غیر مسلم اہل حاجت بھی بکثرت آپ کی خدمت میں آتے تھے اور آپ ان کی خدمت ودلجوئی کرتے تھے۔

خدمت کی پہلی بنیاد دعا ہے اور حضرت تو اللہ والے تھے، بڑے اہتمام سے دعا کرتے تھے، بعض مرتبہ تو اس طرح دعا کرتے تھے کی جس کیلئے دعا کرتے تھے اسے معلوم بھی نہ ہوتا اور مولانا اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے اس کا کام پورا کرا دیتے۔ ایک چھوٹی سی بستی میں پردھانی کا الیکشن تھا، اس جگہ عدد کے اعتبار سے مسلمان کم ہیں مگر وجاہت کے اعتبار سے یہی غالب ہیں، لیکن اب آزادی اور بے راہ روی کا زور ہے، اندیشہ تھا کہ غیر مسلم پردھان ہو جائے گا تو مسلمانوں کو نقصان پہونچے گا، پردھانی کیلئے ایک با اثر ہندو اور ایک فارغ دیوبند مولوی صاحب امیدوار تھے، اللہ کا کرنا کہ خلاف توقع مولوی صاحب اچھے ووٹوں سے کامیاب ہوئے، انھیں پردھان کی معیت میں میری حاضری حضرت کی خدمت میں ہوئی، میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہ پردھان صاحب ہیں، حضرت کا چہرہ کھل اٹھا، فرمایا کہ مجھے کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ پردھانی کے امیدوار ہیں۔ میں ان کیلئے برابر دعا کر رہا تھا کہ یہ جیت جائیں، اللہ کا شکر ہے، پھر ان کو نصیحتیں کرنے لگے۔

ان مولوی صاحب نے حضرت کو نہیں بتایا تھا، لیکن حضرت کو از خود فکر ہوئی اور بالآخر ان کی دعا سے کامیاب ہو گئے، حالانکہ امید کامیابی کی نہیں تھی۔

اس طرح نہ جانے کتنے لوگوں کے لئے برابر اور مسلسل دعائیں کیا کرتے تھے، فکر مند رہتے تھے، اس کیلئے کسی شہادت اور گواہی کی ضرورت نہیں، حضرت کے

سارے اہل تعلق ان کی دعاؤں سے مستفید ہوتے تھے اور سب کو اطمینان رہتا تھا کہ کوئی بھی مسئلہ ہوگا حضرت سے دعا کیلئے کہیں گے، اور پھر وہ کام ہو جائے گا اور اس کے حل ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔

میرے منہ کے اندر تالو میں ایک پھوڑا بہت پرانا تھا، اس میں کوئی تکلیف نہ تھی بس تھوڑا سا ابھرا ہوا تھا اور شاید بیس سال سے زیادہ سے تھا مگر کبھی علاج کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ اخیر میں اس سے کبھی کبھی پانی نکلنے لگا، تکلیف اب بھی نہ تھی مگر پانی کی وجہ سے شبہہ ہوا کہ اس کی وجہ سے وضو باقی رہے گا یا ٹوٹ جائے گا ڈاکٹروں کو دکھایا تو بتایا کہ پھوڑا ہے، ایکسرے کروایا تو معلوم ہوا کہ تین دانت اندر سے متاثر ہیں، انھیں نکالنا پڑے گا، آپریشن قدرے دقت طلب ہے۔ میں اس کے علاج کے لئے بمبئی چلا گیا۔ اپنے بزرگ کرم فرما قاری ولی اللہ صاحب مدظلہٗ کی وساطت سے میں دانتوں کے سب سے بڑے ڈاکٹر کے پاس پہونچا دیا گیا۔ اس نے ساری تفصیل سنی، معائنہ کیا پھر ایکسرے کروایا۔ بہت پرانا پھوڑا ہونے کی وجہ سے وہ تذبذب میں تھا۔ دس پندرہ دن کی تحقیق و کاوش کے بعد اطمینان ہوا کہ صرف پھوڑا ہی ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ میں آپریشن کروں گا تو ۳۰؍ ہزار روپے کے قریب صرف ہوں گے۔ فلاں اسپتال میں چلے جائیں وہاں بہت کم میں آپریشن ہو جائے گا۔ میرے بھیونڈی کے دوستوں نے مخالفت کی اور کہا کہ بھیونڈی چلئے وہاں ایک مسلمان ڈاکٹر دانتوں بہت کا ماہر ہے، اسے دکھایا جائے، بھوینڈی آکر اسے دکھایا تو اس نے اولاً تو کہا کہ بے ہوش کر کے آپریشن کرنا ہوگا مگر عین آپریشن کے دن اس کی رائے یہ ہوئی کہ بغیر بے ہوش کئے محض اوپر کے جبڑے ماؤف کر کے آپریشن کر دیا جائے، میں تو یہی چاہتا تھا، دو گھنٹے میں آپریشن کا عمل مکمل ہوا۔ بحمد اللہ آرام سے آپریشن ہوا اور کامیاب ہوا۔

واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کو میرے بمبئی جانے اور پھوڑے کا علم کسی ذریعہ سے ہو گیا تھا۔ وہ مضطرب تھے، ان کے ایک خصوصی عقیدت مند جو مجھ پر بھی کرم کرتے ہیں وہ مجھے بتا رہے تھے کہ حضرت نے آپ کے متعلق پوچھا، میں نے لاعلمی ظاہر کی تو حضرت نے ناخوشی کا اظہار کیا کہ ان کے حالات سے باخبر رہنا چاہئے، اب معلوم ہوا کہ مشکل معاملہ نہایت آسانی سے کیونکر حل ہوا؟ اس طرح حضرت مولانا لوگوں کی خدمت غائبانہ حاضرانہ دعاؤں کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔

دوسرا بڑا ذریعہ جس کے واسطے سے انھوں نے بلاتفریق مذہب وملت بے شمار لوگوں کی خدمت کی تعویذات ہیں، یہ چیز حضرت مولانا کے ساتھ اس طرح لازم ہو گئی تھی کہ سفر و حضر ہر جگہ اہل حاجت تعویذوں کے لئے ہجوم کئے رہتے تھے۔ حضرت کے پاس رہنے اور ان کی باتیں سننے سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں تعویذات کا ذوق نہیں ہے بسا اوقات وہ لوگوں کو سمجھاتے بھی تھے مگر یہ دیکھ کر کہ اس سے کتنے لوگوں کا کام بنتا ہے اور کتنے ہیں جو اسی ذریعہ سے صالحین سے قریب ہو جاتے ہیں، بے شمار لوگ اسی راہ سے دین دار ہو جاتے ہیں، حضرت لوگوں کو تعویذ دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دستِ مبارک میں ایسی تاثیر بخشی تھی کہ عموماً لوگوں کی حاجات حق تعالیٰ پوری فرما دیتے تھے، مریض شفایاب ہو جاتے تھے، غیر مسلم آتے تھے وہ بھی اپنی پریشانیوں کا مداوا لے کر جاتے تھے۔

ہر روز سینکڑوں آدمی مصائب سے پریشان ہو کر حضرت کی خدمت میں آتے تھے اور مسرور و مطمئن ہو کر واپس جاتے تھے۔ حضرت کے یہاں انکار و دل شکنی کا کوئی خانہ نہ تھا، ایک ایک آدمی کئی کئی تعویذ کی فرمائش کرتا اور حضرت اس کی فرمائش پوری کرتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ تعویذوں کی فرمائش پوری کرنا بھی کرامت سے کم نہ تھا۔ ابھی تو دیکھنے والے بہت ہیں لیکن جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے انھیں نہیں

سمجھا یا جاسکتا کہ اہل حاجت کی کثرت اور ہجوم سے حضرت اقدس کس طرح نہایت خوش اسلوبی سے نمٹتے تھے۔ اسباق تو کثرت سے پڑھاتے ہی تھے ہر سبق کے دوران آنے والوں کا ہجوم ہوجاتا۔ آپ ان کی بات سنتے، ان کا کام کرتے اور پھر دوسرے سبق میں مشغول ہوجاتے۔ اتنے میں پھر اتنا ہی ہجوم ہوجاتا دل تھا کہ سمندر تھا، حوصلہ تھا کہ پہاڑ تھا، نہ ذرا دل تنگی ہوتی نہ از جارفتہ ہوتے۔

ہر ایک مطمئن ہوتا، شاداں وفرحاں ہوتا، حضرت کی محبت وعنایت کی حلاوت اپنے دل میں پاتا، دردمندوں کو دوا ملتی، پریشان حالوں کو اپنے غم کا مداوا ملتا،

بعض حضرات کو اتنی کثرت سے تعویذ دینے پر اشکال ہوتا کہ لیکن حضرت نے اس راہ سے بہت سے لوگوں کے ایمان کی حفاظت فرمائی۔ ارتداد کے سیلاب پر بند باندھنے میں تعویذات بھی زبردست مؤثر ثابت ہوئے تھے۔

میری پہلی حاضری جب حضرت کے یہاں ہوئی تھی تو آپ اپنے حجرے میں تشریف فرماتے، مدرسہ کے بعض اساتذہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، ایک دو صاحب اجنبی سے بھی موجود تھے، مدرسہ میں بجلی کا خرچ بہت تھا کچھ اور میٹر بڑھانے کی بات چل رہی تھی، کسی نے مشورہ دیا کہ بجائے میٹر بڑھانے کے، درخواست دی جائے کہ ایک چھوٹا ٹرانسفارمر مدرسے کے لئے لگا دیا جائے، حضرت نے فرمایا کہ بجلی کا محکمہ بڑا مشکل محکمہ ہے، اس کیلئے مسلسل بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی، کون اس کا تحمل کرے گا، اسی پر غور ہو رہا تھا کہ وہ اجنبی شخص جو خاموش بیٹھا ہوا تھا، اسے تعویذ کی ضرورت تھی، وہ تعویذ پاچکا تھا مگر ابھی بیٹھا ہوا تھا، بول پڑا کہ اس کیلئے کسی بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں ہے، ایک درخواست ابھی لکھ کر مجھے دے دی جائے، ٹرانسفارمر منظور کرنا میرا ہی کام ہے، میں اسی محکمہ کا افسر ہوں، وہ دو تین روز میں لگ جائے گا۔ سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے، حضرت نے اسی شخص کو کاغذ دے کر

فرمایا کہ آپ درخواست لکھ دیں، اس نے خود درخواست لکھی، حضرت سے دستخط کرائے اور درخواست جیب میں رکھ کر چلا گیا۔ یہ ہے اللہ کی مدد۔

اس طرح نہ جانے کتنے واقعات ہوں گے، حضرت کے قریب رہنے والے حضرات ان سے بخوبی واقف ہوں گے، ایک بار حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؒ نے فرمایا کہ مولانا آپ نے یہ کام بہت بڑھا دیا ہے۔ فرمایا کہ حضرت ناظم صاحب (حضرت کے شیخ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ) نے فرمایا تھا کہ کسی کو تم سے نفع ہوجائے تو خدمت سے دریغ نہ کرنا۔ میں اسی فرمان کی وجہ سے ہر ایک کو تعویذ دے دیا کرتا ہوں کہ شاید نفع ہوجائے۔

ان دونوں باطنی اور روحانی طریقوں کے علاوہ اور بھی جس کسی کو کسی خدمت ضرورت ہوتی اور آپ کو اس کا علم ہوجاتا آپ سے درخواست کی جاتی تو اس سے قطع نظر کی آپ کس حیثیت کے بزرگ ہیں، ہر خدمت کے لئے تیار ہوجاتے۔ مدرسہ اور مدرسہ کے متعلقات اور حضرات مدرسین وملازمین اور طلبہ کی خبر گیری، ان کی نگہداشت اور ان کی خدمت ورعایت کا تو ایک مستقل باب ہے۔ اس کو تو وہی حضرات بخوبی بیان کرسکیں گے، ان کے علاوہ بھی عالم یہ ہوتا کہ ایک شخص آتا ہے کہ میرا فلاں آدمی بہت بیمار ہے اس کا علاج بمبئی میں ہوسکتا ہے، پھر یہ ہوتا کہ حضرت خود اسے بمبئی لے جارہے ہیں، اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھا رہے ہیں، اس کی کفالت کررہے ہیں۔ اپنے متعلقین میں کوئی بیمار ہے تو اس کی عیادت کے لئے جارہے ہیں پوشیدہ طور پر اس کی مدد کررہے ہیں، جنھیں کوئی نہیں پوچھتا انھیں سر پر بٹھا رہے ہیں، ان کا خیال رکھ رہے ہیں۔

۱۴۱۵ھ میں حضرت مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور تشریف لائے تھے، میں انھیں لینے کے لئے مئو گیا تھا فرمایا کہ وہاں جانے کا کوئی ایسا راستہ ہے کہ درمیان میں ندوہ

سرائے پڑے، میں نے عرض کیا کہ ہے، آپ نے فرمایا ادھر ہی سے چلئے، ایک صاحب ہمارے یہاں پہلے پڑھاتے تھے، اب بیمار ہیں، ان کی عیادت کرتا چلوں، ہم لوگ عصر کے وقت ندوہ سرائے پہونچے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کے گھر پہونچے، ان کی تو عید ہوگئی، حضرت کچھ دیر وہاں ٹھہرے، تنہائی میں ان سے گفتگو کی پھر تشریف لے آئے۔

ذکر کرچکا ہوں کہ میری پہلی حاضری ایک قافلہ کے ساتھ ہوئی تھی جس میں پانچ آدمی تھے، یہ قافلہ جب واپس ہونے لگا تو حضرت نے سب کو ایک طرف کا کرایہ دے کر واپس فرمایا، معذرت کی گئی تو اصرار فرمایا اور بالآخر قبول کرتے ہی بنی،

یہاں ایک دلچسپ بات کا تذکرہ ضرور کروں گا گوکہ اس کا ایک جز یہاں کے سلسلۂ گفتگو کے لحاظ سے کچھ بے تعلق سا ہوگا۔ حضرت کے یہاں یعنی ہتھورا میرا جانا بار بار ہوا ہے۔ ۱۳۹۸ھ سے ۱۴۱۸ھ تک بیس سال میں ہر سال کم از کم دو بار ضرور جانا ہوا ہے اور کبھی اس سے زائد بھی ہوا ہے، ابتداء میں بہت دن تک میں اپنے خرچ سے جاتا تھا، خدا جانے حضرت کو کشف ہوتا تھا کہ فراست تھی جب بھی میں اپنے خرچ سے گیا حضرت نے باصرار کرایہ آمد ورفت ضرور دیا پھر ایسا ہونے لگا کہ میرے خاص احباب کو جانا ہوتا تو مجھے بھی ساتھ لے لیتے، اس صورت میں کرایہ واخراجات ان کے ذمہ ہوتے، اب اس کی بجز فراستِ ایمانی یا کشف کے اور کیا توجیہ کی جائے کہ اس وقت حضرت کی طرف سے خاموشی رہتی۔

ایک بار چند دوستوں کے ساتھ حاضری ہوئی، ان میں سے ایک صاحب نے راستے میں مجھ سے فرمائش کی کہ اگر حضرت آپ کو کچھ عنایت فرمائیں تو وہ مجھے دے دیجئے گا میں اسے بہ نیتِ برکت محفوظ رکھوں گا۔ میں نے کہا وہ زمانہ چلا گیا، اب میں آپ لوگوں کے خرچ پر جاتا ہوں تو حضرت کی طرف سے عطیہ کا سلسلہ بھی موقوف

ہوگیا ہے۔ بات ختم ہوگئی۔ حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی، ہم لوگ ایک پرائیویٹ گاڑی سے گئے تھے، یہ وہم بھی نہ تھا کہ حضرت کی طرف سے کچھ بخشش ہوگی، چوبیس گھنٹے قیام رہا، جب حضرت سے رُخصت ہوکر گاڑی پر بیٹھ گئے اور گاڑی اسٹارٹ ہوگئی تو اچانک ایک صاحب دوڑے ہوئے آئے کہ حضرت بلا رہے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ کیا خاص بات ہے، اتر کے تیزی سے گیا، حضرت ایک طرف لوگوں سے کچھ فاصلہ پر تنہا کھڑے تھے، جیب میں ہاتھ ڈالا اور ۱۰۰؍ روپئے کا نوٹ نکال کر دینے لگے کہ اس سے گاڑی میں تیل ڈلوا لیجئے گا، میں نے معذرت کی کہ حضرت اس کی ضرورت نہیں ہے، حضرت اصرار فرما رہے تھے اور میں معذرت کر رہا تھا، حضرت نے فرمایا لے بھی لیجئے اس پر اچانک راستے والی بات یاد آئی جس کی مجھ سے فرمائش ہوئی تھے، میری روح وجد میں آگئی، اللہ اکبر کہاں کی بات کہاں تک آپہونچی، میں نے جھٹ وہ نوٹ لے لیا اور اسی طرح لئے ہوئے ان صاحب کے حوالے کردیا کہ لیجئے آپ کی نیت وخواہش پوری ہوگئی، خلاف توقع اور خلاف معمول حضرت نے یہ روپیہ اب کی بار عنایت فرمایا ہے۔ حضرت کے یہاں بخشش وعطایا کے قصے چلتے ہی رہتے تھے۔ نہ جانے کتنے لوگ اس کے شاہد ہوں گے۔ حضرت اقدس کے قلب وروح میں حب مال یا حب جاہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد! حضرت اقدس نے زندگی بھر اپنے کو خادم بنائے رکھا۔ اتنے عالی مرتبہ ہونے کے باوجود کبھی اس کا احساس نہیں ہوا کہ وہ بھی کوئی مرتبہ رکھتے ہیں اور اس مرتبہ کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی حاضری ہوئی تھی تو رات کے اخیر میں استنجا کے لئے بیدار ہوا اور لوٹا لے کے آگے بڑھا کہ نل سے پانی لوں، چند قدم چلا تھا کہ تیزی سے ایک سایہ آتا ہوا محسوس ہوا، دیکھا تو حضرت تھے انھوں نے میرے ہاتھ سے لوٹا لے لیا کہ آپ کو معلوم نہیں ہوگا

کہ نل کہاں ہے، میں پانی لا دیتا ہوں، میں ہکا بکا ہو گیا، پھر میں نے بڑی لجاجت سے عرض کی کہ مجھے معلوم ہے کہ نل کہاں ہے، میں گنہ گار تو ہوں مزید گنہ گار نہ بنایئے، خیریت گزری کہ حضرت کو ترس آگیا اور لوٹا مجھے دے دیا۔ اسی سفر میں دیکھا کہ تمام خدام سامنے موجود ہیں، حضرت نے فرمایا کہ فلاں جگہ مہمانوں کے لئے پلنگ بچھا دیجئے اور جب تک کوئی پہونچتا حضرت خود ہی پہونچ کر پلنگ بچھانے لگے، خدام دوڑے اور حضرت سے پلنگ لے لی۔

حضرت کا جذبۂ خدمت عام تھا، علماء اور مشائخ کے سامنے تو بچھے رہتے تھے اسی خدمت کا ایک شعبہ مہمان نوازی کا بھی تھا، حضرات علماء کی آمد کی خبر حضرت کو ملتی تو نہایت مسرت اور اہتمام سے ان کی آمد کا انتظار فرماتے، ان کے لئے خاص طور سے رہنے اور کھانے کا انتظام فرماتے، پہلے قدرے فرصت رہتی تھی تو کھلانے کا اہتمام خود ہی کرتے، دسترخوان پر بیٹھتے، گرم روٹی اور سالن کی تاکید فرماتے، اخیر میں جب ہجوم زیادہ رہنے لگا تھا تو بسا اوقات حضرت شریک دسترخوان نہ ہو پاتے مگر نگرانی اور تاکید پوری رکھتے اور اچانک کھانے کے دوران آ بھی جاتے، اس کی وجہ سے خدام کو بہت مستعد رہنا پڑتا۔

میں جب بھی حاضر ہوتا بغیر کسی اطلاع کے حاضر ہوتا، بعض احباب کہتے کہ پہلے سے معلوم کرلیا جائے یا کم از کم کوئی اطلاع کردی جائے کیونکہ حضرت کے اسفار بکثرت ہوتے رہتے ہیں لیکن میری طبیعت نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ جانتا تھا کہ علم ہوجانے کے بعد حضرت کو انتظار ہوگا اور اگر خدانخواستہ اپنا ارادۂ سفر منسوخ ہوا تو حضرت کو تکلیف ہوگی، بلا اطلاع کے جاتا اور یہ نیت کر کے جاتا کہ اگر ملاقات ہوگئی تو زہے نصیب، نہیں ہوگی تو حاضری کا ثواب تو مل ہی جائے گا مگر اللہ کا بڑا فضل رہا کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ملاقات نہ ہوئی ہو۔

ایک مرتبہ حماقت کی کہ خط لکھ دیا کہ فلاں تاریخ کو حاضر ہونے کا قصد ہے، میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ حیدرآباد گیا ہوا تھا، وہاں سے واپسی میں پروگرام تھا کہ ہتھورا حاضری دی جائے، میں نے اطلاع کردی، پھر ہم لوگ حیدرآباد سے چلے اسی لحاظ سے کہ وقت موعود پر ہتھورا حاضری ہوجائے گی مگر مشیئتِ الٰہی کہ گاڑی ۱۲/ گھنٹے لیٹ ہوگئی اس کے نتیجے میں دوسرے دن وہاں پہونچ سکے، پہونچتے ہی وہاں کے اساتذہ اور حضرت کے خدام نے بتایا کہ کل ہی سے آپ کا انتظار ہو رہا ہے، حضرت نے خاص اہتمام کر کے پرندوں کے گوشت کا انتظام کروایا، دوپہر کو کھانا پکا، وہ چار بجے شام تک رکھا گیا پھر شام کو اور پرندے حاصل کر کے ان کا گوشت پکوایا اور دس گیارہ بجے رات تک اسے رکھوایا پھر جب ناامیدی ہوگئی تو کچھ دوسرے مہمانوں کو کھلایا، مجھے نہایت شرمندگی ہوئی، حضرت سے ملاقات ہوئی تو کھانے وغیرہ کا تذکرہ انھوں نے نہیں کیا البتہ یہ فرمایا کہ کل ہی سے آپ کا انتظار تھا، میں نے صورتحال عرض کی۔

ایک بار شیخوپور کے مولانا مستقیم احسن صاحب اعظمی جو بمبئی میں رہتے ہیں اور مولانا عبدالرب صاحب اعظمی کے ساتھ حاضری ہوئی رات کو نو بجے کے بعد باندہ شہر میں پہونچے، وہیں ایک ہوٹل میں ہم لوگوں نے کھانا کھا لیا کہ ناوقت حضرت کو کھانے کی زحمت نہ کرنی پڑے، گیارہ بجے ہتھورا مدرسہ میں پہونچے، مفتی محمد زید صاحب سے ملاقات ہوئی انھوں نے بتایا کہ حضرت ابھی سو گئے ہیں، انھوں نے کھانے کو پوچھا، ہم لوگوں نے کہا کہ کھانا ابھی باندہ میں کھا چکے ہیں، نماز نہیں پڑھی ہے، نماز پڑھیں گے اور سو جائیں گے، آپ ہم لوگوں کو کمرہ بتا دیں، انھوں نے مہمان خانے میں پہونچا دیا، ہم لوگ وضو اور نماز کی تیاری کرنے لگے، اتنے میں مفتی محمد زید صاحب آگئے اور فرمایا کہ حضرت بیدار ہوگئے ہیں اور حکم دیا ہے کہ

آپ لوگوں کھانا کھلا دیا جائے، میں نے ان سے کہا کہ جس طرح ممکن ہو حضرت کو مطمئن کردیں کہ ہم لوگ خوب شکم سیر ہو کر کھانا کھا چکے ہیں، اگر اس کے لئے آپ کو قسم بھی کھانی پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کیجئے گا۔ وہ بیچارے گئے اور الٹے پاؤں لوٹ کر آئے اور یہ کہا کہ حضرت بلا رہے ہیں، میں بھی حاضر ہوا اور رفقاء بھی حاضر ہوئے، اس وقت حضرت گھٹنوں کے شدید درد میں مبتلا تھے، ملاقات ہوئی بہت شفقت اور مہربانی فرمائی اور فرمایا کہ کھانا کھالیجئے، ہم نے نہایت اصرار سے معذرت کی، مگر حضرت کے حکم کے آگے ایک نہ چلی، تعمیل حکم میں کھانا کھانا ہی پڑا۔

واپسی ہوتی تو خواہ کوئی وقت ہوتا حضرت کھانا ضرور کھلاتے، یہ حضرت کا مزاج تھا، بے شمار لوگ اپنی اپنی حاجات اور اغراض لے کر آتے اور حضرت سب کی حاجت بھی پوری کرتے اور کھانا بھی کھلاتے۔ اس اللہ کے بندے کا سینہ کتنا فراخ اور دل کتنا وسیع تھا کہ آدمی دیکھ دیکھ کر حیران ہوا جاتا تھا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب مدظلہ تشریف لاتے تو حضرت کی خوشی دیدنی ہوتی، ان کے آجانے کے بعد ہر کام ان کے مشورے بلکہ حضرت کی زبان اختیار کروں تو ان کی اجازت سے ہوتا، حضرت ان کے سامنے بچھے جاتے۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہ بخاری شریف کا آخری سبق پڑھانے کے لئے ہتھورا تشریف لائے تھے، درس شروع ہوا، طلبہ تپائیوں پر کتاب اور کاپی سنبھال کر بیٹھ گئے، دیکھا تو حضرت بھی طالب علموں کی زمرے میں تپائی پر کتاب اور کاپی رکھے بیٹھے ہیں، شیخ کا درس شروع ہوا تو حضرت نے کاغذ اور قلم سنبھال لیا اور جس طرح طلبہ اپنے اساتذہ کی تقریریں نوٹ کرتے ہیں مجھے محسوس ہوا کہ حضرت اسی طرح شیخ کی تقریر کی خاص خاص چیزیں نوٹ کر رہے ہیں۔

اللہ اکبر! وقت کا اتنا بڑا شیخ، مقبول ترین انسان، بہترین عالم اس طرح اپنے

کو فنا کئے ہوئے اور مٹائے ہوئے تھا، **رفع اللہ درجاتہ**

خدمت کا ایک اور انداز ملاحظہ ہو، حضرت تو پیکر جمال تھے جدھر دیکھئے حسن عمل کا ایک جلوہ دکھائی دیتا تھا۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ میری پہلی حاضری حضرت مولانا جامی صاحب کے ساتھ ہوئی تھی، اس موقع پر حضرت نے باندہ کیا ایک وسیع مسجد میں ہم لوگوں کے وعظ کا انتظام کیا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا، شب میں گیارہ بجے کے قریب وعظ ختم ہوا، بارہ بجے ٹرین کا وقت تھا، ہم لوگوں نے پروگرام بنایا کہ ذرا چائے وغیرہ پی کر اسٹیشن چلیں، حضرت نے فرمایا کہ ٹرین کا کچھ ٹھیک نہیں کہ کب آئے، جاڑے کی رات ہے آپ لوگ پریشان ہوں گے، میں اسٹیشن جا کر معلوم کر کے آتا ہوں کہ وہ لیٹ تو نہیں ہے، ہم لوگ حیران کہ یا اللہ! آپ جائیں گے، ہاں ہاں میں جا کے ابھی معلوم کر کے آجاتا ہوں، ہمارے ساتھ حافظ سرور بھی تھے جو حضرت کے بہت چہیتے شاگرد ہیں اور بے تکلف بھی، اوپر گزر چکا ہے کہ الہ آباد میں حضرت وقت بے وقت تشریف لاتے تو حافظ سرور صاحب کے کتب خانہ میں رومال بچھا کر لیٹ جاتے اور حافظ سرور صاحب، حضرت کے مزاج کے مطابق کھانا لا کر وہیں کھلا دیتے، حافظ سرور نے کہا کہ حضرت میں جا کر معلوم کر کے آتا ہوں، فرمایا تم سے نہیں بنے گا، میں ہی جا کر معلوم کروں گا، حافظ سرور نے کہا کہ ایک سائیکل منگوا دیجئے، فوراً چلا جاتا ہوں، سائیکل آگئی، حافظ سرور صاحب نے اس پر سوار ہونا چاہا تو حضرت نے فرمایا کہ مجھے بھی بٹھا لو، سائیکل میں پیچھے کیریر نہین تھا، حضرت آگے ہی سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ گئے اور اسٹیشن گئے اور تھوڑی دیر میں معلوم کر کے آگئے، فرمایا کہ گاڑی وقت پر ہے، لیکن آپ لوگ آرام کر لیجئے، صبح بس سے چلے جائیے گا۔ پھر یہ بات طے ہوگئی، واللہ عجب شان تھی اس مرد خدا کی۔

حضرت اقدس کی خدمت، عبادت وطاعت اخلاص وللّٰہیت اور مجاہدہ و

ریاضت کا اثر تھا کہ حق تعالیٰ نے آپ کو عوام وخواص میں بڑی مقبولیت عطا فرمائی تھی ۔ حضرت کی مقبولیت وشہرت کا انداز یہ نہیں تھا کہ عوام کی بھیڑ بھاڑ اکٹھی ہوگئی ہو بلکہ آپ کی مقبولیت اس فطری اور صحیح ترتیب پر تھی جس کا ایک حدیث میں ذکر آیا ہے، یہ حدیث مشکوٰۃ شریف کے **باب الحب فی اللہ ومن اللہ** میں مسلم شریف کے حوالے سے نقل کی گئی ہے، روایت کرنے والے حضرت ابوہریرہؓ ہیں، وہ فرماتے ہیں: **قال رسول اللہ ﷺ إن اللہ إذا أحب عبداً دعا جبرئیلؑ فقال إنی أحب فلاناً فأحبہ قال فیحبہ جبرئیل ثم ینادی فی السماء فیقول إن اللہ یحب فلاناً فأحبوہ فیحبہ اھل السماء ثم یوضع لہ القبول فی الارض** ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو جبرئیل کو بلاتے ہیں اور ان سے فرماتے ہیں کہ مجھے فلاں بندے سے محبت ہے تم بھی اس سے محبت کرو تو جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر وہ آسمانوں میں ہر طرف پکار دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو فلاں بندے سے محبت ہے، تم لوگ بھی اس سے محبت کرو، پھر آسمانوں میں اس کی محبت عام ہوجاتی ہے، پھر اس کے بعد اس کی مقبولیت زمین پر اتار دی جاتی ہے۔

مقبولیت کی یہی صحیح ترتیب ہے کہ پہلے خواص میں مقبولیت ہو اور اس کے بعد عوام میں ۔ حضرت کی مقبولیت اور محبوبیت کی یہی ترتیب دیکھی گئی ۔ عوام میں ان کی شہرت عام ادھر چند برسوں سے ہوئی تھی البتہ اللہ والوں کے درمیان بہت پہلے سے وہ مقبول ومحبوب تھے ۔ حضرت کے اساتذہ ومشائخ کی نظر کرم تو ان پر بالکل ابتدا ہی سے رہی ہے ۔ حضرت مولانا شاہ اسعد اللہ صاحب علیہ الرحمہ ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارن پور کے تو وہ مجاز ومعتمد تھے ہی، ان کے علاوہ حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ مفتیٔ اعظم دار العلوم دیوبند کا ان کے ساتھ جو

معاملہ تھا بس اللہ ہی جانتا ہے اس میں کس قدر محبت، شفقت اور عنایت شامل تھی ۔ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ حضرت اقدس کے استاد تھے اور جامعہ عربیہ ہتھورا کے شروع ہی سے سرپرست تھے۔

یہاں مجھے حضرت مولانا نفیس اکبر صاحب مدظلہٗ کا بیان کردہ ایک واقعہ یاد آرہا ہے، اس واقعہ سے دونوں بزرگوں کے باہمی تعلق کی نوعیت بھی معلوم ہوتی ہے اور حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ جس جود وسخا کے ساتھ معروف تھے اس کی بھی جھلک ملتی ہے۔

مولانا نفیس اکبر صاحب، حضرت اقدس کے قدیم ترین تلامذہ میں ایک نہایت بزرگ ہستی ہیں، وہ شروع ہی سے حضرت کے ساتھ ہیں، حضرت کے مدرسہ کے ابتدائی طالب علم اور پھر فراغت کے بعد وہیں مدرس ہیں، انھوں نے مدرسہ کا ہر دور دیکھا ہے، معلوم ہے کہ مدرسہ اپنے آغاز میں چند جھونپڑیوں پر مشتمل تھا، یہ جھونپڑیاں خود حضرت اقدس اور طلبہ مل کر بناتے تھے، بعد میں جب طلبہ بڑھے تو ضرورت ہوئی کہ کوئی مستقل تعمیر مدرسے کی ہو ۔ ابتداءً تجویز ہوئی کہ چھ کمرے بنا لئے جائیں ۔ حضرت نے مولانا نفیس اکبر صاحب کو جو اس وقت مدرس ہوچکے تھے اور ان کے ساتھ دو اور صاحبوں کو کان پور بھیجا، وہاں حضرت مفتی صاحبؒ اس وقت جامع العلوم میں مفتی اور شیخ الحدیث تھے، یہ لوگ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں پہونچے، مدعا بیان کیا کہ مدرسے میں چھ کمرے بننے تجویز ہوئے ہیں، ایک کمرہ ہزار روپئے میں تیار ہوگا حضرت کوئی تحریر عطا فرمادیں اور اہل خیر کو اشارہ فرمادیں تو چھ ہزار روپئے جمع ہوجائیں ۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے سن کر فرمایا کہ یہیں ٹھہرو، کھانا کھاؤ پھر بتاؤں گا، ان لوگوں نے دوپہر کا کھانا کھایا، حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ مولوی صدیق صاحب سے کہو کہ چندے کی فکر نہ کریں، یہ کہہ کر انھوں نے

چھ ہزار روپئے نکالے اور ان حضرات کو دے کر واپس فرمادیا۔ اس مقدس اور بابرکت عطیہ سے ابتدائی چھ ابتدائی کمرے تعمیر ہوئے، اسی میں کا ایک کمرہ اخیر تک حضرت کی قیام گاہ رہا۔

حضرت اقدس مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ جب دیوبند صدارت افتاء کے منصب پر فائز ہوکر گئے تو حضرت مولانا گاہے گاہے حاضری دیتے تھے اور جب وہ آجاتے تو حضرت مفتی صاحب کو بڑا انشاط اور انبساط ہوتا، جن دنوں راقم الحروف دیوبند میں تھا حضرت تشریف لائے، ان کے جانے کے بعد ایک طالب علم نے جو حضرت مفتی صاحب کے یہاں حاضر رہا کرتا تھا بیان کیا کہ باندہ کے مولانا صدیق صاحب آئے تھے، حضرت مفتی صاحب کے یہاں نہایت مسکنت وتواضع سے بیٹھے تھے، باتوں باتوں میں حضرت مفتی صاحب نے کسی بات پر خوش ہوکر فرمایا کہ مولوی صدیق! میرے بدن پر جو کچھ ہے سب آپ کا اور یہ کہہ کر فوراً لباس تبدیل کیا، کرتا اور کرتے میں جو کچھ تھا، اسی طرح بدن کی تمام چیزیں حضرت کو بخش دیں۔

بعد میں جب حضرت کی شہرت عام ہوئی تو مقبولیت کا وہ عالم تھا کہ پچھلی تاریخ کے ان علماء کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جن کی ایک جنبش سے پورا پورا شہر حرکت میں آجاتا تھا، دمشق کے علامہ عزالدین عبدالسلام کو حکومت نے شہر بدر کیا تو پورا دمشق ان کے ساتھ باہر نکل پڑا کہ جب آپ نہیں تو ہم بھی نہیں۔

حضرت بختیار کاکیؒ کو ان کے شیخ طریقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے کسی وجہ سے حکم دیا کہ دلی کے بجائے میرے ساتھ اجمیر چلو تو دلی کی آبادی ان کے ساتھ چل پڑی کہ ہم بھی وہیں رہیں گے جہاں خواجہ صاحب رہیں گے۔ اس پر حضرت خواجہ صاحب نے دلی میں اذنِ قیام دیا۔

حضرت کی مقبولیت کا یہی رنگ دیکھنے میں آیا کہ جدھر اس درویش بے نوا کا

رُخ ہوا خلقت ٹوٹی پڑتی تھی۔ حضرت عام معنوں میں واعظ نہ تھے نہ الفاظ کی تراش خراش تھی نہ تقریر مرصع ہوتی تھی، مگر جب وہ سادہ انداز میں نصیحت شروع کرتے تو ہزاروں لوگ گوش برآواز ہوتے، آواز نہ پہونچتی تب بھی لوگ صبر وسکون کے ساتھ بیٹھے رہتے، حضرت کا وعظ نہایت مؤثر ہوتا۔

میں نے حضرت کو شہروں میں بھی دیکھا، قصبات میں بھی دیکھا، چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی دیکھا، لوگ پروانہ وار ٹوٹے پڑتے تھے جیسے دلوں میں کسی نے پھونک دیا ہو کہ یہ شخصیت گو کہ تمہارے درمیان ہے مگر یہ کچھ اور ہی شے ہے۔ یہ مقبولیت مسلمانوں میں تو تھی ہی ان سے آگے بڑھ کر ہندوؤں میں بھی بڑی محبوبیت تھی۔ باندہ میں سنا کہ ہندو انھیں چھوٹا بھگوان کہتے تھے، میں نے یہ منظر خود دیکھا ہے کہ بڑے بڑے ذی وجاہت ہندو حاضر خدمت ہیں اور جتنی دیر وہ ہیں ہاتھ جوڑے ہوئے ہیں، حضرت منع فرماتے تو وہ ہاتھ نیچے کرلیتے مگر جوڑے ہی رہتے۔

شروع میں مدرسہ سے دوتین کلومیٹر کچا راستہ تھا، ایک بار ہمارے قافلے کو جس میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی علیہ الرحمہ تھے، رُخصت کرنے کے لئے حضرت باندہ تک کے قصد سے نکلے۔ قبیل مغرب کا وقت تھا سب لوگ پیدل چل رہے تھے، طلبہ کا ہجوم بھی ساتھ تھا، ایک غیر مسلم بوڑھا بیل گاڑی پر چنوں کے پودوں کا ڈھیر لاد کر لا رہا تھا، بیل چل رہے تھے اور وہ بوڑھا اس ڈھیر کے اوپر لیٹا ہوا تھا۔ بیل گاڑی جب آگے بڑھی تو اسے احساس ہوا کہ حضرت ہیں تو بے اختیار اسی ڈھیر پر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا اور جب تک حضرت دور نہیں نکل گئے اسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

ہم لوگ جب سڑک کے قریب پہونچے ابھی دوتین فرلانگ کا فاصلہ باقی تھا کہ ایک بس مین روڈ سے باندہ کی طرف جاتے ہوئی نظر آئی، ڈرائیور کو احساس ہوا

کہ حضرت ہیں، اس نے بس کو روک دیا اور منتظر رہا، حضرت نے فرمایا کہ سڑک پر پہونچ کر مغرب کی نماز ادا کی جائے گی، حضرت نے اشارہ کیا کہ تم چلے جاؤ مگر وہ کھڑا رہا پھر جب حضرت کا اشارہ مسلسل اس نے دیکھا اور اسے سمجھ میں آگیا کہ یہ لوگ کچھ دیر ٹھہر کر نماز پڑھیں گے تو وہ روانہ ہوا، جیسے ہی ہم لوگ سڑک پر پہونچے ایک دوسری بس آکر رکی، اسے بھی حضرت نے رُخصت کیا، نماز اطمینان سے پڑھی گئی، نماز سے فارغ ہونے کے تھوڑی دیر بعد تیسری بس آئی وہ بھی ٹھہری، حضرت اس بس میں سوار ہوئے، بس چلی کنڈکٹر حضرت کے قریب آکر کھڑا ہوگیا، حضرت اس کو کرایہ دینے لگے کل سات آدمی تھے، اس نے ہاتھ جوڑ کر بڑی لجاجت سے کہا صرف آپ کا آشیرواد چاہئے، حضرت نے بہت اصرار کیا مگر اس نے کسی قیمت پر کرایہ لینا منظور نہیں کیا، اس نے یہ بھی کہا کہ گاڑی کے مالک کا یہی حکم ہے۔

جب باندہ شہر پہونچے اور گاڑی سے اترے تو رکشہ والوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ ہتھورا والے بابا ہیں، بہت سے رکشہ والے دوڑ پڑے اور انھوں نے بھی کسی طرح کرایہ لینا منظور نہیں کیا۔

اس وقت یہ بھی دیکھا کہ آس پاس کے گاؤں دیہات سے بیل گاڑی والے، ٹریکٹر ٹرالی والے، ہتھورا کی طرف سے گزرتے تو حضرت کی خدمت ضرور جاتے اور پوچھتے کی کسی مہمان کو کہیں جانا ہو تو یہ سواری حاضر ہے۔ دیہاتوں کے لوگ آئے ہوئے ہوتے تو حضرت ادھر جانے والی گاڑیوں میں انھیں بٹھا دیتے، بعد میں جب کاروں اور جیپوں کا ہجوم رہنے لگا تو اس وقت بھی موقع ومحل کے مناسب لوگوں کو کسی گاڑی پر سوار کر کے بھیجتے تھے اور لوگ اپنی سعادت سمجھ کر یہ خدمت انجام دیتے تھے۔

حضرت اقدس مسلمانوں کے آپسی تنازعات کو حل کرنے میں بہت دلچسپی

رکھتے تھے اور حضرت کی مقبولیت اور وجاہت کا اثر تھا کہ بڑے بڑے سنگین نزاعات حضرت کی توجہ سے حل ہو جایا کرتے تھے۔

الہ آباد کے انیس بھائی بیان کرتے ہیں کہ شادی کی ایک تقریب میں دو پارٹیوں کی طرف سے بندوقیں تنی ہوئی تھیں، حضرت اقدس تشریف لے گئے تو تنی ہوئی بندوقیں سرنگوں ہوگئیں اور بحسن وخوبی نکاح کی تقریب انجام پا گئی۔

حضرت کی مقبولیت کے مظاہر کی داستانیں اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کو سمیٹا نہیں جا سکتا مگر ایک خاص بہت ہی خاص بات یہ تھی کہ حضرت کو اس مقبولیت اور مقبولیت کے مظاہر سے کوئی دلچسپی یا دل بستگی نہ تھی، خلقت کی خلقت حضرت کے نام پر جمع ہوتی تھی، حضرت پر ٹوٹی پڑتی تھی لیکن حضرت کا یہ حال ہوتا تھا کہ جیسے کوئی چیز ان سے متعلق ہی نہ ہو، نہ کبھی ان کا تذکرہ نہ اس کی کوئی اہمیت، وہ ویسی ہی سادگی اور فنائیت کے ساتھ آتے جاتے، وہ صرف کام کرنا جانتے تھے۔ اپنے کاموں اور کارناموں کا تذکرہ باید وشاید کرتے ہوں۔ میں نے تو کبھی نہیں سنا، پوچھنے پر بھی کوئی ایسی بات فرما دیتے جس سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ کسی اور ہی خیال میں ہیں۔

مدرسے کا سارا کاروبار ان کے دم سے تھا مگر مدرسہ میں اس طرح رہتے تھے جیسے اس سارے نظام کا وہ بھی اسی طرح ایک جز ہیں جیسے دوسرے حضرات!

اسے اخفائے حال کہا جائے یا فنائیت کا نام دیا جائے لیکن ہے بڑے حوصلے کی بات کہ سب کچھ ہوتے ہوئے اپنے کو کبھی کچھ نہیں سمجھا جیسے انھیں خبر ہی نہ ہو کہ میں کچھ ہوں اور بسا اوقات ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ انھیں اپنی شخصیت کی عظمت کی کوئی خبر ہی نہیں ہے، حالانکہ چہار جانب غُل پڑا ہوا تھا کہ باندہ کا درویش ایک مردِ عظیم ہے۔ سب کے کانوں میں یہ آواز آتی تھی اگر نہیں آتی تھی تو اس مرد عظیم کے کانوں میں نہیں آتی تھی۔

حضرات صوفیہ کے مقامات اور حالات میں ایک مقام کا تذکرہ آتا ہے، اسے ’’**فناء الفنا**‘‘ کہتے ہیں یعنی آدمی سے یہ علم بھی مٹ جائے کہ میں اپنی ہستی فنا کرچکا ہوں، اگر اسے یہ علم واحساس باقی ہے کہ میں اپنی ہستی کو فنا ونیست کرچکا ہوں تو گویا اسے ابھی اپنی ہستی اور شخصیت کا علم وادراک باقی ہے اور جب یہ احساس نہیں رہا کہ میری کوئی شخصیت تھی جو فنا ہوگئی ہے تو ’’**فناء الفنا**‘‘ کا مرتبہ ہے اور یہ فنائیت وعبدیت کی انتہا ہے، پھر اس مقام پر پہونچ کر بندہ چاہے جتنی ترقی کرے،

حضرت اقدس کے بارے میں بار بار یہ خیال گزرا کہ یہ اسی مرتبے کے انسان تھے، وہ متواضع تھے لیکن ان کی کسی حرکت وسکون سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ انھیں اپنے متواضع ہونے کا احساس بھی ہے۔ عبدیت کی اس شان نے انھیں نہ جانے کس مقام تک پہونچایا تھا۔ آسی مرحوم کا شعر ہے۔

اتنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہوا
اور اس سے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہوا

حضرت کی علالت کی خبریں مل رہی تھیں، ایک بار یہ بھی معلوم ہوا کہ لکھنؤ کے کسی اسپتال میں ہیں، ارادہ ہورہا تھا کہ حاضری دی جائے مگر پروگرام نہیں بن پا رہا تھا کہ ۲۳؍ربیع الآخر ۱۴۱۸ھ (اگست ۱۹۹۸ء) بروز جمعرات بعد نماز ظہر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ مولانا عبدالرب صاحب اعظم گڑھ سے اطلاع دے رہے تھے کہ حضرت مولانا قاری قاری صدیق صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ واقعہ ہونا تھا ہوگیا، بتایا کہ آج ہی رات کو نو بجے جنازہ کی نماز ادا کی جائے گی، وقت پر پہونچنے کا کوئی امکان نہیں تھا، نظام یہ بنا کہ کل سویرے سفر کا آغاز کیا جائے، تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے شاگرد مولوی عبداللہ سلّمہٗ کا ٹیلیفون سنجر پور سے آیا، ان کا گریہ کسی طرح تھم نہیں رہا تھا، انھین بمشکل تسلی دی، جمعہ کے روز علی الصباح ہم لوگوں کا قافلہ باندہ کے لئے روانہ ہوا۔ ساتھ میں مولانا عبدالرب صاحب اور بدر عالم جہانا گنج والے بھی تھے، شام قبیل مغرب ہم لوگ ہتھورا پہونچے لوگوں کا ہجوم تھا، لوگ فاتحہ خوانی کررہے تھے ہم لوگ بھی حاضر ہوئے، دل پر بڑا بوجھ تھا کچھ دیر وہاں ٹھہر کر دعا وایصال ثواب میں مشغول رہے پھر مدرسہ میں حاضر ہوئے، صاحبزادگان سے ملاقات ہوئی۔ بڑا مجمع تھا، ہر طرف سوگواری چھائی ہوئی تھی، ہر شخص کو احساس ہورہا تھا کہ ایک بڑی قیمتی شے ہاتھ سے نکل گئی، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب بھی تشریف فرما تھے، مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب بھی موجود تھے اور قافلے مسلسل آرہے تھے، حیدرآباد، ڈابھیل، دلی اور نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ بے تابانہ آرہے تھے۔ حضرت کے ساجزادگان اور مدرسہ کے اساتذہ اور خدام کا کمال صبر وضبط قابل دید تھا کہ اس صدمہ شدید سے دوچار ہونے کے باوجود خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ بعد نماز عشاء مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب کی تقریر ہوئی، جس میں انھوں نے حضرت کے اوصاف ومحامد کو بہت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا اور تلقین کی کہ حضرت طریقہ واسوہ کو اپنایا جائے۔

ہم لوگ فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد ہتھورا سے دل پر غموں کا بوجھ لئے ہوئے رُخصت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کے اسوہ ودستور کو زندہ رکھے، ان کی یادگار مدرسہ عربیہ ہتھورا کو قائم ودائم رکھے اور ان کے نامۂ اعمال میں اس کے ذریعہ حسنات کا اضافہ کرتا رہے۔ آمین!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نمونۂ اسلاف

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نوراللہ مرقدہٗ

اگر آج کسی سے پوچھا جائے کہ تم نے جنید وشبلی کو دیکھا ہے؟ بایزید بُسطامی و ابوالحسن خرقانی سے ملاقات کی ہے؟ شیخ عبدالقادر جیلانی وخواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کی ہے؟ خواجہ نظام الدین اولیاء وخواجہ نصیرالدین چراغ دہلی سے ملے ہو؟ میاں جی نور محمد وحاجی امداداللہ مہاجر مکی کی خدمت میں حاضر ہوئے ہو؟ تو اس کا جواب یقیناً یہی ہوگا کہ نہیں! پھر اس سے پوچھئے کہ تم نے باندہ والے حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب کو دیکھا ہے؟ اگر وہ کہے کہ ہاں انھیں دیکھا ہے، انھیں سنا ہے، ان سے مصافحہ کیا ہے، ان کا مہمان رہا ہوں، اگر وہ یہ کہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم نے پچھلے بزرگوں کا جلوہ دیکھا ہے، جنید وشبلی کا علم وعرفان، بایزید بسطامی و ابوالحسن خرقانی کے مجاہدات وریاضات، شیخ عبدالقادر جیلانی وخواجہ معین الدین چشتی کا فیضان عام، خواجہ نظام الدین وخواجہ نصیرالدین کی محبوبیت واتباعِ سنت، میاں جی نور محمد وحاجی امداداللہ کی روحانیت، سب کا نمونہ تم نے دیکھ لیا۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب اس دور ظلمت میں ایک ماہتاب ہدایت تھے، اللہ کی قدرت کاملہ کی حجت بالغہ تھے، اسلام کی حقانیت کی دلیل وبرہان تھے، وہ اس بات کے نشان تھے کہ آدمی خواہ کتنا ہی بے نوا ہو، ظاہری اسباب ووسائل

سے تہی دامن ہو، دور افتادہ اور گمنام علاقہ میں ہو، جہل وضلالت کے ماحول میں ہو، لیکن اگر اس کے پاس ایمان کی طاقت، توکل کا سرمایہ، یقین کی پختگی، محبت کی سرشاری، اللہ کے لئے اخلاص سنت پر شیفتگی اور دین کا سچا درد ہو، نیز خدمتِ خلق کا جذبہ ہو، تو بے نوائی کی تہوں سے اس کیلئے بال وپر پیدا ہوں گے، اسباب ووسائل سے تہی دامنی، کامیابی کا زینہ بن جائے گی، علاقہ کی گمنامی اس کی شہرت کا دروازہ ثابت ہوگی، جہل وضلالت کی چٹانوں سے علم ومعرفت کے سرچشمے اُبل پڑیں گے۔

حضرت مولانا جب اپنی تعلیم سے فارغ ہوئے، تو ہندوستان ایک نئے انقلاب سے دوچار ہورہا تھا۔ انگریزوں کی حکومت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی، ابتداءً حضرت نے ایک عربی مدرسہ میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، پھر خبریں ملنے لگیں کہ باندہ کے بعض علاقوں میں کم علم اور ناخواندہ افراد پر ارتداد کی بلا مسلط کی جارہی ہے، اس خبر کو سن کر حضرت تڑپ اٹھے۔ کتابیں پڑھی تھیں اور خوب سمجھ کر پڑھی تھیں، کہ بعد میں اچھے مدرس بنیں گے، اونچی کتابوں کا درس دیں گے، لیکن اب جو خبر سنی، تو یہاں مسئلہ اونچی کتابوں کا نہ تھا، اعلیٰ مدرسی کا نہ تھا، دین وایمان کی بنیاد واساس کا تھا، اگر مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد لقمۂ کفر بن جائے، جنت سے نکل کر جہنم میں گر جائے، تو میرا پڑھنا لکھنا کس کام کا؟ پھر بھول گئے کہ مجھے کیا ہونا ہے؟ اور میں نے کیا پڑھا ہے؟ صرف ایک بات یاد رہی کہ مخلوقِ خدا کو عذابِ جہنم سے بچانا ہے، نبی کریم ﷺ کا دین، جسے مٹانے کی کوشش ہورہی ہے، اس کو زندہ کرنے کے لئے خود کو مٹانا ہے، اس عزم کے ساتھ باندہ لوٹ آئے، جہاں آرام وراحت کا کوئی سامان نہ تھا، جہاں جاہ ومنصب کا کوئی نشان نہ تھا۔ جہاں علمی حوصلہ مندیوں کے لئے کوئی میدان نہ تھا۔ جہاں حضرت کہنا تو دور ہے، مولوی صاحب کہنے والے بھی کم ہی تھے، لیکن حضرت نے اللہ کے لئے عزت وآبرو، جاہ ومنصب، مال ومنال

شہرت وناموری، سب کا خیال دل سے نکال پھینکا، مشکلات میں مردانہ وارقدم رکھ دیا، اگر وہ چاہتے، تو اپنے یہاں سے قطع نظر کر کے کسی اونچے مدرسہ میں مدرسی اختیار کر لیتے، اور شہرت وعزت کا ایک خاص مقام پیدا کر لیتے، مگر اللہ کا یہ مخلص بندہ ہر طرف سے یکسو ہو کر اپنے گھر پر ہی دھونی رما کر بیٹھ گیا۔ جہاں جہاں ارتداد کی آگ جل رہی تھی، جل چکی تھی یا جلنے والی تھی، ایمان وعزیمت کی بارش لے کر پہونچ گیا، اور اس آگ کو بجھا کر رہا، اس عمل میں ایک مدت لگ گئی، بڑا مجاہدہ کرنا پڑا، مخالفتوں کے طوفان آئے، مشکلات کی چٹانیں کھڑی ہوئیں، مگر اس مردِ خدا کے عزم وحوصلہ نے طوفانوں کا رُخ موڑ دیا، چٹانوں کو چور کر دیا، ارتداد کی آگ بجھ گئی تو خیال آیا کہ اب کوئی ایسا انتظام کرنا چاہئے، جس کے بعد دوبارہ یہ آگ نہ بھڑکے، احساس ہوا کہ مسلمانوں کے جہل نے اس آگ کو پھیلنے کا موقع دیا تھا، انھیں اگر علم ومعرفت کے اسلحہ سے آراستہ کر دیا جائے، تو دشمن پست ہو جائے گا، بڑے بوڑھے، تو اپنی عمریں پوری کر چکے، جوان اپنی معاش میں سرگرداں ہیں، بچے ہی مستقبل کا سرمایہ ہیں۔ انھیں کسی طرح حاصل کرنا چاہئے اور ان کی عملی ودینی تربیت کرنی چاہئے، یہ دین کے بہترین سپاہی بنیں گے۔

بس اسی خیال نے ہتھورا میں جو حضرت کا آبائی گاؤں ہے، بہت چھوٹا سا گاؤں، اسی گاؤں کی ایک مسجد میں حضرت کو بیٹھا دیا اور اس طرح بیٹھایا، کہ جب ملک الموت نے انھیں دنیا سے اٹھایا ہے، تو صحرا میں گلزار، اور جہل وضلالت کے ظلمت کدے میں علم ومعرفت اور نورِ حق کا ایک عظیم الشان قلعہ تیار ہو چکا تھا، حضرت نے اس وقت سے وفات تک کتنے عظیم مجاہدے کئے ہیں، چھوٹے چھوٹے بچوں کو دینی تعلیم سے آشنا کرنے کیلئے کتنی مشقتیں جھیلی ہیں، مخلوق خدا پر شفقت ومحبت کی کیسی بارش برسائی ہے، اللہ کے مخفی دروازوں کو کتنے جتن اور الحاح وزاری کے ساتھ کھٹکھٹایا ہے، خدا پر کس کس طرح توکل کیا ہے، اس کا نمونہ تو ہم جیسے بعد کے لوگوں نے بھی دیکھا، مگر ابتدائی دور میں کیا رنگ تھا، اسے کچھ وہی لوگ بتا سکتے ہیں، جو اس وقت حضرت کے دم اور قدم کے ساتھ تھے۔

حضرت خدمت وعبادت کے پیکر تھے، وہ اللہ کے بندے تھے، مخلص اور سچے بندے! وہ جو کرتے تھے، اللہ کے لئے کرتے تھے، نہ اپنے نفس کیلئے، نہ اپنے خاندان کیلئے، ان کا مرنا جینا اللہ کیلئے تھا۔ وہ خدا کی عبادت میں بہت چست تھے، نمازِ پنجگانہ تو خیر فرض ہے، اس کی پابندی اور اہتمام کا کیا پوچھنا، رات کے سناٹے کی عبادت ومناجات کا زندگی بھر ایسا التزام رہا کہ رحمتِ حق ٹوٹی پڑتی تھی، حضر میں ہوں، سفر میں ہوں، تندرست ہوں، بیمار ہوں، رات بھر کے جاگے ہوئے ہوں ......اور یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا تھا...... ہر حال میں انھیں رات کے اخیر حصے میں بیدار ہی پایا جاتا، اس میں ذرا بھی سستی نہ ہوتی، میں نے انھیں دیکھا ہے کہ ایک بجے رات کے بعد سوئے ہیں، صبحِ صادق کا وقت قریب ہے، آنکھ کھلتی ہے، اس طرح بجلی کی تیزی سے بستر چھوڑتے ہیں، جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، بے تابانہ اٹھتے ہیں، حوائج سے فارغ ہو کر وضو کرتے ہیں اور پھر نہایت سکون کے ساتھ ہاتھ باندھ کر پروردگار کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ساری رات سفر کیا ہے، سڑک پر گاڑی کے ہچکولوں سے ہڈیاں چور چور ہیں، تکان سے بے حال ہیں نیند کی وجہ سے آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں، منزل پر پہونچتے ہیں، تو تہجد کا وقت ہے، رفقاء سب خوابگاہ ڈھونڈھ رہے ہیں، بستروں پر گر رہے ہیں، اور حضرت لوٹا تلاش کر رہے ہیں، وضو کر رہے ہیں، اور پھر نماز میں اس طرح مشغول ہو جاتے ہیں، جیسے نہ انھوں نے سفر کیا ہے، نہ انھیں کوئی تکان ہے۔

ایک بار ایک مدرسہ کے جلسہ میں ۱۲؍ بجے رات تک شریک رہے، وہاں سے

اٹھے تو ایک صاحب اپنے گھر لے گئے، وہاں سے گاڑی پر بیٹھے تو دو بجے رات کو دوسرے صاحب اپنے گھر لے گئے، حضرت کی دلداری ہے کہ ہر ایک کے گھر بے تکلف جا رہے ہیں، پھر اٹھے تو ڈیڑھ گھنٹے گاڑی پر چل کر ایک قصبے میں پہونچے، سارا قصبہ چشم براہ تھا، لوگ انتظار اور شوق میں رات بھر سوئے نہیں تھے، ایک قافلہ قصبے سے ایک کلومیٹر پہلے منتظر تھا، حضرت کی گاڑی گزر گئی، وہ لوگ دوڑ پڑے، اور بھی قافلے جگہ جگہ راستہ دیکھ رہے تھے، حضرت قصبے کے اندر پہونچے تو پورا قصبہ مصافحہ کے لئے ٹوٹ پڑا کہا گیا کہ مصافحہ بعد میں ہوگا۔ ابھی حضرت کو تھوڑی دیر آرام کرنے دیں۔ لوگ رک گئے، حضرت کمرے کے اندر تشریف لے گئے، باہر عشاق کا ہجوم تھا۔ حضرت نے ایک رفیقِ سفر سے کہا کہ مجھے تھوڑی مہلت مل جاتی، رفیق سفر نے کہا کہ حضرت آنکھ بند کر کے لیٹ جائیں آگے میں سمجھا لوں گا، اتنا سنتے ہی حضرت بلا تامل اور بلا تاخیر لیٹ گئے، اب اس رفیق نے سمجھا کہ حضرت سو گئے ہیں۔ آپ لوگ اب دروازہ چھوڑ دیں، ہجوم ختم کر دیں، لوگ ہٹ گئے اور حضرت واقعۃً نیند سے سو گئے، مگر شاید ۱۵/ منٹ گزرا ہو کہ حضرت تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے، وہ رفیق سفر ہکا بکا ہو گئے، حضرت آرام کیجئے، مگر اب آرام کہاں، وضو کیا، اور ہاتھ باندھ کر نماز میں مشغول ہو گئے۔

اللہ کی محبت دل میں تھی کہ نیند کو وہ اڑا دیا کرتی تھی، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ تین شخصوں سے بہت محبت فرماتے ہیں۔

ان میں سے ایک شخص کا حال آپ نے بتایا کہ **قوم ساروا لیلتھم حتیٰ إذا کان النوم أحب إلیھم مما یعدل بہٖ فوضعوا رؤوسھم فقال یتملقنی ویتلوا آیاتی** (مشکوٰۃ شریف)

اللہ تعالیٰ جن تین آدمیوں سے محبت فرماتے ہیں، ان میں سے ایک شخص وہ

ہے، کہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ رات بھر چلا، پھر جب ان کو نیند ہر اس چیز سے پیاری اور محبوب ہو گئی، جو اس کے برابر ہو سکتی ہے، اور انھوں نے اپنے سر بستروں پر رکھ لئے، تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ آدمی علیٰحدہ کھڑے ہو کر میری خوشامد کرنے اور میری آیات کی تلاوت میں لگ گیا۔

آپ غور کیجئے، حضرت وہی آدمی ہیں یا نہیں؟ پھر وہ اللہ کے محبوب کیوں نہ ہوں گے؟ وہ اس حدیث کے بہترین مصداق تھے، اے اللہ! آپ ہمارے اور ایک مخلوق کی مخلوق کے حسن ظن کو سچا بنایئے۔

عبادت تو یہ تھی، اور خدمت کا حال تو ان بے شمار لوگوں سے معلوم کیجئے جنھوں نے حضرت اقدس کی ذات سے دینی اور دنیوی فوائد حاصل کئے ہیں، اور ایسے لوگوں کو کون گن سکتا ہے۔

مخلوق کی خدمت وہی کر سکتا ہے، جس میں فنائیت اور تواضع درجۂ کمال کو ہو، اور پھر چستی و مستعدی بھی بدرجۂ اتم ہو، اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثواب طلبی کا جذبہ بھی کامل ہو، حضرت اقدس کی تواضع اور فنائیت کا کیا کہنا! اللہ اکبر! اللہ نے جو رتبۂ عظیم انھیں بخشا تھا، وہ عالم آشکارا تھا، مگر وہ ہر ایک کے سامنے بچھے جاتے تھے، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، وہ جسے کوئی نہیں پوچھتا، کوئی نہیں منہ لگاتا، وہ بھی حضرت کے پاس پہونچتا، تو سر پر بٹھایا جاتا، اسے بھی احساس ہوتا کہ میں پوچھا جا سکتا ہوں، وہ زمین پر گرے ہوئے سنگریزوں اور خس و خاشاک کو بھی نوازتے تھے، اس لئے ان کے گزر جانے کے بعد جہاں اہل علم اور اہل کمال کو صدمہ ہوا اور انھوں نے ایک بڑا خلا محسوس کیا، وہیں وہ لوگ جو دوسروں کے نزدیک معمولی اور بے حیثیت ہیں، انھیں بھی محسوس ہوا کہ ان کے سر کا سایہ اٹھ گیا، اور وہ گرم دھوپ میں آ گئے۔

انھیں شاید کبھی بھول کر بھی اس کا خیال نہیں آتا تھا کہ ان کی بھی کوئی عزت ووجاہت ہے، وہ ہر جگہ اپنے اس رنگ میں ممتاز تھے۔

اس فنائیت کا ثمرہ تھا کہ حضرت اقدس ہمہ وقت، ہر شخص کی خدمت کے لئے تیار رہتے تھے، اپنے اہل تعلق کا وہ اہتمام کرتے تھے کہ خود آدمی اتنا اہتمام نہ کر سکے، کوئی بیمار ہے اور آپ اس کے علاج کا اہتمام کر رہے ہیں، اخراجات کا انتظام کر رہے ہیں، کوئی پریشان حال ہے، آپ اس سے زیادہ پریشان ہو رہے ہیں دعائیں کر رہے ہیں، اپنا اثر ورسوخ استعمال کر رہے ہیں، اور جب تک اس کی پریشانی دور نہیں ہو جاتی، آپ فکر مند رہتے ہیں، ان کے پاس پہونچ کر ہر شخص قلبی راحت محسوس کرتا تھا۔ کیا بڑے اور کیا چھوٹے، کیا عالم اور کیا ناخواندہ سب ان کے جگر کے ٹکڑے تھے۔

مدرسہ میں طلبہ آتے، واپس کرنے کا دستور نہ تھا، اپنے یہاں گنجائش نہ ہوتی تو دوسرے مدارس میں داخل کرتے اور پھر اسے یاد رکھتے، ایک طالب علم حضرت کی خدمت میں بیٹھا ہوا اصرار کر رہا تھا کہ میں اس لڑکے کو اپنے گاؤں سے لایا ہوں، اس کا داخلہ کر لیجئے، حضرت فرما رہے تھے کہ فلاں مدرسہ میں اسے داخل کر دو، وہ یہیں داخلہ پر مصر تھا، حضرت فرما رہے تھے کہ اگر پیسہ نہ ہو تو میں تمہارا ابھی اور اس کا بھی کرایہ دیتا ہوں، اسے لے جاؤ، لیکن وہاں مرغ کی ایک ٹانگ تھی، دیکھنے والے اندر اندر کھول رہے تھے، مگر وہ طالب علم جما ہوا تھا، اور حضرت نے اس کی بات مان لی۔

حضرت مدرسہ سے کبھی کسی طالب علم کا اخراج نہیں کرتے تھے، ایک بار فرمایا کہ کوئی مدرسہ ایسا بھی تو ہونا چاہئے، جہاں اخراج نہ ہوتا ہو۔

عجیب تھا یہ مرد درویش، فقیر بے نوا، ایک سادہ انسان تھا، لیکن ہزاروں کی زندگیوں میں رنگ بھر گیا۔ اسلاف کی چلتی پھرتی یادگار! پرانے بزرگوں کا نمونہ! ہم سے قریب اتنا قریب کہ جب چاہئے مل لیجئے، اپنی کہہ لیجئے، سکون حاصل کر لیجئے، مگر رتبہ ومقام کے لحاظ سے بعید، اتنا بعید کہ نگاہ اٹھایئے تو سر سے ٹوپی گر جائے۔

اب یہ شخصیت بھی چلی گئی، ہزاروں کے دلوں میں اپنی یاد، اپنی محبت چھوڑ کر چلی گئی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے، ہم بھی وہیں پہونچنے والے ہیں۔ **إنا لله وإنا إليه راجعون**

☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک گمنام درویش

حافظ محمد فاروق صاحب (علیہ الرحمہ)

وفات: ۲۷؍شعبان ۱۴۱۸ھ

آخر وہ بھی چلا گیا جس کے جانے کا ابھی خیال نہ تھا، ابھی وہ تندرست تھا چاق وچوبند تھا، عمر بھی ایسی کچھ زیادہ نہ تھی، ساٹھ سال کی بھی نہ ہوئی تھی، قضا وقدر نے اس کے ساتھ عجلت کی؟ نہیں! وہ اپنے وقت پر گیا، جتنی مدت کے لئے دنیا میں آیا تھا، اتنا رہا، اس سے ایک منٹ کم نہ رہا، لیکن ہم کو وہ مدت معلوم نہ تھی، ہمیں یہ غلط فہمی تھی کہ چند سال کے بعد ساٹھ سال کی عمر ہوگی، دس سال اور گذریں گے، تب ستّر سال ہوگی پھر آگے بھی دس سال متوقع ہیں، پس اسّی سال کے بعد موت کی راہ دیکھی جائے گی، لیکن ہماری توقع سے بہت پہلے موت کے فرشتہ نے اسے پکار دیا اور وہ لبیک کہہ کر اس کے ساتھ چل دیا۔

وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا، بلکہ شاید لکھنا سرے سے جانتا ہی نہ تھا، ہاں قرآن پڑھتا تھا، قرآن کریم بچپن میں حفظ کرنا شروع کیا تھا مگر تکمیل نہ ہوسکی تھی۔ تاہم ''حافظ'' کا لفظ نام کے ساتھ لگ گیا تھا، وہ اُردو نہیں بولتا تھا، پوربی زبان میں گفتگو کرتا تھا وہ کچھ زیادہ وجیہ بھی نہ تھا، بہت دبلا پتلا، پستہ قد معمولی ناک نقشہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پکا رنگ، مختصر سا چہرہ، داڑھی صرف ٹھوڑی پر قدرے دراز، رخساروں پر بہت کم، گاڑھے کا کرتہ، گاڑھے کی دو پلی ٹوپی، سفید رومال، مِل کا

بنا ہوا تہمد، پلاسٹک کا جوتا، بال سب سیاہ، شاید چند بال سفید ہوئے ہوں، جلدی جلدی بات کرنے کا عادی، ایک بات بار بار دہراتا تھا، اتنی مرتبہ دہراتا اور ایسے انداز سے دہراتا، کہ ناواقف کو ہنسی آنے لگتی۔

بس یہ ظاہری حلیہ تھا اس شخص کا جو ۲۷؍شعبان ۱۴۱۸ھ کی شب میں اچانک چلا گیا، میں جب سفر میں جاتا تو اسے میرے آنے کا انتظار رہتا، اس وقت بھی میں سفر میں تھا، اسے انتظار تھا میں ۲۳؍شعبان کو آنے والا تھا، آتا تو ملاقات ہوجاتی، مگر میں ۲۷؍کو آیا، جب کہ وہ اپنی منزل کو جالیا تھا، میں جنازہ میں شریک نہ ہوسکا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ کون ہے؟ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، اور اس میں کیا خاص بات ہے جس کو میں لکھنا چاہتا ہوں، سنئے! نام اس کا محمد فاروق تھا، حافظ کا لقب نام کے ساتھ جڑا ہوا تھا، رہنے والا اس بستی کا تھا جسے ''مدينة العلماء والحفاظ'' کہئے تو بجا ہے، سابق ضلع اعظم گڈھ اور حالیہ ضلع مئو کی علم وفضل کے لحاظ سے نہایت زرخیز بستی پورہ معروف! لوگوں کی نظر میں وہ معمولی شخص تھا، جاننے والوں کو حیرت ہوگی کہ حافظ محمد فاروق میں کیا خاص بات تھی، وہ کیا اوصاف وکمالات تھے کہ ایک مستقل مضمون ان کے حق میں لکھا جارہا ہے، لیکن بقول ایک فرزانہ کے ؎

جو سب میں ناکارے ہیں، ہم کو جی سے پیارے ہیں
محفل محفل ڈھونڈ رہے ہیں، ٹوٹے ہوئے پیمانے ہم

حافظ محمد فاروق کیا تھے؟ دور سے دیکھئے تو کچھ نہ تھے، ایک عام آدمی تھے، ان میں بظاہر کوئی چیز غیر معمولی نہ تھی، لیکن قریب جایئے تو احساس ہوتا تھا کہ یہ عام آدمیوں کی طرح نہیں ہیں، ان سے کچھ مختلف ہیں، خوش قسمتی سے مجھے ان کے قریب ہونے کا موقع مل گیا تھا، میں نے انھیں بغور دیکھا تو ایسا لگا کہ یہ شخص گدڑی

میں لعلِ شبِ چراغ ہے، میں انھیں زندگی میں اس حدیث کا مرقع سمجھتا تھا کہ **قد أفلح من اسلم ورزق کفافاً وقنعه الله بما آتاه** (مسلم شریف) یعنی وہ کامیاب ہے جسے اسلام کی توفیق ملی، روزی بقدر ضرورت ملی، اور جو کچھ ملا اس پر وہ دل سے قانع رہا، لیکن ان کے مرنے کے بعد لوحِ دل پر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد جگمگا اٹھا، جسے امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ **عن ابی امامة عن النبی ﷺ قال: اغبط اولیائی عندی لمومن خفیف الحاذ، ذو حظ من الصلوٰة، احسن عبادة ربہٖ واطاعهٗ فی السر وکان غامضا فی الناس لا یشار الیه بالاصابع وکان رزقه کفافاً فصبر علیٰ ذٰلک ثم نقد بیدہٖ فقال عجلتْ منیتهٗ قلّت بواکیه قلّ تراثهٗ**

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے اولیاء میں بہت زیادہ قابل رشک میرے نزدیک وہ مومن ہے جو سبک بار (یعنی دنیاوی ساز وسامان اور مال وعیال کے لحاظ سے بہت ہلکا پھلکا ہو) نماز میں اس کا بڑا حصہ ہو، اور اپنے رب کی عبادت اچھی طرح کرتا ہو اور وہ اللہ کا فرمانبردار ہو اور یہ سب اخفا کے ساتھ کرتا ہو، چھپا ہوا اور گمنامی کی حالت میں ہو، اور اس کی طرف انگلیوں سے اشارے نہ کئے جاتے ہوں اور اس کی روزی بقدر کفاف ہو اور وہ اس پر صابر وقانع ہو، پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے چٹکی بجائی اور فرمایا کہ اس کی موت بھی جلد آگئی ہو، اور اس پر رونے والیاں بھی کم ہیں اور ترکہ بھی تھوڑا سا ہے۔

اس حدیث میں قابل رشک مومن کے جو اوصاف ذکر کئے گئے ہیں، وہ سب حافظ محمد فاروق صاحب میں موجود تھے، خفیف الحاذ (سبک بار) تھے، پوشیدہ طور پر اللہ تعالیٰ کے مطیع وفرمانبردار تھے، گمنام تھے، انگلیوں سے ان کی طرف اشارہ

نہیں ہوتا تھا، روزی بقدر کفاف (ضرورت) تھی پھر اس پر صابر وقانع بھی تھے اور اس کے بعد موت بھی جلد آگئی، رونے والی صرف ایک ہے اور ترکہ تو برائے نام ہے، یہ ساری خوبیاں حافظ محمد فاروق صاحب میں موجود تھیں۔

حافظ محمد فاروق صاحب نہایت سادہ مزاج، زبان کے سچے، بات کے کھرے، ظاہر وباطن کے بالکل یکساں تھے، جو زبان پر وہی دل میں، رزقِ حلال کا اتنا اہتمام کہ اس زمانہ میں اس کی نظیر ملنی مشکل، شریعت کی پابندی کا شدت سے التزام، علماء ومشائخ کے نہایت دلدادہٗ وقدرداں، کسی نے کوئی سا بھی احسان کر دیا تو اس کی اتنی شکر گذاری کہ احسان کرنے والا پانی پانی ہو جائے، ان سب کے ساتھ اللہ کا ایک خاص فضل واحسان ان کے ساتھ یہ تھا کہ وہ مستجاب الدعوات تھے، ان کی دعاؤں کی قبولیت کا اتنا تجربہ ہوا ہے کہ ہر مشکل مسئلہ میں نگاہ ان کی طرف اٹھتی تھی اور اطمینان تھا کہ وہ دعا کریں گے اور مشکل حل ہوگی، اب اس اجمال کی قدرے تفصیل بلالحاظِ ترتیب کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ان کے اوصافِ جمیلہ کو ان کے حق میں باعثِ سعادت ونجات اور عام مسلمانوں میں انھیں عام فرمائے۔

میری ان سے پہلی ملاقات پورہ معروف ہی میں ہوئی اور اسی وقت اندازہ ہوا کہ یہ شخص دل کا کتنا صاف، زبان کا کتنا کھرا اور علماء کی کس قدر توقیر کرنیوالا ہے،

یہ آج سے تقریباً ۲۰ ؍سال پہلے کی بات ہے، میری مدرسی کو سات، آٹھ سال گذر چکے تھے، اس وقت میں مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مدرسہ میں مدرس تھا، میرے ساتھ پورہ معروف کے حافظ نسیم الحق صاحب بھی پڑھاتے تھے، میرے پُرانے دوست حاجی عبد الاحد صاحب بھی اسی بستی کے رہنے والے ہیں، یہ تینوں پورہ معروف کے محلّہ ’’بلوہ‘‘ کے باشندے کے ہیں، میں کسی تقریب سے حاجی عبد الاحد صاحب کے یہاں گیا ہوا تھا

فجر کی نماز کے بعد وہاں کی جامع مسجد سے نکل رہا تھا تو بہت سے لوگ اس نسبت سے کہ میں خانقاہِ وصی اللّٰہی میں پڑھاتا ہوں مصافحہ کرنے لگے، میں اس سے فارغ ہوکر حافظ نسیم الحق صاحب کے ساتھ اپنی قیام گاہ کی طرف چلا، تو انھوں نے بتایا کہ ایک شخص نے آپ سے مصافحہ نہیں کیا، اس کو آپ سے نفرت ہے، وجہ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ آپ کی زمانۂ طالب علمی کی بعض غلطیوں کی وجہ سے آپ کو ناپسند کرتا ہے اور وہ قصہ یہ تھا کہ بچپن اور طالب علمی کے زمانہ کی بعض حماقتوں میں پڑ کر اس گنہگار نے اپنے بعض اساتذہ اور علماء کو ناراض کرلیا تھا، اسی کی طرف ان کا شارہ تھا۔ پھر حافظ نسیم الحق صاحب نے ان کی کچھ خوبیاں اور اچھائیاں بیان کیں تو میرے دل میں ان کی قدر ہوئی، میں نے سوچا کہ ایسے شخص کی نفرت میرے حق میں مناسب نہیں ہے، میں نے حافظ صاحب سے کہا کہ ان صاحب کو یہیں حاجی صاحب کے یہاں بلالیجئے میں ان سے بات کرلوں۔ تعارف کراتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ یہ حافظ محمد فاروق ہیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ تشریف لے آئے میں نے عرض کیا کہ آپ کو کسی مسلمان کے بارے میں بدگمانی نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ گناہ کرکے سات آٹھ سال تک اسی پر قائم رہے گا، آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اس نے توبہ کرلی ہوگی، اپنے بزرگوں سے معافی تلافی کرلی ہوگی۔ پھر میں نے انھیں بتایا کہ بیشک مجھ سے غلطی ہوئی تھی لیکن میں نے اپنی غلطی کو کبھی درست نہیں سمجھا۔ اس کا مجھے قلق رہا کرتا تھا بالآخر میں نے اپنے بزرگوں سے معافی مانگ لی اور انھوں نے معاف بھی کردیا ہے۔

اتنا سننا تھا کہ وہ بے اختیار اٹھے اور کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی، میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہتے ہوئے انھوں نے مصافحہ کرلیا، وہ دل کے بہت صاف تھے، اس کے بعد پھر ان کے دل میں کبھی گردِ کدورت نہیں بیٹھی، انھوں نے خالص لوجہ

اللہ محبت کی، وہ اکثر پروگرام بناتے رہتے کہ ملاقات کیلئے چلنا ہے، لیکن میرا آنا جانا پورہ معروف میں حاجی عبد الاحد صاحب کی وجہ سے بکثرت رہا کرتا ہے وہیں ملاقات ہوجایا کرتی تھی، انھیں جیسے ہی معلوم ہوتا کہ میں آیا ہوں وہ سب کام چھوڑ کر بھاگتے، ملاقات کرتے کچھ دیر باتیں کرتے، پھر واپس ہوتے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد آتے رہتے، انھیں بزرگوں کے حالات اور تذکروں سے بہت دلچسپی تھی، وہ کرید کرید کر بزرگوں ہی کے متعلق زیادہ تر پوچھا کرتے اور ان کے حالات سن کر بہت خوش ہوتے، ان کے اوپر ایک سرور کی کیفیت چھاجاتی۔

میں پورہ معروف حاضر ہوتا تو عموماً تنہا نہ ہوتا، دو چار آدمی ساتھ ہوتے، وہ باوجود اپنی غربت اور تنگدستی کے ایک بار چائے کی دعوت ضرور دیتے اور میرے ساتھ جتنے لوگ ہوتے سب کو باصرار بلاتے، گھر ان کا کچا تھا، اسی گھر میں صاف ستھری چادر بچھادیتے اور بڑے خلوص سے سب کو بیٹھاتے، بہت زیادہ مقدار میں چائے بنواتے جس میں چائے کی پتی برائے نام ہوتی اور سستی سی دالموٹ اور ہلکا پھلکا بسکٹ لاکر رکھ دیتے، پھر بڑے اصرار سے دالموٹ اور بسکٹ کھلاتے اور چائے پلاتے، دو دو کپ چائے پینے کیلئے اصرار کرتے اس وقت ان کی خوشی دیدنی ہوتی، کبھی دوڑ کر چولھے کے پاس جاتے، کبھی مہمانوں کے پاس آتے اور مسلسل بولتے رہتے جس میں الفاظ و کلمات کم اور ایک ہی بات کو بار بار دہرانا زیادہ ہوتا۔

خفیف الحاذ (سبک بار) تو اتنے تھے کہ خود تھے، بیوی تھی اور کوئی اولاد نہ تھی، ایک ہلکا پھلکا سا مکان تھا، اس کا ایک چھوٹا سا صحن تھا اس میں ایک امرود کا درخت تھا جو ان کی برکت سے بہت زیادہ پھل دیتا تھا غیر معمولی طور پر زیادہ!

اسی آنگن میں تھوڑی سی اینٹوں سے گھیر کر ایک معمولی سا غسل خانہ واستنجا خانہ بنالیا تھا، وہ خود ندی میں جو ان کے گھر سے قریب بہتی ہے نہایا کرتے تھے۔

روزی بقدر کفاف تھی، صرف اتنی تھی کہ بہت معمولی اور خشک انداز میں کھا پی کر گزارہ کر لیتے تھے، اور اس پر بالکل قانع اور مطمئن تھے، بلکہ اللہ کے نہایت درجہ شکر گزار تھے، ایک کرگہہ تھی اسی پر میاں بیوی کچھ کام کر لیتے تھے، لقمۂ حلال کا یہ اہتمام تھا کہ کپڑے کی بنائی کے جو متعدد طریقے، بننے والوں اور ساہوکاروں (دلالوں) کے عرف میں رائج ہیں اور ان میں سے اکثر طریقوں میں کوئی نہ کوئی جز ایسا ضرور ہوتا ہے جس کی حلت و جواز مخدوش ہے، ان سب کو چھوڑ کر انھوں نے اس طریقہ کسب کو اختیار کر رکھا تھا جو حرمت و کراہت کے کسی بھی خدشہ سے پاک ہے، اس کو بنکروں کے عرف میں ''بانی'' کہا جاتا ہے، اس میں آمدنی سب طریقوں سے کم ہے اور عموماً یہ طریقہ اب متروک ہے، کوئی سیٹھ اس طریقہ پر کپڑا تیار کرانا پسند نہیں کرتا کیونکہ اگر بنکر کی نیت خراب ہو تو اس میں سیٹھ کا نقصان بھی ہو جاتا ہے، اس طریقہ میں سیٹھ جس کو یہاں کے عرف میں ''دلال'' کہا جاتا ہے وہ بننے کا تمام سامان سوت وغیرہ اپنے پاس سے دیتا ہے، بننے والا اپنے گھر لا کر اس کا کپڑا تیار کر کے پہونچا دیتا ہے اور اپنی مزدوری لے لیتا ہے، اس طریقہ میں اگر بنکر ایماندار ہے تو اسے اپنی محنت کی اجرت ملتی ہے، یہ خالص حلال آمدنی ہے۔ حافظ فاروق صاحب اسی طریقہ پر تاعمر کاربند رہے گو کہ اس کا رواج بالکل ختم ہو چکا ہے، کوئی دلال اس طریقہ پر بنوانا پسند نہیں کرتا، مگر ان کو اسی پر اصرار ہوتا، اسی لئے دلال انھیں جواب دیدیتے، تو پھر دوسرا دلال تلاش کرتے، بننے کے بعد جو سوت وغیرہ بچتا وہ سب امانت و دیانت کے ساتھ دلال کے یہاں پہونچا دیتے۔ بعد میں ان کی نیکی اور ورع و تقویٰ کو لوگ جان گئے تھے، تو ان کی بڑی رعایت کرنے لگے تھے اور ان سے پہلے ہی کہہ دیتے تھے کہ جو کچھ بچے گا وہ آپ کی ملکیت ہوگی، اس کے بعد وہ واپس کرنے کی دردسری سے بچ گئے تھے۔

اسی طرح وہ کسی ایسے شخص کی دعوت میں کبھی نہیں جاتے تھے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کی کمائی حلال نہیں ہے، یا یہ کہ اس کے یہاں کسی گناہ کا ارتکاب ہو رہا ہے، جن شادیوں میں باجا وغیرہ بجتا ہے اس میں ہرگز نہ جاتے اور کبھی ناواقفی میں پہونچ گئے اور وہاں باجا بج گیا تو وہ فوراً واپس ہو جاتے، اس سلسلے میں وہ بہت محتاط تھے، لیکن خواہ مخواہ بدگمانی میں بھی مبتلا نہ تھے۔

وہ اللہ کے نہایت فرمانبردار تھے، انھیں معلوم ہو جاتا کہ شریعت کا یہ حکم ہے تو اس پر نہایت مضبوطی سے عمل کرتے، ان کی ساری زندگی اسی دُھن سے عبارت تھی کہ اللہ کے احکام کو بجالایا جائے، نماز باجماعت کا خاص اہتمام تھا اس کے لئے طہارت اور دوسری شرائط کے پورا کرنے میں بہت محتاط تھے۔

گمنام تو ایسے تھے کہ انھیں کون جان سکا، ان کے محلّہ کے لوگ انھیں جانتے تھے اور اس مضمون کے پڑھنے والوں سے ان کا کچھ تعارف ہو جائے گا، باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

موت بھی جلد آ گئی کہ ابھی ۵۵؍ سے ۶۰؍ سال کے درمیان سن رہا ہوگا، رونے والا بجز ایک بیوی کے اور کوئی نہیں، ترکہ میں میرا خیال ہے کہ صرف گھر اور گھر کا معمولی اثاثہ چھوڑا ہے، ممکن ہے کچھ روپئے بھی ہوں۔

مکان پہلے تو کل کچا تھا، ابھی دو تین سال قبل مئو کے حاجی مختار احمد صاحب کو خیال ہوا اور کچھ حضرات نے توجہ بھی شاید دلائی تو انھوں نے دو کمرے پُختہ بنوا دیئے، اور گھر میں بیت الخلاء بنوا دیا، حاجی مختار احمد صاحب مئو کے صاحب ثروت تاجر ہیں، اور ماشاء اللہ نیک اور دیندار ہیں، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کے خواص میں ہیں، حضرتؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے سمدھی ہیں اور مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو کے خاص رکن رکین ہیں اور اس

کے معاون! انھیں حافظ فاروق صاحب سے بڑا گہرا تعلق تھا، وہ ان کی خدمت کرتے رہتے تھے، حافظ فاروق صاحب کو بھی ان سے بہت محبت اور بے تکلفی تھی، مئو آتے تو ان کے یہاں ضرور جاتے، وہیں کھانا کھاتے، وہیں رہتے اور جیسا کہ ان کا انداز شکر گزاری تھا، بار بار حاجی مختار صاحب کا تذکرہ کرتے اور ان کے احسانات بیان کرتے انھیں حاجی مختار صاحب نے ان کی زمین پر دو کمرے پُختہ اور بیت الخلاء بنوا دیا تھا، اس سے انھیں بڑی راحت ہوگئی تھی، اور وہ بار بار اس احسان کا تذکرہ کرتے اور ان کے لئے دعائیں کرتے۔

جذبہ احسان مندی کا ذکر آگیا تو بتا تا چلوں کہ ان کے ساتھ اگر کوئی شخص معمولی سا سلوک بھی کر دیتا تو اسے وہ بڑے والہانہ انداز میں بیان کرتے، انھیں مجھ سے ملنے کا اشتیاق رہتا اور میں بھی ان کی ملاقات کو اپنے لئے سعادت سمجھتا، ایک مرتبہ میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ بے تکلف تشریف لائیں، میں ایک طرف کا کرایہ آپ کو دے دیا کروں گا، وہ بہت ممنون ہوئے اور پھر جب بھی آئے وعدہ کے مطابق ایک طرف کا کرایہ میں ضرور دیدیا کرتا اور وہ اپنے مزاج کے مطابق متعدد لوگوں سے اس کو بیان کرتے۔

آخری مرتبہ جب میرے یہاں شیخوپور آئے تو میں کرایہ دینا بھول گیا۔ وہ واپس ہوگئے بعد میں مجھے احساس ہوا، میں نے حاجی عبد الاحد صاحب کے ہاتھوں کرایہ بھیجا اور اس کے چند ہفتے کے بعد میں خود پورہ معروف حاضر ہوا تو انھوں نے نہایت ممنونیت کے ساتھ آہستہ سے مجھے بتایا کہ حاجی صاحب نے کچھ پیسے دیئے ہیں، ! ان کی ادائیں بڑی معصومانہ تھیں۔

اعظم گڈھ شہر کی جامع مسجد میں اتوار کو بعد نماز مغرب درس قرآن ہوتا ہے، حافظ محمد فاروق صاحب کو اس کا بہت اشتیاق رہا کرتا تھا، اس میں شرکت کا موقع وہ نکال کر کبھی کبھی اعظم گڈھ درس میں آجایا کرتے تھے، ایک بار اتوار کو میری طبیعت خراب تھی، میں نہ پہونچ سکا وہ شام کو جامع مسجد میں آگئے، وہ مجھے نہ پا کر بہت مضطرب ہوئے اور عادت کے مطابق تأسف کا اظہار کرتے رہے، ہمارے مدرسہ کے ناظم مولانا محمد عارف صاحب عمری موجود تھے، انھوں نے ان کا والہانہ انداز دیکھا تو پیشکش کی کہ میرے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ کر مدرسہ چلئے، اور مولانا سے مل لیجئے، وہ فوراً تیار ہوگئے، مغرب کی نماز کے کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ آرہے ہیں، مجھے بے حد خوشی ہوئی اور ان کی پریشانی سے ندامت بھی ہوئی، وہ جلدی جلدی اپنی کیفیت سناتے رہے اور ناظم صاحب کے احسان کو بتکرار دہراتے رہے، پھر ان کے ساتھ وہ اعظم گڈھ لوٹ گئے اور وہاں ان کے گھر آرام سے رہے، صبح ناشتہ کرا کے ناظم صاحب نے انھیں رُخصت کیا، اس کے بعد میری پہلی ملاقات جو ہوئی، تو وہ مسلسل مولانا محمد عارف صاحب کا تذکرہ کرتے رہے، ان کا لفظ یہ تھا کہ ”وہ بہت اخلاقی ہیں“ اور کئی لوگوں سے ناظم صاحب کے اخلاق کی تعریف سنی، کیونکہ انھیں حافظ صاحب نے بتا رکھا تھا اور پھر یہ سلسلہ زندگی کی آخری ملاقات تک چلا، وہ جب ملتے تب پوچھتے کہ مولانا عارف صاحب خیریت سے ہیں؟ اور پھر کہتے کہ ”وہ بہت اخلاقی ہیں“۔

میرے ہی واسطے سے خیر آباد کے حاجی عبد الرحمٰن صاحبؒ سے انھیں تعلق ہوا، وہ کبھی حاجی صاحب کی دعوت پر انکے یہاں بھی پہونچ جاتے، حاجی صاحب انھیں موٹر سائیکل سے پورہ معروف پہونچوا دیتے، انھیں اس سے راحت بھی ہوتی اور وقت بھی بچ جاتا، کسی نماز کی جماعت میں بھی کوئی خلل نہ آتا، وہ حاجی صاحب کے نہایت شکر گزار ہوتے اور ہر ملنے والے سے اس کا تذکرہ کرتے۔

لقمۂ حلال وصدق مقال اور نیکی واطاعت خداوندی کا یہ اثر تھا کہ وہ

”مستجاب الدعوات“ تھے، لوگ اپنی حاجات وضروریات میں ان سے دعا کراتے اور کامیاب ہوتے، ابتداء میں بعض لوگوں نے ان کو ستایا، مگر جس نے ستایا، وہ کسی نہ کسی مصیبت میں ضرور مبتلا ہوا، کچھ دنوں کے بعد لوگوں کو اس کا احساس ہوگیا تو لوگ محتاط ہوگئے، ان سے ڈرنے لگے مگر وہ اپنی تواضع اور مسکنت میں مگن تھے، اس سلسلے میں ان کے متعدد واقعات ہیں، جنھیں ذکر کرنے کی چنداں حاجت نہیں، لیکن زندگی کے بالکل آخری ایام میں ایک شخص نے ان کے ساتھ گستاخی کی، اسے عبرت کے لئے ذکر کردینا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ اندازہ ہوجائے کہ اللہ کے بعض بندے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق بہت معمولی اور خستہ حال ہوتے ہیں، لیکن ان کے مرتبہ کی بلندی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے منہ سے جو کچھ نکل جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پورا کردیتے ہیں۔

رب اشعث اغبر ذی طمرین تنبو عنه اعین الناس لو اقسم علی اللہ لابرہ‘ (جامع صغیر بحوالہ مستدرک حاکم)

بعض پراگندہ بال، غبار آلود، دو پرانی چادروں میں لپٹے ہوئے، جنھیں دیکھنا آنکھوں کو ناگوار ہوتا ہے، ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی بات، خدا پر قسم کھا کر کہہ بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کریں گے۔

ایسے بندوں سے لوگوں کو بہت محتاط رہنا چاہئے، انھیں ہلکا سمجھ کر لوگ ان کی دل آزاری کرتے ہیں، اور مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں، **من عادیٰ لی ولیاً فقد آذنتہٗ بالحرب**، جو شخص میرے کسی ولی کے ساتھ عداوت ٹھانتا ہے اسے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے، یہ حدیثِ قدسی ہے، پھر ظاہر ہے کہ جس کی جنگ اللہ سے ہوجائے، وہ کب بچ سکتا ہے۔

مرض الوفات سے چند روز پہلے وہ ندی پر گئے ہوئے تھے، کوئی شخص ان سے الجھ گیا، انھوں نے اسے سمجھایا، مگر وہ الجھتا ہی گیا اور انھیں سخت سست کہنے لگا، ایک دوسرے صاحب وہیں موجود تھے، انھوں نے اس کو ڈانٹا اور تنبیہ کی کہ حافظ صاحب کو کچھ مت کہو، مگر وہ بکتا ہی رہا اور وہ صاحب منع کرتے رہے، حافظ صاحب کی زبان سے نکلا کہ اسے مت سمجھاؤ، یہ جیل کی ہوا کھائے گا اور پولیس کا ڈنڈا اس پر پڑے گا۔

چند دنوں کے بعد حافظ صاحب کا انتقال ہوگیا، جنازہ جانے کے راستے میں ایک گندی سی نالی تھی، اس کی وجہ سے لوگوں کو دشواری ہوتی، ایک شخص وہاں مٹی ڈال کر راستہ برابر کر رہا تھا کہ لوگوں کو پریشانی نہ ہو، وہی شخص جو حافظ صاحب سے الجھا تھا اس کارِ خیر کرنے والے سے لڑ پڑا کہ تم زمین پر قبضہ کرنا چاہتے ہو، انھوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے، میں راستہ صرف اس لئے درست کر رہا ہوں کہ ابھی حافظ فاروق صاحب کا جنازہ آئے گا، گندی نالی کی وجہ سے لوگوں کو پریشانی ہوگی، مگر وہ نہیں مانا، اس کے گھر کے لوگ بھی آگئے، پھر اس کو مارنے لگے، یہاں تک کہ جان سے مار ڈالا، فوراً پولیس اس شخص کو اور اس کے دوسرے حمایتیوں کو گرفتار کرکے لے گئی، جاننے والوں نے کہا کہ ابھی حافظ فاروق صاحب کا جنازہ گھر ہی میں ہے اور چند دن پہلے والی ان کی بات پوری ہوگئی۔ **والحمد للہ رب العٰلمین**

میں نے ایک مرتبہ کسی تقریب سے اپنے قرض کا ذکر کردیا کہ میں اچھا خاصا مقروض ہوں، اور دعا کی درخواست بھی کردی، یہ بات ان کے جی جان سے لگ گئی، ملاقات ہونے پر بار بار پوچھتے کہ قرض ادا ہوا یا نہیں؟ ابھی دو تین ہی بار ان کے پوچھنے کی نوبت آئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد نے پورے قرض سے چھٹکارا بخش دیا۔

ایک بار وہ مدرسہ میں تشریف لائے، میں موجود نہ تھا، انھیں بڑا افسوس ہوا، ملاقات ہوئی تو داستان سنانے لگے اسی دوران انھوں نے کہا کہ آپ کے مدرسہ میں

فون لگ جاتا تو بہت اچھا ہوتا، میں گھر ہی سے معلوم کر لیتا کہ آپ ہیں یا نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ فون کی درخواست ۶/سال سے پڑی ہے مگر شاید اب اس کی فائل بھی گم ہوگئی ہے، کئی مرتبہ مدرسہ کے اربابِ انتظام نے زور لگایا مگر ناکام رہے اور مجھے فون سے کوئی دلچسپی نہیں کہ میں کاوش کروں، اس کی وجہ سے بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں تو انھوں نے باصرار کہا کہ نہیں، فون ہونا چاہئے، میں نے کہا کہ پھر دعا کر دیجئے، انھوں نے دعا کر دی اور چند مہینوں میں بالکل اچانک فون کی کارروائی مکمل ہوگئی اور فون لگ گیا۔

۱۹۹۷ء سے پہلے والے سال میرے والد صاحب کے حج کا پروگرام بن رہا تھا میں چاہتا تھا کہ میں بھی ساتھ رہوں مگر میرے پاس کوئی نظم نہ تھا میں نے حافظ فاروق صاحب سے دعا کے لئے کہا، انھوں نے وعدہ کیا مگر موسم حج گزر گیا نہ والد صاحب کا پروگرام مکمل ہوا نہ میرے سلسلے میں کوئی پیش رفت ہوئی، موسم حج گزرنے کے بعد میں نے کہا کہ دیکھئے آپ کی دعا قبول نہیں ہوئی، ہنسنے لگے کہ کیا اسی سال کی شرط تھی؟ میں نے کہا اور کیا؟ انھوں نے کہا نہیں اب کی سال انشاء اللہ! اور پھر وہی ہوا، اللہ تعالیٰ نے والد صاحب اور ان کے ساتھ ۵/آدمیوں کے قافلہ کو جن میں، میں بھی تھا حج کرا دیا،

ہمارے مدرسہ میں ایک گاڑی کی شدید ضرورت ہے، میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے دعا کر دیجئے، انھوں نے کہا کہ انشاء اللہ رمضان کے بعد مدرسہ میں گاڑی آجائے گی، رمضان تو آ گیا، اللہ نے چاہا تو یہ بات بھی پوری ہو کر رہے گی۔ میں ۱۱/شعبان کو کلکتہ گیا تھا، ۲۳/شعبان کو میری واپسی تھی، ۲۵/کو گھوسی میں ایک پروگرام تھا، میں کلکتہ سے وقت پر نہ آسکا، اور گھوسی اطلاع بھجوا دی کہ میں حاضر نہ ہوسکوں گا۔

بعد میں حاجی عبدالاحد صاحب نے بتایا کہ ۲۳/شعبان بروز بدھ وہ میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ مولانا کلکتہ سے کب آئیں گے، میں نے بتایا کہ گھوسی میں مولانا کا پروگرام ہے، گھوسی آئیں گے تو پورہ معروف بھی ضرور آئیں گے، اس کے بعد اور بھی باتیں کرتے رہے، دوسرے دن ان پر فالج کا اثر ہوا۔ دماغ کی کوئی رگ پھٹی اور بیہوش ہوگئے، لوگ انھیں اسپتال لے گئے، مگر ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کی، پھر گھر پر ہی زندگی کی آخری سانس لی اور خدا کے حضور پہونچ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

۲۷/شعبان کو علی الصباح میں اعظم گڈھ شہر میں داخل ہو رہا تھا کہ میرے ایک عزیز حافظ ضیاء الحق سلّمہٗ سڑک پر کھڑے دکھائی دیئے، میں نے گاڑی روک کر انھیں بیٹھا لیا، وہ شیخوپور جا رہے تھے انھوں نے پہلی خبر جو سنائی وہ یہ کہ حافظ صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، آج ظہر کے بعد جنازہ ہے میرا جی چاہا کہ یہیں سے گاڑی پورہ معروف کے لئے موڑ دوں، مگر میرے ساتھ پورا ایک قافلہ تھا اور پھر ظہر کی نماز کے بعد شہر میں ایک بہت ضروری پروگرام تھا جس میں شرکت سے چارہ نہ تھا، اس لئے کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

اس کے بعد مسلسل لوگوں کی آمد و رفت اور مشاغل کی وجہ سے رمضان سے پہلے پورہ معروف نہ پہونچ سکا اور اب جبکہ رمضان شریف کی ۲۵/تاریخ ہے ابھی تک نہیں پہونچ سکا ہوں۔

اللہ تعالیٰ جانے والے کو اپنے کرم سے نواز دے کہ ہمارے گمان کے مطابق وہ اللہ کا بڑا مخلص، بے ریا اور سادہ بندہ تھا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی، جو ابتداء میں تحریر کیا اس پر ہو بہو صادق آتا تھا، امید یہی ہے کہ اللہ نے ان کو روح و ریحان سے نوازا ہوگا اور وہ رب کی ملاقات سے مسرور و شاداں ہوں گے۔ یا اللہ ایسا ہی ہو

(ماہنامہ انوار العلوم جہانا گنج، اگست ۱۹۹۹ء)

حضرت مولانا عبدالحمید صاحب الاعظمیؒ

وفات: ۴؍شوال ۱۴۱۹ھ

۴؍شوال ۱۴۱۹ھ کو ایک عرصہ کی علالت ونقاہت کے بعد مجاہد حریت حضرت مولانا عبدالحمید صاحب الاعظمی نظام آبادی کی وفات ہوگئی۔ اِنا للہ واِنا الیہ راجعون

مولانا مرحوم دیوبند کے فارغ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب قدس سرہٗ کے تلمیذ ومسترشد تھے، زندگی بھر جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رہے، تحریکاتِ آزادی کے سلسلے میں اور اس کے بعد جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے ملک وملت کی بہت خدمت کی، بہت اچھے خطیب تھے، تقریر وخطابت میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی علیہ الرحمہ کا رنگ جھلکتا تھا۔ بہت فعال اور حوصلہ مند شخصیت کے مالک تھے، جس مجلس میں ہوتے اپنی گفتگو سے چھا جاتے، اخیر میں سماعت سے معذور ہوگئے تھے۔ اپنی خوب کہتے تھےااور دسروں کی بالکل نہ سنتے تھے، وعدہ کے بہت پُختہ تھے، ضعف ومعذوری کی حالت میں بھی کہیں پہونچنے کا وعدہ کرلیتے تو ساری مشکلات برداشت کرکے پہونچتے تھے اور اس کیلئے کسی خاص سواری اور شرط کا مسئلہ نہ پیدا کرتے، اپنے طور پر پہونچ جاتے، سحر خیز تھے، پابندی سے تہجد کے وقت اٹھ جاتے تھے اور آہِ سحر گاہی کی سعادت حاصل کرتے، اس وقت ذکر جہر بھی کرتے، نظام آباد میں ایک دکان کرلی تھی، اور پائی پائی کا حساب کرکے زکوٰۃ نکالتے تھے اور وضعداری اور استقامت کا یہ عالم تھا کہ جس مدرسہ اور جس شخص کو جتنی رقم دینی ہوتی،، ہرسال پابندی سے منی آرڈر سے بھیجتے۔ خطوط کے جواب پورے التزام کے ساتھ دیتے اس میں تخلف نہ ہوتا اور اگر دوسری جانب سے جواب نہ پہونچتا تو خوب خفا ہوتے۔

اپنے اہل تعلق سے بہت محبت رکھتے اور ہر موقع پر ان کا خیال رکھتے، ان کی تقریبات میں بہت شوق اور خوشی سے شریک ہوتے، کوئی ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا تو بار بار اس کا ذکر کرتے۔

حج بیت اللہ کی سعادت سے سرفراز ہوئے تو ایک عرصہ تک ان پر وہ کیف و سرور چھایا رہا کہ جو بھی ان کے پاس بیٹھتا وہ ضرور متاثر ہوتا، دورانِ تقریر ایک سماں بندھ جاتا اور بے ساختہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔

اس خاکسار پر بہت مہربان تھے، المآثر ان کا محبوب مجلّہ تھا۔ جو کوئی مضمون پسند آتا تو پسندیدگی کا خط ضرور لکھتے، اور اگر کہیں کوئی خامی محسوس کرتے تو اس پر متنبہ فرماتے۔

حضرت محدث کبیر علیہ الرحمہ کے بہت معتقد اور مداح تھے، فارغ البال تھے، آل واولاد کے جھنجھٹ سے پاک تھے، ہلکے پھلکے دنیا سے گزر گئے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت ومغفرت سے نوازے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆

ایک روشن چراغ تھا نہ رہا

عارف باللہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نوراللہ مرقدہٗ

وفات: ۱۰؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ

مرنا تو برحق ہے، اور موت ہر ایک کے حق میں مقدر ہے، لیکن یہی موت کسی کے حق میں پیغامِ فنا ہے، اور کسی کے حق میں حیاتِ جاوداں ہے۔ ایک آدمی مرتا ہے تو اس کا سب کچھ مردہ ہوجاتا ہے، اس کا تذکرہ بھی مرجاتا ہے، اس کی روح بھی فراموش ہوجاتی ہے، اور ایک آدمی مرتا ہے تو صرف اس کا جسم بے جان ہوجاتا ہے، اس کی روح مزید جاندار ہوجاتی ہے، اس کا ذکر روشن ہوجاتا ہے، اس کی زندگی کے وہ مخفی گوشے جنھیں اس کی حیات میں کم لوگوں نے جانا ہوتا ہے، وہ بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صرف کھانے پینے اور جسم کی خواہشات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے نہیں جیتے بلکہ کسی بڑے مقصد کیلئے جیتے ہیں، ان کی زندگی کھانے پینے کی ضرورت سے نہیں بلکہ کسی خاص محور کے ساتھ منسوب ہوتی ہے اور اسی مقصد کے واسطے سے انھیں بڑائیاں ملتی چلی جاتی ہیں۔ کھانا پینا اور رہائش سب زندگی کی ضروریات ہیں، مقاصد نہیں ہیں۔ ان ضروریات کیلئے جینا اور مرنا بجز بہیمیت کے کچھ اور نہیں ہے۔

پھر مقصد کے کمتر و برتر ہونے کے لحاظ سے آدمی کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے اور اس کے بقاء و دوام کے اعتبار سے انسان کو بقاء و دوام کا تحفہ ملتا ہے، اگر مادی چیزیں اس کا مقصد ہیں تو جتنی حیات مادہ کی اتنی حیات اس آدمی کی! اور اگر روحانی امور اس کا مقصد ہیں تو جس قدر عمر روح کی ہے اتنی ہی عمر اس روحانی آدمی کی ہے،

ایک مسلمان......مومن خالص...... کی زندگی کس مقصد کے لئے بسر ہوتی ہے یا ہونی چاہئے، اے اللہ! آپ کا بے پایاں احسان ہے کہ اس مقصد کی تعین آپ نے اپنی مخلوق ...... جاہل وظالم مخلوق...... کے سپرد نہیں کی، ورنہ یہ نہ جانے کن پستیوں کو بلندی اور بلندی کو پستی سمجھ لیتی، انسان محدود، اس کا مبلغِ علم محدود، اس کی عقل نارسا، اس کی فہم ناقص! **عسیٰ أن تکرھوا شیئاً وھو خیرٌ لکم وعسیٰ أن تحبوا شیئاً وھو شرٌلکم** (ہوسکتا ہے کہ تمہاری ناپسندیدہ چیز میں خیر ہو، اور تمہاری پسندیدہ چیز میں شر ہو) کے ہی تماشے میں آدمی کی زندگی پگھل کر رہ جاتی اور اسے خیر و شر کی تمیز نہ ہو پاتی۔

اللہ تعالیٰ نے بڑا اکرم فرمایا، بڑی دلداری فرمائی، اور آدمی کو ایک سنگین امتحان سے بچالیا کہ مقصد کے انتخاب کا اسے مکلّف نہیں بنایا بلکہ خود ہی ایک صاف ستھرا، ایک بلند و بالا، ایک مبارک و میمون مقصد آدمی کے لئے انتخاب فرمادیا کہ بس اسی کے لئے مرتے رہو، جیتے رہو، یہ تمہیں زندۂ جاوید بنادے گا۔

وہ مقصد کیا ہے؟ سنئے! خالق کائنات جل جلالہٗ نے رحمت کائنات ﷺ کو ہدایت فرمائی: **قل إن صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین لاشریک لہٗ وبذٰلک أمرت وأنا أول المسلمین** (سورہ انعام) تم کہہ دو کہ میری نماز، میری عبادت، میری حیات اور میری موت صرف اللہ کے لئے ہے، جو سارے جہاں کا پروردگار ہے، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں اول فرمانبردار ہوں۔

رب کا یہ حکم آیا، اور سعادتمند روحیں اس جذبہ کیلئے بے قرار ہوگئیں، پھر تمام

دنیا، دنیا کی تمام رونقیں اوران رونقوں کی تمام نمائشیں، ان کی نظروں میں ہیچ ہوگئیں ان کی نگاہ پروردگار پر جمی اور جم کررہ گئی۔ اب جس کو دیکھا پروردگار کی نگاہ سے دیکھا، ان کا اشارہ ملا تو خوب دیکھا اور فائدہ اٹھایا اور پروردگار نے نگاہ پھیری تو ان کی بھی نظریں پھر گئیں، یہ جماعت ہے انبیاء ورسل کی، یہ جماعت ہے ان کے سچے متبعین، مومنین قانتین کی!

ابھی چند دنوں پہلے تک ۱۴۲۰ھ کے یوم عاشوراء کے پہلے تک ایک ایسا ہی مردمومن ہمارے درمیان تھا، وہ ہماری دسترس میں تھا، ہم جب چاہتے تھے حاضر ہوجاتے اوراس کی روح پرور صحبت اوراس کی دلنواز نگاہوں سے ایمان میں تازگی اوردل میں محبت کی گرمی حاصل کرتے، اس کی دلآویز باتیں، قلوب کو مسخر کرتیں اور کتنے غافلوں اور سرپھروں کو اللہ ورسول کے قدموں پر جھکادیتیں۔ وہ ہمارے درمیان تھا تو اس تک پہونچنا ہمارے لئے بے حد سہل تھا، اس سے مصافحہ کرتے تو اس کے دل کی گرمی اوراس کے ہاتھوں کی نرمی سخت سے سخت دلوں کو پگھلادیتی، اب وہ مردمومن ہم سے رُخصت ہوکر وہاں پہونچ گیا ہے جہاں پہونچ کر پھر کوئی لوٹ نہیں سکتا ہے، اب ہم اس کی نگاہ دلنواز سے محروم ہوگئے ہیں، اب ہمارے کان اس کے کلام شیریں کے لئے ترسیں گے، مگر نہ سن پائیں گے، اس پر وہی موت طاری ہوئی جو سب پر طاری ہوتی ہے، لیکن کیا وہ فنا ہوگیا؟ نہیں! اس نے اپنی نسبت اس ذات حی وقیوم کے ساتھ قائم کی تھی، جس کے لئے فنا تو کیا شائبۂ فنا نہیں ہے۔ پس وہ مردمومن بھی موت کا جام پی کر حیات جاوداں سے سرفراز ہوگیا۔ انشاء اللہ

آیئے! میں بتاؤں کہ وہ مردمومن کون تھا؟ عالم باعمل، نمونۂ سلف، رہنمائے راہِ طریقت، معلم کتاب وسنت، عارف باللہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نوراللہ مرقدہٗ فیض آبادی ثم جونپوری،

حضرت مولانا کی حیات کی تفصیلات سے میں زیادہ واقف نہیں ہوں، لیکن میں ان کی خدمت میں، ان کے قائم کئے ہوئے مدرسہ میں چارسال مسلسل رہا ہوں اور واقفیت وملاقات اس کے پہلے سے ہے۔ اس قرب وتعلق اور واقفیت وملاقات میں جو کچھ میں نے دیکھا ہے گو کہ میری نگاہ قاصر ہے، لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ اس آیت کے عملی پیکر تھے، جس میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے مقصد زندگی متعین فرمایا ہے، یعنی **قل إن صلاتی ونسکی الخ** کے وہ ایک دلآویز نمونہ تھے۔

میری پہلی ملاقات حضرت مولانا سے اس وقت ہوئی، جب میں الہ آباد مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے مدرسہ وخانقاہ میں مدرس تھا۔ غالباً ۱۹۷۷ء کا سن تھا، ایک دن علی الصباح خانقاہ میں دو بزرگ تشریف لائے، دونوں حضرات رات ہی میں کسی وقت تشریف لائے تھے، فجر کی نماز کے بعد خانقاہ کے سربراہ حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہٗ سے دونوں حضرات نہایت تواضع اور عجز وانکساری کے ساتھ مل رہے تھے، دوسری طرف سے بھی اسی ادب وتواضع کا ظہور تھا۔

ان میں ایک بزرگ نسبتاً زیادہ معمر تھے، سنجیدگی اور وقار کا پیکر، گندمی رنگ سر پر خوبصورت سفید صافہ، چہرہ پر ہلکی سی داڑھی، قد تھوڑا سا خمیدہ، گفتگو بہت ہی ہلکی اور ٹھہر ٹھہر کر جیسے ہر ہر لفظ تول کر بول رہے ہوں، ہاتھ میں خوبصورت سی چھڑی، سراپا ایسا کہ دیکھتے ہی اللہ یاد آجائے۔ معلوم ہوا کہ یہ بزرگ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب ہیں، حضرت مصلح الامتؒ کے مسترشد خاص اور مجاز بیعت! اور اسی لئے خانقاہ میں ہر شخص ان سے واقف تھا اور سب کے دلوں میں ان کا احترام تھا، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامؔی کاتب خاص حضرت مصلح الامت تو خاصے بے تکلف

تھے، دوسرے بزرگ...... معلوم ہوا کہ...... حضرت مولانا مفتی محمد حنیف صاحب ہیں جوانھیں مولانا کے شاگرد اور حضرت مصلح الامتؒ کے خاص لوگوں میں ہیں۔

یہ میری حضرت مولانا سے پہلی ملاقات تھی، میں اس وقت ایک نوجوان مدرس تھا اور حضرت مولانا ایک عمر رسیدہ پیر و مرشد! مگر ملاقات ہوئی تو ایسی شفقت فرمائی کہ پہلی ہی ملاقات میں طبیعت کھل گئی، حضرت طبعاً سنجیدہ تھے، لیکن گفتگو سے معلوم ہوا کہ یہ سنجیدگی، بوجھل اور کھردری نہیں ہے بلکہ اس کے پردے میں ایک ایسی سُبک روح ہے، جس پر ہمہ وقت بشاشت چھائی ہوئی رہتی ہے، بزرگی ومتانت کے ساتھ خوش طبعی اور سُبک روحی کا ایسا دلنواز آمیزہ تھا کہ باوجود ظاہری رُعب کے، ملنے جلنے اور بات کرنے میں کوئی حجاب اور تکلف نہیں محسوس ہوتا تھا۔ حضرت کا قیام اس وقت خانقاہ میں دوروز ہوا تھا، اس لئے بار بار خدمت میں بیٹھنا نصیب ہوا اور دل میں محبت وعقیدت کا تخم پڑا۔

حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ کے جتنے متوسلین ومریدین سے ملنے اور ان کی زیارت کا اتفاق اس خاکسار کو ہوا ہے۔ ان سب میں ایک مشترک خصوصیت پائی ہے، وہ ہے اوقات کا انضباط اور معمولات کی پابندی! حضرت مولانا کی صحبت میں وہ دوروز جو بسر ہوئے، حالانکہ وہ مسافر تھے، مگر میں نے دیکھا کہ اپنے وظائف ومعمولات اور عبادات ونوافل کے حد درجہ پابند ہیں۔ رات کو خواہ کتنا ہی جاگے ہوں مگر رات کے آخری حصہ میں بیدار ہوکر رب کائنات کے حضور ضرور کھڑے ہوجاتے تھے، یہ بات بعد کی ملاقاتوں اور صحبت میں مزید نکھرتی چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ سخت بیمار ہیں، تھکا دینے والا سفر کرکے آئے ہیں، بدن ٹوٹ رہا ہے، خستہ جان ہو رہے ہیں، لیکن رات کا آخری حصہ آیا اور عالم غیب کی صدا کانوں میں آنے لگی، کہ اٹھو! رب کائنات کا نزول اجلال آسمان دنیا پر ہوگیا ہے وہ اپنے بندوں کو پکار رہے ہیں کہ مغفرت کے طالب، صحت کے آرزومند اور روزی کے بھکاری آئیں اور ہاتھ پھیلائیں، پھر تو یہ اللہ کا بندہ سب تکان بھول کر سب تکلیفوں کو فراموش کرکے، اس کے دربار میں ہاتھ باندھ کر حاضر ہوجاتا۔

میں نے مولانا کو بڑھاپے کے دور میں دیکھا، جبکہ ضعف کا تسلط ہر حصۂ بدن پر ہوچکا تھا۔ لیکن عبادت کے انہماک میں ضعف کا کوئی اثر ان کو متاثر نہیں کرتا تھا۔ تمام فرائض ونوافل کے اہتمام میں نہایت مستعد اور چست تھے، نماز میں خشوع و خضوع کا انہماک بھی عجیب تھا، دل کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ نماز کے لئے ہاتھ بندھتا ہے تو سراپا خشوع وخضوع ہوجاتے، ہر رکن نہایت اطمینان سے ادا کرتے تھے، غالباً شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ ان کو حضوری کی کیفیت حاصل ہے، یعنی ہمہ وقت مولیٰ حقیقی کے حضور میں انھیں حاضری وموجودگی کا احساس قائم رہتا ہے، نماز کی حالت میں شاید یہ حالت عروج پر ہوتی رہی ہوگی، اسی کیفیت حضوری کو زبانِ نبوت نے ''احسان'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کہ ایسی عبادت کی جائے جیسے عبادت کرنے والا خدا کو دیکھ رہا ہے، یہ کیفیت بندگی کی روح اور اس کا مغز ہے، اس حالت کا جب رسوخ ہوتا ہے تو بندہ کی ترقی کی کوئی حد ونہایت نہیں رہتی۔ مولانا آسی مرحوم کا شعر ہے۔

اتنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہوا　　اور اس سے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہوا

واقعہ یہی ہے کہ ایک دیکھنے والا یہی دیکھ سکتا ہے کہ عشق ومحبت کی شعلہ سامانیوں نے، کسی کے ارادہ وخیال اور خواہشات وجذبات کو فنا کرکے رضائے محبوب کی دھن میں لگا دیا ہے۔ اب وہ ہمہ تن محبوب حقیقی کا ہوکر رہ گیا ہے، اغیار کی منتشر راہوں سے یکسو ہوکر وہ یار کی ایک راہ پر ہولیا ہے، اس کے بعد کہاں تک پہونچتا ہے، بس خدا ہی جانتا ہے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد زباغباں بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

اب کسے یارا کہ باغباں سے یہ پوچھ سکے کہ بلبل نے کیا کہا، پھول نے کیا سنا اور بادصبا نے کیا کیا؟

مولانا کی پوری زندگی اسی ایک ''کیفیت رفیعہ'' کے زیراثر گزری ہے، مولانا کی جوانی، حضرت مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے میکدۂ محبت میں گزری، **شاب نشأ فی عبادۃ اللہ** کے مصداق! جوانی نثارِ آستانۂ یار ہوئی، جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت مصلح الامت کی کیا شان تھی، جوان کی خدمت میں حاضر ہوگیا، اس پر ایک نشہ سا چھا گیا، ان کے دل میں عشق الٰہی کی جو حرارت تھی، اس نے نہ جانے ہوا وہوس کے کتنے خرمنوں کو پھونک کر رکھ دیا تھا۔ حضرت قاری عبدالسلام مضطر ہنسوری نے خانقاہ وصی اللّٰہی کی کتنی سہی ترجمانی کی ہے۔ فرماتے ہیں، ؎

تھی رگ وپے میں مرے صہبا ہی صہبا موجزن
اے خوشا وقتیکہ تھا میں میہمانِ مے فروش

اورخود حضرت مصلح الامت کا حال یہ تھا کہ ؎

سارا عالم غرقِ مَے کرنے پہ ہے آمادہ آج
عہدِ پیری اور یہ عزمِ جوانِ مے فروش

اس میخانۂ محبت میں اور اس مے فروش عشق کے قدموں پر جس مے گسار کا عہدِ شباب گزرا ہو، کون اندازہ کرسکتا ہے کہ اس کے نہاں خانۂ باطن کا کیا حال ہوگا۔ ہم نے تو دیکھا کہ مولانا نے سب کچھ پھونک کر آستانۂ یار پر دھونی رمالی تھی ۔

حق تعالیٰ جب کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں، تو اس کی تعلیم وتربیت کا ایسا غیبی انتظام فرماتے ہیں کہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر انھیں کا ہو رہے، حضرت مولانا ضلع فیض آباد کے ایک گاؤں دیوریا کے رہنے والے تھے، فیض آباد ہی کے قصبہ ٹانڈہ میں ایک زبردست صاحب نسبت اور نہایت قوی التاثیر بزرگ حضرت چاند شاہ صاحب تھے، ان کی تعلیم وتربیت کا آوازہ ہر طرف گونج رہا تھا۔ ان کے فیض یافتہ حضرات جدھر جدھر نکل گئے شرک وبدعت کا خاتمہ ہوگیا، اور سنت وشریعت کا نور جگمگانے لگا، حضرت مولانا کی ولادت سے چند سال قبل ہی ان کی وفات ہوئی تھی۔ ان کے خلفاء جوان کے فیض صحبت سے خود آفتاب وماہتاب بنے ہوئے تھے، اس وقت موجود تھے، حضرت مولانا کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا انتظام حضرت چاند شاہ صاحب کے ایک برگزیدہ خلیفہ اور عالم باعمل ، حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں ہوا۔ مولانا کی فطرت خود سعید تھی اس پر ایک مرد سعید کی خدمت میسر آئی، تو سونا نکھر گیا، فراغت جامعہ مظاہر علوم سہارنپور سے ہوئی جو اس وقت اصحاب نسبت کا مرکز ومخزن تھا، اس کے بعد فتح پورتال نرجا کی دکان مے فروش پر پہونچ گئے، یہاں خوب آسودہ وسیراب ہوئے۔ لیکن عشق ومحبت کا جنون بھی عجب جنون ہے، جب حضرت مصلح الامت کا وصال ہوگیا تو تشنگی کی طلب نے انھیں سہارن پور کے پیر مغاں کی خدمت میں پہونچا دیا۔ یعنی وقت کے برگزیدہ شیخ ومرشد حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی صحبت بابرکت میں حاضر ہوئے، اس طرح نشۂ محبت کی تندی بڑھتی رہی۔

یہ بھی عجیب شان الٰہی ہے کہ فیض آباد کے ایک گاؤں میں پیدا ہونے والا بچہ جب شہرت کی عمر کو پہونچتا ہے، تو جونپوری کہلاتا ہے۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس کا وطن ولادت کیا ہے اور یہ بھی اسی عہدِ وفا کا کرشمہ ہے، جو محبت کا فرشتہ اہل محبت سے بندھواتا ہے۔

مولانا کے استاذ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور ان کے برادر خورد

حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب کی دینی و تبلیغی کوششوں کے مراکز میں ایک اہم مرکز ضلع جونپور کا ایک گاؤں مانی کلاں بھی تھا، تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد غالباً انھیں استاذ کے حکم سے حضرت مولانا مانی کلاں تشریف لائے، مذکور الصدر دونوں بزرگوں کا دورہ اس حلقہ میں ہوتا رہتا تھا، ان حضرات کو خیال ہوتا تھا کہ دینی جدوجہد کو پائیداری اسی وقت حاصل ہوگی جبکہ کوئی مرد خدا اس جگہ مستقل قیام کرے، ان بزرگوں کی نظر انتخاب مولانا پر پڑی اور انھیں یہاں پہونچا دیا۔ یہاں مکتب میں حضرت مولانا نے کام شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ آس پاس کی آبادیوں میں تبلیغی و اصلاحی عمل جاری فرما دیا۔ یہ مکتب مولانا کے فیض برکت سے علم دین اور حفظ قرآن کا مرکز بن گیا، شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب جامعہ مظاہر علوم سہارنپور اور شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد حنیف صاحب مدرسہ بیت العلوم سرائے میر نے یہیں تعلیم پائی۔ اول الذکر کی فراغت تو سہارنپور سے ہوئی۔ لیکن مفتی محمد حنیف صاحب نے تو ابتداء سے انتہاء تک یہیں علم حاصل کیا۔

مولانا کو اس راہ میں بڑی قربانیاں دینی پڑیں، گھر بار چھوڑا، وطن کو چھوڑا اور مستقل مانی کلاں میں ہی مقیم ہوگئے، فقر و فاقہ کی بہت سختیاں جھیلیں۔ دیوریا والا مکان اجڑ گیا، تنگدستی کی وجہ سے اس مکان کا سامان تک بیچ ڈالا، مگر آستانِ یار سے اٹھے نہیں، اور تقریباً ۴۰ ؍سال تک اس طرح مانی کلاں میں رہے کہ لوگوں کو یہ خیال بھی نہ رہا کہ مولانا یہاں کے نہیں ہیں۔

پھر ایک مدت کے بعد اہل اللہ کی سنت کے مطابق ایک ابتلائی دور آیا اور حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ مانی کلاں کے مدرسے میں رہنا آپ کیلئے مشکل ہوگیا، جس چمن کی آبیاری آپ نے تقریبا نصف صدی کی تھی، اب اس چمن میں باغبان ہی کو تنگی محسوس ہونے لگی، آپ خاموشی سے اٹھے اور گورینی کے ایک مکتب

عزیز العلوم میں آکر بیٹھ گئے، آپ کا یہاں آنا تھا کہ علم دین کا ایک گلستاں لہلہانے لگا یہی عزیز العلوم اب ریاض العلوم کے نام سے ملک بھر میں معروف ہے، چالیس پچاس سال کی محنت و کوشش کا ثمرہ مدرسہ ریاض العلوم میں دفعۃً ظہور کرنے لگا، غالباً ۱۹۷۳ء میں حضرت مولانا یہاں تشریف لائے اور چند ہی سالوں میں دورۂ حدیث اور افتاء تک تعلیم ہونے لگی اور اس کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ کیا تعمیر کے اعتبار سے اور کیا تعلیم کے اعتبار سے، ہر لحاظ سے مدرسہ کی وسعت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

مولانا کے قلب میں علم دین کی اشاعت کی ایک خاموش لگن تھی، خاموش اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مولانا کے اس جذبہ اور لگن کا پُر شور ظہور نہیں ہوتا تھا۔ ان کی مجلس میں بیٹھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اندر کیا تلاطم برپا ہے، ایک سکون، ایک طمانینت، ایک ٹھہراؤ، لیکن آثار دیکھئے تو ہر روز مدرسہ میں تعلیم کی ترقی ہے، تعمیر میں اضافہ ہے، طلبہ کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، اچھے سے اچھے اساتذہ لائے جا رہے ہیں، مدرسہ کی شاخیں جا بجا قائم ہو رہی ہیں، ان آثار سے اندرون قلب کے اس جذبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا، جس پر اوپر سے سکون اور ٹھہراؤ کی ایک چادر تنی ہوئی تھی اا اور صرف اتنا ہی نہیں اطراف و جوانب سے، اور ملک کے دور دراز حصوں سے ارباب علم و دین دعوتیں دیتے رہتے اور مولانا باوجود بڑھاپے اور ضعف کے بقدر امکان ہر ایک کی دعوت قبول فرماتے، سفر ہوتا، مگر سفر کا کوئی ہنگامہ نہ ہوتا، جاتے تو کچھ احساس نہ ہوتا کہ کہیں تشریف لے جا رہے ہیں اور آتے تو پتہ نہ چلتا کہ کتنے طویل سفر سے آ رہے ہیں، سب کچھ معمول کے مطابق ہوتا رہتا، اسی بنا پر میں نے ”خاموش لگن“ عرض کی

مولانا ایک زبردست عالم اور فقیہ تھے، عالم کا راس المال کتابیں ہیں۔ مولانا کو کتابوں سے بہت دلچسپی تھی، مدرسہ کے کتب خانہ کو مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے مالا مال کر دیا تھا، مولانا نے مدرسہ کے اساتذہ سے کہہ رکھا تھا کہ دورانِ

مطالعہ جن کتابوں کی ضرورت محسوس ہو، یا کسی اچھی معتبر کتاب کا نام سامنے آئے، اور وہ کتب خانہ میں موجود نہ ہوتو اسے کاغذ پر نوٹ کرلیں اور پھر اسے مولانا کے حوالے کردیں، پھر جہاں سے بن پڑتا، مولانا اس کتاب کو فراہم کرتے۔

جب تک صحت رہی ہر سال حج کے لئے تشریف لے جاتے، اور جب حج کا سفر ہوتا، اساتذہ سے فرداً فرداً پوچھتے کہ دورانِ مطالعہ کن کن کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی انھیں طلب کرتے اور پھر جب واپس آتے تو کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ساتھ لاتے۔

یہ احقر مولانا کے مدرسہ میں مدرس تھا، ایک دفعہ حیدرآباد کے سفر کا میرا پروگرام بنا۔ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ آپ حیدرآباد جارہے ہیں، وہ پہلے کتابوں کا مرکز رہ چکا ہے کوئی مفید کتاب نظر آئے تو بے تکلف مدرسہ کے لئے خرید لیجئے، مہنگی سستی مت دیکھئے گا کتاب خریدتے وقت مہنگی معلوم ہوتی ہے، جب خرید لی جاتی ہے تو سستی ہوجاتی ہے۔ یہ فرماتے رہے اور ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم ظاہر ہوتا رہا۔

گورینی کی مدرسی کے دور میں مجھے حج کے سفر کی سعادت نصیب ہوئی، مولانا اس وقت علیل ہوکر سفر سے معذور ہوچکے تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ پُرانی کتابیں جونئی طباعت کے ساتھ آرہی ہیں، انھیں دیکھئے گا اور جتنی ممکن ہو مدرسہ کے لئے خریدیئے گا، اس سفر میں حضرت مولانا کے عاشقِ زار مرید جناب حاجی رضوان اللہ صاحب بمبئی کی رفاقت میسر آئی۔ انھوں نے حضرت مولانا کی منشاء کو اس طرح عملی جامہ پہنایا کہ مجھے پکڑ کر کتب خانہ میں لے جاتے، میں گھنٹوں کتابوں کو دیکھتا اور منتخب کرتا رہتا، حاجی رضوان صاحب میری ہر طرح دلجوئی کرتے اور حوصلہ افزائی کرتے، اور فرماتے کہ بغیر جھجھک کے کتابیں خریدیئے، حضرت خوش ہوجائیں، بس یہی کافی ہے، چنانچہ اس سال چودہ ہزار ریال کی کتابیں خریدی گئیں، حضرت اس سے بہت مسرور ہوئے اور بار بار اس کا تذکرہ فرماتے۔

مولانا بہت سخی اور فیاض تھے، دل کے غنی تھے لیکن ان کی فیاضی کے انداز بڑے البیلے تھے، بسا اوقات محسوس نہیں ہوتا تھا، اور مولانا نہایت خاموشی سے یا ظرافت کے پیرائے میں بخششیں کرجاتے اساتذہ کی کوئی ضرورت محسوس کرتے تو اس انداز سے ان کی مدد فرماتے کہ بعض اوقات شاید انھیں بھی احساس نہ ہوتا کہ مولانا مدد فرمارہے ہیں اور اس بات میں مولانا اتنے کشادہ دست تھے کہ بڑی سے بڑی رقم اور بڑی سے بڑی چیز، ایسا معلوم ہوتا کہ انھیں بہت چھوٹی اور معمولی محسوس ہورہی ہے۔

مولانا مفتی محمد حنیف صاحب ایک بار بیان فرمارہے تھے کہ حضرت مولانا کا ایک سفر تھا، تیاری بالکل مکمل ہوچکی تھی، مفتی صاحب ملنے کے لئے گئے، حضرت مولانا نے فرمایا کہ کوئی شیشی لایئے تو آپ کو کچھ عطر دوں، سب جانتے ہیں کہ عطر کی شیشی کیسی اور کتنی بڑی ہوتی ہے، لیکن مفتی صاحب کی ظرافت دیکھئے کہ ۲۰۰؍ گرام کی تیل کی خالی شیشی لے کر پہونچ گئے، حضرت نے دیکھا تو مسکرائے اور فرمایا کہ یہ عطر کی شیشی ہے؟ مفتی صاحب نے فرمایا کہ جب دینے والا از خود دے رہا ہے تو میں چھوٹی شیشی کیوں لاؤں۔ حضرت نے مسکرا کر وہ شیشی لے لی اور اسے عطر سے بھر کر واپس کیا۔

ایک بار مجھے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب علیہ الرحمہ کی آپ بیتی کی ضرورت ہوئی، اس وقت وہ کتاب زیر تصنیف تھی، زیادہ تر حصے اس کے آچکے تھے، ہر حصہ الگ الگ مل رہا تھا، میرے پاس استطاعت نہ تھی کہ خریدتا۔ میرے دو طالب علم ان دنوں مدرسہ ریاض العلوم میں فتویٰ نویسی کی مشق کررہے تھے۔ ان

کی معرفت حضرت کے یہاں سے آپ بیتی کے دو حصے عاریۃً میں نے منگائے، حضرت نے بخوشی عنایت فرمائے، میرا مقصد ان دونوں سے حل نہیں ہوا، میں نے سوچا کہ سب حصوں کا مطالعہ کرڈالوں پھر منگوانے کے بجائے میں خود ہی کسی تقریب سے گورینی حاضر ہوا، میں نے عرض کیا حضرت باقی حصے بھی عنایت فرمادیجئے، حضرت نے اپنے حجرے میں تلاش کروایا تو دو حصے اور ملے اور باقی نہ ملے، حضرت نے فرمایا کہ باقی حصے بعد میں تلاش کرواؤں گا، پھر ایک لحظہ کیلئے مسکرائے اور فرمایا کہ وہ لطیفہ آپ نے سنا ہے؟ میں ہمہ تن استفہام بن گیا، فرمانے لگے کسی عقلمند کا قول ہے کہ:

وہ آدمی بہت بے وقوف ہے، جو کسی کے مانگنے پر کتاب دیدے۔ اور اس سے بڑا بے وقوف وہ ہے، جو کتاب لے کر واپس کردے۔

تو میں تو بے وقوفی کرچکا، اب آپ کا ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا حضرت میرا ارادہ بڑا بے وقوف بننے کا نہیں ہے۔ خوب مسکرائے، اور فرمایا کہ میں بھی یہی سمجھ رہا تھا، پھر کچھ دنوں کے بعد باقی حصے بھی میرے پاس حضرت نے بھجوادئے، بخشش وعطا کا کیسا نرالا انداز تھا!

میں مدرسہ دینیہ غازی پور میں مدرس تھا، مولانا مفتی محمد حنیف صاحب مدظلہٗ کا بار بار تقاضا ہوتا تھا کہ میں گورینی آجاؤں۔ ایک بار حضرت مولانا مدرسہ دینیہ میں تشریف لائے اور اہتمام سے اس حقیر سے ملاقات فرمائی اور صاف صاف تو کچھ نہ فرمایا لیکن گفتگو کے اشاروں سے صاف ظاہر ہوتا تھا وہ مجھے ریاض العلوم میں جانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ مدرسہ دینیہ سے ہٹنے کا ماحول بنتا چلا گیا۔ جب یہ بات یقینی ہوگئی تو میں نے مولانا مفتی محمد حنیف صاحب کو ایک خط لکھا کہ اگلے سال میں شاید یہاں نہ رہ سکوں۔ اب آپ کا اور حضرت مولانا کا کیا خیال

ہے؟ اگر اب بھی وہی سابق خیال باقی ہے تو میں خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ اور میرا کسی طرح کا کوئی مطالبہ نہیں ہے نہ تنخواہ کی مقدار کا نہ کسی خاص کتاب کا۔ صرف اتنی بات ہے کہ میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہوں گا اس کیلئے ایک مکان کی ضرورت ہوگی۔ اس کا انتظام ہوجائے تو مجھے حاضری سے کوئی عذر نہیں ہے، یہ خط گیا اور بہت جلد مولانا مفتی محمد حنیف صاحب کے قلم سے جواب آیا کہ آپ ضرور تشریف لائیں، رہی مکان کی بات تو جیسے ہی مولانا نے آپ کا خط ملاحظہ فرمایا اسی وقت کاریگر اور مزدور کو جگہ پر لے گئے اور زمین منتخب کرکے بنیاد کھدوائی، اور بنیاد بھی رکھ دی۔ آپ شوال میں آئیں گے تو مکان انشاء اللہ تیار ملے گا۔ اس طرح مولانا اپنے لوگوں کی دلداری فرماتے تھے!

ہر جمعرات کو بعد نماز ظہر مولانا کی مجلس عام ہوتی تھی، جس میں اطراف و جوانب کے متوسلین و مسترشدین شریک ہوتے، مولانا بہت ٹھہر ٹھہر کر اس میں اس طرح وعظ کہتے تھے کہ ہر لفظ ہر شخص کی سمجھ میں آجائے، بہت سادہ وعظ کہتے مگر موثر ہوتا، میں نے مولانا کے مواعظ بکثرت سنے ہیں، ان کے وعظ میں کوئی کچی بات، کوئی بے سند بات نہ ہوتی، جو کچھ فرماتے قرآن وحدیث کے ٹھوس حوالوں سے فرماتے اور دل سے نکلتی اور دل پر اثر کرتی۔

اخیر عمر میں مولانا پر ایک خاص نوع کا فالج کا حملہ ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے وہ وعظ وتقریر اور سفر وغیرہ سے معذور ہوگئے تھے۔ لیکن ہمت کا یہ عالم تھا کہ جب تک بس چلا نماز کیلئے مسجد میں تشریف لاتے رہے، البتہ جمعرات کے دن کا وعظ موقوف ہوگیا، مجلس تو قائم رہی مگر میرِ مجلس کے بغیر وہ رنگ باقی نہ رہا۔ عصر سے مغرب تک عموماً باہر تشریف فرما ہوتے، متوسلین اس وقت حاضر ہوتے، حضرت زیادہ تر خاموش رہتے، اس وقت کوئی دینی اور روحانی کتاب پڑھی جاتی، لوگ خاموشی سے سنتے، کبھی

کبھی کوئی بات ارشاد بھی فرماتے مگر مختصر! ایسی ہی ایک مجلس میں، میں حاضر تھا، ایک غیر مسلم صاحب ثروت غالباً کلکتہ سے آیا تھا اس کا اکلوتا جوان لڑکا گھر سے فرار ہوگیا تھا وہ اس کیلئے بہت بے قرار تھا وہ حضرت سے پوچھنے آیا تھا کہ میرا لڑکا زندہ ہے، یا مرگیا، اگر زندہ ہے تو کہاں ہے؟ بہت سے جھاڑ پھونک کا پیشہ کرنے والے مختلف حسابات یا حاضرات کے ذریعہ غیب کی اس طرح کی باتوں میں اٹکل چلایا کرتے ہیں اور بہت سے تو مدعی ہوتے ہیں کہ اس سے گمشدہ مال یا مفرور آدمی کا پتہ چل جاتا ۔ وہ غریب یہی سمجھ کر حاضر ہوا تھا کہ بابا سب کچھ جانتے ہوں گے بتادیں گے۔

حضرت نے نہایت قوت سے اس کو بتایا کہ یہ غیب کی بات ہے اس کو کوئی بتا نہیں سکتا اسے اللہ ہی جانتا ہے۔ اگر کوئی اس کے جاننے کا دعویٰ کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، میں کچھ نہیں جانتا اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کا لڑکا بسلامت واپس آجائے۔

مولانا یہ فرمارہے تھے بات میں قوت تھی، مگر حسبِ عادت لہجہ دھیما تھا اور ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس غیر مسلم کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑتی چلی جارہی تھی، اس کا اضطراب سکون میں بدلتا جارہا تھا، اس نے کہا کہ بابا آپ کی بات میں سچائی ہے، آپ نے دعا کردی ہے مجھے یقین ہے کہ میرا بچہ مل جائے گا۔

آخر میں حد درجہ ضعف بڑھ گیا، نماز کے لئے مسجد میں جانے سے معذوری ہوگئی تھی مگر طبیعت پر بشاشت رہتی تھی، اس ضعف کے عالم میں کئی مرتبہ میری حاضری ہوئی حسبِ معمول نہایت شفقت سے ملتے اور دعائیں دیتے، کچھ ظریفانہ باتیں بھی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ فرماتے، میں نے مولانا کو کبھی کھلکھلا کر ہنستے نہیں دیکھا، مگر چہرہ بوجھل بھی نہیں دیکھا۔ ہلکا سا تبسم ہر ملاقات میں محسوس ہوتا، جو کہ عین

سنت نبوی ہے، مولانا اتباعِ سنت کے بڑے شیدا تھے۔

اسی ضعف واضمحلال کے وقت ایک مرتبہ خدمت میں میری حاضری ہوئی، خیریت پوچھی تو فرمایا کہ سانس لینے بھر زندہ ہوں یہ موقوف ہوجائے تو لوگ دفن کردیں۔

اخیر میں ضعف کے باعث غالباً گر پڑے تھے، جس سے کولہے کی ہڈی متاثر ہوگئی تھی، بنارس کے کسی ہسپتال میں داخل تھے۔

عاشوراء کے دن پھولپور سے میرے ایک عزیز حافظ ریاض احمد صاحب کا دس بجے دن میں فون آیا کہ حضرت مولانا کا انتقال ہوگیا، خبر غیر متوقع نہ تھی، لیکن اللہ والوں کے وصال سے زمانہ کے افلاس کا احساس بڑھ جاتا ہے، اللہ والوں پر جو برکتیں ہمہ وقت منجانب اللہ نازل ہوتی رہتی ہیں ان کا سلسلہ بند ہوجاتا ہے تو قلوب میں تغیر آجاتا ہے، حضرت مولانا کی وفات صرف ان کی اولاد، صرف ایک ادارہ کیلئے حادثہ نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں تک ان کی توجہات کا دائرہ تھا، سب اس سے متاثر ہوں گے۔

حق تعالیٰ کی شان نرالی ہے، یہ بزرگ حضرات مہبطِ نور الٰہی ہوتے ہیں، حق تعالیٰ کے لئے یہ حضرات اپنے کو فنا کرتے ہیں تو رحمت الٰہی ان پر بارش کی طرح برستی ہے ان کے گرد رحمت کے فرشتوں کا ہجوم ہوتا ہے، جن کی طرف ان کی توجہ ہوجاتی ہے رحمت کا دھارا اسی طرف بہنے لگتا ہے ان کا وجود کتنی آفات اور بلاؤں کا سد باب ہوتا ہے۔ ان حضرات کے جانے سے قلوب کی دنیا میں اندھیرا چھا جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کسی طاقتور شخصیت کو پیدا فرماتے ہیں تو اس کی تلافی ہوجاتی ہے۔

اسی دن رات کے دس بجے جنازہ کا اعلان تھا، علماء وصلحاء کے ایک جمِ غفیر نے نمازِ جنازہ ادا کی، نماز کے بعد تدفین کا مرحلہ تھا، معتقدین ومتوسلین اور عوام کا

اس قدر ہجوم تھا کہ جنازہ کا قبرستان تک پہونچنا مشکل ہورہا تھا، دیر تک تدفین کا سلسلہ رہا۔

حق تعالیٰ اپنی رحمت ومغفرت سے نوازیں، تمام عمر جسکی یاد میں گزاری تھی، جس کی رضامندی کے حصول میں ساری زندگی قُربان کی تھی رات کی تاریکیوں میں جس سے سرگوشی اور مناجات کی تھی۔ دن کے اجالے میں جس کے نام کو پُکارا تھا، جس کے کلمہ کو لے کر جا بجا پھرتے رہے تھے۔ یہ رات اسی محبوب ذات سے ملاقات کی رات ہے، امید تو یہی ہے کہ إن الله لا يضيع أجر المحسنين کا فرمان جاری کرنے والا خوش ہوکر ان سے ملا ہوگا۔ ہائے آسیؔ مرحوم نے کیا عمدہ بات کہی ہے۔

اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسیؔ
ہے شبِ گور بھی اس گل کی ملاقات کی رات

أللٰهم اغفر لهٗ وارحمه وأدخله وارض عنه وارضهٖ عنک یا أرحم الراحمين

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حاجی عبدالرحمٰن صاحب خیرآبادی علیہ الرحمہ

وفات: یکم رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۰/دسمبر ۱۹۹۹ء

میرا بچپن تھا، غالباً مکتب کی تعلیم مکمل ہوچکی تھی، ابتدائی فارسی گاؤں ہی میں پڑھ رہا تھا۔ رمضان کا مہینہ آگیا، اس وقت ہمارے گاؤں میں حفاظ کی کمی تھی، ایک کھیپ حفاظ کی ان دنوں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور سے فارغ ہوکر آئی تھی، ان لوگوں نے تراویح کے لئے مختلف مسجدیں سنبھال لی تھیں، مگر ان میں سے بعض نے آخر تک پہونچتے پہونچتے ہمت ہاردی، تکمیل قرآن کے لئے قریبی گاؤں خیرآباد سے حافظ عبدالحی صاحب کو۔۔۔ جو اس وقت مفتاح العلوم مئو میں زیر تعلیم تھے۔۔۔ دعوت دی گئی۔ وہ تشریف لائے اور لوگوں کے دلوں پر بہترین نقوش چھوڑ گئے، بچپن کا معصوم دل! ان کی عظمت سے معمور ہوگیا، تلاش ہوئی کہ یہ کون صاحب ہیں؟ معلوم ہوا کہ اترا ری خیرآباد کے رہنے والے ہیں، حاجی درگاہی صاحب کے فرزند ہیں، ان کے بڑے بھائی عبدالرحمٰن صاحب جو گھر گرہستی کا کام دیکھتے ہیں، اور یہ حافظ صاحب اوران سے چھوٹے بھائی پڑھتے ہیں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ حاجی عبدالرحمٰن صاحب کا نام کان کے راستے سے دل میں داخل ہوا، دل میں یہ نام اچھی طرح یاد ہے کہ محفوظ رہا۔ مگر ملاقات کی تقریب کیا ہوتی، میں طفل نابالغ اور وہ جوان صاحب اولاد! مگر مختلف اوقات میں، مختلف عنوانات سے یہ نام تذکرہ میں آتا رہا، اور طبیعت میں ایک نامعلوم سی دلچسپی محسوس ہوتی رہی۔

وقت اپنی متعین رفتار سے آگے بڑھتا رہا، میں مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا انقلاب روزگار میں الٹا پلٹتاے ۱۳۹ھ میں الہ آباد مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مدرسہ وصیۃ العلوم میں بسلسلۂ تدریس جا پہونچا، مجھ سے پہلے میرے دوست مولانا عبد الرب صاحب اعظمی وہاں پڑھا رہے تھے، اسی سال الہ آباد مجیدیہ کالج میں ایک بڑا تبلیغی اجتماع ہوا، مولانا عبد الرب صاحب شام کے وقت دو مہمانوں کے ساتھ اجتماع گاہ سے واپس آئے، انھوں نے بتایا کہ یہ دونوں حضرات خیرآباد کے رہنے والے ہیں، یہ حاجی صغیر احمد صاحب ہیں، اور یہ حاجی عبد الرحمٰن صاحب ہیں۔

دل میں انس اس نام سے تو پہلے ہی سے تھا، ملاقات کے بعد اس میں استواری پیدا ہوئی، تھوڑی دیر کی یہ ملاقات دونوں کے لئے بہت مؤثر ثابت ہوئی، محبت کا تخم موجود تو تھا ہی، اب پودا بن کر نکلا، اس کی جڑیں گہری ہوتی گئیں، اور سایہ گھنا ہوتا گیا، الہ آباد سے میں گھر آتا، تو ان سے ملنے کے لئے ان کے گھر جاتا، انھیں معلوم ہو جاتا تو وہ ملنے کے لئے تشریف لاتے، اور دیر تک ساتھ رہتے، گو کہ عمر میں بہت تفاوت تھا، میں بہت چھوٹا تھا، وہ بہت بڑے تھے، مگر وہ جب آتے بہ نیت استفادہ آتے، اکرام و تعظیم کے تمام تقاضوں کا لحاظ رکھتے تھے، دین سے، دینداروں سے، علماء و شائخ سے دینی کتابوں سے انھیں بہت دلچسپی تھی، خوب سوالات کرتے، میں جواب دیتا تو بہت غور سے سنتے، اسے یاد کرنے کی کوشش کرتے، اور اس میں کامیاب ہوتے، کبھی کچھ بھولتے تو حافظہ کی خرابی کی شکایت کرتے، حالانکہ ان کا حافظہ اچھا تھا، مگر ان کے شوق کے مطابق باتیں یاد نہ رہتیں، تو افسوس کرتے، کوئی اہم بات ہوتی، تو بعد میں اسے لکھ لیتے، اور وقتاً فوقتاً پڑھتے رہتے۔

پھر اتنی کثرت سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، صحبتیں رہیں کہ ہم میں سے ہر ایک

دوسرے کے لئے علامت اور شناخت بن گیا، حاجی صاحب میرے گاؤں آتے تو ناواقف لوگ سمجھ جاتے کہ فلاں الہ آباد سے آگیا ہے، اور میں گھر آتا تو حاجی صاحب کے متعلقین کو انتظار ہو جاتا کہ فلاں شخص ضرور یہاں آئے گا، لیکن الہ آباد پھر بھی دور تھا، وطن کی آمد و رفت کم تھی، چند سال کے بعد دوبارہ غازی پور آگیا۔ الہ آباد جانے سے پہلے مدرسہ دینیہ غازی پور میں پڑھاتا تھا، الہ آباد کے اصحاب مجھے الہ آباد لے گئے تھے، چند سال کے بعد میں لوٹ آیا، اب قرب رُوحانی کے ساتھ قرب مکانی بھی حاصل ہو گیا، ادنیٰ ادنیٰ بہانوں سے خیرآباد کی آمد و رفت شروع ہو گئی، وہ بھی وقتاً فوقتاً مدرسہ میں وارد ہوتے رہتے۔

غازی پور کی آمد و رفت میں اس حلقہ میں ایک اہم شخصیت کا اضافہ ہوا، جو کثرت مطالعہ، علمی استحضار، قوت حافظہ، فصاحت و بلاغت اور حاضر جوابی میں سب سے ممتاز ہے، یہ ہیں حافظ قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی، قاری صاحب بھی مدرسہ دینیہ میں استاذ تھے، قاری صاحب نابینا ہیں، جن لوگوں نے انھیں دیکھا نہیں، وہ ان کی صلاحیتوں اور ان کے فضل و کمال کا اندازہ نہیں لگا سکتے، اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی بچپن میں واپس لے لی، اور دل و دماغ کی آنکھیں روشن کر دیں، میں نے اگلوں کی قوت حافظہ کی داستانیں پڑھی ضرور ہیں، لیکن ان کی مثال قاری شبیر احمد صاحب کے اندر دیکھی، سینکڑوں کتابیں، انھوں نے پڑھوا کے سنیں اور حافظہ میں محفوظ کر لیں، حاضر جوابی میں لاجواب، شاعری میں بے مثال، فصاحت و بلاغت اور حسن تقریر کا وہ ملکہ کہ ان کی مجلسی گفتگو اور تقریریں سن کر خیال ہوتا ہے کہ شاید مولانا ابوالکلام آزاد پھر سے زندگی پا کر ہم لوگوں کے درمیان آگئے ہیں، نہ جاننے والے شاید اسے مبالغہ سمجھیں، مگر جاننے والے اس کی حرف بحرف تصدیق کریں گے۔

میرا ان سے تعلق دیوبند کے زمانۂ طالبعلمی سے ہے، میں جب مدرسہ دینیہ

غازی پور میں مدرس ہوا، اس وقت وہ میرٹھ اکلا خان پور میں پڑھاتے تھے، مجھ سے ملنے کے لئے وہ متعدد بار غازی پور تشریف لائے ، مدرسہ دینیہ کے مہتمم جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی نے ان کی بڑی قدر کی ، بالآخر میری تحریک پر انھوں نے ان کو غازی پور بلالیا، حاجی صاحب کی جب ان سے ملاقات ہوئی، تو وہ تو ایسے جوہر قابل کی تلاش میں رہا ہی کرتے تھے ، انھوں نے بڑی قدر کی ، اب ہم مولانا عبدالرب صاحب سمیت تین شخص حاجی صاحب کے مرکز نظر بن گئے ۔ وہ بار بار اپنے دولتکدہ پر ہم لوگوں کو بلاتے ، ہم لوگوں کو اپنے گھر پاکر بہت خوش ہوتے ، ضیافت کا بہت اہتمام کرتے ، ہم لوگوں کو ان کے گھر ٹھہرنے میں بعض وقت دقتیں ہوتی تھیں ۔ انھوں نے بہت جلد ان دقتوں کا حل نکالا ۔

حاجی صاحب سے میرا دوستانہ تعلق ۱۳۹۷ھ (۱۹۷۷ء) سے ان کی وفات ۱۴۲۰ھ (۱۹۹۹ء) تک رہا ۔ اس طویل مدت میں میرا ان کا ساتھ سفر میں بھی رہا، حضر میں بھی رہا، میں بارہا ان کا مہمان رہا، وہ بار بار میرے مہمان رہے، بہت ہی قریب سے انھیں دیکھنے کا موقع مجھے ملتا رہا، وہ خود بھی اپنے احوال بیان کرتے رہتے تھے، اپنے نجی معاملات میں مشورہ کرتے، دینی امور میں استفسار کرتے، غرض ان کی زندگی کا ہر رخ اور ہر پہلو میرے سامنے عیاں تھا انھوں نے اپنا کوئی عیب و ہنر چھپانے کی کوشش نہیں کی، ریا و نمائش کی چادر کبھی نہیں اوڑھی ۔ ان کا دل محبت کا خوگر تھا، ٹوٹ کر محبت کی، اور اس محبت کی راہ میں بدنامیاں آئیں، طعنے سننے کو ملے، مسکرا کر سب کا استقبال کیا، اور محبت کی جس راہ پر چلے تھے، کبھی قدم کو انحراف اور لغزش کی شکایت نہیں ہوئی ، میں نہیں کہتا کہ وہ صرف خوبیوں کے پُتلے تھے، محض محاسن و محامد کے مخزن تھے، بشر، وہ بھی چودھویں صدی کا بشر معائب سے کب پاک ہوسکتا ہے، لیکن آدمی پر نظر کی جاتی ہے، اس کے مجموعی طرز کے لحاظ سے! اس کے قلبی

رجحان وعقیدہ کے اعتبار سے! اس کی نظر کے مرکز و مطمح کے زاویے سے! اگر اس کے نظر وفکر کا قدم علم وعقیدہ کے ’’صراط مستقیم‘‘ پر گامزن ہے، تو اس کی رفتار کی لغزش، کبھی اس کا گر پڑنا، کبھی کسی وجہ سے اس کا تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جانا، کبھی کچھ لحظہ کے لئے پیچھے کی طرف مُڑ جانا سب قابل عفو ہے، لائق درگزر ہے، پس وہ بشری اور بشری کمزوریوں سے خالی نہ تھے، مگر محبت کا جواب محبت ہے، محبت کی نگاہ عیبوں پر نہیں پڑتی، اگر پڑتی ہے تو اس میں ہنر کی چمک دمک دیکھتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ محبت کی نگاہ زیادہ تر محاسن پر پڑتی ہے، میں نے ان کے محاسن کو دیکھا اور اتنی کثرت سے دیکھا کہ عیبوں پر پردہ پڑا رہا ۔

واقعی محبت عجیب چیز ہے، اب خیال فرمایئے حاجی عبدالرحمٰن صاحب نہ عالم و فاضل تھے ، نہ میرے استاذ یا ساتھی تھے ، نہ لوگوں کی نگاہ میں بظاہر ان کا کوئی کارنامہ ہے، نہ وہ سیاسی لیڈر تھے، ایک عام آدمی جیسے تھے، نماز باجماعت کے پابند تھے ۔ تلاوت کا اہتمام کرتے تھے، کچھ تسبیحات اور ’’اوراد ووظائف‘‘ پر دوام رکھتے تھے، کون سی ایسی خاص بات ہے جس پر مضمون لکھا جائے، مگر وہ محبت ہے جو مجھ سے یہ سطریں لکھوا رہی ہے، اور میں سرشار ہوکر لکھے جا رہا ہوں، اس مضمون میں ان کی جتنی باتیں ذکر کروں گا، ان سب میں اسی محبت کی جلوہ گری ہے، محبت ہی بات کا آغاز ہے اور محبت ہی اس کا اختتام، محبت ہی نے معمولی چیزوں کو غیر معمولی بنایا ہے، اگر یہ محبت نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو سارا مضمون ناقابل اہمیت الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جائے گا، اور اگر وہ نگاہ کے سامنے رہے تو اس کا لفظ لفظ بیش قیمت ہوگا ۔

حاجی صاحب کو جب میں نے دیکھا، انھیں ایک دیندار آدمی پایا، نہ صرف لفظی اور ظاہری اعتبار سے، بلکہ معنوی اور باطنی لحاظ سے بھی وہ دیندار تھے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتے تھے، ہر ہر امر میں اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ اس

میں دین وشریعت کی منشا کیا ہے؟ عمل میں چاہے کوتاہی رہ جاتی ہو، مگر اس کی ہمیشہ کوشش رہتی تھی کہ کسی بات میں منشاءالٰہی سے ناواقفیت نہ رہے، کوتاہی ہوتی تو اس کا اعتراف کرتے، عجز وقصور کی شکایت کرتے، کوئی تاویل نہ کرتے، غلط کو صحیح بنانے اور بتانے کی کوشش نہ کرتے، اپنے اسی جذبہ کی وجہ سے وہ مسائل ومعاملات میں بکثرت سوال کرتے، باریک امور کی طرف ان کا ذہن بہت تیزی سے چلتا، اور وہ جاننے اور عمل کرنے کے لئے ہر ملاقات میں کچھ نہ کچھ پوچھتے رہتے، اور حتی الامکان اس پر عمل کرتے۔

وہ نماز باجماعت کے بڑے پابند تھے، شاید کسی عذر کی وجہ سے ان کی جماعت چھوٹتی رہی ہو، اپنی گھڑی ہمیشہ مسجد کی گھڑی سے ملا کر رکھتے، گھر سے مسجد پہونچنے میں کتنی دیر لگتی ہے، یہ ہمیشہ ان کے ذہن میں رہتا، عموماً گھر سے وضو کر کے نکلتے اور ایسے وقت مسجد میں پہونچ جاتے کہ اطمینان سے سنت ادا کر کے تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھ سکیں، اس پابندی کا اثر یہ تھا کہ اپنی مسجد میں بیشتر اوقات وہی امام ہوتے، حالانکہ وہ اصطلاحی طور پر نہ قاری تھے، نہ حافظ نہ مولانا! تاہم قرآن صحیح پڑھتے تھے۔ چھوٹی بڑی سورتیں انھیں بکثرت یاد تھیں، اور نماز کے مسائل سے خوب واقف تھے، ان کے پیچھے میں نے نماز پڑھی ہے، قرآن درست پڑھتے تھے۔ وہ سنت کے مطابق نمازوں میں قرأت کیا کرتے تھے، اور پوچھ پوچھ کر معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔

انھیں معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں پہلی رکعت میں سورہ ’’**الم سجدہ** ‘‘ اور سورہ ’’**دھر** ‘‘ پڑھنا مسنون ہے، تو خوب اس کی تحقیق کی، پھر انھوں نے ارادہ کیا کہ اسے فجر کی نماز میں پڑھا کریں، مگر ان کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اول تو اس لئے کہ نماز میں سورہ ’’**الم سجدہ** ‘‘ پڑھنے کی انھیں مشق نہ تھی، سورہ ’’دھر‘‘ تو

اکثر پڑھا کرتے تھے، لیکن سورہ سجدہ نماز میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، وہ ڈرتے تھے کہ بھول جاؤں گا، دوسرے یہ کہ ہمارے دیار میں یہ سنت عام طور سے متروک ہے، اسی لئے کوئی جانتا ہی نہیں کہ یہ بھی کوئی سنت ہے، یہ بھی اندیشہ انھیں رہتا تھا کہ نامانوس ہونے کی وجہ سے اور لاعلمی کے باعث کہیں یہ وجہ تشویش نہ بن جائے۔ اور چونکہ وہ عالم نہیں ہیں، اس لئے لوگوں کے اعتراض کا نشانہ بن سکتے ہیں اور لوگ ان کے جواب پر مطمئن نہ ہوں گے۔

میں جب بھی جمعہ کی شب میں وہاں ہوتا، تو ضرور فرمائش کرتے کہ آج فجر کی نماز میں مسنون سورتیں پڑھ دیجئے گا، اس طرح گاہے گاہے اس محلّہ کی مسجد میں جمعہ کی فجر میں یہ سورتیں پڑھی جانے لگیں، مگر خود ان کی ہمت نہیں پڑتی تھی، میں ان کو حوصلہ دلاتا رہا کہ آپ خود پڑھئے، بھولنے کی فکر نہ کیجئے، بالآخر انھوں نے ہمت کر کے شروع کر دی، اور الا ماشاء اللہ، باید وشاید کبھی بھولے ہوں، پھر وہ اس پر مسلسل عمل پیرا رہے، اور اس سلسلے میں کسی کہنے سننے والے کی فکر نہ کی، کیونکہ اس کا پڑھنا سنت سے ثابت ہے۔

اللہ کی محبت ہی کا اثر تھا کہ حاجی صاحب شب خیزی کے بہت شائق تھے، تہجد کے وقت اٹھنے کے لئے وہ بڑا جتن کرتے تھے، نیند انھیں زیادہ آتی تھی، جہاں چاہیں بے تکلف سو جاتے تھے، اور اخیر شب میں اس وقت نہ اٹھ پاتے، تو بہت دلگیر ہوتے، بار بار پوچھتے، اٹھنے کی کیا تدبیر ہو! معلوم کرتے، اس کے لئے الارم لگاتے، وہ صبح صادق سے کم از کم ایک گھنٹہ پہلے اٹھتے، اور نماز تہجد میں طویل طویل سورتیں پڑھتے، دعائیں کرتے، اور جب صبح صادق ہوجاتی تو سنت فجر پڑھ کر تلاوت کرتے، اور ایک پارہ تلاوت کر کے مسجد جاتے۔

ان کی تلاوت کا معمول بھی خوب تھا، اور اس کی بڑی پابندی کرتے، علاوہ

خاص خاص سورتوں کے پڑھنے کے، جن کے احادیث میں فضائل بیان کئے گئے ہیں، ایک پارہ پڑھنے کا روزانہ بالالتزام معمول تھا۔ اور وہ اس طرح چاند کی پہلی تاریخ سے قرآن کا آغاز کرتے، کہ چاند کی جو تاریخ ہوتی، تلاوت کے پارے کا عدد بھی وہی ہوتا، اگر اگلا چاند ۲۹ / کا ہوتا تو اسی شب میں قرآن کے آخری **جُز** کی تلاوت پوری کرتے، اور پھر پہلی تاریخ کو پہلا پارہ پڑھتے، اس میں سفر وحضر میں کبھی تخلف نہ ہوتا، انھیں ہمیشہ مستحضر رہتا کہ آج چاند کی کون سی تاریخ ہے، صبح کو جو پارہ تلاوت میں رہا ہوتا، وہی تاریخ ہوتی۔

رمضان شریف میں تلاوت کا معمول بدل جاتا، اب ایک پارے کی تلاوت پر اکتفا نہ ہوتی، کم از کم دس پارے کی تلاوت کرتے یا پندرہ پارے کی، اخیر عشرہ میں مقدار کچھ بڑھ جاتی، وہ ناظرہ خواں تھے، مگر رواں اور صاف پڑھنے میں بہت سے حفاظ بھی ان کے ہم عناں نہیں ہوسکتے تھے، کثرت تلاوت کی وجہ سے اتنا استحضار انھیں تھا کہ تراویح یا عام فرض نمازوں میں امام سے کبھی کوئی غلطی ہوتی، تو اس پر گرفت وہی کرتے تھے، کبھی نماز میں لقمہ دیدیتے، اور کبھی نماز کے بعد متنبہ کرتے،

رمضان شریف کا ذکر آگیا تو یہ بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ میں ایک طویل عرصہ تک پورا رمضان اپنے گاؤں میں گزارتا رہا، ماہ مبارک میں ہر جمعہ کو، کبھی خطبۂ جمعہ سے پہلے اور کبھی نماز جمعہ کے بعد ۴۵ / منٹ یا ایک گھنٹہ وعظ کا معمول ہوتا، اور روزانہ نماز تراویح کے بعد درس قرآن ہوا کرتا، گرمیوں کے رمضان ہوتے، مگر حاجی صاحب کا دستور تھا کہ جمعہ کی اذان سے پہلے وہ خیرآباد سے بھیرہ آجاتے، خیرآباد سے بھیرہ کا فاصلہ سڑک کی راہ سے تین چار کلومیٹر ہے، وہ اذان سے پہلے آجاتے، اور عصر کی نماز کے بعد گھر جاکر افطار کرتے، یہ دستور سالہا سال رہا، کبھی کبھی تراویح کے بعد درس قرآن میں بھی آتے، اور تحسر کے لہجے میں کہتے کہ روزانہ آنا چاہئے، مگر رات چھوٹی ہوتی ہے، اور درس قرآن ختم ہوتے ہوتے آدھی رات بیت جاتی ہے، اتنا جاگنے کا تحمل نہیں ہے۔

بزرگوں کی زیارت کرنے، ان سے نصیحتیں حاصل کرنے اور دعائیں لینے کا انھیں بڑا شوق تھا، ایک سے زائد بار وہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں باندہ بھی حاضر ہوئے، حضرت ماسٹر محمد قاسم صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں بھی پہونچے۔

میرے شیخ **حضرت مولانا عبد الواحد صاحب مدظلہٗ** پاکستان سے تشریف لاتے، تو ان کی خدمت میں کئی کئی دن رہتے، خصوصیت سے حضرت کے ساتھ بے حد تعلق تھا، اور ان سے بڑی محبت رکھتے تھے، چونکہ حضرت سراپا تواضع وفنا ہیں، اس لئے ان کی خدمت میں حاضری اور ان کے ساتھ رہنا بہت آسان محسوس ہوتا، حضرت بھی حاجی صاحب کے ساتھ بہت خصوصی برتاؤ کرتے، حضرت پاکستان ہوتے تو حاجی صاحب ٹیلیفون سے رابطہ رکھتے، حج میں جانے والوں کے ہاتھ حضرت مدظلہٗ کے لئے ہدئے بھیجتے، حضرت کی طرف سے ہدایا وعطایا کے تحفے آتے رہتے۔

ایک بار حضرت ہندوستان میں اپنے قدیم وطن شیخ پور ضلع غازی پور میں مقیم تھے۔ حاجی صاحب کے ساتھ میں بھی وہاں حاضر تھا، حضرت پر قرآن کی تلاوت کے وقت بسا اوقات شدید گریہ طاری ہوتا ہے، ایک روز فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، دوسری رکعت میں سورہ ”قیامہ“ کی تلاوت فرمارہے تھے، پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ پوری کائنات وجد کرتی محسوس ہورہی تھی۔ ہر مقتدی سرشار تھا، آہستہ آہستہ حضرت کی آواز بھراتی چلی گئی، كَلَّآ إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ پر پہونچے تو اتنے زور کا گریہ

طاری ہوا کہ آواز آنسوؤں میں گھٹ کر رہ گئی۔ اور تمام مقتدی بلبلا اٹھے، سب پر ایک کیف طاری ہوگیا۔

حاجی صاحب اس نماز کے کیف وحال کا تذکرہ زندگی بھر کرتے رہے، کہ اس دن نماز کی حلاوت اور کیفیت ولذت کا ذوق حاصل ہوا۔

حاجی صاحب کو اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کے سلسلے میں دینداری کی بہت فکر رہا کرتی تھی، چار بھائیوں میں بڑے تھے، والد صاحب کے ساتھ محنت ومشقت سے کاروبار میں لگے رہتے، اپنے ہاتھ سے کرگہہ پر کپڑا تیار کرتے، پھر کاریگروں سے مال تیار کرانے لگے، مگر اپنے بھائیوں کو براہ راست کاروبار میں شریک نہیں کیا، یہ دین اور دینداری سے محبت ہی کا اثر تھا کہ تینوں بھائیوں کو علم دین کی تحصیل پر لگایا، تینوں ماشاء اللہ عالم فارغ التحصیل ہوئے، اور تینوں کسی نہ کسی نوع سے دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

مولانا حافظ عبد الحی صاحب مدظلہٗ تو ماشاء اللہ مشرقی یوپی کے ممتاز مدرسہ منبع العلوم خیرآباد کے ناظم ومہتمم ہیں اور چند اسباق بھی پڑھاتے ہیں، یہ دونوں کام وہ حسبةً للہ انجام دیتے ہیں، مدرسہ سے کوئی تنخواہ نہیں لیتے اور بھی کئی مدرسوں کے سرپرست ہیں۔

دوسرے بھائی **مولانا عزیز الرحمن صاحب** مدظلہٗ تعلیم وتدریس کے کام میں براہ راست تو نہیں لگے، لیکن مدارس، طلبہ اور علماء کی خدمت میں پیش پیش رہتے ہیں، علماء وطلبہ سے بے حد محبت رکھتے ہیں، ان شاء اللہ، حدیث **المرء مع من أحب** (آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے) کی بشارت کے مطابق اسی زمرہ میں ان کا شمار ہوگا۔

تیسرے بھائی **مولانا حفیظ الرحمن صاحب** دارالعلوم دیوبند اور

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بھی فراغت حاصل کی، اور اب مدرسہ منبع العلوم خیرآباد میں شعبہ عربی کے استاذ ہیں۔

پھر حاجی صاحب نے اپنے فرزندوں کے لئے بھی یہی راہ اختیار کی، بڑے فرزند **فیض الحق سلمہ**' بچپن اپنی سخت بیماریوں کی وجہ سے تعلیم میں آگے نہ بڑھ سکے۔ مگر ماشاء اللہ دینداری میں اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، علماء وطلبہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، اور مزید یہ کہ خدمت خلق کا جذبہ حق تعالیٰ کی طرف سے خصوصی طور سے پایا ہے، لوگ اپنے مشکلات ومسائل کے حل کرنے میں جس شخص کو پیش پیش پاتے ہیں، وہ ان کے چچا حافظ عبد الحی صاحب مدظلہٗ کے بعد یہی فیض الحق سلمہٗ ہوتے ہیں۔

دوسرے فرزند عزیزی مولوی **حافظ منظور الحق سلمہ**' دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہیں، مدرسہ منبع العلوم میں شعبہ حفظ کے استاذ ہیں، اور اپنے بھائی فیض الحق کے دست وبازو ہیں۔

تیسرے فرزند عزیزم **مولوی حافظ ضیاء الحق سلمہٗ** (حاجی بابو) ان کو حاجی صاحب نے حفظ کی تکمیل کے بعد جلد ہی میرے سپرد کردیا، انھوں نے عربی کے متوسطات تک تعلیم مجھ سے حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، اسی دوران مجھے سفر حج کی سعادت حاصل ہوئی، حاجی صاحب اور ان کے فرزندوں نے ازراہ محبت انھیں میرے ساتھ اس سفر سعادت میں بھیجا، جب یہ گود میں تھے، تو والدین کے ساتھ حرمین شریفین حاضر ہوئے تھے، اور اسی مناسبت سے حاجی بابو کہلاتے ہیں، اب حقیقةً ''حاجی بابو'' ہوگئے۔

دیوبند سے فراغت کے بعد حاجی صاحب نے انھیں میرے ہی سپرد کیا۔ اور اب یہ ماشاء اللہ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں شعبہ عربی کے استاذ ہیں، اور ماھنامہ

’’**ضیاء الاسلام**‘‘ کے مدیر! لکھنے پڑھنے کا ذوق بہت خوب ہے، اللہ تعالیٰ ترقیات سے نوازیں۔ آمین

حاجی صاحب نے پہلا حج ۱۹۷۶ء میں کیا تھا، ۱۹۸۸ء میں انھیں دوبارہ حج میں جانے کا شوق ہوا اور ان کی بڑی خواہش یہ تھی کہ میں سفر حج میں رفیق رہوں، مگر میرے پاس اسباب نہ تھے کہ سفر حج کی ہمت کرتا، اور حاجی صاحب کے حالات ایسے نہ تھے کہ میرا خرچ ادا کرتے، مگر انھیں محبت کی وجہ سے لگن تھی کہ جیسے بھی ہو ساتھ چلوں، میں نے بے اسبابی کے باوجود حامی بھر دی کہ فارم بھر دیجئے، اسباب کے لئے اللہ کے حضور گریہ وزاری کی جائے گی، اس وقت پانی کا جہاز حاجیوں کو لے جایا کرتا تھا، انھوں نے اپنے ساتھ میرا بھی فارم بھر دیا لیکن اس میں ناکامی ہوئی اور درخواست منظور نہ ہوئی، دوسرے سال پھر فارم بھرنا تھا، مگر فارم بھرنے کے وقت میں کہیں لمبے سفر میں تھا، میں غفلت میں رہا، وقت کی تنگی کی وجہ سے حاجی صاحب نے اپنے ساتھ تین رفقاء کا فارم پانی کے جہاز سے بھرا، مجھ سے گفتگو کا چونکہ موقع نہ مل سکا تھا اس لئے میرا فارم نہیں بھرا گیا۔

میں سفر سے واپس آیا تو پانی کے جہاز کی تاریخیں نکل چکی تھیں، مجھے بھی قلق تھا، اور حاجی صاحب کو بہت افسوس تھا، میرے دوست حافظ نسیم الحق معروفی نے جو بمبئی میں رہتے ہیں، انھوں نے میرے علم کے بغیر ہوائی جہاز سے حج کا پروگرام بنا لیا، پھر حاجی صاحب پانی کے جہاز سے اور ہم دونوں ہوائی جہاز سے حرمین شریفین حاضر ہوئے، میرے اس حج کا کم وبیش نصف حصہ حاجی صاحب نے اپنے ذمہ لیا، حج میں حاجی صاحب سراپا کیف ومستی تھے، میں نے اپنے سفرنامۂ حج ’’بطواف کعبہ رفتم ......‘‘ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اخیر کے چند سالوں میں حاجی صاحب کی صحت کمزور ہوگئی تھی، لیکن ایسی نہیں

کہ معمولات وعبادت میں کوئی فرق واقع ہوا ہو، علاج پابندی سے کراتے، کچھ مقروض بھی ہوگئے تھے، اس کا بوجھ بہت محسوس کرتے، اس کے لئے بہت دعائیں کرتے، بزرگوں سے دعائیں کراتے۔ (باری تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے اس کی ادائیگی کا سامان پیدا فرمائیں۔ آمین)

شعبان ۱۴۲۰ھ میں ان کی طبیعت خراب ہوئی، بخار میں مبتلا ہوئے، ٹیلیفون سے مجھے اطلاع کی، میں اس خیال میں رہا کہ بخار ہی تو ہے، ہوتا ہی رہتا ہے، انشاء اللہ اچھے ہوجائیں گے، مدرسہ میں امتحان کی مشغولیات تھیں، وہ ٹیلیفون کرتے رہے، اپنے احوال کی خبر دیتے رہے، امتحان سالانہ سے فراغت کے بعد میں عیادت کے لئے حاضر ہوا، تو ضعف زیادہ ہوگیا تھا، گھر کے لوگ اس وقت مئو لے جارہے تھے، ابھی اتنی قوت تھی کہ خود سے چل کر گھر سے سڑک پر آگئے تھے، دوبارہ ۲۲ر شعبان کو حاضری ہوئی، تو کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔ سماعت بہت کم ہوگئی تھی۔ میں دیر تک بیٹھا رہا، رک رک کر باتیں کرتے تھے، دعا کی درخواست کرتے رہے، واپسی کی اجازت مانگی، تو بڑی حسرت سے کہا کہ ’’میں کیسے کہوں کہ جائیے؟‘‘

مجھے دوسرے روز بھدوہی جانا تھا، بھدوہی پہونچ کر ٹیلیفون کیا، تو معلوم ہوا کہ حلیمہ اسپتال مئو میں داخل ہیں، اور ڈاکٹر خواجہ کے زیر علاج ہیں، میں جن کے یہاں بھدوہی میں ٹھہرا تھا، ڈاکٹر خواجہ ان کے بہنوئی ہیں، میں نے ان سے ڈاکٹر خواجہ کو ٹیلیفون کرایا، اور خود بھی ان سے بات کی، ان کے بتانے کے لحاظ سے صورت حال زیادہ تشویشناک نہ تھی، تیسرے روز میں مئو پہونچا، تو حالت دگرگوں تھی، غشی طاری تھی، سانس کی آمد ورفت جاری تھی، کبھی کبھی جھٹکے لگ رہے تھے، دیکھ کر دل بھر آیا زندگی بھر کی شگفتہ وشاداب شخصیت کس طرح بے ہوش واداس پڑی تھی، اندر کیا کرب تھا، باہر والوں کو کیا اندازہ، میں تو غم سے نڈھال ہوگیا، دوڑ کر ڈاکٹر خواجہ کے

یہاں گیا انھوں نے تسکین دلانے کی کوشش کی، مگر اندازہ ہوا کہ مرض کی یہ لوگ اب تک تشخیص نہیں کر پائے ہیں، بعد میں معلوم ہوا، غالباً کسی اور ماہر ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کا بخار دماغ میں سرایت کر گیا ہے، اور اب علاج مشکل ہے۔

رمضان شریف کی آمد آمد تھی، مدرسہ کی مسجد میں ان کے چھوٹے فرزند عزیزم مولوی حافظ ضیاء الحق سلمہٗ کو تراویح پڑھانی تھی، ۳۰؍ شعبان کو چاند نظر آیا، حاجی صاحب کی حالت تشویشناک تھی، مگر حاجی بابو شام کو مدرسہ میں آگئے، انھوں نے تراویح پڑھائی، تراویح کے بعد سونے کی تیاری تھی کہ فون کی گھنٹی بجی، بڑے فرزند فیض الحق سلمہٗ نے اطلاع دی کہ تراویح کی نماز کے دوران حالت بہت نازک ہوگئی تھی، ......فیض الحق سلمہٗ تراویح کی نماز کے لئے قریب کی مسجد میں چلے گئے تھے......اب کسی قدر سکون ہے۔

تشویش کی حالت میں نیند کیا آتی، امید وبیم کی کشمکش میں کبھی نیند آتی، اور فوراً ایک جھٹکے سے آنکھ کھل جاتی، ایک بجے کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، فیض الحق نے خبر دی کہ میں ابھی مئو سے آیا ہوں، آتے ہی منظور الحق کا فون آیا ہے کہ ابھی آجاؤ، ڈھائی بجے رات میں مولانا حافظ عبدالحی صاحب نے فون کیا کہ حاجی صاحب کا انتقال ہوگیا، حاجی بابو کو بھی بتادیجئے گا، ساڑھے چار بجے پھر فون آیا کہ سب لوگ مئو سے گھر آگئے ہیں، یہ رات کس اضطراب میں گذری، اب اسے یاد کرتا ہوں تو طبیعت لرز اٹھتی ہے، سب سے مشکل مرحلہ یہ تھا کہ حاجی بابو کو کیونکر اطلاع کروں، اس پر کیا بیتے گی، اور اسے دیکھ کر میرا کیا حال ہوگا؟ حاجی بابو نے میرے ساتھ سحری کھائی، مجھ سے کھایا نہ جاتا تھا، مگر جبراً میں نے اس کے ساتھ کھایا کہ کہیں اس کے ہاتھ سے لقمہ نہ گر جائے، کھالینے کے بعد جی میں آیا کہ بتادوں، مگر ہمت نہیں ہوئی، تب میں نے ایک رقعہ لکھا، اس کو یہاں نقل کرتا ہوں، اس سے میرے حال کا اندازہ ہوجائیگا،

> عزیزم! السلام علیکم
>
> میرا دل حیران ہے، میں کیونکر تمھیں یہ اطلاع سناؤں کہ حاجی صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے، اِنا للہ واِنا الیہ راجعون، رات سوا بجے فیض الحق نے خیر آباد سے ٹیلیفون کیا کہ ابھی مئو سے آیا ہوں، اور منظور الحق کا ٹیلیفون آیا ہے کہ فوراً آجاؤ، کوئی بات ہوگئی ہے، ڈھائی بجے کے قریب حافظ عبدالحی صاحب کا فون آیا کہ انتقال ہوگیا ہے، ساڑھے چار بجے کے قریب منظور الحق کا فون گھر سے آیا کہ سب لوگ گھر آگئے ہیں۔
>
> زبانی سنانے میں ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا، اس لئے لکھ رہا ہوں، اللہ کے نام پر صبر کرو، دل مضبوط رکھو، حالانکہ میں خود اپنے دل میں کمزوری محسوس کرر ہا ہوں، نماز پڑھ کر گھر چلے جاؤ، میں انشاء اللہ آؤں گا، دل دماغ سخت متأثر ہیں، اسی وقت سے جاگ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں، اور تم لوگوں کو اور مجھے بھی صبر کی توفیق بخشیں۔ آمین

یہ رقعہ میں نے ایک طالب علم کے ہاتھوں حاجی بابو کے پاس بھجوادیا، تنہائی میں ان پر کیا گذری، نہ میں نے پوچھا، اور نہ ہی اس کی ہمت تھی، البتہ جب وہ میرے سامنے آئے تو صبر ورضا کے پیکر تھے، انھوں نے بتایا کہ بارہ ایک بجے کے قریب خواب دیکھا کہ میں ابا کے سر پر تیل لگا رہا ہوں، اور وہ کہہ رہے ہیں کہ اب بہت آرام ہے، ٹھیک وہی وقت تھا جب ان کا انتقال ہوا، کہنے لگے اس کے بعد سے میں بھی جاگ رہا ہوں، میں نے کہا انشاء اللہ آرام ہی ہوگا۔ حاجی بابو تو فجر پڑھتے ہی گھر روانہ ہوگئے، میں بھی جی کڑا کر کے خیر آباد پہونچا، اور ایسے وقت میں پہونچا کہ غسل دے کر کفن پہنا کر لوگوں نے انھیں گھر کے صحن میں لٹا رکھا تھا، میں سیدھا وہیں پہونچا، تمام لوگوں پر ایسی سوگوارانہ کیفیت تھی کہ یہ کیفیت میں نے بہت کم

جنازوں میں دیکھی، حاجی صاحب کفن پہنے اس طرح لیٹے تھے، جیسے سو رہے ہوں اور کوئی اچھا خواب دیکھ کر مسکرا رہے ہوں، سامنے کے کچھ دانت کھلے ہوئے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تبسم ان کے ہونٹوں پر کھیل رہا ہو، زندگی میں آخری زیارت میں نے کی تھی، تو سخت اضطراب کا حال تھا، اب سکون ہی سکون تھا، خود تو پُر سکون تھے، اور سارا مجمع اضطراب میں تھا، فیض الحق سلمہٗ سراپا تصویرِ غم بنے کھڑے تھے، میں نے دو ایک کلمہ تسلی کا کہنا چاہا، مگر الفاظ حلق میں گھٹ کر اور آنسوؤں میں پھنس کر رہ گئے۔ کچھ دیر بعد وہاں سے باہر کی طرف آیا، تو حافظ عبدالحی صاحب مل گئے، وہ بے تابانہ لپٹ گئے، لفظ تو کوئی نہ ان کے منہ سے نکلا نہ میرے منہ سے، بس دونوں طرف سسکیاں تھیں، مولوی منظور الحق سلمہٗ الگ نڈھال تھے۔

جمعہ کا دن تھا، جمعہ کی نماز کے بعد مدرسہ منبع العلوم خیرآباد کے وسیع صحن میں جنازہ کی نماز ادا کرنی تھی، بڑی مشکلوں سے ضبط کر کے جنازہ کی نماز اس حقیر نے پڑھائی اور اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا، پھر یہ محبّ و محبوب رفیق خاکی چادر اوڑھ کر صبح قیامت کے لئے سو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ بنائے۔ مغفرت کی دلنواز ادائیں ہمدم و ہم ساز رہیں، نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسُ کی صدائے روح پرور ان کو لوریاں دے، عفو و درگذر کا آب زلال تمام خطاؤں اور غلطیوں سے دھو کر پاک و صاف کر دے۔

تدفین سے واپسی کے بعد دروازے پر ایک بڑا مجمع اکٹھا تھا، تعزیت اور تسلی کے کچھ کلمات کہنے تھے، ہر زبان خاموش تھی، مجھ سے کہا گیا کہ تسلی کے کچھ کلمات کہہ دیں، میں خود نڈھال ہو رہا تھا بڑی مشکل سے کچھ کہہ سکا۔

میرے اوپر کسی کے انتقال کا عموماً اثر زیادہ نہیں ہوتا یہ خیال ہر وقت دل میں جاگزیں رہتا ہے کہ دنیا تو رہ گزر ہے، منزل نہیں، منزل تو خدا کی بارگاہ ہے۔ جس کا

انتقال ہوا ہے، وہ اور کہیں نہیں، اپنی منزل پر پہونچا ہے، کل انشاء اللہ ہم بھی وہیں پہونچ جائیں گے۔ یہ خیال ہمیشہ باعث تقویت و تسلی بنا رہتا ہے، چند ایک موتیں ایسی ہوئیں ہیں، جنھوں نے مجھے اندر سے ہلا ڈالا، چاہے باہر سے میں نے ضبط کی کتنی نمائش کی ہو، میری بڑی بہن سعید النساء جو میرے لئے بمنزلہ ماں کے تھی، کیونکہ ماں کا انتقال میری بے شعوری کے دور میں ہوا تھا، اس بہن کی موت نے مجھ پر شدید اثر ڈالا تھا، پھر خالہ کی موت نے ہلا ڈالا، اسکے بعد میرے استاذ حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ کے انتقال پر بے انتہا اضطراب ہوا تھا، یہی کیفیت میری، حاجی صاحب کے انتقال پر بھی ہوئی۔

حاجی صاحب کی موت خوش نصیبی کی موت تھی، رمضان المبارک کی پہلی شب، وہ بھی جمعہ کی شب، جنت کے دروازے کھلے ہوئے تھے، بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی تمنا یہی تھی، بعض علماء سے وہ پہلے ہی اس رات میں مرنے کی فضیلت پوچھ بھی چکے تھے، حق تعالیٰ نے ان کی تمنا پوری کر دی، اللہ تعالیٰ باقی آرزوئیں بھی پوری فرما دیں۔

حاجی صاحب کی عمر ساٹھ برس سے کچھ زائد ہوئی ہوگی، گندمی رنگ، چہرا بڑا اور شاداب، داڑھی سفید، دہن فراخ، آنکھیں بڑی اور روشن، ہونٹ مسکراتے ہوئے، بہت صاحب اخلاق، جو ملتا، اپنے دل میں محبت محسوس کرتا، چہرے پر عبادات کا نور جھلکتا تھا، اللہ تعالیٰ کی ردائے رحمت ان پر تنی رہے۔ اور ان کی قبر ہمیشہ ٹھنڈی رہے اور جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنے۔ آمین یا رب العٰلمین بحق سید المرسلین ﷺ

(ماہنامہ الاسلام شیخوپور، جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ، اگست ۲۰۰۰ء ص: ۱۱ تا ۲۵)

☆☆☆☆☆☆

مفکر اسلام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی علیہ الرحمہ

وفات: ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء

اللہ کی مشیئت اور اللہ کا ارادہ ہر چیز پر غالب ہے، لیکن عام طور سے لوگوں کے قلوب میں اس کا احساس نہیں ہوتا، واللہ غالبٌ علیٰ أمرہٖ ولکن أکثر الناس لایعلمون ، کسی کو پیدا کیا، کسی کو موت دی، کوئی نقش بنایا۔ کسی نقش کو مٹایا۔ یہ اس کی شان قدرت کا ظہور ہے۔ کل یومٍ ھو فی شأن ، وہ بے نیاز ہے وہی بھیجتا ہے وہی بلاتا ہے۔ انبیاء کو بھیجا اور بلایا، اولیاء کو پیدا کیا پھر اٹھالیا۔ ایک کو دوسرے کے بعد لاتا ہے۔ پھر اسے واپس لے کر دوسرے کو بھیج دیتا ہے۔ کارخانۂ عالم کا یہی نظام چلتا آرہا ہے۔ مگر اس نظام میں بعض افراد اتنے اہم ہوجاتے ہیں ....اور اللہ تعالیٰ ہی انھیں اہم بناتا ہے.......... کہ سیکڑوں، ہزاروں قلوب ان سے وابستہ ہوجاتے ہیں، ان کے چلے جانے سے کتنی رونقیں گم ہوجاتی ہیں۔ کتنے گھر سنسان ہوجاتے ہیں، کتنے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ پھر عرصہ تک ان کی یاد دلوں میں کچوکے لگاتی رہتی ہے۔

حضرت مولانا علی میاں علیہ الرحمہ کوئی ایک شخصیت نہ تھے، وہ شاید تنہا ایک امت تھے، بہت ضعیف ہوچکے تھے، بیمار بھی بہت رہتے تھے، ان کی وفات غیر متوقع نہ تھی، مگر کیا کہئے جب ان کی وفات کی خبر سنی تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ خبر بالکل ناگہانی ہے، کاش یہ خبر نہ آتی۔ انسان کے دل میں جس شخص کی محبت وعقیدت رچ بس جاتی ہے۔ شاید اس کے دل میں اتنی جگہ باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنے مرکز محبت کی موت کو سوچ سکے، لیکن جو واقعہ ازل سے مقدر تھا۔ وہ ہوگیا۔ اور دلوں کی دنیا، علم کی دنیا، دعوت انسانیت کی دنیا، ویران ہوگئی، تکیہ رائے بریلی کا فقیر منش عالم، صاحب دل درویش، اسلام کا منادی، انسانیت کا نقیب، اللہ کا مخلص بندہ، نبی کا سچا امتی، دنیا کے ہر گوشے میں صدائے حق بلند کرتا ہوا، بارگاہ حق میں حاضر ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو۔ وہ اللہ سے خوش ہو۔

مرنا تو ہر ایک کو ہے۔ مگر کتنی خوش نصیبی ہے۔ ایسی موت، جس پر زندگی کو رشک آئے۔ رمضان شریف کی موت، وہ بھی اخیر عشرہ میں، جمعہ کا مبارک دن، قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے، اور تلاوت بھی اس سورہ کی جسے جمعہ کے روز پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ایک خاص نور حضرت حق کی بارگاہ سے عطا ہوتا ہے، یعنی سورہ کہف پڑھتے ہوئے حالت اعتکاف میں، اللہ کے صالح بندوں کے جھرمٹ میں، فرشتے قید زندگی سے رہائی کا پروانہ لے کر آئے۔ اور رمضان کی ۲۳/تیئیسویں شب میں تدفین ہوئی، جس کے شب قدر ہونے کا احتمال تھا۔ اور تدفین ایسی سرزمین میں ہوئی، جو عرصۂ دراز سے انوار ولایت سے جگمگا رہی ہے۔ مسلسل اور بلا انقطاع اس کی آبادی سے لے کر اب تک نور ولایت وہاں چمک رہا ہے۔ اتنی سعادتوں کے بعد کس کا جی نہ چاہے گا کہ کاش ساری زندگی لے لی جاتی اور یہی موت نصیب ہوتی۔ خیر وسعادت کے تمام اسباب اس مسبب الاسباب نے جمع کردئے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے یہی امید ہے کہ حضرت مولانا گزشتہ بزرگوں کے درمیان رضاء الٰہی وخوشنودی انبیاء وصالحین سے نوازے گئے ہوں گے۔

أللّٰھم نور مرقدہ وبرد مضجعہٗ وأدخلہ الجنة وأرض عنہ وأرضہٖ
عنک یا أرحم الراحمین

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب علیہ الرحمہ

وفات: ۲؍ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ

زمانے کی برکتیں اٹھتی جارہی ہیں، رمضان شریف میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہٗ کا وصال ہوا۔ شوال گذرا تو ۲؍ذی قعدہ کی شب میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب بھی خاکدانِ عالم کو چھوڑ کر آخرت کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ إنا للہ وإنا إلیه راجعون

حضرت مفتی صاحب کی جلالت شان کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ عرصہ دراز تک ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند میں منصبِ افتاء پر فائز رہے، جہاں دنیا بھر کے الجھے ہوئے مسائل آتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کو حق تعالیٰ نے بصیرت وتفقہ میں ممتاز مقام عطا فرمایا تھا، اس کا حق ادا کرتے ہوئے، آپ نے پوری ملت اسلامیہ کی رہنمائی فرمائی، اور الجھے ہوئے مسائل کو حل کیا۔

حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا وطن ضلع مئو کا ایک چھوٹا سا گاؤں ''اُندرا'' ہے، وہیں ۱۳۲۸ھ میں مفتی صاحب کی ولادت ہوئی۔ ۱۳۵۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ ابتداءً مدرسہ جامع العلوم جین پور اعظم گڈھ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد کچھ عرصہ گورکھپور میں بسلسلۂ تدریس قیام رہا، پھر اپنے شیخ ومرشد مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے ایماء پر دارالعلوم مئو میں تشریف لائے، مئو میں ۲۵؍سال تک درس وتدریس اور فتویٰ نویسی کی خدمت کرتے رہے۔

پھر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی طلب پر حضرت شاہ صاحب نے مفتی صاحب کو دارالعلوم دیوبند جانے کا حکم دیا، ماہ رجب ۱۳۸۵ھ سے وفات تک ۳۵؍سال فقہ وفتاویٰ کی خدمات انجام دیں۔

حضرت مفتی صاحب طالب علمی کے دور ہی سے، جب وہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئے۔ اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں استاذ تھے، وہیں سے تعلق وعقیدت کی بنیاد پڑی۔ دارالعلوم مئو کے زمانۂ تدریس میں حضرت شاہ صاحب نے اجازت وخلافت سے نوازا۔

حضرت مفتی صاحب سادگی اور بےنفسی میں علمائے متقدمین کی یادگار تھے، اللہ تعالیٰ نے جس قدر علم وفضل اور علوئے مرتبہ سے نوازا تھا اور ماشاء اللہ ظاہری وجاہت اور چہرے کی نورانیت بھی ایسی تھی کہ دیکھنے والا اول وہلہ میں مرعوب ہوجائے۔ لیکن تھوڑی دیر کی ملاقات میں ہی ایسی بےتکلفی، تواضع اور کسر نفسی کا احساس ہوتا کہ بےساختہ ان کی محبت وعظمت دل میں بیٹھتی چلی جاتی، حضرت شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے والہانہ تعلق تھا، راقم الحروف نے جب حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ لکھا، تو اسی والہانہ لگاؤ کی بنا پر جو انھیں اپنے شیخ سے تھا، اس حقیر کے ساتھ جو نہ ان کا شاگرد ہے اور نہ مرید! بےحد تعلق رکھنے لگے، جب ان کی خدمت میں پہونچ جاتا، حضرت شاہ صاحب کے تذکرے کا سلسلہ چھڑ جاتا، دیر تک وہ باتیں کرتے رہتے اور میں سن کر محظوظ ہوتا رہتا۔ نسبت مع اللہ کے نور سے قلب لبریز تھا۔ وہی نور چہرے پر چھلکا پڑتا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے مفتیان کرام ہمیشہ سادگی وبےنفسی میں ممتاز رہے ہیں۔ دارالعلوم کے پہلے باقاعدہ مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی تواضع وبےنفسی تو ضرب المثل تھی، حضرت

مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ کا بھی یہی رنگ تھا، حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ بھی اس وصف میں ممتاز تھے، حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ کا بھی یہ وصف امتیازی تھا، چھوٹوں کے ساتھ بھی وہ ایسا معاملہ فرماتے جیسے وہی بڑے ہوں، اور حضرت مفتی صاحب ان سے چھوٹے ہوں، یہ انسانی وصف ایسا ہے جس سے انسان کی بلندیوں کی کوئی انتہاء نہیں رہتی۔

ہر انسان اپنی زندگی کی ایک میعاد لے کر آتا ہے، اور جب وقت پورا ہو جاتا ہے، تو وہیں چلا جاتا ہے، جہاں سے آیا ہے، حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ بھی اپنی زندگی کا وقت پورا کر کے گئے ہیں، لیکن پیچھے رہ جانے والوں کیلئے یہ بات باعثِ رنج ہوتی ہے کہ ان کے وجود سے جو برکتیں اور رحمتیں اللہ کی جانب سے ہوتی رہتی ہیں، ان کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، لوگوں کو ایک طرح کا احساس محرومی ہونے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو اپنی رحمت و مغفرت سے نوازیں، ان کے درجات کو بلند فرمائیں۔ اور اہل ایمان سے پروردگار نے جو وعدے فرمائے ہیں، وہ انھیں عطا فرمائیں، اور ہم پسماندگان کو اہل علم کی برکات عطا فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا محمد فاروق صاحبؒ

اترا ؤں، الہ آباد

وفات: ۱۴؍صفر ۱۴۲۱ھ

زندگی کی کتنی یادیں اور کتنی تاریخیں ہیں جو الہ آباد سے وابستہ ہیں، الہ آباد میرے قیام کی مدت صرف ۴؍سال تھی، لیکن مدت خواہ کتنی ہی قلیل ہو، چونکہ اس کا دامن ایک بزرگ، وقت کے بڑے شیخِ طریقت اور ایک بلند پایہ صاحب نسبت شخصیت سے وابستہ ہے۔ اس لئے اس کا ہر لمحہ کسی نہ کسی متاعِ گرانمایہ سے مالامال ہے۔ وہاں رہ کر علم وکمال کی ایک ایسی دنیا کا انکشاف ہوا، جہاں شہرت و ناموری کے تمام اسباب موجود تھے، مگر اس دنیا کے رہنے والے ہر شہرت اور ہر ناموری سے بے نیاز اپنے اپنے حلقے میں خاموشی سے اپنے استاذ کا پڑھایا ہوا سبق دہرا رہے تھے۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ دنیا نے انھیں جانا یا ان سے انجان رہی وہ جس کی خدمت کر رہے تھے، بس یہ کافی تھا کہ ان کے آقا و مخدوم کو ان کی خدمت کی خبر ہے، استاذ ان کا کامل تھا۔ جو سبق استاذ نے پڑھا دیا تھا، اسے انھوں نے لوحِ قلب سے مٹنے نہیں دیا۔ ان سے میرا تعارف ہوا، میں ان کے لئے اجنبی تھا۔ مگر انھوں نے بڑی محبت سے خیر مقدم کیا، وہ بہت کچھ تھے، مگر ہمیشہ یہی کہتے رہے اور یہی سمجھتے رہے کہ وہ کچھ نہیں ہیں۔ اور اگر کسی نے ان کے اندر کچھ دیکھ لیا، تو یہ کہہ کر ٹال گئے کہ یہ استاذ کا فیضانِ نظر ہے، شیخ کی چشمِ التفات ہے۔ ع

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم (میں وہی مشتِ خاک ہوں جو کہ ہوں)

اور جو کچھ نہیں تھا، اسے مجلس میں صدر مقام پر بیٹھانے کی کوشش کی، اور اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا، جیسے وہ کوئی حیثیت رکھتا ہو، استاذ نے ان کے خمیر میں خاکساری اور تواضع کو ایسا گوندھ دیا تھا کہ جو بھی ان کے سامنے آیا، اپنے کو اس سے پست دیکھا، حالانکہ وہ بلند تھے، بہت بلند تھے۔

آپ نے پہچانا یہ استاذ کون تھا؟ شیخ کا نام نامی کیا تھا؟ میں بتاؤں۔ وہ مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ تھے، جو اصلاً تو ضلع مئو کے ایک گاؤں فتح پور تال نرجا کے رہنے والے تھے اور زندگی کا بڑا عرصہ وہیں بسر کیا تھا، مگر اخیر میں کچھ حالات ایسے آئے کہ پہلے گورکھپور، پھر اس کے بعد الہ آباد تشریف لے گئے۔ الہ آباد میں مدرسہ کا سامان ہوا، خانقاہ آباد ہوئی۔ ان کی وفات کے دس سال بعد ان کے مدرسے میں بسلسلۂ تدریس میری حاضری ہوئی۔

خانقاہ میں حضرت سے تعلق رکھنے والے بکثرت علماء اور صلحاء تشریف لاتے رہتے تھے، ان سے میں اپنی بساط اور استعداد کے لحاظ سے ملتا رہتا۔ ان کا ایک خاص انداز ہوتا۔ خاص رنگ ہوتا۔ چہرہ پر ذکر کا نور، گفتگو میں نرمی، آنکھوں میں نمی، چال ڈھال میں تواضع و مسکنت، لباس کی ایک خاص تراش وخراش، جس سے دل کی صالحیت ٹپکتی، ان میں سے بعض لوگوں سے ایک ہی دو ملاقات رہی۔ بعضوں سے بار بار ملنا ہوا۔ بعض حضرات کے ساتھ مسلسل رہنا ہوا۔ حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب، مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؔ، مولانا قاری حبیب احمد صاحب الہ آبادی، مولانا انوار احمد صاحب کوپا گنجی، محمد انیس صاحب ندوہ سرائے، جمیل بھائی جونپوری، انیس بھائی الہ آبادی، داروغہ مشتاق احمد صاحب کلہا پوری اور بہت سے دوسرے حضرات! کچھ مرحوم ہو چکے، کچھ کمر باندھے تیار بیٹھے ہیں۔ کچھ سلامت باکرامت ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؒ کا مفصل تذکرہ میں نے لکھا ہے، جو ''ذکر جامیؔ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس میں دو تین بزرگوں کا اختصار سے ذکر کیا ہے۔

انھیں بزرگوں میں، جن سے میں بہت متاثر ہوا۔ اور ان کی عظمت کو دل نے بے تکلف قبول کیا، ایک بزرگ حضرت مولانا محمد فاروق صاحب تھے، اتراؤں ضلع الہ آباد کے رہنے والے، بھاری بھرکم اور بہت ٹھوس بدن، رنگ سانولا، داڑھی سفید، ہاتھ میں موٹا سا عصا۔ رفتار میں قوت بھی اور تواضع بھی، نگاہیں۔ نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو، سر چھوٹا مگر حافظہ کی قوت بے نظیر، علوم کا ایک خزانہ! فضل وکمال میں بلند مرتبہ، مگر ملتے تو ساری بڑائیاں خاکساری کی چادر میں اس طرح سمیٹ دیتے کہ ملنے والے کو احساس بھی نہ ہوتا کہ اس خاک کے پردے میں کیا کیا جلوہ گری ہے۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ میری پہلی ملاقات کب اور کس ماحول میں ہوئی! ہاں اتنا یاد ہے کہ جب ان کی آمد خانقاہ میں ہوئی تو ہر طرف چرچا ہوا، مولوی فاروق صاحب آئے، یہ چرچا محبت کے ساتھ تھا، خوشی کے ساتھ تھا، جو دلچسپی اور دلی لگاؤ کا ترجمان تھا۔ میں بھی ملا، مگر وہی خاکساری کی چادر حائل رہی۔ مگر پھر بار بار ان کا آنا ہوتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ خانقاہ کے سب چھوٹے بڑے ان سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا احترام کرتے ہیں، میں بھی کچھ دیر ان کی خدمت میں بیٹھنے لگا، ان کی باتیں سننے لگا، مجھے محسوس ہوا کہ سادگی کے پیکر میں ذہانت وذکاوت، استحضار وقوت حفظ اور علم ومعلومات کا یہ ایک گنجینہ ہیں۔ میں بہ نیت استفادہ ان کی گفتگو سنتا، اور علم میں اضافہ ہوتا۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ان کا مطالعہ وسیع بھی ہے اور عمیق بھی! لیکن اس وسعت کے دائرے میں کوئی کتاب تیسرے درجے کی نہیں، وہ ہمیشہ معتبر اور بلند پایہ اصحابِ تصنیف کی کتابیں اپنے مطالعہ میں رکھتے، دوسرے درجہ کی بھی شاذ ونادر ہی کوئی کتاب ان کے حریمِ مطالعہ میں بار پاتی ہے، اور گہرائی کا یہ حال تھا کہ ہر بات کی تہ میں اتر جاتے، اور اس کی ہر تہ کے آثار ومضمرات کو اپنی گرفت میں لے لیتے،

اس لئے ان کی ہلکی پھلکی گفتگو بھی عالمانہ ہوتی ۔ پھر میں دیر دیر تک ان کی خدمت میں بیٹھنے لگا ۔ اور وہ اپنے نطق وتکلم سے معلومات میں اضافہ اور دل میں جلا پیدا کرتے رہے ۔

میں ان سامنے طفل مکتب تھا، علم وذہانت سے نہ اس وقت بہرہ ور تھا اور نہ اب تک اس کی بو پاسکا ہوں، لیکن ان کی گفتگو میں کبھی ان سے اختلاف بھی کرلیتا، بڑے غضب کا حوصلہ تھا ان کا! بہت غور سے اختلاف کو سنتے ، پورے اطمینان سے اس کو سمجھتے ، اگر اس میں واقعیت ہوتی ، تو بے تکلف قبول کرتے ، ان کے مرتبہ کی بلندی قبول حق سے کبھی مانع نہ ہوتی ، اور اگر وہ محسوس کرتے کہ اختلاف کرنے والے کی فہم کا قصور ہے ، تو بڑے اچھے انداز میں سمجھاتے ، ایسا انداز ، جس میں نہ مخاطب کی تحقیر ہوتی ، نہ اس کی بدفہمی یا قصور فہم کی شکایت ہوتی ، نہ اس میں جوش واشتعال ہوتا ، نہ الزامی جواب کی ضرب ہوتی ، ہلکے ہلکے بولتے اور دلائل کے موتی بکھیرتے اور بالآخر مخاطب کو مطمئن کردیتے ۔

مولانا کا شمار ان علمائے **راسخین فی العلم** میں ہے، جو کھرے کھوٹے کی پرکھ بخوبی رکھتے ہیں، جو کسی نظریے یا کسی شخص کی شہرت عام سے متاثر نہیں ہوتے ، جب تک کہ تاثر کیلئے دلیل وبُرہان کی روشنی نہ ہو، نہ کسی حُبِّ مال وجاہ کے دباؤ میں وہ غلط کو صحیح کہہ سکتے تھے نہ کسی عمل کی صرف ظاہری افادیت کو دیکھ کر، یا اس لئے کہ بہت سے لوگ اس میں شامل ہیں، اسے قبول کرتے ، بلکہ وہ یہ دیکھتے کہ قرآن وسنت سے، یا قرآن سے مُسْتَنبَطْ اصول وقواعد صحیحہ سے، یا ائمہ وفقہاء کی تصریحات سے اس کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں، اور اگر ملتا ہے تو اس عمل کا کیا درجہ ہے؟ ان سب باتوں پر وہ بہت گہری نگاہ رکھتے تھے، اسی لئے ہمارے دور میں جو دین وشریعت کے نام پر بھانت بھانت کی ٹولیاں بن رہی ہیں، مختلف نظریے ایجاد ہورہے ہیں ، اور ہر ٹولی اور ہر نظریہ اپنی پُشت پر وقت کی مصلحتوں اور زمانے کے تقاضوں کا ایک انبار رکھتا ہے ، ظاہری نظر والے اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں ، مگر مولانا محمد فاروق صاحب ان کو شریعت اور اصولِ شریعت کے معیار پر پرکھتے تھے ، اگر اس پر کوئی نظریہ وعمل پورا اترتا تو اعتراف میں بُخل نہیں کرتے تھے، اور اگر پورا نہیں اترتا تو اس کا شرعی حکم بلاخوفِ ملامت گراں ، ظاہر کردیتے تھے، اس سلسلے میں بعض اوقات انھیں بہت سی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا مگر جو کچھ انھوں نے حق جانا، اس کے اظہار میں کسی فرد یا کسی جماعت کا خوف نہیں کھایا ۔

تبلیغی جماعت کے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں انھوں نے مفصل گفتگو کی ، اور جو کچھ ان کی نگاہ میں حق تھا ۔ اسے واضح کردیا ۔ گو کہ اس کے باعث وہ بہت سے عوام وخواص کا نشانۂ ملامت بنے ، مگر کوئی اندیشہ وہ خاطر میں نہ لائے ، افسوس کہ علماء نے ان کے اس فتویٰ پر اثباتاً یا نفیاً کوئی توجہ نہ دی ، اگر ان کی گفتگو حق ہے ، تو اسے قبول کرنا چاہئے ، اور اگر اس میں کوئی غلطی ہے ، تو اسے واضح کرنا چاہئے ۔ مولانا محمد فاروق صاحب بہت وسیع القلب انسان تھے ، اگر دلائل سے ان کی غلطی واضح کی جاتی ، تو اسے وہ بے تکلف قبول کرلیتے ۔ بلکہ وہ اس کے منتظر رہا کرتے تھے ، بات کی پچ جانتے ہی نہ تھے ، ان کا فتویٰ آج بھی اہل علم کے لئے لمحہ فکریہ ہے ۔

مولانا محمد فاروق صاحب نے ۱۳۶۵ھ میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم کی تکمیل کی تھی ، ابتدائی اور متوسطات تک کی تعلیم الہ آباد میں حاصل کی تھی ۔ حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے خاص معتقد تھے ، طالب علمی کے زمانے میں تھانہ بھون حضرتؒ کی خدمت میں حاضری بھی دی تھی ، فراغت کے بعد حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ اول حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کا دامن تھاما ، پھر ان کے وصال کے بعد کسی شیخِ کامل کی تلاش ہوئی تو طلب وجستجو نے مصلح الامت

، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں فتح پور پہونچایا، یہاں اپنی سلامتی طبع، اعتقادِ کامل اور رزانتِ عقل کی وجہ سے بہت جلد حضرت کی خدمت میں رُسوخ حاصل کرلیا، حضرت کو ان پر بہت اعتماد ہوگیا تھا۔ اہم امور میں حضرت ان سے مشورہ بھی لیتے تھے۔ وہ حضرت کے مزاج شناس تھے، حضرت کی منشا پہچان کر اس کے مطابق کام کرتے تھے۔

حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامیؒ جو حضرت مصلح الامت کے کاتب خاص تھے، اور حضرت کے علوم و معارف کے امین اور ان کے مرتب اور شارح و ترجمان تھے، سناتے ہیں کہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد جو صاحب خانقاہ تھانہ بھون میں تعلیم وغیرہ کے ذمہ دار تھے، ان کی موجودگی میں کچھ انتشار کی کیفیت وہاں ہوئی، اور انھیں وہاں سے علیٰحدہ ہونا پڑا تو حضرت کے بھتیجے مولانا شبیر علی صاحب جو حضرت کی حیات میں مدرسہ اور خانقاہ کے منتظم رہ چکے تھے، اور اب کراچی منتقل ہوگئے تھے، انھوں نے لکھا کہ کسی معتمد اور مناسب آدمی کو وہاں مقرر کیا جائے، بہت سے لوگوں کی نگاہ حضرت مصلح الامت پر پڑی، اور ان سے وہ جگہ سنبھالنے کی درخواست کی گئی، حضرت نے تو معذرت کردی، البتہ لوگوں کی فرمائش پر اپنے معتمد خاص مولانا محمد فاروق صاحب کو تھانہ بھون بھیج دیا، بھیجتے وقت ان سے فرمایا کہ:

> تم کو دو نصیحتیں کرتا ہوں، ان کا برابر خیال رکھنا، ایک تو یہ کہ وہ ہمارے شیخ کی جگہ ہے، وہاں ادب کے ساتھ رہنا، وہ جگہ پلکوں سے جھاڑو دینے کی ہے، دوسرے یہ کہ وہاں کسی سے نزاع مت کرنا، اور اختلاف نہ کرنا، لوگ موافق رہیں تو اخلاق کے ساتھ رہنا، اور کسی رویہ سے مخالفت کا اندازہ ہو تو خاموشی سے چلے آنا۔

چنانچہ مولانا محمد فاروق صاحب اسی طریقہ کار پر ثابت قدم رہے، اور بڑی مقبولیت حاصل کی، مگر کچھ دنوں کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ بات کچھ بگڑنے کا اندیشہ ہے، تو خاموشی سے چلے آئے، اور حضرت سے پوری صورتِ حال ذکر کردی، حضرت نے اسے پسند کیا۔

مولانا محمد فاروق صاحب کو اپنے تلامذہ اور متعلقین کی تربیت کا بڑا ملکہ تھا۔ وہ بہت شفیق و مہربان تھے، ان کے طلبہ ان کی محبت میں اور ان کے رنگ میں اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے، اپنے علاقہ اور گاؤں میں رہ کر انھوں نے جس محبت اور دلسوزی سے لوگوں کی تربیت کی ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ اتراؤں کے لوگ نہایت مہذب اور شائستہ ہیں، علماء کے بڑے قدردان، ان کے سامنے ادب و تواضع کا بہترین ملکہ رکھتے ہیں، مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامی علیہ الرحمہ کی شہادت یہاں نقل کرتا چلوں، حضرت مصلح الامت قدس سرہٗ کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> حضرت والا سے تعلق کے بعد ہی سے عموماً اور بالخصوص حضرت اقدسؒ کے الہ آباد میں قیام فرمانے کے بعد سے مولانا محمد فاروق صاحب کا جذبۂ اخلاص بھی ترقی کرتا رہا اور اسی کے بعد حضرت اقدس کے ساتھ ان کا تعلق بھی بڑھتا گیا، چنانچہ حضرت والا کبھی کبھی مولوی فاروق صاحب کے تعلق کے لحاظ سے اتراؤں بھی تشریف لے جانے لگے، کبھی خود مولوی فاروق صاحب بھی درخواست کرتے اور ہمراہ ہوجاتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضرت اٹھتے اور مولوی عبد المجید صاحب یا کسی اور کا ہاتھ پکڑتے اور فرماتے چلو اتراؤں چلیں، غرض حضرت اقدس کے اس طرح اچانک پہونچ جانے سے وہاں عید ہوجانے کا منظر مولوی صاحب اکثر بیان

کرتے تھے، چونکہ یہاں کے عوام بھی مولوی صاحب کے تربیت یافتہ تھے اور طلبہ تو ماشاء اللہ بہت ہی مہذب اور فہیم تھے، اسلئے حضرت کو یہاں بہت آرام ملتا، پھر ماشاء اللہ ان سب پر مولوی صاحب کا حسن انتظام، جسے مولوی صاحب موصوف نے حضرت تھانویؒ کے حالات وملفوظات اور خود اپنے حضرت کی تربیت سے سیکھا تھا، یہ اور حضرت کیلئے راحت رساں ثابت ہوتے، چنانچہ جانے کو تو حضرت متعدد جگہ تشریف لے گئے لیکن الہ آباد سے کہیں باہر جانے کا مقصد یہیں حاصل ہوتا تھا، اسی بنا پر کبھی کبھی یہ فرمادیا کرتے تھے کہ:

مولوی فاروق! میں نے الہ آباد میں گھر لے لیا ہے، اگر کہیں دیہات میں رہنے کا ارادہ ہوا تو یہیں اتراؤں میں گھر بنواؤں گا۔

غرض یہاں دیہات کے سکون کے علاوہ طلبہ کا مجمع اور متشرع صورت انسانوں کا اجتماع، مولوی فاروق صاحب کا حسنِ نظم، لوگوں کا ایثار، ان ساری چیزوں نے اس بستی کے قیام کو موزوں وراحت رساں بنادیا تھا ۔(حالات مصلح الامت ج:۲ص:۳۷۲)

ایک بار **دارالعلوم دیوبند** کے مہتمم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے حضرت مصلح الامت قدس سرہٗ سے ملاقات کرنی چاہی، تو حضرت نے ملاقات کا انتظام اتراؤں میں کیا، تاکہ الہ آباد کی بھیڑ بھاڑ سے الگ یکسوئی سے ملاقات ہوسکے، چنانچہ مولانا محمد فاروق صاحبؒ کے یہاں وہ تشریف لائے، اور وہاں کے حسنِ انتظام سے بہت متاثر ہوئے۔

اتراؤں اور آس پاس کی آبادیاں زیادہ تر اہلِ بدعت پر مشتمل ہیں۔ وہ بڑے سخت قسم کے اہلِ بدعت تھے۔ مولانا محمد فاروق صاحب نے انھیں کے درمیان

رہ کر کام کیا، مناظرے کئے، تبلیغی دورے کئے، وعظ وتقریر کے ذریعے لوگوں کو بیدار کیا، بدعت سے دور اور سنت کے قریب کرنے کی انتھک جدوجہد کی اور بحمد اللہ اس میں کامیاب رہے، وہ اس علاقہ کے معتمد علیہ عالم تھے، انھوں نے اپنے دائرہ کو زیادہ وسیع نہیں کیا، ایک حلقے میں رہ کر کام کیا اور پُختہ کام کیا۔

الہ آباد میں سنا کرتے تھے کہ سیدآباد اسٹیشن پر اگر کوئی مولوی یا مولوی صورت آدمی ٹرین سے اترتا ہے، تو فوراً کئی آدمی لپکے ہوئے آتے ہیں، اس کا استقبال کرتے ہیں، اگر اسے اتراؤں جانا ہوتا ہے تو اس کا انتظام کرتے ہیں یا اور کہیں جانا ہو تو اس کی مدد کرتے ہیں، ایک مرتبہ خانقاہِ وصی اللّٰہی کے کئی افراد نے جن میں حقیر بھی شامل تھا، اور سالارِ قافلہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی تھے، اچانک اتراؤں چلنے کا پروگرام بنایا، مولانا محمد فاروق صاحب کو کوئی ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے اطلاع نہ کرسکے، الہ آباد سے ٹرین پر سوار ہوئی، اور جونہی سیدآباد اسٹیشن پر ٹرین رُکی، ابھی ہم لوگ پلیٹ فارم پر قدم رکھ ہی رہے تھے کہ کئی لوگوں نے آکر گھیر لیا، سامان ہاتھوں سے لے لیا۔ جامی صاحب کو تو یہ لوگ پہچانتے تھے، باقی اور کسی سے شناسائی نہ تھی، وضع قطع پر دینداری کے آثار بھی نہ تھے، مگر اس طرح بچھے جاتے تھے، جیسے انھیں کوئی نعمتِ غیر مترقبہ ہاتھ آگئی ہو۔ ایک شیڈ کی چھت والی عمارت میں ٹھہرایا، جس میں سائیکلیں رکھی ہوئی تھیں، گرمی کا موسم تھا، چند ایک نے پنکھے جھلنے شروع کئے، پیاس لگی تھی، پانی پلایا، معلوم ہوا کہ یہ لوگ اتراؤں ہی کے ہیں۔ اسٹیشن پر سائیکل اسٹینڈ بنائے ہوئے ہیں۔ اطراف سے لوگ اسٹیشن پر سائیکلوں سے آتے ہیں اور سائیکل جمع کردیتے ہیں، پھر ٹرین سے یا بس سے جہاں جانا ہوتا ہے چلے جاتے ہیں۔ پھر لوٹتے وقت واپس لے لیتے ہیں، اور کچھ رقم کرائے کی ادا کرتے ہیں، انھوں نے ہم لوگوں کے لئے یکّے کا انتظام کیا اور ہم لوگ آرام سے اتراؤں

پہونچ گئے، وہاں لوگوں کے ملنے کا انداز سراپا ادب وتواضع کا تھا۔ مہمان کی راحت کا ہر انتظام تھا۔ مہمان کی مرضی اور راحت کے مطابق وہ خود کو ڈھالتے، مہمان کو اپنی مرضی پر بالکل نہ چلاتے، بہت جی لگا وہاں پر!

ان کی محنت اور کام کی برکت کا اندازہ کرنا ہو تو مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامیؒ کا بیان پڑھئے، جسے انھوں نے حالات مصلح الامت کی تیسری جلد میں ص: ۷ پر مولانا محمد فاروق صاحب کے ہی حوالے سے تحریر فرمایا ہے، یہ اس وقت کی بات ہے جب مولانا محمد فاروق صاحب تھانہ بھون سے واپس آچکے تھے، اور اب وہاں جانے کا ارادہ نہ تھا۔ مولانا جامی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

> مکرمی مولوی فاروق صاحب بیان کرتے تھے کہ دوسری بار جب میں تھانہ بھون سے واپس آیا اور پھر حضرت کے پاس فتح پور حاضر ہوا تو حسن اتفاق سے انھیں دنوں میں سید ظہور الحسن صاحب کسولوی (۱) بھی تشریف لائے تھے، انھوں نے میرے متعلق حضرت سے کچھ کہا ہوگا، اور شاید یہ بھی خواہش ظاہر فرمائی کہ فاروق کی وہاں ضرورت ہے، ان سے وہاں کے لوگ خوش اور مطمئن ہیں، لوگوں کو نفع ہورہا تھا، یہ تو معلوم نہیں کہ حضرت والا نے ان کو کیا جواب دیا، بہرحال میرا عندیہ چونکہ حضرت کو معلوم ہو چکا تھا، اسلئے حضرت نے اپنی خداداد بصیرت سے یہ سوچا کہ ایسی کوئی صورت پیدا ہوجائے کہ مجھے انکار نہ کرنا پڑے، بلکہ مولوی ظہور الحسن صاحب خود ہی مولوی فاروق کو وہاں لے جانا مناسب نہ سمجھیں تو بہتر ہے، چنانچہ مولوی فاروق صاحب کو بلا کر ان سے فرمایا کہ تم مکان واپس جارہے ہو، مولوی ظہور صاحب کو بھی اپنے وطن الہ آباد لے جاؤ۔ پھر وہ ادھر ہی سے تھانہ بھون چلیں جائیں گے، میں نے اس وقت حضرت کے منشا کو قطعی نہیں سمجھا، لیکن حکم تھا، منظور کرلیا، اور مولوی صاحب موصوف سے اپنی جانب سے عرض کیا کہ واپسی پر غریب خانہ الہ آباد تشریف لے چلیں، تو آپ کی عنایت ہوگی، اسی طرف سے تھانہ بھون چلے جائیے گا، انھوں نے سنتے ہی کان پر ہاتھ دھرا، ارے توبہ توبہ! حضرت کے یہاں سے پتّہ کٹواؤگے کے کیا؟ حضرت کیا خیال فرمائیں گے کہ اس طرف لوگ سیر کرنے آتے ہیں، اگر فرصت تھی تو وہ ایام یہیں کیوں نہ گزارے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت والا سے اجازت لینا ہمارے ذمہ ہے، بس چلنے کے لئے تیار ہوجائیے۔ چنانچہ مولانا ظہور صاحب کو اپنے ہمراہ اتراؤں لے گیا، قُرب وجوار میں اطلاع کرادی، بہت سے لوگ ملنے کے لئے آئے، میں نے وعظ کی فرمائش کی۔ فرمایا ارے میں وعظ کہاں کہتا ہوں، میں نے کہا دو چار منٹ کچھ فرمادیجئے، باقی وقت میں کچھ کہہ دوں گا، چنانچہ مولانا نے وعظ فرمایا، اور اچھا وعظ کہا، اور مجھ سے فرمایا ماشاء اللہ یہاں تو آپ نے بڑا ہی اچھا ماحول پیدا کر رکھا ہے، پہلے میرا یہی خیال تھا کہ باصرار آپ کو تھانہ بھون بلاؤں گا، لیکن یہاں کا کام دیکھ کر اب آپ کو تکلیف دینا ظلم ہے اور ایک جگہ کو اجاڑ کر دوسری جگہ آباد کرنے کے مرادف ہے، آپ کو یہیں کام کرنا چاہئے، اور اتنا کام جو یہاں دیکھ رہا ہوں، شاید وہاں برسوں کے بعد بھی نہ ہوسکے۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ حضرت اقدسؒ نے کیوں مولوی صاحب موصوف کو الہ آباد دلوا جانے کیلئے فرمایا تھا۔ اس واقعہ سے ناظرین کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ حضرت کو کس درجہ مولوی محمد فاروق صاحب پر اعتماد تھا، اور

---

(۱) حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے مرید، حضرت مصلح الامت کے خلیفہ اور خانقاہِ اشرفیہ تھانہ بھون کے مہتمم۔

حضرت ان سے کس قدر مطمئن تھے۔

(حالات مصلح الامت ج:۳ص:۷)

حضرت مولانا محمد فاروق صاحب علم ومطالعہ کے بڑے شیدائی تھے، جو بھی اچھی اور معیاری کتاب ملتی، از اول تا آخر غور سے پڑھتے، اس سلسلے میں انھیں محققین کی کتابوں سے زیادہ لگاؤ تھا۔ مالی حالت بہت بہتر نہ تھی، اسلئے بیش قیمت کتابیں خرید نہیں سکتے تھے، تو اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ جن کتابوں کا ہونا اپنے پاس وہ ضروری سمجھتے تھے، انھیں محنت کرکے پوری نقل کرلیتے تھے۔ امام شاطبی کی ''الاعتصام'' کی انھیں بڑی ضرورت تھی، اس وقت یہ کتاب عام نہیں ہوئی تھی۔ اس کی دو جلدیں ہیں، اور ہر جلد متوسط ضخامت کی ہے۔ ایک صاحب کے یہاں سے مطالعہ کیلئے عاریۃً مانگ کر لائے، اور وقت کچھ زیادہ متعین کرالیا، اور اسی فرصت میں اول سے آخر تک پوری کتاب نقل کرلی۔ مولانا کا خط بڑا پاکیزہ تھا، اور بڑا کمال یہ تھا کہ ان سے کتابت کی غلطی بالکل نہیں ہوتی تھی، کسی مشغولیت میں ہوں، حالات چاہے کتنا ہی خیال ودماغ کو منتشر کررہے ہوں، مگر قلم ہاتھ میں لے لیتے تو بالکل یکسوئی ہوجاتی، اور بے تکلف لکھتے چلے جاتے، میں نے کئی ضخیم کتابیں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں۔ بہت صحیح اور صاف تحریر! دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، طاش کبریٰ زادہ کی ضخیم کتاب جو کئی جلدوں میں ہے، ''**مفتاح دار السعادہ**'' اس کا مکمل ترجمہ کرکے خوش خط لکھ رکھا ہے۔

ان کی محنت اور استقامت قابلِ رشک ہے، اور حافظہ کی قوت کا یہ حال تھا کہ کتابوں کی عبارتوں کی عبارتیں ازبر تھیں، اور اس طرح بے تکان سناتے کہ کہیں تشابہ اور التباس کی نوبت نہ آتی۔ الہ آباد میں ایک صاحب بہت علم دوست تھے، ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب مرحوم، ان کے یہاں جمعہ کے روز شہر کے بعض اہل علم حضرات جمع ہوتے تھے، اور کسی علمی موضوع پر گفتگو ہوتی تھی، یہ بندہ بھی اس میں شرکت کرتا تھا، مولانا الہ آباد تشریف لاتے اور جمعہ کا دن ہوتا تو ڈاکٹر صاحب ان کو بھی دعوت دیتے، ایسے ہی ایک جمعہ کو کسی موضوع پر بات ہورہی تھی، مولانا نے اپنی گفتگو کے لئے امام غزالیؒ کی ''احیاء علوم الدین'' کا حوالہ دیا اور ساتھ ساتھ اس کی عبارت پڑھنی شروع کی، اور پڑھتے چلے گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ کم وبیش ایک صفحہ کی عبارت پڑھی اور پھر اس کی توضیح وتشریح کرنے لگے، میں ان کے حافظے کی قوت پر سخت حیرت زدہ ہوا۔

۱۹۸۰ء میں مرادآباد، میرٹھ، علی گڈھ اور الہ آباد میں بھیانک فساد ہوا۔ الہ آباد کی خانقاہ بھی اس سے متاثر ہوئی۔ جب ذرا سکون ہوا اور حالات درست ہوئے تو گو کہ امن ہوگیا تھا، مگر طبیعتیں بہت افسردہ اور شکستہ تھیں، مسلمانوں پر ایک طرح کا ہراس چھایا ہوا تھا۔ انھیں دنوں مولانا محمد فاروق صاحب خانقاہ میں تشریف لائے، حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب کی مجلس ہورہی تھی، مجلس ختم ہوئی تو قاری صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ کچھ بیان فرمادیجئے، مولانا نے سورہ قصص کا پہلا رکوع پڑھا، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور فرعون کے مظالم اور پھر موسیٰ علیہ السلام کی اسی کے محل میں پرورش کا تذکرہ ہے، پھر اس کی تشریح کرنے لگے، تسلی اور تقویت کا مضمون بیان فرمارہے تھے، اسی دوران انھوں نے مثنوی مولانا رومؒ کا کوئی شعر پڑھا، ایک شعر پڑھنا تھا کہ ان کے سامنے گویا مثنوی شریف کے تمام دفتر کھل گئے، پھر اسی مضمون کے اتنے اشعار انھوں نے پڑھے اور ان کی تشریح کی کہ سارا مجمع ششدر رہ گیا، اور دلوں میں ایمان تازہ ہوگیا۔

قاری صاحب نے اس تقریر کے خاتمہ پر فرمایا کہ کیا معلوم تھا کہ آج مولانا روم تشریف لائے ہیں، ورنہ ٹیپ ریکارڈ لگادیا ہوتا، اب درمیان مجلس میں اس کا

موقع نہ تھا۔

اس علمی بلندی اور کمال کے باوجود ملاحظہ فرمایئے کہ انھوں نے کبھی ایک منٹ کے لئے بڑائی اور شہرت کی طلب نہیں کی، زندگی اتراؤں جیسے گاؤں میں گزار دی، مگر ماشاء اللہ بہت کام کر گئے۔ وہ نہایت متواضع تھے، انھوں نے کبھی اپنی کوئی حیثیت نہیں سمجھی، کوئی علمی بات اپنے کسی بہت چھوٹے سے بھی سنتے، تو اس طرح سنتے جیسے یہ ان کو معلوم نہ رہی ہو، اور آج ان کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

لیکن تواضع وخاکساری کے ساتھ غیرتِ حق کا مادہ بھی ان میں خوب تھا۔ کوئی ایسا طریقہ، کوئی ایسا فرقہ، کوئی ایسا نظریہ جو شریعتِ حقہ سے ٹکراتا ہو، یا شریعت کی کسی تعلیم کو مسخ کرتا ہو، یا اس سے شریعت کے تحفظ میں فرق پڑتا ہو، اسے ان کی غیرت گوارا نہیں کر سکتی تھی، اس باب میں وہ کسی مداہنت اور نرمی کے روادار نہ تھے، بریلویت اور رافضیت سے تو ان کا براہ راست مقابلہ تھا۔ اس موضوع پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، ان کا ذہن بہت مرتب تھا۔ وہ دلائل کو بہت سلیقے سے منطقی انداز پر مرتب کرتے تھے، اور اپنے مخاطب سے بھی اسی کا مطالبہ کرتے تھے۔ وہ دلائل وشواہد، آثار وثمرات اور نظائر کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے کوئی چلتی ہوئی بات کہہ کر ان کے سامنے پیش نہیں پا سکتا تھا۔

مولانا اپنے شیخ کے اور ان کے حکم کے بہت وفادار تھے، شیخ سے وفاداری تو کوئی خاص مشکل کام نہیں ہے، اگر مناسبت اور عقیدت ہے، تو وہ خود آدابِ وفاداری کا پابند رکھتی ہے، لیکن شیخ کی وفات کے بعد شیخ کے متعلقین ومنتسبین سے چونکہ معاصرت کا تعلق ہوتا ہے، اور معاصرت کے نشیب وفراز ظاہر ہے کہ آدمی کی رفتار کو اعتدال پر رہنے نہیں دیتے، ایسے وقت میں اپنے توازن اور اعتدال کو باقی رکھنا ایک دشوار کام ہے، بکثرت دیکھا گیا ہے کہ کسی بڑے کے دنیا سے گزر جانے

کے بعد انھیں سے تعلق رکھنے والے کتنے لوگ کسی عنوان سے اور کسی غرض کو لے کر یا بجا طور پر سہی ان کے خاندان سے دوری اور انحراف اختیار کر لیتے ہیں۔

مولانا محمد فاروق صاحب نے اپنے شیخ ومرشد کے ہر حکم بلکہ ہر منشا کی تعمیل ان کی زندگی میں بھی کی اور ان کی وفات کے بعد بھی! حضرت مصلح الامتؒ کے بعد ان کی خانقاہ اور مدرسہ کا انتظام وانصرام ان کے خلیفہ اور داماد حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب دامت برکاتہم کے ذمہ آیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت نے اپنی زندگی میں یہ انتظام فرما دیا تھا اور اپنے خاص خاص لوگوں کو اس کی اطلاع بھی کر دی تھی، اور ان کو ہدایت بھی دی تھی کہ قاری صاحب کی موافقت کریں گے۔

حضرت کی وفات کے بعد جیسا کہ عام دستور ہے کہ بڑے لوگوں کے گزر جانے کے بعد ان کے پسماندگان کے درمیان شیطان کبھی نزاع ڈال دیتا ہے، یہاں بھی کچھ دراڑ پڑی، اور متعدد حضرات قاری صاحب سے الگ ہو گئے، اور انھوں نے اپنی مستقل حیثیت بنالی، لیکن حضرت کے تربیت یافتہ بکثرت حضرات قاری صاحب سے وہی تعلق رکھتے رہے جو حضرت کی منشا تھی، ان میں بہت نمایاں چند حضرات تھے، خاص طور سے مولانا محمد فاروق صاحب نے اسے خوب نبھایا، پوری زندگی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں بنائی، قاری صاحب کے دامن فیض سے وابستہ رہے، اپنے طالب علموں کو تعلیم کے لئے قاری صاحب کے مدرسے میں بھیجتے کوئی بیعت وارادت کی درخواست کرتا، تو اسے حضرت قاری صاحب کی خدمت میں بھیج دیتے، نرم وگرم اوقات آتے رہے، مخالف ہوائیں چلتی رہیں، لوگ ٹوٹتے رہے، مگر مولانا محمد فاروق صاحب نے وفاداری کی جس زمین پر قدم جمایا تھا، کوئی آندھی انھیں ہلا نہ سکی، غلطی کس سے نہیں ہوتی، اور کس سے نہیں ہو سکتی، اپنے شیخ کے اہل تعلق سے بھی ہو سکتی ہے، اور ہوتی رہتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ

شیخ کے واسطے سے جو محبت ان سے استوار ہوئی تھی وہ ختم ہو جائے، آخر شیخ کی محبت تو اب بھی باقی ہے، پھر اسی محبت کی سرزمین پر محبتوں کے اور جو پودے اُگے تھے، وہ سوکھ کیوں جائیں، محبت کی وہ زمین تو اب بھی موجود ہے، اپنی اور اپنی اولاد کی غلطی قابل درگزر ہو سکتی ہے، تو کیا اپنے مرکز محبت کی شاخوں میں کچھ غلطی اگر واقعی بھی دکھائی دے تو وہ لائق عفو و درگزر نہ ہو گی۔

یہ نکتہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، تو آدمی اعتدال سے ہٹ کر افراط و تفریط میں پڑ جاتا ہے۔ مولانا محمد فاروق صاحب ان نکتوں سے خوب واقف تھے، اور صرف واقف ہی نہ تھے، انھیں برتنا بھی خوب جانتے تھے۔ انشاء اللہ وہ اپنے شیخ کے حضور سرخرو ہوں گے، اور ان کے اخلاص اور حسن معرفت کا صلہ بارگاہِ الٰہی سے ملے گا۔

مولانا کی صحت ہمیشہ اچھی رہی، آخر میں شوگر کے مریض ہو گئے تھے، مگر ماشاء اللہ مشاغل و معمولات میں کوئی فرق نہ تھا، البتہ جسم سے اضمحلال محسوس ہوتا تھا، وفات سے دو چار روز پہلے بخار رہنے لگا تھا، مگر بظاہر تشویش کی کوئی بات نہ تھی، ۱۴؍ صفر ۱۴۲۱ھ کو شب میں ساڑھے بارہ بجے جان جانِ آفریں کے سپرد کی، زندگی کی اَسّی منزلیں یہ بوڑھا مسافر طے کر چکا تھا، اب تھک گیا تھا اسے نیند آ گئی، اسے خاکساری پسند تھی، زندگی بھر اسی کی مشق کی تھی، مٹی کا چھوٹا سا مکان بنا، مٹی کا بستر بچھا، مٹی کی چادر اوڑھی اور قیامت کی نیند سو گیا۔ اللہ تعالیٰ اس خاکی مکان پر اور اس کے خاکسار مکین پر اپنی رحمت کا سایہ کرے، اس کی مغفرت کرے، اس کے درجات کو بلند فرمائے، آمین

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوری علیہ الرحمہ
حضرت مولانا مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ
حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری ثم المدنیؒ

آدمی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، تب نہ وہ کچھ جانتا ہے اور نہ اس کے متعلق کوئی کچھ جانتا ہے کہ کتنے دن دنیا میں رہے گا، اور رہے گا تو کیا بن کر رہے گا، اس کے اندر کیا صلاحیت واستعداد ہے، اس کا بھی پتہ نہیں ہوتا: **واللہ أخرجکم من بطون امہٰتکم لاتعلمون شیئاً وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون** (النمل) اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے نکالا (اس حال میں نکالا کہ) تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لئے کان، آنکھ اور دل بنائے تا کہ تم شکر گزاری کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت کاملہ کے سائے میں انسان کو نشو ونما بخشتے ہیں، اس کی صلاحیتیں مناسب ماحول کے تحت اجاگر ہونے لگتی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں اس سے کام لیتے ہیں، اس کے کاموں اور اس کے فوائد کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا ہے، اسی کے بقدر اس کو جاننے والے اور اس سے محبت کرنے والے لوگ ہوتے ہیں، اس کے گزر جانے کے بعد اس کی جدائی کے صدمے کو محسوس کرنے والے بھی بہت ہوتے ہیں، لیکن یہ قانون الٰہی ہے کہ کسی کے لئے دوام نہیں ہے، اگر دوام ہوتا تو

انبیاء کے لئے ہوتا کیونکہ عالم انسانیت کے لئے سب سے زیادہ ضرورت انبیاء کی ہے، مگر حق تعالیٰ نے ان کے لئے بھی ایک وقت مقرر کیا ہے، جب وہ وقت پورا ہوجاتا ہے تو وہ بھی اٹھالئے جاتے ہیں، گوان کے جانے سے انسانیت کتنا ہی دکھ محسوس کرے، یہ کارخانۂ عالم اسی طرح چل رہا ہے، اور بالآخر اس کا بھی وقت پورا ہوجائے گا، اور بساطِ کائنات لپیٹ دی جائے گی، اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا کیا جائے گا، اس عالم میں البتہ خلود ودوام ہے، وہاں جو چیز ہوگی دائمی ہوگی، راحت ہے تو دائمی، اور تکلیف ہے تو دائمی!

اور اب تو دنیا کا وقتِ آخر ہی معلوم ہوتا ہے، جس تیزی سے دنیا میں الٹ پلٹ ہورہی ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اب بازار اٹھنے والا ہے، اس لئے سامان اونے پونے جارہا ہے، دنیا کے حالات ہردم بدل رہے ہیں، تو دنیا کے رہنے والوں پر بھی چل چلاؤ کا عالم طاری ہے، کیا اچھے کیا برے، موت سب کا پیچھا کررہی ہے، فرق یہ ہے کہ ایک عام انسان مرتا ہے، یا برا آدمی مرتا ہے، تو لوگ تھوڑا سا ماتم کرتے ہیں اور اگر کوئی اچھا اور اہم آدمی مرتا ہے تو ایک عالم کا عالم ماتم سرا ہوتا ہے۔ ادھر دو تین ماہ کے اندر تین ایسی ہستیاں بارگاہِ الٰہی میں پہونچ گئیں، جن کی شان یہی تھی کہ بہت دنوں تک لوگ ان کے فراق کا صدمہ محسوس کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

﴿حضرت مولانا سید احمد ہاشمیؒ﴾

ان میں ایک ہستی مشہور قومی رہنما مولانا سید احمد ہاشمی کی ہے، مولانا موصوف مشرقی یوپی کے مشہور ضلع غازی پور کے رہنے والے تھے، جامعہ عالیہ کلکتہ اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے، ابتداء عمر سے ہی جمعیۃ علماء ہند سے فکری اور عملی اعتبار سے وابستہ ہوگئے تھے، ایک عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری رہے،

بعد میں کچھ اختلافات کے باعث ملی جمعیۃ بنائی، مگر اس میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی، مولانا ہاشمی عرصہ سے بیمار تھے، شوگر کا موذی مرض ان پر اپنا تسلط جمائے ہوئے تھا، آخر میں بینائی بھی بہت متاثر ہوگئی تھی۔ ۱۷؍شعبان ۱۴۲۲ھ مطابق ۴؍نومبر ۲۰۰۱ء بروز توار ایک مدت تک بیماری جھیلنے کے بعد اپنے خالق ومولیٰ کے حضور جاپہونچے،

مولانا ہاشمی ایک نڈر، مخلص اور مدبر قائد تھے، اور نہایت متحرک اور فعال تھے، جن دنوں بیماری نے انھیں نڈھال کررکھا تھا، اس وقت بھی وہ کاموں کے لئے مستعد رہتے تھے، بہت مہمان نواز اور صاحب اخلاق انسان تھے، بڑی خوبیوں کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں اور جنت سے اور اس کی نعمتوں سے نوازیں۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆

﴿حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ﴾

حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب اس دور میں تدین وتفقہ اور تقویٰ وطہارت کی ایک روشن علامت تھے، ۲؍رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۸؍نومبر ۲۰۰۱ء کو یعنی عشرۂ رحمت، میں آغوش رحمت الٰہی میں بلالئے گئے، مولانا کے فتاویٰ کا ایک عظیم مجموعی ''فتاویٰ رحیمیہ'' کے نام سے مشہور ومتداول ہے، یہ فتاویٰ کیا ہیں، علمی تحقیق، وسعت نظر اور دقت فکر کا عظیم سرمایہ ہیں۔

حضرت مفتی صاحب دینی حمیت میں بھی بہت ممتاز تھے، گو کہ وہ ایک گوشہ نشین عالم تھے۔ اسفار تو شاید ان کے ہوتے ہی نہ تھے، لیکن دنیا کے حالات سے، دین کو برباد کرنے والے فتنوں سے خوب باخبر تھے، اور فتنوں کی سرکوبی میں سرگرم ہوجاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کی عمر میں برکت بھی خوب عطا فرمائی تھی، ۱۰۱؍سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور علم وتحقیق کا یک عظیم الشان ذخیرہ بعد

والوں کیلئے چھوڑ گئے۔

حضرت مفتی صاحب نہایت شریف النفس، متبع سنت اور متواضع ومتقی عالم تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

﴿**حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب** بلندشہری ثم المدنی﴾

ہندوستانی وقت کے لحاظ سے ۱۲؍رمضان المبارک اور عربی وقت کے حساب سے ۱۳؍رمضان المبارک مطابق ۲۸؍نومبر ۲۰۰۱ء کو ایک ایسی ہستی دنیا سے اٹھ گئی جس کے نام اور کام سے اس راقم الحروف کو بچپن ہی سے واقفیت تھی، جس کے قلم نے شروع ہی سے زندگی کا ایک رُخ متعین کر دیا، اسی وقت سے میرے ذہن ودماغ پر یہ بات چھائی ہوئی تھی کہ شاید اگلے بزرگوں میں سے کوئی بلند پایہ ہستی ہے، یہ ہیں حضرت مولانا عاشق الٰہی بلندشہری، یاد نہیں کہ عمر کے کس حصے میں تھا، بس اتنا تھا کہ اردو پڑھ لیتا تھا، اس وقت مولانا کی تصنیف ”مرنے کے بعد کیا ہوگا“ اور کچھ مختصر مسائل، حالات جنت وجہنم کو اتنی مرتبہ پڑھا تھا کہ مجھے تقریباً ازبر ہو گئے تھے اور غیر شعوری طور پر (کیونکہ اس وقت شعور کی عمر ہی نہ تھی) زندگی کا یہی رُخ متعین ہو گیا تھا کہ اسے جنت کی طرف بڑھتے رہنا اور جہنم سے دور رہنا چاہئے۔

۴۰؍سال کی عمر پہونچی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت نصیب فرمائی، مدینہ منورہ حاضری ہوئی، مسجد نبوی ﷺ سے بعد نماز عشاء نکل رہا تھا، باہر لوگوں کا ہجوم تھا، ہجوم میں کئی میرے شناسا تھے، میں لپکا تو دیکھا کہ ایک بوڑھے بزرگ کو لوگ گھیرے ہوئے ہیں، اور اس طرح گھیرے ہوئے ہیں جیسے سعادتمند اولادیں اپنے بزرگ باپ کی خدمت میں حاضر ہوں، میں مصافحہ کے لئے آگے بڑھ رہا تھا اور استفہامیہ نظروں سے حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوریؒ کے صاحبزادے، مولانا عبدالعظیم ندوی کو دیکھ رہا تھا، انھوں نے بتایا کہ حضرت مولانا عاشق الٰہی بلندشہری ہیں، میں بے ساختہ آگے بڑھا، مولانا بھی مجھے دیکھنے لگے، مصافحہ ہوا، مولانا عبدالعظیم صاحب نے بتایا کہ مولانا اعجاز احمد اعظمی ”**حیات مصلح الامت**“ کے مصنف! پھر انھوں نے مختصر لفظوں میں تعارف کرایا، مولانا نے نہایت محبت اور بے تکلفی کے لہجے میں فرمایا، انھوں نے مجھے اپنی کتاب کہاں دی؟ میں نے وعدہ کیا کہ واپسی کے بعد انشاء اللہ بھیج دوں گا، بہت خوش ہوئے، پھر بار بار ملاقاتیں ہوئیں، میں نے عرض کیا حضرت میں آپ کا بچپن ہی سے شاگرد ہوں، فرمایا وہ کیسے؟ میں نے ان کتابوں اور رسائل سے استفادہ کا حوالہ دیا تو ان کی عنایتیں اور بڑھ گئیں اور بڑھتی چلی گئیں۔

مولانا اس بڑھاپے میں بھی علم وتحقیق اور مطالعہ ودرس، اور تصنیف وتالیف میں اتنی محنت کرتے تھے کہ جوانوں سے نہ ہو سکے، رات بھر جاگتے تھے اور پوری رات علم ومطالعہ اور عبادت میں بسر کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے دین کی زبردست خدمت لی، علم حدیث اور علم فقہ سے انھیں بہت زیادہ شغف تھا، انھوں نے علمی، دینی، اصلاحی ہر موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں، اخیر میں قرآن کریم کی تفسیر ”**انوار البیان**“ کے نام سے مرتب کی، حضرت مفتی صاحب دینی بصیرت اور حمیت وغیرت میں بہت ممتاز تھے، کسی غلط عقیدہ اور فاسد نظریے یا کسی فتنہ کی تحریک سے ایک لمحے کی مصالحت تو درکنار ادنیٰ درجے کی مداہنت بلکہ مسامحت بھی نہ کرتے تھے، ہندوستان میں فقہ اکیڈمی نے فقہی سیمیناروں کا سلسلہ شروع کیا، اس کے بعض فیصلوں اور اس کے طریقہ کار سے مولانا کو محسوس ہوا کہ یہ ایک فتنہ ہے، جو خوشنما لباس میں جلوہ گر ہو رہا ہے، مولانا نے بلا خوف **لومة لائم** اس کا سخت احتساب کیا، بالخصوص انشورنس کے جواز کے فیصلے کے

رد میں تو مسلسل لکھا اور بھی جہاں جہاں انھیں کجی اور زیغ وضلال کی بو محسوس ہوئی، انھوں نے اس کا احتساب کیا، ان کے یہاں حق وباطل میں التباس واشتباہ نہ تھا، وہ صاف صاف حق کو واضح اور باطل کو نمایاں کر دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور ان کی بخشش ومغفرت فرمائے۔ آمین یا رب العٰلمین

☆☆☆☆☆☆☆

(بقیہ ص: ۴۶۷ پر)

ان مشکلات پر غور کرتے، اسلامی شریعت میں ان کا حل تلاش کرتے، پھر انھیں نہایت سلیقے سے، عام فہم انداز میں مرتب کرتے، اس کے بعد سوال وجواب دونوں کو روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں شائع کراتے تھے۔

اس طرح سوالات وجوابات کا افادہ عام ہوتا، جب استفتاء وجواب کا یک معتد بہ ذخیرہ جمع ہوگیا، تو انھیں متعدد جلدوں میں یکجا شائع کرنے کا آغاز کیا، یہ کتاب اسلامی احکام ومسائل کا عظیم الشان دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) ہے، اس میں زمانہ کے مشکلات میں گھرا ہوا انسان اپنے بیشتر مسائل کا حل اس کتاب میں پالے گا۔

پاکستان کی عجب بدنصیبی ہے کہ وہاں لوگ اپنے ہی ہاتھوں اپنے علماء ومشائخ کو جن کی برکت سے زمانے کی بھلائیاں قائم ہیں، موت کے گھاٹ اتارتے ہین، ہر سال نہ جانے کتنے علماء ملک کے طول وعرض میں مسلمانوں ہی کے ہاتھ قتل ہو جاتے ہیں، اللہ رحم فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی علیہ لرحمہ

شہادت: ۱۸؍ مئی ۲۰۰۰ء مطابق ۲۱؍ صفر ۱۴۲۱ھ

چندروز قبل اخبارات نے خبر دی کہ پاکستان میں کچھ بدبختوں نے وقت کے معروف عالم دین حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ کو گولی مار کر شہید کر دیا۔ إناللہ وإنا إلیه راجعون

مولانا محمد یوسف صاحب کی شخصیت ملت اسلامیہ کی محسن شخصیتوں میں تھی مولانا پاکستان کی تحریک تحفظِ ختمِ نبوت کے مخلص سپاہی تھے، اور آخر میں اس کے بہادر سپہ سالار ہوئے، ان کی دو کتابیں اس دور کی منتخب کتابوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں، جن سے عوام وخواص نے بہت فائدہ اٹھایا، اور واقعی یہ دونوں کتابیں بے نظیر ہیں، ایک تو ان کی شاہ کار تصنیف ''اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم'' ہے، اس میں انھوں نے بریلویت، غیر مقلدیت اور جماعتِ اسلامی کا جیسا منصفانہ اور شائستہ وسنجیدہ جائزہ لیا ہے، اس نے بے شمار لوگوں پر اور بہترین دماغوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ حق وصداقت اور انحراف وبے راہ روی کا تنا متوازن اور قابل قبول تجزیہ مشکل سے کہیں اور ملے گا، یہ کتاب ایسی ہے کہ ہر پڑھے لکھے مسلمان کے پاس ہونی چاہئے۔

دوسری کتاب ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' ہے، مختلف حلقوں سے لوگ دینی معاملات میں اپنے مسائل ومشکلات لکھ کر مولانا کے پاس ان کا حل چاہتے تھے، مولانا نہایت دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ ان مسائل پر، (بقیہ ص: ۴۶۷ پر)

پیکر استقامت

حضرت مولانا **قاری حبیب احمد صاحب** الہ آبادی علیہ الرحمہ

وفات: ۶؍محرم ۱۴۲۲ھ مطابق یکم؍اپریل ۲۰۰۱ء

۲۲؍۲۳ سال کی مدت گزری، یہ حقیر ان حروف کا لکھنے والا، الہ آباد میں عارف باللہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے مدرسہ وصیۃ العلوم میں مدرس تھا، اس بابرکت ادارہ میں، مدرسہ اور خانقاہ پہلو بہ پہلو ہیں، اساتذہ اسباق میں مشغول ہوتے، اور شیخ خانقاہ سالکین وذاکرین کی مجلس میں تشریف فرما ہوتے، جمعہ کے روز عام مجلس ہوتی، اس میں مدرسہ کے اساتذہ بھی ہوتے، طلبہ بھی ہوتے، تمام سالکین وذاکرین بھی ہوتے۔

ایک جمعہ کو ایسی ہی مجلس ہورہی تھی، اس وقت میر مجلس حضرت مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ تھے، جو حضرت شاہ صاحبؒ کے معتمد خاص اور کاتب تھے، ابھی مجلس شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک بزرگ آتے ہوئے دکھائی دیئے، پُرنور وپُر جمال! اتنے پُرنور کہ پوری مجلس روشن ہوگئی، ہر شخص کی نگاہ بے اختیار ان کے چہرے پر مرکوز ہوکر رہ گئی، بہت وجیہ اور نورانی چہرہ، سر پر پنچ کلیا ٹوپی، سر اور داڑھی کے بال سفید برق، خود بھی گورے چٹے، لباس بھی اُجلا اور روشن۔ لانبا قد، سر سے پاؤں تک تواضع کا اثر چھایا ہوا، ایسا چل رہے تھے جیسے فروتنی سے زمین میں گڑے جارہے ہوں، اور جمال صورت کے ساتھ جمال سیرت کا نور اس طرح رچا ہوا تھا کہ بس نورٌ علیٰ نورٌ کے ٹھیک مصداق!

میں تو کچھ دیر تک ششدر ہوکر انھیں دیکھتا ہی رہا، لیکن مجلس شروع ہوچکی تھی، دریافت کرنے کا موقع نہ تھا، وہ بھی بہت ادب اور خشوع وخضوع سے نگاہیں جھکائے ہوئے ایک گوشے میں بیٹھ گئے، میری نگاہ بار بار ان پر اٹھ رہی تھی، کبھی دوران مجلس کسی بات پر مسکراتے تو دانتوں کی چمک سے دل روشن ہوتا ہوا معلوم ہوتا، پوری مجلس وہ سراپا ادب رہے، اور میں مسلسل استفہام رہا۔

مجلس ختم ہوئی، وہ بڑے وقار اور تواضع سے اٹھے اور جامی صاحب سے ملاقات کی، وہ مسکراتے ہوئے ملے، میں نے بھی اٹھ کر مصافحہ کیا، جامی صاحب نے ان کا تعارف کرایا، ’’یہ قاری حبیب صاحب ہیں، کٹرہ میں رہتے ہیں‘‘ میں سمجھ گیا، نام سن رکھا تھا، حضرتؒ کے خلفاء میں ان کا شمار ہے، یہ معلوم تھا، زیارت آج ہوئی، اور ایسی زیارت ہوئی کہ دل میں ان کے سراپا کے ساتھ ان کی محبت بھی رچ بس گئی۔

یہ پہلی ملاقات تھی، عرصہ ہوگیا مگر کل کی بات معلوم ہوتی ہے، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ حضرت قاری صاحب کو بھی مجھ سے انس ہوگیا ہے، وہ ہفتہ میں ایک بار خانقاہ میں ضرور تشریف لاتے، میں اہتمام کرکے ان سے ملتا تھا، اور وہ بھی پوچھتے رہتے تھے، اس وقت مجھ پر یکسوئی کا غلبہ تھا، بغیر کسی شدید ضرورت کے مدرسہ سے قدم باہر نکالنا مشکل کام تھا۔ لوگوں سے ملنے ملانے سے وحشت تھی، لیکن حضرت قاری صاحب سے ملاقات میں دیر ہوتی تو بار بار تقاضا پیدا ہوتا کہ ان سے ملنے جاؤں، مگر وحشت کا ایسا غلبہ تھا کہ یہ تقاضا دب دب جاتا تھا، لیکن انس اور محبت میں ہر ملاقات اضافہ کرتی رہی اور تقاضا بڑھتا گیا، خانقاہ شریف سے حضرت قاری صاحب کی قیام گاہ کافی فاصلہ پر تھی، اور اس پر طُرّہ یہ کہ شہر کے سب سے زیادہ ہجوم والے حصے سے گزر کر جانا تھا، مگر ہمت کرلی، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامیؒ تشریف لے

جارہے تھے، میں بھی ردیف بن گیا، ان کے ساتھ حاضری ہوئی، ان سے ملاقات کیا ہوئی کرم اور تواضع کی ایک نئی دنیا روشن ہوگئی۔

ہمارے وہ اکابر جنھوں نے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر اپنے نفوس کا تزکیہ کرالیا ہے۔ آج کی دنیا سے ان کا رنگ مختلف نظر آتا ہے، آج ہر طرف خودی اور خود پسندی کی لپک محسوس ہوتی ہے، آدمی دوسرے کی تعظیم کرنے سے پہلے اپنی عزت نفس کا تحفظ کرلیتا ہے، اسی لئے اکرام و تعظیم میں بے ساختگی اور بے تکلفی کی دل آویزی عموماً نہیں محسوس ہوتی، جس کو اللہ تعالیٰ عوام میں شہرت اور کسی اعتبار سے قدرے عظمت عطا فرماتے ہیں، وہ اپنا ایک خاص مقام سمجھ کر اس سے نیچے اترنے کو اپنی ہتک محسوس کرتا ہے، لیکن بزرگوں کے صحبت یافتہ حضرات کو دیکھا ہے اور بارہا دیکھا ہے کہ انھیں اپنے نفس اور اپنی خودی کا جیسے احساس ہی نہیں ہے۔ وہ بے تکلف چھوٹے بن کر ملتے ہیں، ان کے دل کا حال یہی ہوتا ہے کہ وہ سب سے چھوٹے ہیں، وہ کسی شخص میں چھوٹائی نہیں دیکھتے، ان کے نزدیک خود ان کے نفس سے زیادہ ذلیل اور حقیر کوئی شے کائنات میں نہیں ہوتی، حضرت قاری صاحبؒ سے جب بھی ملا ہوں، ہر دفعہ یہی احساس ہوا کہ ان کے نزدیک ان کی اپنی ذات سے زیادہ اور کوئی حقیر و کمتر نہیں ہے، وہ تواضع اس لئے نہیں کرتے تھے کہ ملنے والے کی تالیف قلب ہو، بلکہ اس لئے کرتے تھے کہ ان کا یہی حال تھا، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ ھَوْناً، (رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع اور نرمی سے چلتے ہیں) حضرت قاری صاحبؒ اس تعلیم کی مجسم تصویر تھے، ان کی رفتار، ان کی گفتگو، ان کی آواز، ان کا دیکھنا، ان کا متوجہ ہونا، ہر ایک ادا **ھوْناً** کی دلکش تصویر تھی۔

حضرت قاری صاحبؒ کی یہ صفت اس قدر دلکش اور دل آویز تھی کہ ان کی

صحبت میں بیٹھنے والا بھی اس سے سرشار ہوجاتا تھا، ان کے متعدد متوسلین و تلامذہ کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ بھی تواضع کی اس صفت میں ان کے نقش قدم پر ہیں۔

میں حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں تنہا بھی اور متعدد لوگوں کے ساتھ بھی اتنی مرتبہ حاضر ہوا ہوں کہ اس کی گنتی بتانی مشکل ہے، مگر کبھی یہ نہیں دیکھا کہ انھوں نے اپنی خودی کو مقدم رکھا ہو، وہ سب کچھ ہوتے ہوئے، اپنے کو ایسا پیش کرتے کہ ہم جیسے نادانوں کو آگے بڑھ کر بولنے اور اظہار علم کا حوصلہ مل جاتا، مجھے چونکہ بزرگوں کے حالات بالخصوص اکابر دیوبند کے سوانح و تذکار سے خاص مناسبت ہے اور قاری صاحب خود بزرگ تھے۔ اور بزرگوں کے حالات سے بہت دلچسپی رکھتے تھے، میں حاضر خدمت ہوتا، اور وہ آہستگی سے کسی بزرگ کا ذکر چھیڑ کر خاموش ہوجاتے، اور پھر یہ دراز نفس اپنے رہوار گفتگو کو ڈھیلا چھوڑ دیتا، پھر جتنی دیر تک باتیں چلتی رہتیں حضرت قاری صاحبؒ کی محویت قابل دید ہوتی، مسکراتے، ہلکے انداز میں تائید فرماتے، خوش ہوتے خوشی کا اظہار فرماتے، میں چونکتا اور اپنی دراز نفسی کی معذرت کرتا تو اسے خوبصورتی سے ٹال جاتے اور کوئی ذکر چھیڑ کر مجھے پھر آمادۂ گفتگو کردیتے۔

میں الہ آباد میں رہا، پھر غازی پور آگیا، غازی پور سے گورینی، گورینی سے شیخوپور، جگہیں بدلتی رہیں، مگر جو تعلق حضرت قاری صاحبؒ سے استوار ہوا تھا، اور ملاقات و زیارت کا جو سلسلہ قائم ہوا تھا وہ بدستور برقرار رہا، بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا میں الہ آباد کا سفر حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کے لئے کرتا رہا، اور جب مل کر واپس آتا تو دوبارہ ملاقات کا شوق لے کر آتا۔

شیخوپور آنے کے بعد جب حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو دیر تک مدرسہ کے احوال، گاؤں والوں کے احوال، اساتذہ کے احوال پوچھتے

رہے، میں نے یہاں کے ابتدائی حالات، یہاں کی بے سروسامانی، اساتذہ کا صبرو استقلال، طلبہ کے مجاہدوں اور تکلیفوں کا ذکر کیا، راستے کی صعوبت، آسائش زندگی کے فقدان کا تذکرہ کیا تو بہت دلسوزی کے ساتھ دعائیں کرتے رہے، اور ایک خاص کیفیت کے ساتھ فرمانے لگے کہ "ان شاء اللہ ہتھورا ثانی بنے گا"

ہتھورا، حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب قدس سرہٗ کا وطن ہے، نہایت بے سروسامانی کے عالم میں حضرت باندوی قدس سرہٗ نے وہاں مدرسہ کا سامان کیا، حق تعالیٰ نے اسے اتنا عروج بخشا کہ وہ اس وقت پورے ملک کا مرکز نگاہ بن گیا تھا، حضرت باندوی نور اللہ مرقدہٗ سے کون واقف نہیں ہے، میں نے حضرت قاری صاحب کی زبان مبارک سے یہ جملہ سنا تو سناٹے میں آگیا، "کہاں راجہ بھوج کہاں بجوا تیلی" میں نے یہ جملہ سنا، شرم سے پانی پانی ہوگیا، اور اپنے اندر اتنا حوصلہ بھی نہیں پاتا کہ اس جملہ کے ظہور کا انتظار کروں۔

حضرت قاری صاحب نام ونمود سے بہت دور اور شہرت کی خواہش سے بہت نفور تھے، وہ کام کریں اور جس کے لئے وہ کام کرتے ہیں وہ جانے، بس ان کے لئے یہی بات بہت کافی تھی، اسی لئے انھوں نے کہیں بھی اور کبھی بھی اپنے نام کو یا اپنے کسی کام کو نمایاں کرنے یا تعارف کرانے کا قصد نہیں کیا، آج کی دنیا، کام کم کرتی ہے، مگر اشتہار زیادہ دیتی ہے، ہمارا تعارف ہوجائے، ہمارے کام کی شہرت ہوجائے، یہ خواہش دلوں میں چھپی رہتی ہے۔ مگر بار بار کی ملاقات کے بعد بھی کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ ایسی کوئی ہوس دل کے کسی نہاں خانہ میں پوشیدہ ہے، عموماً بزرگوں کے احوال کا تذکرہ کرتے تھے، مگر خود اپنے کو اس لائق کبھی تصور نہیں کیا کہ کبھی اپنے حالات کچھ بیان کرتے۔

پاکستان کے کسی صاحب کو حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے خانوادۂ

بیعت کے حضرات کا قدرے تعارف لکھنے کا ارادہ ہوا، انھوں نے پتہ لگالیا تھا کہ الہ آباد محلّہ کٹرہ کی ایک مسجد میں اس خانوادہ کی ایک کامل شخصیت اپنے آپ کو سمیٹے سنبھالے، شہرت سے بچائے تشریف فرما ہے، انھوں نے اصرار کیا حضرت اپنے کچھ احوال اپنے قلم سے لکھ دیں، حضرت نے بہت عذر کیا، مگر وہ صاحب بھی دھن کے پکے تھے، اصرار کرتے رہے، حضرت قاری صاحب نے بادل ناخواستہ کچھ کچھ لکھا اور پھر ادھورا رہ گیا، یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ ادھورا بھی ان صاحب کے پاس بھیجا گیا، یا یہیں رہ گیا، وفات کے بعد میری حاضری ہوئی، تو حضرت کے بعض تلامذہ سے میں نے کچھ حالات معلوم کرنے چاہے، تو ان کے پاس مذکورہ نا تمام تحریر نظر آئی، جسے انھوں نے کسی طرح قاری صاحب سے حاصل کرلیا تھا، اور وہی تحریر ہے، جس سے ان کے کچھ حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔ اس کی روشنی میں مختصر حالات لکھے جارہے ہیں۔

حضرت قاری صاحب کا آبائی وطن ضلع الہ آباد، موضع اوجھنی، تحصیل چاہل ہے، اوجھنی میں وہ ۶/ رجب ۱۳۳۲ھ مطابق یکم/ جون ۱۹۱۴ء بروز دوشنبہ پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک شخصی مکتب میں حاصل کی، ایک نیک مرد اپنے گھر **حسبۃً للہ** گاؤں کے بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے، ان کے یہاں کافی بچے زیر تعلیم تھے، قرآن مجید ناظرہ وہیں پورا کیا، گاؤں میں ایک پرائمری اسکول بھی تھا، کچھ دنوں اس میں تعلیم حاصل کی، ناظرہ ختم ہونے کے بعد والد صاحب کو حفظ قرآن کی فکر ہوئی، گاؤں کے کچھ اور لوگوں نے اس کار خیر کی ترغیب دی، جب کئی بچے حفظ کے لئے تیار ہوگئے تو ایک حافظ صاحب کو بلایا، اور ان کی خدمت میں یہ حفظ کے لئے بیٹھا دئے گئے، ۱۲/۱۳/ سال کی عمر میں حفظ مکمل کرلیا، دوسال کے بعد تراویح میں پہلی محراب سنائی، اسی اثنا میں والدہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا، والد صاحب

محلّہ کٹرہ میں اسی مسجد میں امامت کرتے تھے، جس میں قاری صاحب دم آخر تک قیام پذیر رہے، والد صاحب اپنے فرزند کو لے کر الہ آباد آگئے، اور وہاں کے مشہور مدرسہ سبحانیہ میں درجۂ قرأت میں داخل کر دیا، اس مدرسہ میں اس وقت فن قرأت کے امام حضرت قاری محبّ الدین صاحبؒ استاذ تھے، انھیں سے حضرت قاری صاحب نے قرأت حفص کی تکمیل کی۔ مدرسہ سبحانیہ میں قرأت کے ساتھ عربی کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے، عربی کی ابتدائی کتابیں مدرسہ سبحانیہ میں پڑھ کر تکمیل کے لئے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جانے کا قصد کیا، حضرت قاری صاحب چونکہ اپنے والد کے اکلوتے صاحبزادے تھے، وہ اپنے سے جدا کرنے کیلئے کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے، مگر انھیں شوق علم دامن گیر تھا، بہت اصرار کے بعد راضی ہوئے، مظاہر علوم میں کافیہ کی جماعت میں داخلہ لیا، اور انہاک کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہوگئے۔

حضرت تھانویؒ کی زیارت: حضرت قاری صاحبؒ اپنے خودنوشت حالات میں لکھتے ہیں کہ:

> ”ذی الحجہ کی تعطیل میں کافی طلبہ اور مدرسین تھانہ بھون کی تیاری کرنے لگے، معلوم ہوا کہ تھانہ بھون یہاں سے قریب ہے، حضرت تھانویؒ کی زیارت کے لئے یہ سب جارہے ہیں، موقع کو غنیمت سمجھ کر میں نے بھی اجازت چاہی، مدرسہ نے بخوشی اجازت دے دی، تھانہ بھون حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہونچے، زیارت ہوئی، مجلس میں شرکت کی اجازت ملی، حضرت کی مجلس اور زیارت سراپا نور ہی نور تھی، بار بار دل میں یہی آتا تھا کہ علم جو مقدر میں ہوگا، حاصل ہوگا، لیکن اس زیارت کی سعادت سے بڑی دولت روحانی نصیب ہوگئی، **الحمد للہ ثم الحمد للہ علیٰ ذٰلک**

مظاہر علوم میں حضرت قاری صاحب کا قیام چھ سال رہا، اسی دوران والد صاحب کا انتقال ہوگیا، والد کے انتقال سے تنگی کا دور شروع ہوگیا، لیکن شوق علم نے ہمت ہارنے نہیں دیا، قاری صاحب کو سہارنپور محلّہ بنجاران کی ایک مسجد میں امامت مل گئی، وہاں نماز پڑھاتے، اور تعلیم کے لئے مدرسہ میں حاضر ہوتے، اس طرح طالب علمی کے مختصر اخراجات کی سبیل بن گئی۔

حضرت نے اپنی تحریر میں یہ نہیں ذکر کیا کہ فراغت کس سن میں ہوئی، اندازہ یہ ہے کہ ۱۳۵۵ھ کے لگ بھگ فراغت ہوئی ہوگی، فراغت کے بعد محلّہ کٹرہ میں اپنے والد صاحب کی جگہ پر کام کا آغاز کیا، اسی مسجد میں امامت کرتے، اس میں ایک مکتب قائم تھا، اس میں بچوں کو ناظرہ، حفظ اور فارسی وعربی کی تعلیم دیتے، اس کے ساتھ ساتھ وہیں ایک چھوٹی سی دوکان بھی پرچون کی کھولی، مگر اسے جلد ہی بند کر دیا۔ کچھ عرصہ تک الہ آباد ہی کے ایک محلّہ حسن منزل کے مدرسہ قرآنیہ میں وقت دیتے، دوسرے وقت کٹرہ کے مدرسہ میں! یہ سلسلہ آٹھ سال تک قائم رہا، اس کے بعد مدرسہ نعمانیہ کٹرہ کے لئے یکسو ہوگئے، اس کے کچھ ہی عرصہ بعد شہر میں ہندو مسلم فساد ہوگیا جس کا سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا، اس کا اثر مدرسہ پر پڑا، طلبہ منتشر ہوگئے، مدرسہ کا نظام درہم برہم ہوگیا، مجبوراً حضرت قاری صاحب نے شہر فتحپور میں مدرسہ اسلامیہ میں عربی اور قرأت کی مدرسی اختیار کی، مگر وہاں جی نہیں لگا، اور الہ آباد کٹرہ کے لوگوں کا بہت اصرار رہا، اس لئے دو تین ماہ میں واپس آگئے، اور پھر نہایت استقامت اور یکسوئی کے ساتھ مدرسہ نعمانیہ اور مسجد میناشاہ کی خدمت میں لگ گئے، اور دم آخر تک پھر قدم باہر نہیں نکالا اور اسی وقت نکالا جب قدرت الٰہی کی طرف سے دنیا ہی سے اذن رحیل مل گیا۔

حضرت قاری صاحب مدرسہ کا نظام نہایت خاموشی کے ساتھ چلاتے تھے،

دھوم دھام، اشتہار، پمفلٹ اور شہرت کی خواہش سے بے نیاز علم دین کی خدمت کرتے رہے، ان کے یہاں کے طلبہ واساتذہ میں تواضع، نرمی، اور خوش اخلاقی ودینداری کا اثر نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کی نشو ونما اللہ تعالیٰ کی محبت اور شریعت مطہرہ کی عظمت پر ہوئی تھی۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب مظاہر علوم سہارنپور میں متعلم تھے، تو ایک قافلہ کے ساتھ بقرعید کی تعطیل میں تھانہ بھون حاضر ہوئے تھے، حضرت تھانوی قدس سرہٗ جہاں ایک زبردست عالم تھے وہیں ایک باکمال درویش، صاحب باطن اور اللہ کی محبت میں سرشار ایک عظیم سالک بھی تھے، وہاں حضرت کی مجلس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، اس پر اس نوخیز طالب علم کا قلبی تاثر ملاحظہ فرمایئے، خود فرماتے ہیں:

> حضرت کی مجلس اور زیارت سراپا نور ہی نور تھی، بار بار دل میں یہی آتا تھا کہ علم جو مقدر میں ہوگا، حاصل ہوگا، لیکن اس زیارت کی سعادت سے بڑی دولت روحانی نصیب ہوگئی، **الحمد للہ ثم الحمد للہ علیٰ ذٰلک**

یہ تاثر دل کی گہرائیوں میں اسی وقت پیدا ہوگا، اور بار بار دل میں اسی وقت آئے گا جب کہ دل اللہ کی محبت کی لذت پارہا ہوگا، نرا علمی ذوق اس تاثر کو پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ طالب علمی کا زمانہ تھا، ہمارے اکابر طلب علم کے دور میں بیعت کرنے سے معذرت فرمادیتے تھے کہ تحصیل علم کی یکسوئی میں اس سے خلل ہوگا، طلب علم، اور بیعت سلوک دونوں کامل یکسوئی کا تقاضا رکھتے ہیں۔ طالب علم کی توجہ کتاب سے، درسگاہ سے، استاذ سے، ذرا بھی ہٹے گی، تو علم کمزور ہو جائے گا اور فرصت کا بیش قیمت وقت ضائع ہوجائے گا۔ اس لئے ہمارے اکابر طالب علموں کو بیعت نہیں کرتے تھے، ورنہ عجب نہیں حضرت قاری صاحب کے دل میں بیعت کا شوق پیدا ہوا ہو۔

تعلیم سے فراغت کے بعد جب وطن واپس آئے اور والد کی جگہ پر کام شروع کیا تو اب یہ شوق ابھرا کہ کسی آستانہ پر جبینِ عقیدت خم کرنی چاہئے، اللہ نے پہلے ہی انتظام فرمادیا تھا، حضرت اقدس تھانویؒ کے اخص الخواص خلیفہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب جو کہ غایت عشق ومحبت کی بنا پر ٹھیک ٹھیک حضرت تھانویؒ کے نقش قدم پر تھے۔ وہ الہ آباد ہی کے رہنے والے تھے، حضرت قاری صاحب نے دیکھا کہ تھانہ بھون کے بحر معرفت وطریقت کی ایک نہر ان کے قریب بلکہ ان کے وطن میں موجیں ماررہی ہے، تو بغیر کسی تاخیر کے انھوں نے آستانہ عیسوی پر حاضری دی اور ان کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے، طلب صادق تھی، دل سراپا اخلاص ومحبت تھا، بہت جلد بارگاہ عیسوی میں تقرب واختصاص حاصل کرلیا۔ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ اس وقت اپنے گاؤں محی الدین پور میں قیام پذیر تھے، گورنمنٹ سے ملازمتِ تعلیم کی پنشن پاتے تھے، اس لئے ہر ماہ الہ آباد شہر تشریف لایا کرتے تھے۔ مولانا کا قیام نئے کٹرہ میں ہوتا، جو حضرت قاری صاحب کی قیام گاہ سے تھوڑے فاصلہ پر ہے، ان کی تشریف آوری جونہی ہوتی، فوراً قاری صاحب کو خبر دی جاتی اور قاری صاحب حاضر خدمت ہوجاتے۔ خود حضرت قاری صاحب لکھتے ہیں کہ:

> خیریت پوچھنے کے معاً بعد فوراً اوقات نماز بالتفصیل وبالترتیب دریافت فرماتے، نئے کٹرہ سے پانچوں وقت جب تک طاقت تھی پیدل آتے، ضعف کا غلبہ ہوگیا تو سواری سے آتے جاتے، ایک دفعہ کرایہ دیتے وقت خوش ہوکر فرمایا ”اللہ نے دیا ہے اور اللہ ہی کی راہ میں جارہا ہے“

یہ تو حضرت قاری صاحب نے تحریر فرمایا ہے، یہ واقعہ حضرت قاری صاحب نے بار بار مجھ سے ذکر کیا ہے، اس میں یہ بھی فرماتے تھے کہ حضرت مولانا کا دستور تھا

کہ جن نمازوں سے پہلے سنت ہے ان میں جماعت کے وقت سے دس منٹ پہلے، اور جن نمازوں سے پہلے سنت نہیں ہے ان میں پانچ منٹ پہلے تشریف لایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ نے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی وفات کے ایک ہی سال بعد وصال فرمایا۔

حضرت مولانا کی وفات کے بعد قاری صاحب تنہائی محسوس کرنے لگے، دل کی بیتابی اور روح کی تشنگی کسی طرح چین لینے نہیں دیتی تھی، کسی مرشد کی تلاش تھی،

جن دنوں حضرت قاری صاحب حسن منزل میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، وہاں عارف باللہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کا تذکرہ سنا، حسن منزل کے رہنے والے بعض حضرات فتح پور حضرت کے پاس آتے جاتے تھے۔ ان لوگوں سے حضرت کے احوال اور حضرت کی باتیں سن کر طبیعت میں کشش پیدا ہوئی، ابتداءً ایک عریضہ حضرت کی خدمت میں تحریر کیا، جس میں اصلاح نفس کے لئے خط وکتابت کی اجازت مانگی، حضرت نے بخوشی اجازت مرحمت فرمادی۔ کچھ دنوں پابندی سے مراسلت جاری رہی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد تعلیمی مشغولیت میں انہماک کے باعث یہ سلسلہ سست پڑ گیا، پھر حسن منزل کے لوگوں کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضری کی توفیق ہوئی، اس حاضری میں حضرت قاری صاحب نے کیا پایا، ان کا تاثر کیا رہا۔ اور پہلی ملاقات کن برکات سے لبریز تھی۔ اس کا تذکرہ خود حضرت کے قلم سے پڑھئے، لکھتے ہیں:

> حضرت اتنے سادہ اور بے تکلف تھے کہ اول اول کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا، حضرت ایک چٹائی پر بیٹھے سنترہ کی قاشیں نوش فرمارہے تھے اور سب کو ایک دو قاشیں دیتے بھی جارہے تھے اور باتیں کررہے تھے، جن کا پہلے سے تعارف نہیں تھا، حافظ صاحب نے تعارف کرایا، تعارف کے بعد حضرت نے احقر سے دریافت فرمایا، تمہارا خط آتا تھا بند کیوں کردیا۔ میں نے صاف عرض کردیا کہ حضرت! غفلت کی وجہ سے بند ہوگیا۔ حضرت خاموش رہے، کچھ نہیں بولے، کئی دن ہم لوگوں کا قیام رہا، حضرت حسب عادت کبھی کسی کو، کبھی کسی کو تنہائی میں بلاتے رہے، اور افہام وتفہیم فرماتے رہے، احقر کو ایک دفعہ بھی نہیں بلایا، میں رشک کرتا رہا اور دل ہی دل میں رنج کرتا رہا، حتیٰ کہ رخصت ہونے کا وقت آیا، سب لوگوں کے ساتھ احقر بھی مصافحہ کرکے رخصت ہوا، جب ہم لوگ کافی دور چلے آئے تو ایک صاحب کی پیچھے سے آواز آئی کہ پکارتے دوڑتے چلے آرہے ہیں، ہم لوگ رک گئے، انھوں نے خادم سے کہا کہ ان کو حضرت بلارہے ہیں، میں واپس گیا، سب لوگ میرا انتظار کرتے رہے، جس وقت میں خدمت میں پہونچا، حضرت ایک خاص کیفیت اور شان کے ساتھ بیٹھے تھے، جب میں پہونچا تو کچھ بولے نہیں، لیکن اسی کیفیت کے ساتھ اس کمترین سے مصافحہ فرمایا، اور یہ فرمایا کہ خط لکھتے رہنا، اور کچھ زیادہ نہیں کہا، اس مصافحہ کا احقر کے اوپر یہ اثر ہوا کہ دفعۃً گریہ طاری ہوگیا، روتا ہوا ان لوگوں کے پاس پہونچا ان لوگوں سے اپنے گریہ کو چھپایا، لیکن چہرہ سے وہ لوگ سمجھ گئے، واپس آکر حسب امکان بہت جلد جلد عریضہ ارسال کرتا رہا، حضرت ہمت افزائی فرماتے رہے اور خوش خوش جواب عنایت فرماتے رہے۔

اس کے بعد تو دل میں ایک لگن سی لگ گئی، شیخ کی عنایات وتوجہات سے دل ذکر الٰہی سے معمور اور منور ہوتا چلا گیا، اور اسی کے بقدر شوق فراواں کی دولت بڑھتی گئی، خطوط کی آمد ورفت کے ساتھ خدمت میں حاضری بھی بار بار ہونے لگی۔ ایک

حاضری میں حضرت نے تنہائی میں فرمایا کہ لگ کر محنت کر ڈالو بار بار کا آنا جانا کہاں؟

اجازت بیعت: ۔ایک دفعہ الہ آباد کے چند مخصوص لوگ حاضر خدمت ہوئے، جن میں حضرت مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہریؒ اور حضرت قاری صاحبؒ، حضرت ماسٹر ابراہیم صاحبؒ اور شہر کے دوسرے معززین تھے، حضرت قاری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

> ”واپسی کے دن مجھے اور مولانا سراج الحق صاحب کو طلب فرمایا: ایک خاص کیفیت کے ساتھ ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر اجازت مرحمت فرمائی، جناب مولانا سراج الحق صاحب رونے لگے، اور عرض کرنے لگے میں اس لائق نہیں ہوں، فرمایا: اچھا اچھا ابھی کچھ کہوں گا، پھر نیچے تشریف لائے اور اہل خانقاہ اور الہ آبادی حضرات کو جمع کر کے اجازت سے متعلق مختصر تقریر فرمائی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ حصول نسبت کے بعد اجازت ہوتی ہے، کسی کو نسبت تامہ کے بعد کسی کو ابتدائی نسبت کے بعد ہی شیخ اعتماد کر کے اجازت دے دیتا ہے“

دوسرے روز یہ حضرات الہ آباد واپس ہوئے، روانگی سے پہلے الہ آباد کے دو سمجھدار آدمیوں کو جن میں ایک ماسٹر محمد ابراہیم صاحب تھے، ان سے فرمایا کہ میں نے ان لوگوں کو اجازت دی ہے، یہ شرم کی وجہ سے کسی پر ظاہر نہ کریں گے، آپ وہاں اطلاع کر دیجئے گا، چنانچہ ان لوگوں نے الہ آباد میں اس اجازت کی اطلاع کر دی اور اہل سعادت حسب توفیق حضرت قاری صاحبؒ کی طرف رجوع ہونے لگے۔

حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہٗ جب تک فتح پور میں تشریف فرما رہے، حضرت قاری صاحبؒ وہاں حاضر خدمت ہوتے رہے، اور حضرت کی خدمت میں سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے، نسبت کا رسوخ حاصل ہوتا رہا، اس دوران بعض

اوقات حضرت پیر و مرشد نے ازراہ امتحان شدید مواخذے بھی فرمائے، جن میں حضرت قاری صاحبؒ پورے اترے اور بشارتوں سے سرفراز ہوئے۔

اخیر میں حضرت نے الہ آباد کو قیام کے لئے منتخب فرمایا، پھر تو حضرت قاری صاحبؒ کے لئے ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ قدر تھی، اللہ ہی جانتا ہے کہ باطنی ترقیات کس نقطۂ عروج پر پہونچی ہوں گی۔ ہاں تابناک اور روشن چہرہ شہادت دیتا تھا کہ قلب کتنا پُر نور ہوگا۔

حضرت کی وفات کے بعد نہایت خاموشی کے ساتھ مدرسہ، تعلیم اور ارشاد واصلاح کا کام کرتے رہے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کے دل میں شہرت وحصولِ جاہ کا شائبہ تک نہ تھا، حاضر ہونے والے حاضر ہوتے، معتقدانہ حاضر ہوتے، مگر حضرت قاری صاحبؒ اپنے کسی کام کا ذرا بھی تذکرہ نہ کرتے، وہ بس اللہ کی یاد میں، ان کی رضاجوئی کی دھن میں غرق تھے، ان کا سوال جو کچھ تھا اللہ سے تھا۔ حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہٗ کی تربیت کا رنگ اس درجہ پُختہ تھا کہ ہر ہر ادا سے اس کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔

اخیر کے چند سال سخت تکلیف اور بیماری میں گزرے، ڈاکٹروں کی تشخیص غالبًا یہ تھی کہ جسم کا پانی سوکھ گیا ہے، جس کا اثر جسم کے ہر حصے پر ہوگیا تھا، جوڑ جوڑ جام ہوگیا تھا۔ آواز بند ہوگئی تھی، الفاظ بولتے تھے مگر بغیر آواز کے۔ ایسی معذوری تھی کہ دیکھ کر دل بھر آتا تھا، مگر کمال صبر اور کمال استقامت کا یہ حال تھا کہ کسی ادا سے شکایت اور تکلیف کی شدت کا احساس نہ ہوتا تھا، بیماری کے دوران بار بار میری حاضری ہوئی۔ ایک حاضری کے موقع پر جب بے بسی اور بے چارگی کا منظر سامنے آیا تو میرا دل بھر آیا، میں نے اپنی نادانی سے خیال کیا کہ شاید حضرت قاری صاحبؒ کو بھی اپنی معذوری کا صدمہ ہو، یہ خیال آیا تو میں تسلی کی کچھ باتیں کرنے لگا کہ اللہ

تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو عروج روحانی اور اپنا قرب لازوال کن کن راستوں سے بخشتے ہیں، یہ ساری مجبوریاں درحقیقت قُرب الٰہی کے راستوں کی برق رفتار سواریاں ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس معذوری اور مجبوری کا ہر لمحہ حضرت کو کہاں سے کہاں پہونچا رہا ہے، پھر اس کی مناسبت سے کچھ آیتیں اور کچھ حدیثیں سنائیں، پہلے بھی زیادہ تر دستور یہی رہا کرتا تھا کہ میں جب حاضر خدمت ہوتا تو حضرت کا اشارہ پا کر اکثر گفتگو میں ہی کرتا تھا، درمیان میں حضرت کوئی ایک جملہ بول کر میری گفتگو کو مزید درازی کا حوصلہ بخش دیتے تھے، آج حضرت کچھ بول نہیں سکتے تھے، تو از خود میں نے لمبی گفتگو چھیڑ دی، میری گفتگو کا دائرہ پھیل رہا تھا اور حضرت کا نورانی چہرہ مزید دمکتا جا رہا تھا، خوب مسکرائے، کسی کسی وقت خوشی سے پورا جسم ہل جاتا، کسی کسی بات پر بے ساختہ آنکھیں ڈبڈبا جاتیں، میں خاموش ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ حضرت کا رُواں رُواں خوشی سے سرشار ہے، اور انھیں کسی مجبوری کا ذرا بھی شکوہ نہیں۔

آخری حاضری میں بھی حضرت اسی عالم میں تھے، سراپا صبر و رضا بنے ہوئے چہرۂ مبارک پر مرض کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا، وہی رونق، وہی نورانیت، صرف اتنا فرق تھا کہ ضعف کی وجہ سے یا استغراق کی وجہ سے آنکھیں اکثر بند رہتی تھیں، آواز بالکل نہیں تھی، مگر کچھ کچھ فرماتے تھے، ہونٹوں کے اشاروں سے کوئی کوئی بات سمجھ میں آجاتی تھی، حضرت کے خدام اور صاحبزادہ گرامی قدر مولانا مسعود صاحب اکثر باتیں سمجھ لیتے تھے۔ اس دن حضرت کا اصرار تھا کہ کھانا یہیں کھاؤ، مگر اس کا نظم ایک دوسری جگہ ہو چکا تھا، بڑی لجاجت کے ساتھ معذرت کی، حضرت مسکرائے، بالآخر اجازت دے دی، ہم کئی لوگ تھے، دیر تک ان کے پاس رہ کر واپس ہوئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

محرم ۱۴۲۲ھ کی ۷/تاریخ تھی، ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف سے مخدوم مکرم حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی مدظلہٗ بول رہے تھے کہ قاری حبیب صاحب الہ آبادیؒ کا انتقال ہوگیا۔ یہ خبر میرے لئے غیر متوقع بالکل نہ تھی، مگر سن کر ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بالکل نیا حادثہ ہوا، بدن بے جان ہوگیا، ہوش و حواس مفلوج ہونے لگے، روح کی دنیا میں سناٹا سا ہوگیا، کب ہوا؟ جواب ملا کہ کل صبح انتقال ہوا، شام کو تدفین ہوئی، میں سوچنے لگا کاش بروقت اطلاع ملی ہوتی، تو میں جنازہ میں حاضر ہوا ہوتا، مگر مقدر نہ تھا۔

محرم کی ۶/اور اپریل کی پہلی تاریخ تھی، اتوار کا دن تھا، حضرت کے خادم نے معمول کے مطابق فجر کی نماز ادا کرائی، نماز سے فارغ کر کے اس نیت سے کہ حضرت کچھ آرام کر لیں، تھوڑی دیر کے بعد وہ حجرہ سے نکل گئے، وہ باہر نکل کر جا رہے تھے، اور دوسرے خادم جو حضرت قاری صاحب کے مدرسہ میں مدرس تھے وہ آرہے تھے، تھوڑے سے وقفہ کے بعد وہ حجرہ میں داخل ہوگئے، انھوں نے معمول کے مطابق سلام کیا مگر جواب نہ ملا، انھوں نے ہاتھ پکڑا اور یہ سوچ کر کہ شاید سنا نہ ہو، ذرا بلند آواز سے سلام کیا، تب بھی کوئی حرکت نہ ہوئی، پاؤں پر ہاتھ رکھا تو وہ ٹھنڈا تھا سینے اور پیٹ کو دیکھا تو پسینے سے تر تھا، انھوں نے گھبرا کر صاحبزادۂ محترم جناب ڈاکٹر احمد صاحب کو اطلاع دی، وہ آئے، لیکن حضرت جا چکے تھے، فرشتے انھیں کب اٹھا لے گئے، کسی نے جانا ہی نہیں۔ انھوں نے کبھی اپنی شہرت نہیں چاہی، ان کا سب کام خاموشی سے ہوتا تھا، کام ہو جانے کے بعد لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ فلاں کام ہوگیا، زندگی مستعار کا آخری کام بھی ایسا ہی ہوا، ایک خادم رخصت ہو کر جاتا ہے اور دوسرا خادم حاضر ہوتا ہے، اسی درمیان فرشتے آتے ہیں اور خاموشی سے انھیں خدا کے حضور لے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں، بڑی باکمال اور

صاحب جمال ہستی تھی۔

حضرت قاری صاحبؒ مدتوں یاد آئیں گے، حضرت قاری صاحبؒ ان بزرگوں میں تھے، جو بغیر میری درخواست کے برابر اس حقیر کے حق میں دعائے خیر فرمایا کرتے تھے، یہ بات انھوں نے بار بار مجھ سے ارشاد فرمائی، ان کا جانا میرے لئے ذاتی نوعیت کا صدمہ ہے۔

حضرت کی یادگار حضرت کے دو صاحبزادے جناب ڈاکٹر احمد صاحب اور مولانا مسعود احمد صاحب ہیں اور آپ کی سرپرستی میں چلنے والا مدرسہ نعمانیہ نیز بے شمار تلامذہ ومتوسلین ہیں، اللہ تعالیٰ سب میں برکت عطا فرمائیں۔ اور حضرت کی روح کے لئے سب کو باعث تسکین وشادمانی بنائیں۔ آمین

(ماہنامہ ضیاء الاسلام اگست رستمبر ۲۰۰۱ء مطابق جمادی الاولیٰ رجمادی الاخریٰ ۱۴۲۲ھ)

☆☆☆☆☆☆☆

اعظم گڈھ کا حادثۂ کبریٰ

(ڈاکٹر محمد سلیم صاحب)

وفات: ۱۰ رذی الحجہ ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۳ رفروری ۲۰۰۲ء

عین بقرعید کے دن، جب لوگ دوگانہ ادا کر کے عیدگاہ سے لوٹ رہے تھے اعظم گڑھ شہر میں ایک خبر بجلی بن کر کوندی اور پورے شہر میں تہلکہ مچ گیا، ہر شخص سوگوار و بے قرار! یہ کیا ہوگیا؟ کیسے ہوا؟ ہر شخص سوال کرتا اور کوئی جواب نہ ملتا، سارا شہر تھرا اٹھا۔

اعظم گڈھ کے ایک مشہور ڈاکٹر، امراض قلب کے بہترین معالج ڈاکٹر محمد سلیم صاحب کے گھر ڈاکہ پڑا، ڈاکو اتنے بدبخت اور شقی القلب تھے کہ مال تو لوٹا ہی، اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو، ان کے بیٹے کو، ان کی بیٹی کو مار کر ہلاک کر دیا، اہلیہ کو بھی مار ہی ڈالا تھا مگر ان میں زندگی کی رمق باقی تھی، آج جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں، حادثہ کا تیسرا دن ہے، بنارس کے ایک ہسپتال میں زیر علاج ہیں، (حادثہ کے تقریباً چار ماہ بعد ان بھی انتقال ہوگیا) ڈاکٹر صاحب کا خاندان مختصر تھا، ایک ہی بیٹا جو علی گڈھ میں پڑھتا تھا اور ایک ہی بیٹی جو ایم بی بی ایس کر چکی تھی، اب اس سے اونچی ڈگری کی جستجو میں تھی، اور اہلیہ۔ بس یہ خاندان تھا، ظالموں نے پورے خاندان ہی کا صفایا کر دیا۔

اس جاں گداز حادثہ نے شہر کے تمام باشندوں کو بالخصوص مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا، بقرعید سوگوار ہوگئی، ڈاکٹر صاحب یکسو آدمی تھے، بس اپنے پیشے تک محدود تھے

، ان کا کوئی دشمن شہر میں سوچا نہیں جا سکتا تھا، پھر یہ کیونکر ہو گیا؟ ہر شخص حیرت زدہ ہے، ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے وائس چانسلر ہیں، ان کے آنے کا انتظار تھا، دوسرے دن دس بجے نماز جنازہ کا پروگرام بنا، ڈاکٹر صاحب کے برادر نسبتی جناب وصی الدین عرف وصّو بھائی کے گھر تینوں لاشیں پوسٹ مارٹم ہو کر آئیں، دوسرے دن جنازے میں اتنا ہجوم ہوا، خود شہر کے اور اطراف واکناف کے لوگ اس کثرت سے شریک جنازہ ہوئے کہ اعظم گڈھ شہر میں اس کی نظیر نہیں دیکھی گئی۔

ڈاکٹر صاحب، اعظم گڈھ کے ایک معروف گاؤں جہاں علم کا چرچا مدت قدیم سے ہے، جیراج پور کے رہنے والے تھے، اہل علم جانتے ہیں کہ اس کے قریب بلکہ متصل ایک گاؤں بندول ہے، جو علامہ شبلی مرحوم کا آبائی وطن ہے، انھیں علامہ شبلی کے معاصر مولانا سلامت اللہ مشہور اہل حدیث عالم، جیراج پور کے رہنے والے تھے، ابتداءً جب علامہ شبلی تحصیل علم سے فارغ ہو کر آئے، تو مولانا سلامت اللہ صاحب سے علمی نوک جھونک بھی رہی، علامہ شبلی پختہ حنفی تھے، اور اسی وجہ سے حضرت نعمان بن ثابت (امام ابو حنیفہ) کی طرف نسبت کر کے نعمانی لکھتے تھے، انھیں مولانا سلامت اللہ صاحب کے صاحبزادے حافظ محمد اسلم جیراج پوری ہوئے، جو جامعہ ملیہ دہلی میں استاذ رہے، اور حدیث کے سلسلے میں ایک خاص نظریہ ان کی طرف منسوب ہوا۔ حافظ محمد اسلم جیراج پوری کے فرزند ڈاکٹر محمد معظم صاحب مرحوم اعظم گڈھ کے مشہور معالج تھے، ڈاکٹر محمد سلیم صاحب، انھیں ڈاکٹر محمد معظم صاحب کے چھوٹے فرزند تھے، پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری ان کے بڑے صاحبزادے ہیں،

یہ حکومت کی کمزوری یا بد دیانتی ہے کہ ڈاکوؤں اور قاتلوں کا حوصلہ اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ ایک بھری پُری آبادی میں گھس کر اس طرح کے سنگین جرائم کا ارتکاب کر جاتے ہیں، حکومت اور حکومت کے اہل کار نتیجے کے اعتبار سے ایک تماشا دیکھنے والے سے بڑھ کر کچھ کر نہیں پاتے۔ جمہوریت کے اس ملک میں نہ انصاف ہے، نہ تحقیق، انصاف کوڑیوں کے مول بک جاتا ہے، اور تحقیق جھوٹ کے انبار میں دب جاتی ہے، یہاں ایسا لگتا ہے کہ قانون کے محافظ خود قانون کے قاتل ہیں۔

جنازہ کی نماز عید کے دوسرے دن اتوار کو ہوئی، اتوار کو بعد نماز مغرب جامع مسجد اعظم گڈھ میں بارہ برس سے درس قرآن کا سلسلہ جاری ہے، اس دن دل و دماغ پر یہی موضوع چھایا ہوا تھا، ایک انجانا سا خوف سب کے دلوں اور چہروں پر صاف محسوس ہوتا تھا، آنکھوں سے شدید کرب و درد جھلک رہا تھا، اس خاکسار نے ایک تعزیتی تقریر کی، اس میں اللہ کی مشیئت اور فیصلے پر صبر و رضا کی وضاحت کی، اور بتایا کہ یہ حادثے تو بے شک اندوہناک ہوتے ہیں، لیکن اگر ان پر صبر کیا جائے، اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر دل سے رضامند رہا جائے، تو بے حد و حساب اجر ملے گا، بے صبری کر کے اجر کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

دوسرے یہ کہ ان حادثوں کی وجہ سے دل میں خوف اور دہشت نہیں ہونی چاہئے، مومن بجز اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتا، نہ مال کا نقصان اسے ڈرا سکتا ہے، نہ جان کی تباہی، جب ایک دن مرنا ضرور ہے اور مرنے کے بعد آدمی ضائع نہیں ہوتا بلکہ خدا کے حضور پہونچ جاتا ہے، تو اس سے ڈرنا کمزوری کی بات ہے، اللہ پر بھروسہ کرنا چاہئے، اور اس کے ساتھ اپنے بچاؤ کی تدبیریں مناسب حد تک کرنی چاہئیں، یہ تدبیریں بدرجۂ اسباب ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے واسطے سے انسانوں کی اور مالوں کی حفاظت فرماتے ہیں، ظاہری تدبیریں تو یہ حکومتی انتظامات ہیں، جن کی ناکامی یا حکومت کی بدنیتی کا ہم آئے دن مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، اور اس کے علاوہ ظاہری تدبیریں جو شرعاً محمود ہوں، اختیار کی جائیں، لیکن ان سے پہلے وہ باطنی اور روحانی

تدبیریں عمل میں لائی جائیں، جن کے ذریعے ہم خود اور ہماری ملکیتیں اللہ کی حفاظت میں آجائیں۔

مال کے سلسلے میں اس کی آمد وخرچ پر نگاہ رکھی جائے، آمدنی پاک ہو، شرعی قانون اور دستور کے مطابق ہو، اور خرچ وہیں کیا جائے جہاں وہ مباح ہو، ناجائز امور سے پرہیز کیا جائے، بالخصوص زکوٰۃ جو ایک شرعی فریضہ اور دین کی پانچ بنیادوں میں ایک اہم بنیاد ہے، اس کا پورا اہتمام کیا جائے، جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی جاتی ہے، وہ سرکاری طور پر یعنی اللہ کی سرکار میں محفوظ ہوجاتا ہے، اب اس میں نقصان کا اندیشہ بہت کم ہوجاتا ہے، حساب کرکے پائی پائی زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے۔ پھر مال اللہ کی ضمانت اور حفاظت میں آجاتا ہے، حدیث شریف میں آیا ہے، جس مال میں زکوٰۃ کا مال غلط طور سے شامل ہوجاتا ہے وہ مال معرض ہلاکت میں آجاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ صبح وشام قرآن وحدیث میں واردشدہ دعاؤں کے پڑھنے کا اہتمام کیا جائے، کتنی بلائیں ان دعاؤں کی برکت سے اللہ تعالیٰ دفع فرماتے ہیں، اللہ کا نام بہت بڑا اور بہت بابرکت ہے، اس نام کو ہم بھول جاتے ہیں تو طرح طرح کی بلائیں اترتی رہتی ہیں۔ اگر ان دعاؤں اور وظائف کو عمل میں لایا جائے تو انشاء اللہ بلاؤں سے حفاظت ہوگی۔ (ماہنامہ ضیاء الاسلام، اپریل ۲۰۰۲ء کے شمارے میں ص: ۶۔۷ پر اس موقع پر پڑھی جانے والی بہت ساری دعائیں مع ترجمہ کے لکھ دی گئی ہیں، وہاں دیکھ لیا جائے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی علیہ لرحمہ

وفات: ۴؍اپریل ۲۰۰۲ء

مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ بہت عرصہ سے صاحبِ فراش تھے، صحت ومرض کی کشمکش بہت دنوں سے چل رہی تھی، ڈاکٹروں کی ٹیم اور دواؤں کے ہجوم کے درمیان ہر ممکن کوشش کی جارہی تھی کہ قاضی صاحب بیماریوں سے شفا پائیں اور صحت مند ہوکر شفاخانے کی قید وبند سے آزاد ہوکر علم وعمل کے ان میدانوں میں پھر نزول فرمائیں، جن کی رونق ان کے دَم سے تھی، لیکن بیماریاں تھیں کہ ان کا گھیرا سخت ہوتا جارہا تھا، قاضی صاحب کی ہمت مردانہ تھی کہ اس ضعف وعلالت اور تکلیف ونقاہت کے درمیان بھی علمی سرگرمیوں میں مصروف تھے، بدن تو نحیف ونزار تھا مگر حوصلہ بہت بلند تھا، لیکن آخر یہ کمزور وناتواں بدن، اس حوصلۂ بلند کا کہاں تک ساتھ دیتا۔ ۴؍اپریل ۲۰۰۲ء بروز جمعرات کو اس حوصلۂ بلند نے جسد کمزور کو الوداع کیا، اور روح کے کاندھوں پر سوار ہوکر عالم بالا میں پرواز کرگیا۔ اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون

نہ کسی کو یہاں رہنا ہے، نہ کوئی رہا ہے، ہر ایک کا آنا درحقیقت جانے کی تمہید ہے، نہ پہلے سے آنے کا وقت معلوم ہوتا، اور نہ جانے سے پہلے جانے کا وقت کوئی جانتا۔ ”آمد“ اور ”رفت“ کے درمیان ایک مبہم اور مجہول وقت متعین ہوتا ہے، اللہ اسے جانتا ہے، اس وقت کو کام میں لانا ہے، خوش نصیب ہے وہ بندہ جو اسے کارآمد بنائے، اور محروم ہے، وہ غلام جو اسے ضائع کردے، اللہ کے پیغامبر دنیا میں تشریف لائے، تاکہ انسانوں کو سکھائیں کہ یہ وقت کیونکر کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے

سکھایا، سیکھنے والوں نے سیکھا، اور پھر اس وقت کو اسی طرح برتا جیسا انھوں نے سکھایا تھا۔ یہ لوگ جب پیدا ہوئے تھے، تو کوئی نہیں جانتا تھا، لیکن جب وقت کا حق ادا کر کے چلے تو دھوم مچ گئی زمین تو زمین، آسمان بھی رو پڑا۔

قاضی صاحبؒ اللہ کے ایسے ہی بندے تھے، جب ضلع دربھنگہ کے گاؤں ''جالے'' میں ۱۹۳۶ء میں انھوں نے عالم وجود میں قدم رکھا تھا تو کون جانتا تھا کہ یہ ننھا منا بچہ کتنی زندگی پائے گا، اور جو زندگی پائے گا، اس میں کیا مقام حاصل کرے گا پھر عمر کا کارواں بڑھتا گیا دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی، باصلاحیت، ذی استعداد، محبت کوش، فرمانبردار اور ذہین طالب علم کی حیثیت سے جانے گئے، دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کے فیضِ درس اور فیضِ صحبت سے سرفراز ہوئے، ۱۹۵۵ء میں بخاری شریف کا آخری سبق پڑھ کر اس بابرکت اور عظیم درسگاہ سے امتیاز کے ساتھ فراغت حاصل کی، امیرِ شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نوراللہ مرقدہٗ کی نگاہِ مردم شناس ان پر پڑ چکی تھی، ان کی ہمت عالی انھیں کہیں اور لے جانے کیلئے پَر تول رہی تھی، مگر امیر شریعت کی منشاء نے انھیں جامعہ رحمانیہ مونگیر میں خود امیر شریعت کی صحبت و معیت میں پہونچادیا، اور پھر وہاں سے جو درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا، تو دنیا دیکھتی رہی، پہچانتی رہی، چھوٹے سے بدن میں بھری ہوئی ہمت مردانہ پر چونکتی رہی۔ کاموں کا دائرہ پھیلتا رہا، علماء و دانشوران، ان کے اردگرد سمٹتے رہے، کہیں اتفاق کہیں اختلاف کا قضیہ چلتا رہا، علماء کے حلقے سے لے کر عوام تک، علم و تحقیق کے مرغزار سے لے کر ملی و ملکی خارزار تک کون سی وہ جگہ ہے، جہاں قاضی مجاہدالاسلامؒ کے نقوشِ قدم نمایاں نہیں ہوئے، امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ، فقہ اکیڈمی، مسلم پرسنل لا بورڈ، ملی کونسل، فقہی سیمیناروں کا سلسلہ، مختلف اداروں کی سرپرستی و رکنیت، وفاق المدارس الاسلامیہ، ہر

محاذ پر جو نام جانا پہچانا بے تکلف زبان و قلم پر آتا، وہ قاضی صاحب کا نام تھا۔ بالآخر ۴/اپریل ۲۰۰۲ء کو جب انھوں نے آخری سانس لی ہے تو ہر محاذ اداس ہوگیا، ہر میدان میں ایک سناٹا سا محسوس ہوا۔ ہر جگہ کمی محسوس ہوئی۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

قاضی صاحب ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے، ان کے اوصاف عالیہ پر بہت سے لوگ لکھیں گے، جنھوں نے انھیں قریب سے دیکھا ہے ان کی صحبت میں رہے ہیں، وہ بہتر لکھیں گے۔ اور بہت سے لوگ لکھ بھی چکے ہیں۔ ان حروف کا لکھنے والا ان سے قریب نہیں رہا، وہ بہت بڑے تھے، یہ بہت چھوٹا ہے، بڑوں کے سامنے جانے سے ڈرتا ہے، دور سے نظارہ کرتا رہا، مرعوب ہوتا رہا۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ میرا ان سے پہلا سابقہ اختلاف رائے ہی کے ساتھ ہوا۔ میرا منہ ہرگز نہیں ہے کہ میں ان سے اختلاف رائے کا دعویٰ کروں، بات یہ ہے کہ جن اکابر کی صحبت میں مجھے زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ اور جن کے تدیُّن و تفقہ پر مجھے آغازِ شعور سے اعتماد و اطمینان رہا، میں نے دیکھا کہ انھوں نے قاضی صاحب کی بعض رایوں سے اختلاف کیا، ان رایوں میں بالکل ظاہر ہے کہ میں دیانۃً انھیں برحق سمجھتا ہوں، بس میں نے اپنے اکابر کی رائے کی حمایت اور وکالت کی، اس کے نتیجے میں حضرت قاضی صاحب سے اختلاف کا ظہور ہوا۔

مسائل و معاملات میں علماء کے درمیان اختلاف کا ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے، لیکن اختلاف کو اس کے حد پر رکھنا، اس میں حدود سے تجاوز نہ کرنا بشری کمزوری پر ایک ایسی فتح ہے، جس کی داد امید ہے کہ خدا کے دربار سے ضرور ملے گی، یہی چیز دیانت کو نفسانیت سے ممتاز کرتی ہے، قاضی صاحب...... میرے تجربہ میں......اس وصفِ عالی کے سرمایہ دار تھے، ان سے، ان کی رایوں سے، ان کے طریقۂ عمل سے

یقیناً اختلاف کیا گیا ہے، علمی اعتبار سے بلند قامت ہستیوں نے بھی ان پر نکتہ چینی اوران کے طریقہ کار پر گرفت کی ہے، اور ہم جیسے کوتاہ قامت بلکہ بے قامت افراد نے بھی نقطۂ اختلاف پر قلم رکھا ہے۔ لیکن دور ونزدیک، معتبر اور نامعتبر کسی طریقے سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ انھوں نے اختلاف کرنے والوں کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ کہا ہو، کیا ٹھکانا تھا، ان کی وسعتِ ظرف کا!

قاضی صاحب کے متعلق جن لوگوں نے لکھا ہے، انھوں نے یہ بات لکھی ہے کہ وہ اتحاد ملت کے زبردست داعی تھے، ان کا دل اس جذبہ سے لبریز تھا کہ مسلمانوں کو ایک وحدت میں پرُو دیں، جس وحدت کا قرآنی نام ''امت'' ہے، مسلمان فرقہ بندیوں سے اوپر اٹھ کر ''امت'' کے شیرازہ میں ایک لڑی بن کر رہیں۔ قاضی صاحب کا یہ فطری جذبہ تھا، اسی لئے، ان میں اختلاف کو برداشت کرنے، بلکہ اسے گوارا کرنے کا حیرت انگیز حوصلہ تھا، اور یہی وہ جذبۂ خلوص ومحبت تھا کہ جس نے مختلف المزاج اور مختلف الخیال علماء کو ان کے گرد جمع کر دیا تھا اور وہ سب سے کام لیتے تھے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ میرا ان سے پہلا سابقہ اختلاف سے ہوا۔ انھوں نے ایک فقہی مسئلہ پر مبسوط مقالہ لکھا تھا، جس کے بنیادی نقطۂ نظر سے ایک بڑے عالم کو اختلاف تھا، وہ خود صاحبِ قلم نہ تھے، انھوں نے مجھے حکم دیا کہ اس مسئلہ پر لکھو، میں نے اس کے رد میں ایک مفصل مضمون لکھا، وہ قاضی صاحب نے بھی پڑھا، اس میں کہیں کہیں لہجہ میں شوخی آ گئی تھی، ایک صاحب نے جو میرے خاص دوستوں میں ہیں، نقل کیا کہ قاضی صاحب اس مضمون کی تحسین کر رہے تھے، البتہ لب ولہجہ کی شوخی کی ہلکی سی شکایت کر رہے تھے، میں یہ سن کر بہت شرمندہ ہوا، اس واقعہ کے چند ہی روز بعد ڈیری اون سون کے ایک جلسہ میں قاضی صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا، میں تو شرم سے گڑا جا رہا تھا، مگر قاضی صاحب نے اشاروں کنایوں میں بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا، اطمینان سے بیٹھ کر میری تقریر سنی، اس وقت پہلے فقہی سیمینار کی تاریخ متعین ہو چکی تھی، مجھے حکم دیا کہ اس میں حاضر ہوں، ان تاریخوں میں میرے سر پر بعض ناگزیر مشغولیتیں تھیں، میں نے عذر کرنا چاہا، مگر قاضی صاحب کی گفتگو، ان کا جذبۂ دل ان کے حکم دینے کا انداز ایسا نہ تھا کہ اسے آسانی سے کوئی ٹال دے، میں نے ہاں کر لی، اور کسی نہ کسی طرح سیمینار میں پہونچ ہی گیا، قاضی صاحب مجھے دیکھ کر حد درجہ خوش ہوئے، اور ایسے ایسے انداز سے انھوں نے مسرت کا اظہار کیا کہ میں حیرت میں پڑ گیا کہ مجھ جیسے معمولی فرد کی شرکت سے اتنے بڑے لوگ بھی اس طرح خوش ہوتے ہیں؟

فقہی سیمینار میں شرکت تو میں نے کر لی، لیکن بعض حالات کی وجہ سے میں نے اس سے اپنے لئے کنارہ کشی ہی بہتر سمجھی۔

اعظم گڈھ شہر میں پانچواں فقہی سیمینار ہوا، اس میں انشورنس کے متعلق ایک ایسا فیصلہ کیا گیا جو اکابر علماء کے نزدیک صحیح نہ تھا، اس وقت اس کے رد وانکار میں مجلّہ ''المآثر'' میں حضرات اکابر کی تحریریں شائع ہوئیں، اس خاکسار نے بھی بحیثیت مدیرِ تحریر اس کی تردید میں کچھ لکھا، مگر اس کے بعد بھی قاضی صاحب جب ملے، اسی محبت اور شفقت سے ملے۔

قاضی صاحب کی شخصیت بڑی دلآویز تھی، میرا جی چاہتا ہے کہ انھیں ''موہنی شخصیت'' لکھوں، اگرچہ یہ لفظ اس باعظمت شخصیت کے سامنے ہلکا سا معلوم ہوتا ہے، مگر میرا تاثر یہ ہے کہ ان کی عظمت، ان کی ''موہنی شخصیت'' کے بعد ہے، میں نے محسوس کیا اور شدت سے محسوس کیا کہ تحریر میں ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر دو بدو ان کے سامنے بھی ان سے اختلاف کر سکتا ہوں، یہ شاید مجھ سے کبھی نہ

ہو سکے، اس میں ان کی قوت استدلال، مہارت تکلم اور ان کی ذکاوت ذہانت سے مرعوبیت کا دخل نہیں ہے، بلکہ ان کی ’’موہنی شخصیت‘‘ کے سامنے بلا مقابلہ سپر انداز ہونے کا معاملہ ہے۔

یہاں ایک حوالہ ذرا بے محل سا معلوم ہوا تا ہے، مگر قاضی صاحب کے اس وصف کو سمجھانے کیلئے بروقت میرے سامنے اس سے بہتر مثال نہیں ہے، اس لئے قارئین سے معذرت کے ساتھ اس حوالہ کو نقل کرتا ہوں۔

پروفیسر کلیم عاجز صاحب بہار کے ایک منفرد شاعر ہیں، ان کی شاعری کا آہنگ اتنی ندرت رکھتا ہے کہ وہ اپنے رنگ میں ہر ایک سے منفرد ہیں، ان کی شاعری کے متعلق فراقؔ گورکھپوری نے اپنے تاثرات لکھے ہیں، اس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو۔

> ’’کلیم عاجز صاحب اپنی شاعری اور اپنی آواز سے ہزاروں لاکھوں سننے والوں کا من موہ لیتے ہیں، یہ ایک خطرناک خوبی ہے، رام سے راون نے جب لڑائی ٹھان لی تو یہی دعا مانگی کہ مجھے رام کو دیکھ کر محبت نہ پیدا ہو جائے، اس لئے پھر میں ان سے کیسے لڑوں گا؟ کچھ ایسا ہی ’’بسی کرن‘‘ کلیم عاجز صاحب کی شاعری میں پایا جاتا ہے‘‘

میرا احساس ہے کہ کچھ ایسا ہی ’’بسی کرن‘‘ قاضی صاحب کی شخصیت میں بھی پایا جاتا تھا، ان کے سامنے لڑنا تو درکنار، ان کی موجودگی میں متحارب گروپوں کا باہم بھی لڑنا مشکل ہوتا تھا، فقہی سیمیناروں میں متعدد بار ایسا منظر سامنے آیا کہ مختلف الخیال علماء آپس میں ٹکرا جائیں اور مجلسِ مذاکرہ دیکھتے ہی دیکھتے مجلس مناظرہ بلکہ مجلس محاربہ میں تبدیل ہو جائے۔ مگر قاضی صاحب اپنی جگہ سے جنبش کرتے، ان کی گفتگو شروع ہوتی، منہ سے الفاظ وکلمات نہیں پھول جھڑتے، نہ جوش، نہ جذبات، ایک دھیمی سی سُر میں قاضی صاحب کچھ فرماتے جاتے اور جوش وجذبہ اور سخت تکرار کی آگ ٹھنڈی پڑتی چلی جاتی۔

قاضی صاحب بڑے عالم تھے، بہت بڑے فقیہ ومفتی تھے، اس پر لوگ خوب لکھیں گے، مگر قاضی صاحب کچھ اور بھی تھے، وہ ایک بلند پایہ انسان تھے۔ حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی علیہ الرحمہ کے انتقال کے دوسرے دن میری حاضری ہتورا میں ہوئی، حضرت قاضی صاحب بھی موجود تھے، رات میں حضرت قاضی صاحب کی تقریر تھی، تقریر کیا تھی بزرگوں کی عظمت ومحبوبیت کی ایک منہ بولتی تصویر تھی۔ انھوں نے حضرت قاری صاحبؒ کا ایک خاص وصف یہ بیان کیا کہ وہ دنیا کی اس مختصر زندگی میں دین سے متعلق ہر کام بہت جلد کر ڈالنا چاہتے تھے کہ بعد میں معلوم نہیں یہ مہلت ملے یا نہ ملے، انھیں وقت کی قیمت کا اتنا احساس تھا کہ بایدوشاید!

قاضی صاحب نے اپنی مسلسل علالت کے دوران خود کو جس طرح بعض اہم علمی مہمات میں مشغول رکھا تھا، اس کی داستان سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے، چنانچہ اس علالت کے دوران انھوں نے بہت سے اہم علمی اور عملی منصوبے پورے کیئے۔

ان کی زندگی ایک ہمہ جہت زندگی تھی، اس میں بعد والوں کے لئے بہت کچھ سبق ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں، ان کی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف فرمائیں، محنت ومشقت کی، علمی وعملی تگ ودَو کی، اور ساتھ ہی ساتھ ضعف وعلالت کی بہت تکلیفیں جھیلی ہیں، ہر تکلیف آخرت میں ان کے لئے راحت کا سامان ہو۔

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

☆☆☆☆☆☆☆☆

اہلیہ مکرمہ حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہٗ

وفات: ۱۳؍جولائی ۲۰۰۲ء

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ مطابق ۱۳؍جولائی ۲۰۰۲ء بروز ہفتہ علی الصباح فون کی گھنٹی بجی، فون اٹھایا تو جامع مسجد گورکھپور کے امام وخطیب جناب مولانا قاری عبدالجلیل صاحب بول رہے تھے، انھوں نے کہا کہ الہ آباد حضرت آپا صاحبہ کا...... اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئے اور میری زبان سے بے ساختہ نکلا کہ انتقال ہوگیا، بولے جی ہاں! تین بجے شب میں خبر آئی، **إنا لله وإنا إليه راجعون**، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں، جنت الفردوس عطا فرمائیں۔

یہ حضرت آپا صاحبہ بلکہ میری زبان میں خالہ صاحبہ، حضرت صفیہ خاتون ہیں، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی بڑی صاحبزادی، حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہٗ کی اہلیہ مکرمہ، عزیزان گرامی مولانا احمد متین ومولانا احمد مکین ومولانا محمد امین سلّمہم کی والدہ محترمہ! حافظِ قرآن، عابد وزاہد، شفیق ومہربان، پورے خاندان پر رحمتِ الٰہی کا سایہ، حضرت مصلح الامت کی شانِ تربیت کا ایک دلآویز نمونہ! یہ خاکسار بندہ، ان کے سایۂ عاطفت میں چار سال رہا، میں بھی رہا، میرے اہل وعیال بھی رہے، میں بھی میرے بال بچے بھی ان کی محبت وشفقت کے مسلسل مورد رہے، حضرت مصلح الامتؒ نے جو مکان وراثت میں اپنی صاحبزادیوں کیلئے چھوڑا تھا، وہ بہت وسیع تھا، اس کے ایک گوشے میں، میں اپنے چھوٹے سے خاندان سمیت مقیم تھا۔ مدرسہ میں پڑھاتا تھا، میری رہائش گاہ کا ایک دروازہ اس مکان کے صحن میں کھلتا تھا جس میں خالہ صاحبہ کی سکونت تھی، میں درسگاہ میں چلا جاتا، تو میرے بچے اور میری اہلیہ سب کی دلجوئی اور خبر گیری کرتیں، اور اولاد کی طرح معاملہ کرتیں، ہر دکھ درد کی خبر رکھتیں، ہماری خوشی سے خوش ہوتیں، اور ہماری تکلیف سے دل گیر ہوتیں، تکلیف کو دور کرنے کی تدبیریں کرتیں، میرے گھر والوں کے ساتھ، میری صحت وعافیت کا بہت اہتمام کرتیں، ان کی مہربانی وشفقت کا انداز میرے دل سے کبھی محو نہیں ہوسکتا، عجیب وغریب انداز! حضرت مصلح الامت قدس سرہٗ کے انداز شفقت کی یاد دلانے والا۔

یہ ۱۳۹۸ھ یا ۹۹ھ کی بات ہے، انگریزی ۱۹۷۸ء یا ۷۹ء رہا ہوگا، میری صحت الحمد للہ اچھی تھی، البتہ میں دبلا پتلا تھا، جسم ہڈی اور چمڑے کا ایک پنجر تھا، عمر یہی کوئی ۲۷، ۲۸؍سال تھی، ایک مرتبہ حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہٗ نے اہتمام سے اپنی بارگاہ میں طلب فرمایا، میں سمجھ گیا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے، ورنہ حضرت عموماً طلب نہیں فرمایا کرتے تھے، بلکہ کسی وقت حاضری ہوتی تو ارشاد فرماتے یا جلدی کا کام ہوتا تو خود تکلیف فرماتے، آج طلب فرمایا تو میں ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا! مجھ سے مواخذہ کے انداز میں قدرے سخت لہجہ میں فرمایا کہ آپ اتنے دبلے کیوں ہیں؟ میں چکرا گیا، کوئی معقول جواب نہ بن پڑا، پھر خود ہی فرمانے لگے کہ آپ تنخواہ کی رقم طلبہ میں تقسیم کردیتے ہیں، اپنے کھانے پینے کا اہتمام نہیں کرتے، گھر والوں کا بھی خیال نہیں رکھتے، میں معذرت کررہا تھا، فرمایا کوئی معذرت نہیں، اب سے تنخواہ آپ کو نہیں دی جائے گی، ہمارے گھر میں اب آپ کی تنخواہ ملے گی، وہ اپنی منشاء کے مطابق آپ کے کھانے پینے کا انتظام کریں گی۔ آپ کو ہلکا پھلکا جیب خرچ مل جایا کرے گا، میں خوشی میں ڈوب گیا، اور محبت کے تاثر نے آنکھوں میں آنسو چھلکا دیا، میں خوشی خوشی آیا، اور اپنے گھر والوں کو بشارت

سنادی، وہاں معلوم ہوا کہ خالہ کئی روز سے اس کا تذکرہ کر رہی تھیں کہ فلاں کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ تنخواہ جو ملتی ہے، اِدھر اُدھر خرچ ہو جاتی ہے، کھانے پینے کا اہتمام نہیں ہوتا۔ اب اندازہ ہوا کہ یہ کاروائی پسِ پردہ سے منصۂ شہود پر آئی تھی، چنانچہ اس پر عمل شروع ہو گیا، جو کچھ ابھی تک میں نے کبھی نہیں چکھا تھا، وہ سب کچھ ملنے لگا، صبح کے ناشتہ کا خاص اہتمام تھا، تنخواہ میری بہت کم تھی، اس میں یہ اہتمام کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس بڑا حصہ حضرت خالہ صاحبہ اپنی جیب سے پورا کرتی تھیں، یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا، اور میرے جسم کا حلیہ اسی وقت سے بدلنے لگا، تھوڑے ہی دنوں میں میرے بدن پر فربہی چھا گئی، میری صحت کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو پانچ چھ ماہ کے بعد میری تنخواہ پھر میرے ہاتھ میں آنے لگی، اس وقت سے اب تک جسم پر لاغری کا تسلط کبھی نہیں ہوا۔

وہ دور میرے اوپر تنگی کا تھا، کھانے پینے کا تو وہ حال تھا، جو ذکر ہوا، کپڑے اور لباس کا بھی ایسا ہی حال تھا کہ نہایت معمولی اور سستا کپڑا ہم لوگوں کے بدن پر ہوتا۔ ایک دن انھوں نے ارشاد فرمایا کہ عائشہ کی ماں کے پاس، کوئی اچھا کپڑا نہیں ہے، اب عید کا کپڑا میں منگواؤں گی، چنانچہ انھوں نے دو جوڑے بہت عمدہ کپڑوں کے تیار کرائے، اور چھوٹی خالہ صاحبہ نے اعلیٰ قسم کی چوڑیاں پہنائیں، اور یہ سب شعبان کی تعطیل سے پہلے انتظام کر دیا، تعطیل میں نہایت خوشی خوشی گھر کیلئے رُخصت کیا، یہ دونوں جوڑے بہت بابرکت ثابت ہوئے، بہت عرصہ تک رہے، وہ انھیں پہنے دیکھتیں تو بہت دعائیں دیتیں اور خوش ہوتیں، ان کی دعاؤں اور توجہ کا اثر یہ ہوا کہ گو ویسے عمدہ جوڑے تو اب تک نصیب نہ ہو سکے اور نہ اتنی مدت تک کوئی کپڑا استعمال میں رہا، لیکن بہر حال اچھے کپڑوں کا تسلسل آج تک قائم ہے۔

جب بمبئی کا سفر ہوتا، تو میرے لئے میرے گھر والوں کیلئے ضرور تحفے لاتیں،

اللہ تعالیٰ نے بڑا دل عطا فرمایا تھا، حافظ قرآن تھیں، خانقاہ میں صبح کے وقت موسم کے لحاظ سے آٹھ نو بجے سے حضرت قاری صاحب مدظلہٗ کی مجلس ہوتی تھی، اس میں پردے کا انتظام ہوتا، ایک گھنٹہ مجلس ہوتی، اس کے بعد تلاوت میں مشغول ہو جاتیں اور دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا، بہت پارسا اور عبادت گزار خاتون تھیں، مغرب کی نماز کے بعد دیر تک تقریباً عشاء کی نماز تک اوراد و اذکار میں مشغول رہتیں۔

عرصہ سے صاحب فراش تھیں، کچھ دن پہلے غالباً ان کے فرزند مولانا احمد متین سلّمہٗ سے فون پر بات ہوئی تھی، اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھیں، بالآخر وقت موعود آ پہونچا، جس سے دنیا میں کسی آنے والے کو مفر نہیں، روح عالم بالا کی مخلوق تھی، جسم کو چھوڑ کر حضور حق میں پہونچ گئی، اور جسم کو اس کی اصل یعنی خاک میں چھپا دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائیں، حسن ظن تو یہی ہے کہ برگزیدہ اور صاحب نسبت والد گرامی علیہ الرحمہ کی روح اپنی صاحبزادی کو پا کر بہت خوش ہوئی ہوگی۔ حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہٗ کی چار صاحبزادیاں تھیں، ان میں پہلی صاحبزادی یہی بزرگ خاتون تھیں، ان کے بعد کی دو صاحبزادیاں حضرت کی حیات ہی میں وفات پا گئیں، چوتھی اور چھوٹی صاحبزادی ماشاء اللہ سلامت با کرامت ہیں، ان کی شفقتیں بھی اس خاکسار اور اس کے اہل خاندان پر بہت تھیں، سب صاحبزادیاں بہت چھوٹی تھیں کہ ان کی والدہ مکرمہ، اہلیہ حضرت شاہ صاحبؒ کا انتقال ہو گیا تھا، حضرت شاہ صاحبؒ نے بنفس نفیس سب کی پرورش کی، اور اس باب میں ان کی دست و بازو یہی بڑی صاحبزادی رہیں، حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ ممنونیت کے ساتھ اس کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ اب گھر کا یہ سایۂ رحمت اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو ہمیشہ رحمت و کرم کے سایہ میں رکھے۔ آمین

حافظ محمد ابراہیم صاحب علیہ الرحمہ (کلکتہ)

وفات: ۲۰/ جولائی ۲۰۰۲ء

حافظ محمد ابراہیم صاحب کا ۲۰/ جولائی کو کلکتہ میں دل کے ایک دورے میں انتقال ہوگیا۔ **إنا للہ وإنا إلیہ راجعون**، حافظ صاحب کلکتہ میں میرے میزبان تھے، میں ہندوستان کے اس بڑے شہر میں انھیں کی دعوت پر ۱۹۸۲ء میں پہلی مرتبہ گیا تھا، اس وقت سے تعلقات وروابط جو استوار ہوئے ہیں تو ان کے حسن اخلاق کی کشش ہر سال کلکتہ لے جاتی رہی، حافظ صاحب منصب کے لحاظ سے نارکل ڈانگہ کلکتہ کی جامع مسجد کے مؤذن تھے۔ جہاں انھوں نے تقریباً چالیس سال بغیر انقطاع کے مسلسل یہ خدمت انجام دی، لیکن فی الحقیقت وہ اس مسجد کے ایک اہم ذمہ دار اور اس علاقہ کے غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کے سرپرست تھے، بہت مہربان اور شفیق سرپرست!

ان کی مسجد مسافروں، غریبوں اور مسکینوں کا ایک بہترین ٹھکانا تھی، جان پہچان والا ہو یا انجانا، جو ان کی خدمت میں پہنچ گیا، وہ ان کا مہمان ہے، کھانے پینے سے لے کر اس کی تمام ضروریات تک کی فکر اپنے اوپر اوڑھ لیتے تھے، اور اس طرح اوڑھتے کہ کسی کو احساس نہ ہوتا کہ یہ کسی کی فکر اپنے اوپر اوڑھے ہوئے ہیں، کلکتہ میں ان کا سب سے قابل اطمینان ٹھکانا انھیں حافظ صاحب کی خدمت میں ہوتا، اور یہ ہر ایک سفیر کی نہایت خوش دلی کے ساتھ ضیافت کرتے، چندے کے لئے اس کی رہنمائی کرتے، اس کی سحری وافطاری کا اہتمام کرتے، سب کی رقمیں بطور امانت کے اپنے پاس محفوظ رکھتے، اور جاتے وقت ایک ایک پیسہ نہایت دیانتداری کے

ساتھ واپس کرتے۔

کتنے طالب علموں، بیواؤں اور مسکینوں کے لئے ان کی طرف سے ماہانہ وظیفہ مقرر تھا، جسے نہایت خاموشی سے دیا کرتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہوتی، مرنے کے بعد ایسے بہت سے لوگوں کا علم ہوا جو ان کے فیض کرم کے دامن سے وابستہ تھے۔

ان کے پاس ایسے لوگوں کی بہت پوچھ تھی جنھیں کوئی نہیں پوچھتا، اس سلسلے میں غیر مسلم بھی ان سے بہت استفادہ کرتے، غریب لوگ اپنے مشکلات میں ان کی طرف رجوع کرتے، وہ دعا سے، تدبیر سے ہر ایک کی مدد کرتے، کوئی بیمار ہے، اور علاج کا انتظام نہیں ہے تو حافظ صاحب اس کے علاج کی ذمہ داری لئے ہوئے ہیں، کوئی پریشان حال ہے، اس کے لئے جدوجہد کررہے ہیں، کوئی طالب علم پڑھنے کا شوقین ہے مگر انتظام نہیں ہے اس کا انتظام کررہے ہیں، اور سب کچھ وہ اس طرح کررہے ہیں جیسے وہ کوئی خاص کام نہ کررہے ہوں۔

کلکتہ ہندوستان کا بہت بڑا تجارتی شہر ہے، ہر طرف مال کی بہتات ہے، مگر وہ غریب بن کر رہے، اپنی اولاد کو بھی ایسا ہی رکھا، اگر وہ چاہتے تو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوا کر انھیں بڑے عہدوں اور منصبوں تک پہونچا دیتے، مگر وہ دیندار تھے، خاص دیندار، ان کے چار بیٹے ہیں، چاروں کو حافظ قرآن بنایا، تین ان میں سے دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں، چوتھے کو بھی اسی لائن پر لگا رکھا ہے، اور سب کو دین ہی کی خدمت میں لگایا۔ بڑے صاحبزادے مولانا حافظ ابوذر صاحب سلّمہٗ مہاراشٹر میں ''پانڈرکوڑہ'' میں وسیع پیمانے پر دینی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ دوسرے صاحبزادے مولانا حافظ ابوالخیر صاحب سلّمہٗ نے کچھ عرصے تک مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں تدریسی خدمات انجام دیں، اور کافی عرصہ سے تیلنی پاڑہ ضلع ہگلی بنگال میں ایک مدرسہ کے ذمہ دار ہیں، والد کے انتقال کے بعد حالات کچھ ایسے ہیں کہ

کلکتہ میں ان کا قیام ناگزیر ہے، تیسرے صاحبزادے مولوی حافظ محمد عارف باللہ سلّمہٗ والد کی جگہ پر مسجد کی خدمت پر متعین کئے گئے ہیں۔ چوتھے صاحبزادے حافظ محمد اطہر سلمہٗ زیر تعلیم ہین، ماشاء اللہ جس رنگ میں خود رہے، بچوں کے لئے بھی وہی رنگ پسند کیا، ان کی دنیا کی فکر کبھی نہیں کی، البتہ آخرت کی سنوارنے کا پورا اہتمام کیا

میرا تعلق انھیں صاحبزادوں کے واسطے سے ان کے ساتھ استوار ہوا۔ انھیں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ ان کے سب بچے میرے ہی پاس تعلیم حاصل کریں، چنانچہ مولانا ابوذر وابوالخیر تو مدرسہ دینیہ غازی پور میں میرے ساتھ رہے اور متوسطات تک تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند گئے اور مولوی عارف باللہ نے شیخوپور میں تعلیم حاصل کی، اور دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، عزیزم حافظ محمد اطہر کے سلسلے میں بھی وہ اسی کے لئے کوشاں رہے کہ شیخوپور میں تعلیم حاصل کریں، مگر تقدیر انھیں دوسری جگھوں پر لے گئی، اللہ تعالیٰ ان کی تعلیم کی تکمیل فرمائیں۔ آمین

حافظ صاحب مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان تھے، اس مختصر تحریر میں سب کو سمیٹنا مشکل ہے، ارادہ ہے کہ ان پر ایک مفصل مضمون لکھوں، ان کی زندگی بہتوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

۲۱؍جولائی اتوار کو بعد نماز ظہر ایک بہت بڑے مجمع نے ان کی نماز جنازہ ادا کی، اور کلکتہ کے مشہور قبرستان ’’باگماری‘‘ میں مدفون ہوئے، میں وقت پر نہ پہونچ سکا، ۲؍اگست جمعہ کو عزیزم مولانا ضیاء الحق خیرآبادی سلّمہٗ مدیر ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور اور فرزند عزیز حافظ محمد عادل سلّمہٗ کے ہمراہ کلکتہ حاضر ہوا، سب صاحبزادگان اور دامادوں مولانا شرافت ابرار صاحب سلّمہٗ صدر مدرس مدرسہ بیت العلوم راجہ بازار کلکتہ وامام وخطیب جامع مسجد نارکل ڈانگہ اور حافظ شمشیر عالم سلّمہٗ مؤذن مسجد محلّہ تپسیا کلکتہ سے ملاقات ہوئی، تعزیت تو پہلے ہی کر چکا تھا، قبر پر حاضری دی، ایصال ثواب کیا، دعاء مغفرت کی، اللہ تعالیٰ انھیں بہترین اجر عطا فرمائیں، اوران کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرما کر ان کے لئے راحت روح کا سامان بنائیں، پس ماندگان میں چار صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہیں، اور پوتوں اور نواسوں کا یک مجمع ہے اور ماشاء اللہ سب دینداری کی راہ پر لگے ہوئے ہیں۔

(ماہنامہ ضیاء الاسلام ستمبر ۲۰۰۲ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۴۲۳ھ)

☆☆☆☆☆☆☆

بابو عزیز الرحمٰن صاحب علیہ الرحمۃ

امام ومتولی جامع مسجد اعظم گڑھ

وفات: ۲۶/ رمضان ۱۴۲۳ھ

بابو عزیز الرحمٰن صاحب ایک معصوم صفت شخصیت کا نام ہے، جن کی نیکی، جن کے تقویٰ وطہارت، جن کی نزاہت وشرافت اور جن کی پاکیزگیٔ نفس کی شہادت ہر وہ شخص دیتا ہے، جس کا ان سے کچھ بھی سابقہ رہا ہو، وہ نرمی، وہ تواضع، وہ مسکنت وہ خشیت خداوندی جوان کے پورے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ان کی شخصیت کو محبوبیت کا لباس پہنا رکھا تھا، وہ اعظم گڑھ کے شبلی اسکول میں انگریزی اور تاریخ کے ماسٹر تھے، مگر اسکول کے علاوہ اوقات میں تلاش کئے جاتے تو خانۂ خدا ہی میں ملا کرتے تھے۔ انہیں ڈھونڈھنے والا انہیں مسجد ہی میں پاتا۔ عجب محبوب اور دلنواز شخصیت تھی۔

میں نے پہلی بار انہیں اپنے استاذ محترم حضرت مولانا افضال الحق قاسمی مدظلہ کی خدمت میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں دیکھا۔ یہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے، میں اس وقت وہاں مدرس تھا، حضرت الاستاذ بھی وہیں تھے، میں حاضر ہوا تو حضرت مولانا نے تعارف کرایا اس وقت مجھے عجیب سا لگا کہ ایک انگریزی ماسٹر اور اعظم گڑھ شہر کی جامع مسجد کا امام! لیکن ان کے چہرے کا نور، ان کی گفتگو کی نرمی اور ان کی مسکنت وفروتنی سے احساس ہو رہا تھا کہ صاحب دل اور صاحب سعادت ہیں

پھر ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں شیخوپور آیا، تو ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ میرے بہت عزیز اور محترم دوست مولانا عبد الرب اعظمی اور مدرسہ شیخ الاسلام کے ناظم مولانا محمد عارف عمری صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہنے لگے کہ بابو عزیز الرحمٰن صاحب نے جمعیۃ علماء اعظم گڑھ کی ایک میٹنگ بلائی تھی، اس میں انھوں نے فرمایا کہ بہت پہلے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ جب یہاں تشریف رکھتے تھے اور ان کی خدمت میں مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی علیہ الرحمہ رہا کرتے تھے تو مولانا اویس صاحب نے جامع مسجد میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا، لیکن وہ جلد ہی یہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد یہ سلسلہ ایسا بند ہوا کہ اب تک بند ہی ہے۔ اس پر غور کریں کہ درس قرآن کا سلسلہ پھر جاری اور قائم ہو۔ مولانا عبد الرب صاحب نے فرمایا کہ میں نے آپ کا نام لیا، اور ہم لوگ اسی لئے آئے ہیں کہ آپ اس درخواست کو منظور فرمالیں، ہفتہ میں ایک بار اتوار کو اعظم گڑھ چلیں اور بعد نماز مغرب درس قرآن کا اہتمام کریں، مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اس طرح اللہ کی کتاب کا پیغام پہونچانے کا موقع ملا، عام مسلمانوں کو اس سے نفع کثیر کی توقع ہے۔

اس کے بعد کے پہلے اتوار سے درس قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس طرح ہفتہ میں ایک بار بابو صاحب سے ملاقات ہونے لگی اور ہر ملاقات میں ان کی نیکی وسعادت کا نقش دل پر بیٹھتا چلا گیا اور ان کی محبت بڑھتی گئی، وہ میری موجودگی میں نماز نہیں پڑھاتے تھے، کہتے تھے کہ علماء کی موجودگی میں امامت کے لئے مصلے پر جاتے ہوئے شرم آتی ہے، لیکن کبھی کبھی ان کی امامت میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، میں سوچا کرتا تھا کہ انگریزی داں ہیں، انگریزی کے ماسٹر ہیں، نہ جانے قرآن کتنا صحیح پڑھتے ہوں گے، مگر جب انکی قرأت سنی تو ماشاء اللہ عمدہ پڑھتے تھے۔

اب مسلسل ہر ہفتہ اعظم گڑھ حاضری ہونے لگی، اعظم گڑھ شہر کا فاصلہ شیخوپور سے ۱۱ کیلومیٹر ہے، میں شام کو جاتا تو رات میں وہیں رہ جاتا، صبح وہاں سے واپسی ہوتی، ابتداء کے چند سالوں تک قیام اور کھانے پینے کا انتظام مولانا محمد عارف صاحب کے گھر پر ہوتا رہا، مولانا موصوف اور ان کے اہل خانہ بڑی بشاشت سے اس ہفتہ وار مہمان اور اس کے رفقاء کی مہمان نوازی کیا کرتے تھے، اس دوران کبھی کبھی بابو صاحب بھی مدعو کرتے، بابو صاحب کے دسترخوان کی سادگی، بے تکلفی اور محبت بھرے انداز میں کھلانے کی ادا قابل دید تھی۔

پھر چار پانچ برسوں کے بعد خاص سواری سے آنے جانے کا انتظام ہوگیا۔ تو درس کے بعد رات ہی میں واپسی ہونے لگی تو بابو صاحب نے مولانا محمد عارف صاحب سے حق مہمان نوازی مانگ لیا۔ چنانچہ وہ مستقل میزبان ہوگئے، درس کے بعد وہ اپنے یہاں کھانے کا نظم کرتے اور میرے ساتھ جتنے لوگ ہوتے اور عموماً دو چار آدمی تو ہوتے ہی، کبھی کبھی زائد بھی ہوتے، سب کو نہایت مسرت اور اکرام کے ساتھ کھلاتے، وہ اپنے گھر والوں اور اپنے صاحبزادوں کو خدمت میں لگا دیتے، ماشاءاللہ یہ سب لوگ خدمت کر کے بہت خوش ہوتے۔

بابو صاحب کا دسترخوان بہت سادہ ہوتا، مگر سادہ کھانا اتنا لذیذ ہوتا کہ مرغن اور پر تکلف کھانوں میں وہ لذت نہ ملتی، دسترخوان پر وہ گرم روٹی کا اہتمام کرتے، مہمان کھاتے رہتے اور گرم روٹیاں پک کر آتی رہتیں۔ بابو صاحب کے دسترخوان میں برکت بھی بہت تھی، کھانا بظاہر اگر تھوڑا بھی ہوتا تو بھی لوگ شکم سیر ہو کر اٹھتے تھے۔ بابو صاحب اپنے اوراد اور معمولات کے بہت پابند تھے، بہت سویرے، صبح صادق سے بہت پہلے اٹھ جاتے، تہجد کی نماز ادا کرتے، منھ اندھیرے مسجد میں آجاتے، کبھی کبھی فجر کی اذان کہتے، اس کے بعد تلاوت اور اوراد و وظائف میں لگ

جاتے، پھر فجر کے بعد بھی جب تک گنجائش رہتی مسجد میں رہتے، ریٹائر ہونے کے بعد وہ رات دن کا زیادہ حصہ مسجد ہی میں گزارتے، صحابۂ کرام میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بکثرت مسجد میں ذکر و عبادت اور نماز و تلاوت میں لگے رہتے تھے، تو لوگ انھیں " **حمامة المسجد** "(مسجد کا کبوتر) کہتے تھے، ہم نے اپنے دور میں بابو صاحب کو ”حمامة المسجد“ پایا۔

ریٹائر ہونے کے بعد امراض نے بابو صاحب کو آگھیرا، عمر بھی ہو چکی تھی، کچھ دماغ کا مرض تھا، جس کی وجہ سے نیند غائب ہوگئی تھی۔ ایک بار بمبئی علاج کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ بے خوابی کا مرض مستقل ہوگیا، ویسے عام طور پر طبیعت ٹھیک رہتی۔ مگر سال میں ایک دو بار ان پر مرض کا دورہ پڑتا، اس وقت ان کا عجیب حال ہوتا، گھبراہٹ اور بے چینی رہتی، اپنے ایمان کے بارے میں بہت متفکر رہتے، سب سے دعائیں کراتے، اس وقت ان کی مسکنت بہت بڑھ جاتی۔ تاہم اپنے اوراد و معمولات اور وظائف بندگی میں کوئی فرق نہ آنے دیتے، اللہ ہی جانتا ہے یہ مرض تھا یا خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا کیونکہ جب ان کی یہ کیفیت ہوتی تو دنیا کی کوئی چیز انہیں یاد نہ رہتی اور نہ کسی چیز کی انہیں فکر رہتی۔ نہ دنیا کیلئے انہیں کوئی بے قراری ہوتی، صرف یہی بے قراری ہوتی کہ میرا ایمان سلامت ہے یا نہیں؟ وہ سب سے اسی کی دعا کراتے، انہیں تسلی دی جاتی تو بہت غور سے سنتے، مگر کچھ دیر کے بعد پھر وہی خوف و خشیت کا غلبہ ہو جاتا۔

رمضان شریف سے ایک ماہ پہلے ان پر اس حال کا شدید دورہ پڑا، اتنا شدید دورہ کہ دماغ مختل ہوگیا۔ صرف یہی فکر تھی کہ میں اللہ کی جناب میں بہت گنہگار و خطا کار ہوں، نیند بالکل اڑ گئی، بھوک ختم ہوگئی، کبھی کبھی بولنا بھی بند کر دیتے۔ گھر والوں کو تشویش ہونے لگتی۔ کمزوری بڑھتی چلی گئی۔ اسی دوران ایک بار قے اور بخار کی

شکایت ہوگئی، شہر کے مشہور معالج ڈاکٹر فرقان احمد صاحب کے ہسپتال میں داخل ہوئے، چندروز میں بخار وغیرہ تو زائل ہوگیا، مگر دماغ کی کیفیت وہی رہی۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا معاملہ تھا۔ پرانے بزرگوں کے بارے میں پڑھا ہے کہ خوف خدا سے بعض حضرات کے جگر ٹکڑے ہوگئے، اسی خوف وخشیت میں روح پرواز کرگئی۔ میں یہاں بھی اسی کا ایک نمونہ دیکھ رہا تھا، لوگ کہتے تھے مرض ہے، مگر کیسا مرض ہے کہ صرف اللہ ہی یاد آتا ہے، صرف اپنے ایمان کی فکر ہے، غلبہ ہے تو اسی کا غلبہ ہے اور اتنا زبردست غلبہ ہے کہ ہوش وحواس برقرار نہیں ہیں۔ اس اخیر کے دورہ میں میں نے دیکھا کہ چہرہ اور بھی تابناک ہوگیا ہے جیسے نور کی بارش ہورہی ہو۔ میں نے ان سے کئی بار کہا بھی کہ آپ کو اپنے اندر ایمان کے سلسلے میں خلش ہورہی ہے اور چہرے پر ایمان کی تابناکی بڑھتی جارہی ہے۔

رمضان شریف سے ایک ہفتہ قبل جامع مسجد کے موجودہ امام مولانا انتخاب عالم صاحب نے فون کیا کہ بابو صاحب دوروز سے بولے نہیں ہیں، کوئی کچھ کہتا ہے تو جواب نہیں دیتے، میں اسی روز حاضر خدمت ہوا، میں نے دیکھا کہ تخت پر ایک شان تجمل کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، چہرہ دمک رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے ابھی غسل کیا ہوا، ڈاڑھی کی سفیدی مزید برق ہوگئی تھی۔ انھوں نے کھڑے ہوکر استقبال کیا، مسکرائے ان کا مسکرانا دیکھ کر مجھے حوصلہ ہوا، میں نے رحمت خداوندی کی باتیں شروع کردیں اور دیر تک باتیں کرتا رہا، اور ان کے چہرے پر مدوجزر کی کیفیت ظاہر ہوتی رہی۔ آخر میں انھوں نے اپنے ایمان کے سلسلے میں خطرے کی بات ذکر کی، میں نے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد کا اہتمام کرتا ہے، اس کے ایمان کی گواہی دو، تو آپ سے زیادہ مسجد کا اہتمام کرنے والا کون ہوگا، ہمیں حضور اکرم ﷺ کا حکم ہے کہ ہم آپ کے ایمان کی گواہی

دیں تو آپ کے ایمان کا گواہ پورا شہر ہے اور کس کی گواہی چاہیئے، اس پر انہیں انشراح ہوا، اور مسکرائے۔

پھر رمضان شریف کا مہینہ آگیا، طبیعت کی خرابی کے باوجود روزے رکھتے رہے، اپنے معمولات بھی بقدر قوت ادا کرتے رہے، مگر ذہن سے خوف وخشیت کا غلبۂ حال ہٹتا نہ تھا۔ رمضان کی چھبیسویں شب میں رات کے سناٹے میں جبکہ تیماردار بھی سوگئے، اللہ جانے کون سی طاقت ان میں آگئی تھی کہ مکان کی اونچی دیوار جس پر شیشے کے ٹکڑے بھی لگے ہوئے ہیں، اور اس کی بلندی تک چڑھنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے اور ان کی کمزوری کا یہ حال تھا کہ سہارے سے مشکل سے چل پاتے تھے، اس کمزوری میں کیا طاقت آگئی تھی کہ چھ فٹ کی دیوار پر چڑھے اور باہر کود گئے، شیشوں سے ہاتھ زخمی ہوا، خون بہا، اس کے قطرے زمین پر گرے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ادھر سے نکلے ہیں، پھر کہاں کہاں گئے، کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی۔ سحری کیلئے گھر کے لوگ اٹھے اور انہیں نہیں پایا تو ڈھونڈھ شروع ہوئی، دن بھر تلاش کئے گئے کہیں سراغ نہیں ملا، رات گئے تک تلاش جاری رہی۔ دوسرے روز یعنی ۲۷ / رمضان کو دس بجے دن میں معلوم ہوا کہ محلّہ بدرقہ میں ایک کنویں کے اندر گرے ہوئے ہیں۔ اللہ جانے کب گرے تھے۔ اندازہ تو یہی ہے کہ جس رات وہ گھر سے نکلے تھے، اسی رات یہ حادثہ ہوا ہے۔ لیکن حیرت اور سخت حیرت کی بات یہ ہے کہ غوطہ خور جب کنویں میں اترا تو اس نے پایا کہ وہ نماز کی ہیئت میں ہاتھ باندھے کنویں میں کھڑے ہیں، سر کندھا سمیت قدرے جھکا ہوا تھا۔ جیسے بہت خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہے ہوں، غالباً تیس گھنٹے سے کچھ زیادہ پانی میں رہے ہوں گے۔ مگر تعجب ہے کہ بدن نہ پھولا نہ اس پر پانی کا کوئی اثر ہوا۔ غالباً پیٹ میں پانی کا کوئی قطرہ بھی نہ گیا تھا اور جب لاش باہر نکال کر رکھی گئی تو چہرہ خود بخود قبلہ کی طرف

ہوگیا۔ غسل دینے والوں نے بتایا کہ اس وقت چہرہ اور پرنور اور بارونق ہوگیا۔ گورے چٹے تو تھے ہی، اس وقت چہرے سے سرخی چھلکی پڑرہی تھی۔

واقعی اللہ والوں کا جسم مرنے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ زندگی بھر زبان ودل سے جو نورانی نام لیا تھا آج اس کا اثر جسم پر، چہرے پر محسوس ہورہا تھا، اتنی دیر تک جسم پانی میں رہا، مگر یہ بھی نہ ہوا کہ کھال ہی متاثر ہوگئی ہو۔

ظہر کی نماز کے بعد جنازے کی نماز ہوئی، یہ خاکسار اعتکاف میں تھا، اس لئے حاضری نہ ہوسکی، جنازہ بہت عظیم الشان تھا، سارا شہر امنڈ پڑا تھا، اتنی تعداد کم جنازوں میں دیکھی گئی ہے۔

جامعۃ الرشاد کے سامنے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی، مولانا انتخاب عالم صاحب امام جامع مسجد شہر اعظم گڑھ نے نماز پڑھائی۔ بابو صاحب کے جانے سے ایک ویرانی سی محسوس ہورہی ہے، میں جب کبھی شہر پہونچتا تو ایک خوشی سی دل میں ہوتی کہ بابو صاحب سے ملاقات ہوگی۔ ان کا مسکرا کر ملنا بے تکلف چائے اور کھانے کیلئے پوچھنا، کسی عذر پر اصرار نہ کرنا، مسکنت کے ساتھ دعا کی درخواست کرنا، واپسی میں کچھ دور مشایعت کرنا اور پھر مسجد میں لوٹ جانا۔ ایک ایک ادا ان کی یاد رہے گی۔

وہ معصومیت کی تصویر تھے، ان کا دل بالکل صاف تھا، لوگوں کا اندازہ ہے، بلکہ یقین ہے کہ شہر میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو کہے کہ مجھے بابو صاحب سے کبھی تکلیف پہونچی ہے، ابتدائے جوانی سے اختتام زندگی تک ان کا یہی حال رہا۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھے، اور جس چیز سے وہ ہمیشہ خوف زدہ رہے، اس سے انہیں امان بخشے۔ پس ماندگان میں چار صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ اللہ سب کو عافیت سے رکھے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

جناب مفتی نسیم احمد قاسمی (علیہ الرحمۃ)

وفات: ۳۰؍جنوری ۲۰۰۳ء

مناسکِ حج سے فراغت کے بعد (۱) ایک روز یہ حقیر راقم الحروف اپنی قیام گاہ کے قریب ایک مسجد میں بیٹھا ہوا تھا، ایک نوجوان عالم آتے ہوئے دکھائی دئے، کچھ دیر انھوں نے مجھے غور سے دیکھا، مجھے بھی ایک کشش سی محسوس ہوئی، پھر قریب آئے، سلام ومصافحہ کے بعد انھوں نے پوچھا کہ آپ......فلاں صاحب ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، انھوں نے بتایا کہ میں ''شرف عالم'' ہوں، میرے قلب میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، ''شرف عالم''؟ مدرسہ دینیہ غازی پور کے طالب علم، عرصۂ دراز کے بعد ملاقات ہوئی، کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں مجھے اپنے مدت کے بچھڑے ہوئے طالب علم کو پاکر مسرت ہورہی تھی کہ اچانک انہوں نے سنایا کہ مفتی نسیم احمد کا انتقال ہوگیا، میں گھبرا گیا، ایک سکتہ سا طاری ہوگیا، کون مفتی نسیم احمد، تمہارا ساتھی؟ ہاں وہی، کب انتقال ہوا؟ ۳۰؍جنوری کو دہلی میں انتقال ہوا، دل کا دورہ پڑا تھا، تدفین آبائی وطن بیل پکونہ میں ہوئی،

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں، میں بہت دیر تک نسیم کی یاد میں کھویا رہا، دعائیں کرتا رہا، یا اللہ یہ کیسی خبر سنی؟ جب وہ طالب علم تھا، تو مجھے بہت عزیز تھا، اس کی تحریک اور دعوت پر میں اس کے چھوٹے سے کوردہ گاؤں بیل پکونہ میں جو صوبہ

---

(۱) اس سال یعنی ۱۴۲۳ھ میں حق تعالیٰ نے اپنے اس بندے کو سفرِ سعادت سے سرفراز فرمایا، فللہ الحمد

بہار کے مظفر پور میں واقع ہے بار بار گیا ہوں، اور وہاں ایک ایک دو دو روز قیام بھی ہوا ہے، اس نے اور بیل پکونہ کے اور طالب علموں نے جو مدرسہ دینیہ غازیپور میں پڑھتے تھے، خدمت کا حق میری حیثیت سے بہت زائد ادا کیا، ، ان خدمت گزاروں میں یہ طالب علم شرف عالم بھی تھا، جس نے اس وقت مجھکو اس کی
وفات کی خبر سنا کر بے چین کر دیا، نسیم مجھکو اس وقت بھی بہت عزیز تھا اور اب بھی بہت عزیز تھا، وہ بہت ذہین وذکی تھا، اور فرمانبردار واطاعت شعار بھی، وہ طلب علم میں بڑا محنت کوش بھی تھا اور بہت باادب اور وفادار بھی، دبلا پتلا سا تیر جیسا سیدھا بدن، رنگت گہری سانولی، ہاتھ پاؤں لمبے لمبے، آنکھوں میں ذہانت کی چمک،

۱۴۰۱ھ میں مدرسہ دینیہ غازیپور کا عربی شعبہ دریائے گنگا کے کنارے محلّہ میاں پورہ میں ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری مرحوم سابق گورنر اڑیسہ کی عرصہ سے خالی پڑی بلڈنگ میں منتقل ہوا، اور اب اس کا نام جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی مہتمم مدرسہ دینیہ نے ”شوکت منزل“ رکھ دیا تھا۔ میں اسی سال مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد سے منتقل ہوکر دوبارہ مدرسہ دینیہ میں مدرس ہوا تھا، نسیم اس وقت عربی سوم کا طالب علم تھا، جب پڑھائی جمی، اور مدرسہ اپنے تعلیمی معمول پر آگیا، تو عربی سوم سے نسیم غائب تھا۔ معلوم ہوا کہ اس نے دار العلوم مئو میں داخلہ لے لیا ہے، میں پہلے سے اس سے واقف تھا، میں چاہتا تھا کہ وہ یہیں آجائے، بقرعید کی تعطیل کے بعد دیکھا تو حاضر! شرمندہ شرمندہ سا، سراپا عجز انکسار بنا ہوا داخلہ کی درخواست کر رہا تھا، مجھے خوشی ہوئی، پھر وہ یہیں پڑھنے لگا، وہ وقت مدرسہ دینیہ کے تعلیمی عروج کا دور تھا، مشکٰوۃ شریف تک تعلیم تھی، طلبہ کیا تھے؟ محنت وکاوش کے پتلے تھے، وہ تعلیم میں اتنی محنت کرتے تھے کہ رشک آتا تھا، ذہینوں کی ذہانت نکھرتی تھی، غبی طلبہ بھی مایوس نہ ہوتے تھے، نسیم کی ذہانت کھلتی گئی، طلبہ کی انجمن تھی، جس کے ماتحت تقریر وتحریر کی تمرین ہوتی تھی، اس میں بھی نسیم کو امتیاز حاصل تھا،

طلبہ نے پروگرام بنایا کہ اہل باطل سے مناظرہ کی مشق ہونی چاہئے، بریلویت سے مناظرہ طے ہوا، موضوع یہ تھا کہ ”نبی کریم ﷺ“ ”عالم الغیب“ تھے یا نہیں؟ بریلویت کی طرف سے مفتی نسیم مناظر قرار پائے، اور اہل حق کی طرف سے مفتی محمد انعام غازی پوری ...... جواب اپنے گاؤں بہورہ میں دلدار نگر کے قریب ...... مدرسہ مدینۃ العلوم کے بانی اور اس کے مہتمم ہیں۔ دونوں ذہانت میں فائق، دونوں نے خوب تیاری کی، اس موضوع پر دونوں طرف کی کتابیں پڑھ لیں، سمجھ لیں اور بڑے اہتمام سے میدان مناظرہ میں اترے، مناظرہ کئی گھنٹے تک چلتا رہا، اساتذہ بھی اس میں موجود تھے، کچھ شہر کے لوگ بھی تھے، اس وقت نسیم کی ذہانت وخطابت کا جوہر دیکھنے کے لائق تھا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بریلوی عالم وخطیب کی روح اس میں سما گئی ہے۔ وہ اس طرح سے بریلویت کی وکالت کر رہا تھا، جیسے سچ مچ یہ بریلوی ہو، میں مناظرہ سن رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ اب ایسا مناظرہ نہ ہونے دوں گا، خدانخواستہ کوئی باطل اور غلط بات دل میں بیٹھ گئی تو خوانخواہ ایک آدمی گمراہی کے کھڈ میں جا گرے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ دجال سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ اس کے قریب ہی نہ جایا جائے۔ جو اس کے قریب گیا، اس کے مبتلائے فتنہ ہونے کا قوی امکان ہے، اور یہاں تو ہم نے ایک آدمی کو باطل کی وکالت کے لئے متعین کر دیا ہے، اس طریقۂ عمل کی غلطی اس دن مجھے بہت شدت سے محسوس ہوئی۔

یادش بخیر! چند سال پہلے دار العلوم دیوبند میں شعبۂ مناظرہ کے طلبہ کی دعوت پر ان کے مجوزہ ایک مناظرہ میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ مناظرہ احناف وغیر مقلدین کے درمیان تھا، میں یہاں بھی یہی منظر دیکھ رہا تھا کہ غیر مقلدیت کا وکیل جیسے واقعۃً غیر مقلد بنا جا رہا ہو، بلکہ بعض اوقات یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی طلاقتِ لسانی اور بے

جھجک چرب زبانی کی وجہ سے غالب آرہا ہو، مجھے اس وقت انعام ونسیم کا مناظرہ یاد آرہا تھا۔ میں اس وقت بھی یہ سوچنے لگا کہ مناظرہ کی مشق کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے، مناسب یہی ہے کہ مختلف فیہ موضوعات پر طلبہ کو دلائل و براہین سے لیس کردیا جائے، باطل کے پینتروں سے انھیں باخبر کردیا جائے، ان کی کاٹ کی تدبیریں بتا دی جائیں، پھر جب موقع آئے گا، تو ذہین مناظر خود اپنی راہ بنالے گا۔ خود ان طلبہ کو فرقۂ باطل کے وکیل وترجمان کے طور پر نہ پیش کیا جائے، ورنہ ''نقلِ کفر'' کی اتنی بھرمار ہوجاتی ہے، کہ اسی کے کفر بن جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

مفتی نسیم نے جب اصولِ فقہ کی مشہور کتاب ''منتخب الحسامی'' شروع کی تو پڑھانے والے کی تقریر کی روشنی میں، اس کی شرح لکھنے کا آغاز کیا، روز کے روز سبق کی شرح وہ لکھ کر دکھاتے رہے، ماشاء اللہ خوب سمجھ کر لکھتے تھے، بہت کم جگہ قلم رکھنے کی ضرورت پڑتی تھی، دیوبند جانے کے بعد اسے وہ چھپوانا چاہتے تھے مگر اللہ جانے کیا رکاوٹ پیش آئی کہ وہ طبع نہ ہوسکی۔

دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد انھوں نے افتاء میں داخلہ لیا، پھر غالباً تدریب افتاء میں بھی دوسال رہے، اسی زمانے میں ''اسلام اور نکاح'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ تدریب سے فراغت کے بعد گجرات میں جام نگر میں دوتین سال تک تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ انھیں ''فقہ اکیڈمی'' میں لے آئے، قاضی صاحب ان کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے، قاضی صاحب نے ان سے تدریس کا بھی کام لیا، ملی کونسل کے وہ کسی ذمہ دار عہدہ پر تھے۔ نیز قاضی صاحب نے بہار کے مدارس عربیہ کا جو وفاق قائم کیا تھا، اس کے بھی ذمہ داروں میں مفتی نسیم شامل تھے، اوراخیر میں امارت کے نائب ناظم بھی منتخب ہوگئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا تھا، علم وتحقیق اور تنظیم وتحریک کے ساتھ جرأت وعزیمت کے بھی مالک تھے، قاضی صاحب کی نگرانی اور تربیت میں ان کی صلاحیتیں پروان چڑھ رہی تھیں، میں انھیں ٹوکا کرتا تھا کہ تنظیمی جدو جہد میں پڑکر کہیں ان کی ذہنی اور علمی صلاحیتیں زنگ آلود نہ ہوجائیں، میں چاہتا تھا کہ تعلیم وتدریس کے مشغلہ میں وہ زیادہ دلچسپی لیں، وہ میری تنبیہات کو طالب علمانہ ادب واحترام کے ساتھ سنتے تھے لیکن ان کے مشاغل اتنے پھیل چکے تھے کہ انھیں سمیٹنا مشکل تھا۔

طالب علمی کے دور میں وہ دبلے پتلے تھے، مگر بعد میں جسم کی ضخامت بڑھ گئی تھی، مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ میری ان کی آخری ملاقات غالباً رجب ۱۴۲۳ھ کی کسی تاریخ میں بھروارہ ضلع دربھنگہ کے مدرسہ اسلامیہ میں ہوئی، جس کے مہتمم حضرت قاری شبیر احمد صاحب ہیں، قاری صاحب ایک حادثہ سے محزون وغمزدہ تھے، یہ حقیر تسلی وتعزیت کے لئے حاضر ہوا تھا۔ وہیں مفتی نسیم احمد بھی آئے تھے، ان سے ملاقات ہوئی، اچھے خاصے تھے۔

میں ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ ۲۳/جنوری ۲۰۰۳ء کو سفر حج کے لئے دلی روانہ ہوا۔ مفتی نسیم احمد بھی اسی کے آس پاس کسی تاریخ میں بیمار ہوکر دہلی پہونچے، مجھے کچھ خبر نہ تھی، ورنہ عیادت کرتا۔ ۲۸/جنوری کو میری فلائٹ تھی، ۳۰/کو ان کا انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

وقت پورا ہوچکا تھا، چل دئے، لیکن دلوں میں کسک چھوڑ گئے، چھوٹے چھوٹے کئی بچے ہیں، بیوہ اہلیہ ہے، اللہ تعالیٰ ضامن وکفیل ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں اور پس ماندگان کی بہترین کفالت فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صوفی عبدالقدوس صاحب علیہ الرحمہ

وفات: جولائی ۲۰۰۳ء

۱۳/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۴ھ بمطابق ۱۲/ اگست ۲۰۰۳ء کو ایک خاص تقاضے کے تحت اپنے صوبہ کے مشہور شہر مرادآباد میں حاضری ہوئی، اب سے تیس سال پہلے ۱۹۷۳ء میں شیخ الحدیث حضرت مولانا سید محمد فخر الدین صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی وفات کے بعد حاضری ہوئی تھی، اس وقت میرے ایک ہم سبق، نہایت نیک نفس اور خوش نہاد رفیق جناب صوفی عبدالقدوس صاحب مدرسہ شاہی کی شاخ میں جو لال باغ میں ہے، مدرس تھے، صوفی صاحب سے مجھے بے حد محبت تھی، لیکن یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ پھر تیس سال تک ملاقات نہیں ہوئی، اب جب کہ بعض لوگوں کے اصرار سے مرادآباد کے سفر کا پروگرام بنا، تو طبیعت پر ایک خاص انشراح تھا کہ صوفی جی سے ملاقات ہوگی، محبت کی باتیں ہوں گی، اتنے دن ملاقات نہ ہونے کی شکایتیں ہوں گی، میں اپنی پرانی عادت کے مطابق احترام و بے تکلفی کے ملے جلے لہجے میں ڈانٹ ڈپٹ کروں گا، اور وہ مسکرا مسکرا کر اعتراف قصور کرتے جائیں گے، خدا جانے اور کیا کیا باتیں ہوں گی؟ لیکن یہ بھی خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں خدانخواستہ یہاں کا تعلق ختم کر کے انھوں نے کہیں اور دوسری جگہ بستی نہ بسا لی ہو۔ میں اپنے فرزند عزیز مولوی محمد عابد سلمہٗ سے کہہ رہا تھا کہ وہ طبیعت کی جس استقامت کے

مالک ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ یہیں ہوں گے، کیونکہ اس جگہ ان کے استاذوں نے بیٹھایا ہے، امید و بیم کی اسی کیفیت کے ساتھ مدرسہ شاہی میں حاضری ہوئی، اس کے مہتمم جناب مولانا اشہد رشیدی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے صوفی جی کے متعلق دریافت کیا۔ اور ان سے اپنا تعلق بیان کیا، وہ افسوس کے لہجے میں کہنے لگے کہ ابھی ۲۰، ۲۵/ دن پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ میں سناٹے میں آ گیا، زبان و دل سے **إنا للہ وإنا إلیہ راجعون** پڑھا، جو ہونا تھا، ہو چکا تھا، ملاقات مقدر نہ تھی، ایک حسرت خلش بن کر دل میں چبھ گئی اور اس کی کسک لازوال ہوگئی، اللہ نے مغفرت فرمائی تو ان شاء اللہ آخرت میں ملاقات ہوگی۔ وہ تو پاک وصاف تھے یہ خاطی و عاصی گناہوں کے نرغے میں ہے، ایمان سلامت لے جائے تو بہت امیدیں ہیں، ان سطور کے پڑھنے والوں سے اسی دعا کا خواستگار ہوں۔

دن جاتے دیر نہیں لگتی، ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن شمار کرتا ہوں تو اڑتیس سال بیت گئے، میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں طالب علم تھا، دس گیارہ رفقاء پر مشتمل جماعت تھی، اس جماعت میں شوال میں ایک نئے طالب علم کا اضافہ ہوا۔ نیک، سیدھا سادا، پستہ قد، دبلا پتلا، بڑی بڑی آنکھیں، داڑھی کے کچھ بال ٹھوڑی پر نمایاں ہو چکے تھے، رنگ صاف، خاموش طبیعت، تیز رفتار، نرم گفتار، ادب و احترام کا پیکر، بڑوں کے ادب کا خوگر تو تھا ہی، برابر والوں اور چھوٹوں کے سامنے بھی جھکا جاتا تھا۔ ہاں دماغ کا کمزور تھا، صاحب استعداد نہ تھا، عبارت نہیں پڑھ سکتا تھا، مطلب سمجھنے میں اسے دقت ہوتی تھی، اسی بھولے پن، نیکی و سادگی اور استعداد کی کمزوری کی بنا پر شروع ہی میں اس پر طلبہ نے ''صوفی جی'' کا لقب چسپاں کر دیا۔ اور وہ پورے مدرسہ میں ''صوفی جی'' کے لقب سے معروف ہوگیا، کافیہ و قدوری کی جماعت میں داخلہ ہوا تھا۔

وہ بہت جلد ساتھیوں میں گھل مل گئے، ہر ایک کی خدمت کرنے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے، اور بڑی خوشی کے ساتھ، اساتذہ تو خیر اساتذہ ہیں، اپنے ساتھیوں اور اپنے سے چھوٹوں کی ہر طرح کی خدمت بے تکلف کردیا کرتے تھے، اس خاص وصف کی وجہ سے اساتذہ میں بھی اور طلبہ میں محبوب ومقبول ہوگئے، وہ لڑنا جھگڑنا، بحث وتکرار کرنا جانتے ہی نہ تھے، جس نے جس کام کے لئے کہا، اسی وقت آمادہ! اس کے ساتھ وہ اسباق میں حاضری کے بہت پابند تھے، کتابیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر مجال کیا کہ سبق کی غیر حاضری ہوجائے، تکلیف میں ہوں، بیمار ہوں یا صحت مند بہرحال وہ سبق میں موجود ہوتے، اساتذہ کی تقریر بہت انہماک سے سنتے، انھیں اس کا احساس تھا کہ وہ کتابوں کی عبارتیں سمجھ نہیں پاتے، مگر اس کی وجہ سے وہ مایوس نہ ہوتے، نہ گھبراتے نہ اکتاتے، بڑی دلچسپی کے اساتذہ کی تقریر سنتے، مذاکرہ ہوتا، تو انہماک کے ساتھ اس میں بیٹھتے، تنہا ہوتے تو کتاب میں غرق رہتے، کوئی استاد کسی خدمت کے لئے کہہ دے تو ان کی عید ہوجاتی، کوئی طالب علم پکارتا تو لپک کر جاتے اور جی جان سے اس کا کام کرتے، چلتے تو دوڑتے ہوئے معلوم ہوتے، میں نے اساتذہ کا دل سے ادب واحترام کرتے ان کے برابر کم دیکھا، وہ ہر استاذ کا احترام کرتے، سامنے بھی پیٹھ پیچھے بھی، کسی طالب علم کی مجال نہ تھی کہ ان کے سامنے وہ کسی استاذ پر زبان تنقید کھولے، یا اس پر کوئی بے جا تبصرہ کرے، وہ فوراً ٹوک دیتے، لڑائی نہ کرتے، خفا نہ ہوتے، نرمی سے ٹوکتے، مگر ایسا ٹوکتے کہ کہنے والا شرمندہ ہوکر رہ جاتا، اور پھر ان کے سامنے اسے زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوتی، شوخی وشرارت سے انھیں واسطہ نہ تھا، طلبہ شرارتیں کرتے، تو وہ دور کے تماشائی ہوتے، لیکن کسی طالب علم کو برا نہ سمجھتے، نہ کسی کی کبھی شکایت کرتے، آج جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو ان کی ادائیں نظر کے سامنے اس طرح آرہی ہیں، جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ کتاب

لئے بھاگے چلے آرہے ہیں، ذرا سبق دہرا دیجئے، میں پھر سے سن لوں، صوفی جی! آپ سمجھتے تو ہیں نہیں پھر کیوں تکلیف دے رہے ہیں، اور خود بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں، نہیں، مجھے سمجھا دیجئے، شاید سمجھ میں آجائے، آپ بہت اچھی طرح سمجھاتے ہیں۔ میں ترس کھاتا، انھیں سمجھاتا، ایک بار نہیں کئی کئی بار! پھر وہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، مجھے وہ سبق ازبر ہوجاتا۔ صوفی جی طبیعت خراب ہے، سر میں درد ہورہا ہے، لائیے میں تیل کی مالش کردوں، سر دبادوں، پھر میں ہاں ہاں، نہیں نہیں، کرتا ہی رہ جاتا اور وہ سر دبانا شروع کردیتے، اچھا اب دوا لارہا ہوں، وہ دوا لاتے، کھلاتے۔

نماز باجماعت کے بہت پابند تھے، طلبہ عام طور سے اس میں لاپرواہی کرتے، مگر وہ اس کا بہت اہتمام کرتے، پہلے سے تیار رہتے، ان کی بعض باتیں عجیب تھیں، گوکہ وہ لکھنے کی نہیں، مگر قلبی محبت تقاضا کرتی ہے کہ اسے خواہ کوئی کچھ سمجھے، مگر میں انھیں لکھ ہی دوں، محبت کی نگاہ ہر ایک ادا اور ہر ایک خصوصیت کے بیان سے روشن ہوتی ہے، میں نے ذکر کیا ہے کہ وہ سبق بڑے انہماک سے سنتے تھے، انہماک کا انداز یہ ہوتا کہ وہ اپنے پورے وجود سے استاذ کی طرف متوجہ ہوتے، اور اور وجود کا سب سے نمایاں حصہ اس وقت ان کی بڑی بڑی آنکھیں ہوتیں، وہ اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے اس طرح متوجہ ہوتے کہ پلک بھی نہ جھپکاتے تھے، ایک ٹکٹکی سی باندھے رہتے، بعض اساتذہ کو ان کے اس طرح مسلسل دیکھنے سے وحشت ہوتی، وہ فرماتے کہ صوفی جی! تم ایک طرف کنارے بیٹھو۔

دوسری خاص بات جو ان کی وجود سے وابستہ تھی، وہ ان کی چھینک تھی، وہ ہفتہ دو ہفتہ میں کبھی ایک بار چھینکتے تھے، مگر اللہ جانے کیا بات تھی، وہ چھینک ایک تھرا دینے والی آواز ہوتی۔ قریب بیٹھے لوگ دہل جاتے، اسی لئے چھینکنا ہوتا تو وہ دور بھاگتے تھے، کبھی سبق کے دوران انھیں چھینک آجاتی تو درس کا تسلسل ٹوٹ جاتا،

بعض ظریف اساتذہ ان سے کبھی کبھی سبق شروع کرنے سے پہلے کہتے کہ صوفی جی چھینکنا مت، ان پر اس زبردست چھینک کا ایسا جھٹکا پڑتا کہ مضبوط سے مضبوط ازاربند ان کی دو تین چھینک سے زیادہ برداشت نہ کر پاتا، ان کی چھینک معروف ہوگئی تھی،

جب جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں عربی کی پانچویں جماعت سے فراغت ہوگئی، تو ساتھیوں نے دیوبند جانے کی تیاری کی، کل گیارہ ساتھی تھے، جن میں سے نو (۹) نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور ایک ساتھی دارالعلوم مئو چلے گئے، صوفی جی نے کہا کہ میں دارالعلوم دیوبند کے امتحان داخلہ کے لائق نہیں ہوں، وہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد چلے گئے، جہاں ان کے ابتدائی درجات کے تین اساتذہ اکٹھے ہوگئے تھے۔ حضرت مولانا سید ارشد مدنی، حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری اور حضرت مولانا محمد احمد صاحب فیض آبادی، یہ حضرات ابتداءً جامعہ قاسمیہ گیا (بہار) میں مدرس تھے، صوفی جی نے ابتدائی تعلیم ان حضرات سے وہیں حاصل کی تھی، ابھی ہم لوگ مبارک پور میں زیر تعلیم تھے کہ یہ اصحاب ثلٰثہ گیا کے جامعہ قاسمیہ سے مرادآباد کے جامعہ قاسمیہ میں منتقل ہوگئے۔ صوفی جی مبارک پور سے اپنے انھیں اساتذہ کی خدمت میں مرادآباد حاضر ہوگئے۔ اب خدا ہی جانتا ہے کہ انھوں نے امتحان داخلہ میں کامیابی حاصل کی، یا اساتذہ کی نظر کرم نے انھیں داخلہ دلوادیا، انھوں نے مدرسہ شاہی میں تعلیم کی تکمیل کی، اور فراغت کے بعد انھیں حضرات نے اس کی لال باغ والی شاخ میں دینیات کا مدرس بنادیا، پھر ہر طرف سے یکسو ہوکر وہیں لگے رہے۔

ان کی فراغت ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ اس کے دو سال بعد میں ۱۹۷۳ء میں مرادآباد حاضر ہوا۔ تو صوفی جی سے ملاقات ہوئی، اس وقت وہ لال باغ میں تدریس

کے ساتھ کسی محلّہ کی مسجد میں امامت بھی کرتے تھے، میں ان کی مسجد میں حاضر ہوا، انھوں نے اپنے مقتدیوں سے میرا تعارف کرایا، میں نے دیکھا کہ وہ اپنی نیکی، سادگی اور جفاکشی کی وجہ سے بہت محبوب ومقبول ہیں، میں وہاں دس بارہ گھنٹے رہا، اسی دوران انھوں نے چار پانچ آدمیوں سے ملاقات کرائی، اور بتایا کہ یہ سب نومسلم ہیں، میں انھیں قرآن اور اردو پڑھاتا ہوں، مجھے حیرت بھی ہوئی، اور خوشی بھی! یہ لوگ صوفی جی کی تلقین سے مشرف باسلام ہوئے تھے، میں نے بے ساختہ ان سے کہا کہ ہم لوگوں نے بھی پڑھا اور اب پڑھا رہے ہیں، اور ہم لوگ علم کے میدان میں نمایاں سمجھے جاتے رہے، اور آپ بھی اسی راہ کے مسافر تھے، مگر آپ کو کمزور اور غبی جانا جاتا رہا۔ لیکن دیکھئے کہ علم نافع کس کو حاصل ہوا؟ آپ کے علم نے تو ابھی سے پھل دینا شروع کردیا کہ اتنے لوگ جہنم کے گڑھے سے نجات پاکر جنت کی آغوش میں آگئے۔

واقعی ان کی نیکی، اساتذہ کی عزت وعظمت اور سب کی یکساں خدمت گزاری نے ان کو کہاں سے کہاں پہونچادیا اور کیا سے کیا بنادیا۔ وہ بڑے عالم تو نہ بن سکے، لیکن بہترین انسان اور صاحب ایمان بن گئے تھے۔

ان کی طبیعت میں وفاداری اور استقامت کا رچاؤ تھا، ان کے اساتذہ نے ایک جگہ بیٹھادیا، تو وہ وہیں بیٹھے رہے، اور اس وقت اٹھے، جب اسی ذات کی طرف سے بلاوا آگیا، جس کے لئے ان کا مرنا جینا تھا، میری ان سے ملاقات تیس سال پہلے ہوئی تھی، تیس سال کے بعد ملنے کے لئے گیا، تو خدا کے حضور پہونچ چکے تھے، میں اس عرصے میں انھیں کبھی نہیں بھولا، طلبہ کے درمیان جب میری تربیتی تقریر ہوتی تھی، تو کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر آ ہی جاتا تھا۔

ایک بار حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندوی نوراللہ مرقدہٗ کی

خدمت میں حاضری ہوئی، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ آج بخاری شریف کا آخری سبق ہوگا، اس تقریب سے عوام کا مجمع بھی خاصا ہوگیا تھا، بعض اکابر علماء بھی تشریف لائے تھے، حضرت نے مغرب کے بعد اعلان فردیا کہ فلاں بزرگ عالم کی تقریر ہوگی، اور ان کے ساتھ اس خاکسار کا نام بھی پکار دیا، ان بزرگ عالم نے اللہ جانے کس جھونک میں طلبہ کی استعداد علمی پر بہت سخت نکتہ چینی کی، اور اس انداز سے تقریر کی کہ طلبہ میں مایوسی پھیل جائے، ان کے بعد اس حقیر کی گفتگو تھی، میں نے اس تقریر میں بہت تفصیل کے ساتھ صوفی جی کا ذکر کیا کہ استعداد کچھ نہ تھی، مگر ان کے اخلاق وتدیُّن نے ان کو کیا بنادیا تھا، اور ان کے علم سے خود ان کو اور دوسروں کو بھی کتنا فائدہ پہونچا۔ تو علمی استعداد اگر نہ ہو، تو آدمی اچھا انسان تو بن سکتا ہے، علمی استعداد بہت حد تک غیر اختیاری ہے، لیکن اخلاق واعمال تو اختیاری ہیں، اگر ایک طرف سے آدمی نہ چل سکے تو دوسری طرف سے چلے،

ہمارے صوفی جی صوبہ بہار کے ضلع مظفر پور کے رہنے والے تھے، کبھی کبھی لطف میں آکر مجھ سے پوچھتے کہ آپ کبھی بہار گئے ہیں۔ میں نوعمر طالب علم تھا، بہار تو بہار ہے، میں اور مئو اعظم گڈھ سے آگے کہیں نہیں گیا تھا۔ میں نفی میں جواب دیتا تو کہتے بہار ضرور جایئے، پھر کہتے، جب بلیا سے آگے ٹرین بڑھے اور کسی اسٹیشن پر آپ سنیں، بِیری پان، پان بِیری (یعنی بیڑی پان، پان بیڑی) خالص بہار کے دیہاتی لہجے میں بولتے، تو سمجھ جایئے کہ بہار شروع ہوگیا۔

کبھی کہتے کہ جب کسی اسٹیشن پر آپ کے کان میں آواز آئے ’’چائے گرٹم‘‘، ’’چائے گرٹم‘‘، تو جان لیجئے کہ بہار آگیا۔

ایک بڑا پاک طینت اور صاف باطن انسان دنیا سے چلا گیا، میرے ہم سبق رفقاء میں سے دو رفیق دنیا سے کوچ کر گئے، ایک مبارک پور کے مولوی محمد عامر مرحوم

، اور دوسرے یہ صوفی جی مرحوم، اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ دونوں دوران طالب علمی نہایت نیک تھے اور نماز وتلاوت کی پابندی میں سب طلباء سے ممتاز تھے، مولوی محمد عامر مرحوم نماز باجماعت اور تلاوت قرآن کے اتنے پابند تھے کہ شاید ہی ان دونوں چیزوں میں ان سے ناغہ ہوتا ہو، ہم جیسے لوگ اساتذہ کے خوف سے فجر کی نماز پڑھ تو لیتے تھے، مگر تلاوت کی توفیق گاہے گاہے ہوتی تھی، مگر مولوی محمد عامرؒ اس کے نہایت شدت سے پابند تھے، اسی کے ساتھ وہ نہایت نیک سیرت اور پاک باطن بھی تھے، ان کا انتقال ۲۰/۲۱ سال قبل ہوا۔ اب یہ دنیا اچھے لوگوں کے رہنے کی...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ...... جگہ نہیں، کتنے اچھے لوگ اٹھ گئے۔

اللہ تعالیٰ میرے دونوں مرحوم ساتھیوں کی مغفرت فرمائیں، ان کے درجات بلند فرمائیں، **وإنا إن شاء الله بهم لاحقون**

(ماہنامہ ضیاء الاسلام جنوری وفروری ۲۰۰۴ء مطابق ذی قعدہ وذی الحجہ ۱۴۲۴ھ)

☆☆☆☆☆☆

’’ظہیر بھائی‘‘

وفات: ۱۱/ ذی قعدہ ۱۴۲۴ھ (۴/ جنوری ۲۰۰۴ء)

یہ خاکسار کچھ عرصہ تک مدرسہ ریاض العلوم گورینی ضلع جونپور میں تھا، وہاں کے تعلق سے جو مخلصین ومحبین میسر آئے، جن میں دینداری کا بھی گہرا رنگ تھا، اور عقل وفہم میں بھی اصابت وصلابت تھی، اور ساتھ ساتھ بزرگانہ شفقت ومحبت بھی تھی، بزرگوں کی صحبت وبرکت کے اثرات چہرے اور لباس بلکہ پوری زندگی پر نمایاں نظر آتے تھے، ان میں ایک ’’ظہیر بھائی‘‘ بھی تھے ’’ظہیر بھائی‘‘ تھے، تو معمر، میرے والد مکرم کی عمر سے کچھ ہی کم رہے ہوں گے۔ مگر جس ماحول میں ان سے ملاقات ہوئی، اور محبت کا بیج دل میں پڑا، اس ماحول میں وہ ’’ظہیر بھائی‘‘ ہی تھے، اس لئے محبت کی خوشبو میں بسا ہوا، یہی لفظ میری زبان کی بھی حلاوت بن گیا۔

’’ظہیر بھائی‘‘، ضلع اعظم گڈھ کے قصبہ نما گاؤں کوٹلہ کے رہنے والے تھے، جو بنارس اعظم گڈھ روڈ پر واقع ہے، مگر عمر کا زیادہ حصہ بمبئی میں گزرا۔ میں جب گورینی مدرس ہوکر پہونچا، تو ان کے صاحبزادے مولوی عرفان احمد سلّمہٗ وہاں طالب علم تھے۔ ملاقات ہوئی تو ان کی محبت اور بے تکلفی کی وجہ سے بہت کشش اور مناسبت معلوم ہوئی، شکل وصورت سے اچھے خاصے مولوی معلوم ہوتے تھے، چہرے پر ذکر کی نورانیت کا احساس ہوتا تھا۔ یہ اثر تھا بزرگوں کی صحبت ومحبت کا ابتداءً مصلح الامت حضرت مولانا شاہ **وصی اللہ** صاحب علیہ الرحمہ سے بیعت ہوئے۔ ان کے متعلقین ومنتسبین کا کیا کہنا، ماشاء اللہ، سبحان اللہ۔ ان کی وفات کے بعد

حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں رہے، حضرت مولانا کی وفات کے بعد حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہٗ سے تعلق ہوا۔

ابھی چند دنوں کی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن ایک سال سے زائد کی بات ہے کہ ضلع اعظم گڈھ میں سرائے میر کے حلقہ میں ایک گاؤں کھُٹہنہ ہے، وہاں کے مدرسہ میں ایک جلسہ تھا۔ میری حاضری وہاں ہوئی، میں پہونچا تو دیکھا کہ ’’ظہیر بھائی‘‘ ایک بڑے قافلے کے ساتھ چلے آرہے ہیں، دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ فرمانے لگے آپ کے پاس ایک معاملہ لے کر آیا ہوں، پھر بہت دیر تک معاملہ کی باتیں ہوتی رہیں اور دل میں ان کی محبت وشفقت کا نقش اور گہرا ہوتا رہا۔ فرمانے لگے صبح آپ کی دعوت ہے، معلوم ہوا کہ یہاں ان کی سسرال ہے۔ ان لوگوں نے ’’ظہیر بھائی‘‘ کو نمائندہ بنایا تھا، مجھے علی الصباح فجر کے بعد معاً بلکہ اگر ہوسکے تو فجر کی نماز اول وقت ادا کر کے دوسری جگہ جانا تھا۔ اس لئے معذرت کی، فرمایا نہیں معذرت قبول نہیں۔ مکان مسجد کے پاس ہے، نماز پڑھئے، گھر پہونچئے، ناشتہ تیار ملے گا، کھائیے۔ اور فوراً جائیے۔ ان کی پختگی کے سامنے کس کی چلتی، میں نے ان کی یہ دعوت کھائی۔ انھوں نے شکریہ ادا کیا۔ اپنے رشتہ داروں سے تعارف کرایا، میں ان کی محبت سے سرشار ہوا۔

ایک روز صبح فون آیا، میرے ایک سابق طالب علم، ان کے بھتیجے ملت نگر بمبئی کے امام وخطیب مولانا مفتی شبیر احمد صاحب سلّمہٗ بول رہے تھے کہ اتوار کو ظہیر بڑے ابا کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ ۱۱/ ذی قعدہ مطابق ۴/ جنوری کا دن تھا۔ اچھے خاصے تھے، رات کو کسی ولیمہ میں شریک ہوئے تھے، واپسی میں اپنے دو بیٹوں سے جو باہر کسی ملک میں رہتے ہیں بات کی اور فرمایا کہ صبح مجھ سے بات کر لینا۔ وقت غالباً آٹھ اور ساڑھے آٹھ بجے کا بتایا، اور یہ بھی کہا کہ نو بجے سے پہلے پہلے بات

کرلینا، نوبج جائے تب نہیں، صبح معمول کے مطابق اٹھے، نماز فجر کے بعد تلاوت وغیرہ سے فارغ ہوکر چائے پی، مفتی شبیر احمد سلّمہٗ ان کے پاس موجود تھے، کہا کہ لیٹتا ہوں اور لیٹ گئے، اور تھوڑی دیر گزری تھی، نوبجنے میں ایک آدھ منٹ باقی تھا کہ روح اپنے پیدا کرنے والے کے حضور حاضر ہوگئی۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائیں، بڑی خوبیوں کے مالک تھے، ۷۴؍سال عمر پائی۔ تین بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، پس ماندگان بالخصوص عزیزم مولوی عرفان احمد سلّمہٗ کی خدمت میں کلمۂ تعزیت پیش ہے، اور صبر جمیل کی دعا ہے۔ قارئین بھی ان کیلئے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا اہتمام فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(بقیہ ص: ۵۲۸ کا)

پھر جب صبح فجر کی نماز سے پہلے دیکھا گیا تو روح پرواز کرچکی تھی، کس سہولت سے، جان، جان آفریں کے سپرد کردی، اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگذر فرمائیں، اور بہشتِ بریں کو ان کا ٹھکانہ بنائیں۔ مولوی اظہار الحق سلّمہٗ سینکڑوں میل دور یہاں مدرسہ میں تھے، فون سے خبر آئی۔ عزیز موصوف سے تعزیتی کلمات کہے، مدرسہ میں دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ سب پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائیں، قارئین سے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی درخواست ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حاجی **نعیم الدین** صاحب مرحوم

وفات: ۱۲؍ذی قعدہ ۱۴۲۴ھ (۵؍جنوری ۲۰۰۴ء)

ہمارے مدرسہ کے مکتب کے استاد مولوی اظہار الحق صاحب جو ضلع کٹیہار بہار کے رہنے والے ہیں۔ ابتدائی عربی سے یہیں تعلیم حاصل کی اور یہیں سے بخاری شریف پڑھ کر فراغت حاصل کی، اور یہیں مکتب میں مدرس ہوگئے، ۱۲؍ذی قعدہ مطابق ۵؍جنوری بروز سوموار ان کے والد محترم کا انتقال ہوگیا، **انا للہ و انا الیہ راجعون**

مرحوم ذاکر وشاغل اور خوش اوقات بزرگ تھے، ذکر الٰہی کے لذت آشنا تھے، اور اللہ والوں سے بہت محبت رکھتے تھے، اپنے صاحبزادے مولوی اظہار الحق سلّمہٗ کو میرے حوالہ کیا تو مجھ سے تعلق ہوا۔ اس تعلق سے متعدد باران کے گھر جانا ہوا۔ اور پھر ان سے اور ان کے پورے خاندان کے ساتھ بہت گہرا ربط قائم ہوا، وہ بہت ضعیف تھے، مگر اس کے باوجود اپنے معمولات واوقات کے بہت پابند تھے، میرا جب کبھی ان کے یہاں یہاں جانا ہوا۔ انھیں اس درجہ خوشی ہوتی اور ایسی والہانہ ہوتی کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی، خوشی میں ان کے اندر نوجوانوں جیسی پھرتی آجاتی، اس انداز سے تواضع اور مہمان نوازی کرتے، کہ مجھے شرم آنے لگتی۔

عرصہ سے ضعف علالت کی کشمکش میں چل رہے تھے، رات میں انھیں سینے میں تکلیف ہوئی، دوادی گئی۔ فرمایا کہ آرام ہے، کچھ دیر کے بعد ایک صاحبزادے نے پھر جا کر دیکھا، تو اس وقت بھی آرام تھا۔

(بقیہ ص: ۵۲۷ پر)

ڈاکٹر ساغر اعظمی

وفات: ۵/جون ۲۰۰۴ء

۵/جون ہفتہ کا دن تھا۔ میں مغل سرائے میں تھا، رات کے سوا نو بجے فون کی گھنٹی بجی، مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کے ناظم مولانا انتخاب عالم صاحب بول رہے تھے کہ آج بلیا شہر میں ڈاکٹر ساغر اعظمی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

جنازہ بلیا سے شیخوپور لایا جا رہا ہے، ساڑھے دس بجے تک ان شاء اللہ یہاں پہونچ جائے گا۔ یہاں نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد بارہ بنکی لے جایا جائے گا، اب اتنا وقت نہ تھا کہ میں مغل سرائے سے چل کر وقت پر شیخوپور پہونچتا۔ دل مسوس کر رہ گیا۔ دعائے مغفرت کی، اہل وعیال کے لئے صبر جمیل کی دعا کی۔

میں ساغر اعظمی کے بھتیجے افتخار احمد کے ساتھ مغل سرائے گیا تھا۔ وہ ٹرین پر بیٹھ کر حیدر آباد روانہ ہو چکے تھے، انھیں اطلاع بھی نہ مل سکی۔

ساغر صاحب مشاعروں کی دنیا میں بہت مشہور ہوئے، ان کی غزلوں کا بھی اور ان کے ترنم کا بھی آوازہ ہر طرف گونجا۔ لیکن مجھے شاعر اور ترنم ریز ہونے کی حیثیت سے ان پر نہیں لکھنا ہے، میں ان پر اس حیثیت سے لکھنا چاہتا ہوں، جس پر شاید کسی نے نہ لکھا ہو۔

۱۹۶۴ء میں، میں بحیثیت طالب علم کے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخل ہوا، وہاں جن قدیم طلبہ کا تذکرہ پرانے طلبہ سے بار بار سننے میں آیا۔ ان میں ایک نام امتیاز احمد کا بھی تھا، (اس وقت تک یہ ساغر اعظمی کے نام سے مشہور نہیں ہوئے تھے) ان کے ترنم اور نعت خوانی کی بڑی شہرت تھی، احیاء العلوم میں غالباً عربی چہارم شرح جامی وشرح وقایہ تک پڑھ کر تعلیم ترک کر کے لکھنؤ چلے گئے، مجھ کو مشاعروں سے مناسبت نہیں، اس لئے نہ کبھی مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوا، نہ ساغر کو دیکھنے اور سننے کا۔ انھوں نے بارہ بنکی کو وطن بنا لیا تھا۔

میں ۱۹۹۰ء میں شیخوپور آیا۔ امتیاز احمد ساغر اعظمی کا آبائی وطن یہی گاؤں ہے، یہاں ان کے بھائی، والدہ اور صاحبزادے غرض پورا خاندان ہی رہتا ہے۔ ان سب حضرات سے میرے گہرے مخلصانہ تعلقات ہیں۔ ساغر صاحب گاہے گاہے شیخوپور آتے رہتے تھے مگر ان کی دنیا ہی دوسری تھی، رندی و سرمستی ہمہ وقت چھائی رہتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ نہ مدرسہ میں آتے تھے، نہ مجھ سے ملاقات ہوتی تھی، ان کے بڑے بھائی ماسٹر عبد الستار صاحب ایک بار انھیں مدرسہ میں لائے، ماسٹر صاحب نے فرمایا کہ ان کیلئے دعا کر دیجئے کہ جس دنیا سے (یعنی دینداری سے) یہ بھاگے ہیں پھر اسی دنیا میں لوٹ آئیں۔ پھر اس کے بعد معمول ہو گیا کہ جب آتے تھے ایک بار مدرسہ میں ضرور ملنے آتے تھے۔

میں انھیں سرمستی کے اسباب سے منع کرتا تھا۔ نماز کی پابندی کی تلقین کرتا تھا۔ ساغر صاحب بہت تاثر کے ساتھ سنتے تھے اور اعتراف کرتے تھے کہ میں اپنے دیندارانہ ماضی سے بہت دور ہو چکا ہوں۔

چند سال قبل (۱۴۲۰ھ، دسمبر ۱۹۹۹ء) رمضان شریف کی کوئی تاریخ تھی ان کے بڑے بھائی مرحوم ریاض الدین کا انتقال ہوا، وہ جنازہ میں شرکت کیلئے شیخوپور آئے۔ اس سے پہلے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اب یہ شراب سے تائب ہو چکے ہیں۔ مگر نماز کی پابندی ابھی نہ تھی۔ میں نے عصر کی نماز شیخوپور کے بازار ’’جے گہاں‘‘ میں

پڑھی۔ مسجد کے قریب ساغؔر صاحب کے فرزند شمس الزماں رومی کی دکان ہے، میں مسجد میں داخل ہورہا تھا کہ رومی بھی مسجد کی طرف چلے، ساغؔر صاحب دکان کے پاس کھڑے تھے، میں نے رومی سے کہا کہ ابا کو بھی لواتے آؤ، انھوں نے سن لیا، اور بڑی لجاجت سے بولے کہ اس ملاقات کے بعد آپ ان شاء اللہ مجھے نمازی پائیں گے۔

چنانچہ انھوں نے اپنا قول سچ کردکھایا۔ اس واقعہ کے چار پانچ ماہ کے بعد میں اپنے کمرے میں ظہر کی سنت پڑھ رہ تھا اچانک دروازہ کھلا اور دو صاحب کمرے میں داخل ہوئے، اور وہ بھی سنت میں مشغول ہوگئے، سلام پھیرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ساغر صاحب ہیں اور ان کے بھتیجے افتخار احمد، مجھے بہت خوشی ہوئی۔ واقعی میں نے انھیں نمازی ہی پایا۔

اب وہ باقاعدہ نماز کے پابند ہوگئے تھے، میں متعدد بار بارہ بنکی ان کے گھر گیا ہوں، میں نے دیکھا کہ وہ نماز کا خاص اہتمام کرتے ہیں ایک مرتبہ رات کو وہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، تو انھیں تہجد بھی پڑھتے ہوئے دیکھا، بہت سے اوراد ووظائف بھی پڑھتے تھے۔ محلّہ میں ایک مسجد کی تعمیر کا بھی اہتمام کیا۔ جب تک مکان پر رہتے، اسی مسجد میں نماز پڑھتے اور اذان بھی کہتے، وہ آواز جو غزلوں کے ترنم کیلئے مشہور تھی، اب صدائے اللہ اکبر سے مشرف ہورہی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی بھی آگئی تھی، اب مشاعروں سے ان کی دلچسپی کم ہوگئی تھی۔

ان کی اہلیہ کے دل کا آپریشن ہوا تھا۔ اس وقت وہ بڑا کرب محسوس کررہے تھے۔ بار بار مدرسے میں دعا کے لئے فون کرتے تھے، اللہ نے فضل فرمایا وہ صحت مند ہوگئیں، اس وقت ڈاکٹروں نے ان کا بھی معائنہ کیا تھا۔ ڈاکٹروں نے رائے دی کہ آپ بھی دل کا آپریشن کرالیں انھوں نے یہ رائے قبول نہیں کی، مجھ سے ایک

روز کہنے لگے کہ میرے دل کی بھی کئی رگیں بند ہوگئی ہیں۔ ڈاکٹروں کی تجویز ہے کہ میں بھی آپریشن کرالوں مگر میں نے اسے قبول نہیں کیا ہے۔ آپ دعا کیجئے اور مجھے کوئی دعا بتادیجئے تاکہ میں آپریشن کے جاں گداز مجاہدے سے بچ جاؤں۔ پھر اسی پر وہ مضبوطی سے جم گئے۔ جب ملتے تو ضرور کہتے کہ میں ٹھیک ہوں، آپ دعا کرتے رہیں۔

ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ جب بھی لکھنؤ کی طرف میرا سفر ہو، تو اطلاع دیدیا کروں، پھر موقع ہوتا تو مجھے اتار کر اپنے گھر لیجاتے، ورنہ اسٹیشن پر ہی ملاقات کرلیتے، ایک بار میں دیوبند جارہا تھا، میں نے انھیں اطلاع کردی۔ اترنے کا موقع نہ تھا، اسٹیشن پر گاڑی پہونچی، دوپہر کا وقت تھا۔ وہ اپنے گھر سے کھانا پکواکر پلیٹ فارم پر کھڑے تھے، ان کے ساتھ اسٹیشن کے متعدد عملے والے بھی موجود تھے، وہاں گاڑی کم ٹھہرتی ہے، مگر ساغر صاحب کی وجہ سے کچھ دیر ٹھہری رہی۔ کچھ تک باتیں ہوتی رہیں۔

اپنے آپریشن کے مسئلے کی یاددہانی کراتے رہتے، اور بار بار جوش سے کہتے کہ مجھے اللہ کے کرم پر بہت بھروسہ ہے، ان شاء اللہ آپریشن کی نوبت نہیں آئے گی۔

ادھر ملاقات کو عرصہ بیت گیا تھا۔ انتقال سے ایک ہفتہ قبل خبر سنی کہ دل کے آپریشن کی تیاری ہے، شیخوپور ضعیف والدہ اور اہل خاندان سے ملنے کیلئے آئیں گے، جس دن انتقال ہوا اس کے ایک دن بعد آنے والے تھے۔ میرے دماغ میں ان کا بار بار کا کہا ہوا جملہ گونج رہا تھا کہ آپریشن کی نوبت نہیں آئے گی۔ میں نے سوچا کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ میں نے بھی بہت دعائیں کیں کہ وہ آپریشن نہیں کرانا چاہتے تو اے اللہ! انھیں یونہی صحت مند کردیجئے۔

مگر کسے معلوم تھا کہ آپریشن کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ آغوش رحمت میں

چلے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں۔

ساغرؔ صاحب بہت بااخلاق اور صاحب مروت انسان تھے، ایک مرتبہ تین دن کیلئے بارہ بنکی کی تحصیل فتحپور میں میرا پروگرام تھا۔ ساغرؔ صاحب کی محبت تھی کہ وہ ان پروگراموں میں شریک رہے، جن لوگوں نے انھیں پہلے دیکھا تھا انھیں یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی ساغر صاحب ہیں، جو کبھی مشاعروں میں سرمستی کے عالم میں جھومتے جھامتے پہونچا کرتے تھے، انھوں نے ان پروگراموں میں متعدد نعتیں سنائی تھیں۔

ساغرؔ کے دل میں محبت کا اتھاہ جذبہ تھا۔ وہ کسی کو ناراض کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ ان کی اہلیہ ڈاکٹر سلطانہ بارہ بنکی کی مشہور ڈاکٹر ہیں۔ اللہ نے دست شفا عطا فرمایا ہے، بہت عاقل اور مدبر خاتون ہیں، ساغر صاحب کے چار صاحبزادے ہیں۔ پہلی اہلیہ سے جو مرحوم ہوچکی ہیں، ڈاکٹر قمرالزماں یہ مدینہ شریف کے کسی ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں، اور شمس الزماں رومی، یہ شیخوپور میں رہتے ہیں، بہت خوب شخص ہیں۔ دوسری موجودہ اہلیہ سے دو صاحبزادے جاوید احمد اور محمد طارق ہیں جو بارہ بنکی میں ہی رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو عافیت دارین نصیب فرمائیں۔ ساغرؔ صاحب کی مغفرت فرمائیں۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میرے استاذ

حضرت مولانا عبدالستار صاحب علیہ الرحمہ

وفات: ۵؍جمادی الاخریٰ ۱۴۲۵ھ (۲۳؍جولائی ۲۰۰۴ء)

میرے ابتدائی عربی فارسی کے استاذ حضرت مولانا قاری عبدالستار صاحب جمعہ کے روز پونے پانچ بجے شام ۵؍جمادی الاخریٰ ۱۴۲۵ھ کو ۹۱؍سال کی عمر میں دارالفناء سے رخصت ہوکر دارالبقاء میں حضور خداوندی میں حاضر ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ساڑھے دس بجے شب میں نماز جنازہ ادا کی گئی، صاحبزادگان محترم استاذی مولانا عزیزالرحمٰن صاحب مدظلہٗ اور ڈاکٹر حسام الدین صاحب نے امامت جنازہ کا شرف اس حقیر شاگرد کو بخشا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائیں۔ آمین

میری وابستگی حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ سے براہ راست ۴۲، ۴۳ سال رہی ہے۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں، میں نے مدرسہ اسلامیہ رحیمیہ بھیرہ میں مکتب کی تعلیم مکمل کی۔ اس مرحلہ کی تکمیل کے بعد طلبہ کے سامنے تین راہیں ہوتی تھیں، گھر والے دیندار ہوئے، تو بچے کو آگے دینی عربی تعلیم میں لگادیتے، بعض اپنے بچوں کو انگریزی اسکول میں داخل کردیتے، اور بہت سے تعلیم موقوف کراکے گھر کے کام کاج میں لگادیتے۔

مکتب کی تعلیم درجہ پانچ پر مکمل ہوتی ہے۔ بعض حضرات کے مشورے سے مجھے انگریزی اسکول کے حوالے کرنے کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں، لیکن اسی دوران ایک خاص واقعہ سے متاثر ہوکر انگریزی تعلیم سے میری رغبت جاتی رہی، اور ایک گونہ اس سے بُعد ہوگیا۔ میں نے اپنے والد صاحب سے اس کا ذکر کیا، تو انھوں نے میری یہ بات استاذ محترم کے سامنے پیش کی۔ مولانا بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ اس کو میرے حوالے کردو، میں اسے فارسی پڑھاؤں گا۔

اس وقت میرے لئے یہ بات بہت اہم سمجھی گئی۔ کیونکہ عرصۂ دراز سے مولانا تعلیم وتدریس سے یکسو ہوکر گھریلو کاروبار میں مشغول تھے، ہاں مدرسہ اسلامیہ رحیمیہ بھیرہ کے مستقل ناظم تھے، اور تعلیمی امور سے بہت دلچسپی رکھتے تھے، تاہم پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ بالکل نہ تھا مگر شہرت تھی کہ بہت صاحب استعداد ہیں، اور جب پڑھاتے تھے تو بہت اچھا پڑھاتے تھے، مجھ سے پہلے بعض طلبہ نے گاؤں کے مدرسہ میں اکا دکا فارسی پڑھی تھی، مگر مولانا نے خود نہیں پڑھایا تھا اب جبکہ مولانا از خود مجھے پڑھانے کیلئے آمادہ ہوئے، تو والد صاحب بھی بہت خوش ہوئے، کیونکہ وہ ان سے تعلیم حاصل کرچکے تھے، اور ان کے کمالات سے واقف تھے، بلکہ مداح ومعترف تھے، اور دوسرے لوگ بھی اسے میری سعادت اور خوش نصیبی قرار دے رہے تھے، بعض حضرات نے مجھے اس کی مبارکباد بھی دی۔

اس وقت میری عمر گیارہ بارہ سال تھی، میں مولانا کے گھر حاضر ہوتا۔ وہ کرگہہ پر کپڑا بُنتے ہوتے، میں انھیں سلام کرتا اور ان کے ایک دوسرے مکان میں آجاتا، جس میں رہائش نہ تھی، اس میں مولانا کے بہت بوڑھے والد جناب حاجی عبد الغفور صاحب علیہ الرحمہ رہتے تھے، میں اس میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا۔ مولانا فرصت پاتے تو آکر پڑھادیتے، یہ سلسلہ باوجود مولانا کی مصروفیت اور ناغوں کے اتنا

بابرکت ہوا کہ ڈیڑھ سال میں، میں نے فارسی کی اس وقت کی تمام درسی کتابیں پڑھ لیں، اور عربی اول کا نصاب بھی مکمل کرلیا۔ جس کیلئے عربی مدارس میں تین سال کی مدت صرف ہوتی تھی۔ مولانا نے اسے نہایت حسن وخوبی کے ساتھ ڈیڑھ سال میں سمیٹ دیا، میں ان کے حسنِ تعلیم اور خوبیٔ تدریس کو کیا بیان کروں، جو کچھ پڑھاتے تھے، دل میں اتار دیتے اور ذہن ودماغ میں بسا دیتے تھے، ڈیڑھ سال کے بعد انھوں نے مجھے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں بھیج دیا، اور وہاں عربی دوم میں میرا داخلہ ہوا۔

پھر تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا، اور مولانا سے تعلق گہرا ہوتا گیا، ان کی شفقتیں، محبتیں بڑھتی رہیں، میری تعلیم پر ان کی خصوصی توجہ برابر قائم رہی، اس سلسلے میں وہ میرا محاسبہ کرتے رہتے تھے، کیا کیا پڑھتا ہوں، اور کس طرح پڑھتا ہوں، اس کی پوری خبر رکھتے تھے، نامناسب باتوں پر تنبیہ فرماتے۔ کوئی بات پسند آتی تو خوش ہوتے۔

طالب علمی کے ابتدائی دور میں ہی میں ٹوٹی پھوٹی تقریر کرنے لگ گیا۔ کافیہ قدوری پڑھنے کے دوران میں نے گاؤں کی جامع مسجد میں تقریر کی تو بہت مسرور ہوئے، احیاء العلوم کے بعد تعلیم کی تکمیل کیلئے دار العلوم دیوبند حاضر ہوا۔ شوال میں داخلہ ہوا، اور بقرعید کی تعطیل میں گھر آیا، تو بہت ڈانٹا کہ اتنی دور سے اتنی جلد گھر آؤگے، تو پڑھوگے کیا، پھر وعدہ لیا کہ اب شعبان سے پہلے نہیں آؤگے لیکن اس کے بعد کچھ حوادث کی زَد میں، میں آگیا۔ اور اس سے میری تعلیم متاثر ہوئی، تو مولانا کو بہت افسوس ہوا، لیکن وہ تقدیری اور تکوینی امر تھا، شاید اسی لئے اس موضوع پر مولانا نے نہ مجھے ڈانٹا نہ پھٹکارا، اور نہ اظہارِ ناراضگی کیا۔ حالانکہ مجھ سے سنگین غلطی ہوئی تھی، لیکن ان کی شفقت ومحبت نے باوجود نوجوانی کے لاابالی پن کے اِدھر اُدھر بھکنے

نہیں دیا۔

تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد ڈیڑھ سال تک میں گھر پر رہا۔ بظاہر مولانا مجھ سے کچھ فرماتے نہیں تھے، لیکن ان کی خواہش ہمیشہ یہی رہی کہ میں تعلیم وتدریس کے مشغلہ میں لگوں، پھر جب میں یکسو ہوکر تعلیمی میدان میں آگیا، تو مولانا کی شفقت وعنایت میرے اوپر بیکراں ہوئی۔ یہ ان کی محبت وکرم کا ہی کا اثر تھا کہ ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہونے کے بعد ایک لحظہ کیلئے کبھی ان سے دوری نہیں ہوئی۔ میں خواہ کہیں بھی ہوں ان کی عنایت ومہربانی کی خوشبو میرے وجود کو معطر کئے رہتی، اور جب بھی باہر کہیں سے اپنے گاؤں بھیرہ میں آتا تو، تو پہلی حاضری ان کی خدمت میں دیتا، اور جب وہاں سے باہر جاتا تو آخری رخصتی ملاقات ان سے کرتا، وہ بہت بہت دعاؤں سے، خوشیوں سے، مسکراہٹوں سے نوازتے، ان کے پاس پہونچتا، تو ان کی مسرت دیکھ کر دل خوشیوں سے معمور ہوجاتا، اور جب ان کے پاس سے رخصت ہوتا، تو حوصلوں کی ایک دنیا ساتھ ہوتی۔

تعطیل کے ایام میں جتنے دن گھر رہنا ہوتا، عصر کے بعد مغرب تک ان کی خدمت میں حاضری ایک لازمی عمل تھا۔ اس وقت انھیں انتظار رہتا۔ وہاں حاضر ہوتا، صحن میں چارپائی بچھواتے، میرے ساتھ بہت سے لوگ آجاتے، سب کے بیٹھنے کا انتظام کرتے، پھر سب کو چائے پلاتے، اور خوش ہوتے، ادھر پچھلے کئی برسوں سے کولھے کی ہڈی توٹنے اور ضعف وعلالت اور سن رسیدگی کی وجہ سے بہت کمزور اور صاحب فراش ہوگئے تھے، تب بھی پچھلا سارا انتظام، اہتمام سے باقی رکھتے۔

میں جب ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوا، تو ان کی عمر پچاس سال کے قریب تھی، اس کے کافی پہلے سے وہ گاؤں کے مدرسے کے ناظم، اور جامع مسجد کے امام تھے، اس طرح وہ صرف مدرسے کے ناظم اور جامع مسجد کے امام ہی نہ تھے، بلکہ

پورے گاؤں کے قائد اور پیشوا تھے، ان کی رائے کے بغیر گاؤں کا کوئی اہم کام انجام نہیں پاسکتا تھا، پورے گاؤں کو ان کی پیشوائی تسلیم تھی، وہ نہایت پختہ رائے کے مالک تھے۔ کبھی کبھی جامع مسجد میں تقریر بھی فرماتے تھے، ان کی تقریریں خاص خاص مواقع پر اس وقت کی ہدایتوں پر مشتمل ہوتی تھیں، شعبان کی پندرہویں شب، رمضان سے پہلے، اور عیدالفطر وعیدالاضحیٰ کے مواقع پر، نیز گاؤں کے کسی خاص عوامی اور ہنگامی معاملات پر ان کی تقریریں ہوتیں، اور پورے گاؤں کو ان سے بڑی بصیرت حاصل ہوتی۔

جامع مسجد کے علاوہ اپنے محلّہ کی مسجد کے وہ پنج وقتہ نمازوں کے امام بھی تھے۔ وہ عالم تو تھے ہی، دارالعلوم مئو سے فراغت حاصل کی تھی، قاری بھی بہت عمدہ تھے۔ ان کا قرآن پڑھنا بہت معیاری تھا، وہ نماز میں مسنون سورتوں کی قرأت کرتے تھے، ضعف وعلالت کے لاحق ہونے سے پہلے ہمیشہ امامت وہی کرتے تھے، ان کی پابندی معروف تھی بالخصوص صبح کی نماز میں کبھی تخلف نہیں ہوتا تھا۔ وہ سحر خیزی کے عادی تھے، ہر موسم میں وہ صبح صادق سے پہلے بیدار ہوجایا کرتے تھے، اور اسی وقت تلاوت قرآن کرتے۔

مولانا کے والد حاجی عبدالغفور صاحبؒ نے طویل عمر پائی تھی، میں نے جب انھیں دیکھا تو بہت ضعیف ہوچکے تھے، مولانا ان کے اکیلے صاحبزادے تھے، وہ ان کی خدمت میں بہت مستعد تھے، کتنے ہی ضروری کام میں ہوتے، والد صاحب کا اشارہ پاتے تو فوراً حاضر خدمت ہوتے اور ان کی منشاء کی تعمیل وتکمیل نہایت بشاشت سے کرتے، بارہا ایسا ہوا کہ مولانا گھر سے دور کھیتی باڑی کے کام میں ہوتے، اور حاجی صاحب انھیں کسی ذریعے سے بلاتے، تو وہ بلاتاخیر سب کام چھوڑ کر گھر چلے آتے۔ والد صاحب کی خدمت ودلداری میں، بہت معروف تھے، ان کی اس ادا

سے گاؤں کا ہر شخص واقف تھا، اور اس کا بھی تذکرہ ہوتا کہ حاجی صاحب کے والد حسینی بابا نے بھی طویل عمر پائی تھی، اور حاجی صاحب نے ان کی بے نظیر خدمت کی تھی، حسینی بابا نماز باجماعت کے بہت پابند تھے، جب وہ مسجد جانے سے معذور ہو گئے تھے، تو حاجی صاحب انھیں اپنی گود میں اٹھا کر مسجد لے جاتے تھے، مولانا نے بھی اپنے والد صاحب کی خدمت اسی رنگ میں کی تھی، حق تعالیٰ کی مہربانی دیکھئے کہ جب مولانا ضعف وعلالت کی شدت میں پہونچے تو انکے صاحبزادوں، پوتوں اور نواسوں نے بہت مستعدی سے خدمت کی۔

ان کے بڑے صاحبزادے استاذ محترم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مدظلہٗ جو خود بڑھاپے کی عمر کو پہونچ چکے ہیں، اور گوناگوں امراض سے دوچار رہتے ہیں، ہمہ وقت خدمت میں حاضر رہتے، اور ہر خدمت نہایت بشاشت سے انجام دیتے۔ چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر حسام الدین صاحب گاؤں سے کچھ فاصلے پر خیرآباد قصبہ میں مطب کرتے ہیں، مطب جانے سے پہلے اور وہاں سے آنے کے بعد مولانا کی خدمت ہی مشغلہ تھا، پھر دونوں کے صاحبزادگان ہر وقت حاضر باش رہتے، اور دادا کی خدمت کا شرف حاصل کرتے۔

کئی برس پہلے مسجد کے صحن میں گر گئے تھے، اور غالباً دایاں کولھا ٹوٹ گیا تھا۔ علاج کے بعد وہ تندرست ہو گئے۔ مگر ایک مرض چکر آنے کا ہو گیا تھا کھڑے نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے، مگر مسجد کی حاضری اس حالت میں بھی جاری تھی، اس سال جاڑوں کی ابتداء میں پھر دوسرا کولھا ٹوٹ گیا۔ بظاہر کوئی چوٹ نہیں تھی، نہ کہیں گرے تھے، غالباً کروٹ وغیرہ لینے میں ہڈیوں کی کمزوری کی وجہ سے ایسا ہو گیا۔ جس کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا، اور پاؤں میں چمک اور تشنج کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، تکلیف بڑھتی گئی، ہڈی بیٹھانے والے لوگ دیکھتے رہے، مگر کولھے کی

ہڈی کے فریکچر ہونے کا احساس نہیں ہوا، تکلیف بہت بڑھ گئی، اور کئی ماہ گزر گئے، تو میری درخواست پر اعظم گڈھ کے ہڈی کے مشہور معالج جناب ڈاکٹر جاوید صاحب باوجود اپنی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت کے میرے ساتھ بھیرہ گئے۔ انھوں نے ہاتھ رکھتے ہی بتا دیا کہ کولھے کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے، پھر مولانا ان کے مشورے سے اعظم گڈھ لائے گئے، اور شہر کے دوسرے مشہور معالج ڈاکٹر فرقان احمد صاحب کے ہسپتال میں داخل کئے گئے۔ علاج ڈاکٹر جاوید صاحب کا تھا، اور ہسپتال ڈاکٹر فرقان احمد صاحب کا، ہر دو ڈاکٹر صاحبان نے میرے اوپر کرم فرمایا۔ اور مولانا کی خدمت اور علاج نہایت تندہی اور اہتمام کے ساتھ کیا۔ ۲۲/ دن تک مولانا یہاں رہے، پاؤں کی تکلیف کم ہو گئی، مگر کمزوری کی وجہ سے کھڑے نہیں ہو سکے، یہاں سے واپسی کے بعد ضعف کا غلبہ بڑھتا چلا گیا۔ وفات سے پانچ چھ دن پہلے خدمت میں حاضر ہوا، تو سانس اکھڑ اکھڑ کر آ رہی تھی ہر تھوڑی تھوڑی دیر پر زبان سے کلمہ طیبہ پڑھتے تھے، چہرے کا تغیر بتا رہا تھا کہ زندگی کا یہ مسافر اب جلد ہی کمر کھولنے والا ہے، منزل قریب آ لگی ہے، شاید انھیں بھی احساس ہو چلا تھا، نبض دکھلاتے تھے کہ چل رہی ہے؟ طہارت کا اس حال میں بھی بڑا اہتمام تھا۔ ذرا بھی احساس ہوتا تو بیٹوں اور پوتوں کے سہارے استنجا سے فراغت حاصل کرتے تھے۔

وفات سے دو ایک روز پہلے آواز ساتھ چھوڑنے لگی تھی، مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نے کلمہ کی تلقین کی کہ پڑھتے رہئے۔ آہستہ سے فرمایا کہ جاری ہے۔ جمعہ کے روز نمازِ عصر سے کچھ پہلے پونے پانچ بجے، اس طرح سہولت سے روح پرواز کر گئی کہ پاس والوں کو بھی بعد میں احساس ہوا کہ زندگی موت سے ہم آغوش ہو چکی ہے۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون**

میں نے تجہیز وتکفین کے بعد چہرے کی زیارت کی، کتنا سکون چہرے پر نثار

ہو رہا تھا، برسوں کا اضطراب، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راحت وسکینت میں تبدیل ہو چکا ہے۔

ساڑھے دس بجے شب میں نماز جنازہ ہوئی۔ اور گاؤں کے عام قبرستان میں اللہ کی یہ امانت آغوشِ زمین کے سپرد کردی گئی۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ کے سایے میں مولانا کو جگہ عطا فرمائیں، ان کی مغفرت فرمائیں، تدفین کے بعد میں نے اپنے دل میں ایک ایسا سناٹا محسوس کیا، جس کو لفظوں میں تعبیر کرنا مشکل ہے، ۴۲۔۴۳/ سال کا تعلق سُونا سُونا سا ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا عبداللہ صاحب مہاجر مدنی علیہ الرحمہ

المتوفی ۳۰/رجب ۱۴۲۵ھ

۱۱/ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ مطابق جولائی ۱۹۸۹ء کی بات ہے، یہ خاکسار اپنے رفیق حج جناب قاری غریب نواز مظفر نگری کی معیت میں رمیِ جمار کے لئے منیٰ کے ہجوم میں گزر رہا تھا۔ اچانک قاری صاحب رُک گئے، دیکھا تو ایک منحنی سے سفید ریش بزرگ سے بہت ادب واحترام کے ساتھ مصافحہ کررہے ہیں، اور نہایت مؤدبانہ لہجے میں خیریت دریافت کررہے ہیں، میں بھی ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا، اور مصافحہ کے لئے میں نے بھی ہاتھ بڑھائے، ریشم جیسے ملائم ہاتھوں کے لمس نے جسم سے لے کر روح تک کو شادابی اور تازگی بخش دی، گہرے سانولے رنگ کے دُبلے پتلے جسم سے ایمان وتقویٰ کی روشن شعاعیں نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں، آنکھیں سرورِ عشق سے لبریز تھیں، چہرہ یقین کے نور سے دمک رہا تھا۔ آواز کی نرمی اور لہجے کی حلاوت دل کی گہرائیوں میں رَس گھول رہی تھی۔ میرے سامنے ایک ایسا جسم تھا، جو جسم نہیں روح معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے ہمت نہیں ہوئی کہ تعارف کے متعلق کچھ دریافت کرتا، قاری صاحب نے ان سے میرا کچھ ذکر کیا۔ فرمایا ابھی مدینہ تشریف تو نہیں لے گئے ہوں گے؟ پھر فرمایا جب آپ تشریف لائیں تو مجھ سے ملیں۔

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے، وہ رمی کرکے واپس ہو رہے تھے، قاری صاحب نے بتایا کہ یہ مولانا عبداللہ صاحب بستویؒ ہیں۔ تاؤلی (مظفر نگر) کے مدرسہ میں بہت عرصہ تک رہے ہیں، میرے استاذ ہیں، نومسلم ہیں، شیخ الاسلام حضرت مولانا

سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہٗ کے مرید اوران کے عاشق زار ہیں، نہایت بزرگ ہیں، بہت دنوں سے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے سامنے ایک عمارت میں عبادت وریاضت میں مصروف ہیں، وہ عمارت صرف عابدوں اورزاہدوں کے لئے ہے۔ اور بہت کچھ ان کی تعریف کی۔

بات آئی گئی ختم ہوگئی۔ میں اس سرزمین قدس کو پاکر ایک خاص مستی اور سرشاری میں تھا، وہاں کہاں ہوش تھا کہ کوئی بات یادرہتی، وہاں تو اپنی ذات فراموش ہوئی جارہی تھی، قسمت نے ایسی جگہ پہنچایا تھا کہ نہ اپنا نہ غیر کچھ یادنہ رہا تھا۔ حج کے بعد تقریباً بیس دن مکہ مکرمہ میں قیام رہا۔

۲؍محرم کو مدینہ منورہ حاضری ہوئی، شام کو مغرب کی نماز کے بعد، میں مسجد نبوی سے نکل رہا تھا، بابِ مجیدی والے صحن میں پہونچا تو ایک شخص پیچھے سے دوڑتا ہوا آیا کہ تاؤلی والے مولانا عبداللہ صاحب آپ کو بلارہے ہیں۔ یہ نام مجھے اجنبی سا لگا۔ میں نے ناواقفیت کا اظہار کیا اور کہا کہ کسی اور کو بلارہے ہوں گے، اس نے کہا، نہیں! آپ ہی کو بلارہے ہیں۔ یہیں قریب ہی ہیں، آپ چل کر مل لیجئے۔ میں بادل ناخواستہ اس کے ساتھ ہولیا، دیکھا تو وہی بزرگ تھے جن سے ایک لمحے کے لئے منیٰ کے ہجوم میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں حیرت زدہ ہوگیا کہ اتنا ضعیف آدمی اور اتنا قوی حافظہ! ایک لمحہ کی سرسری ملاقات اوراتنی پختہ یادداشت! فرمانے لگے، آپ سے منیٰ میں راستے میں ملاقات ہوئی تھی، اور میں نے عرض کیا تھا کہ مدینہ میں ملئے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ملاقات ہوگئی۔ صبح اشراق کے بعد آپ کی دعوت ہے، میں یہیں، اسی جگہ ملوں گا۔ آپ اشراق کے بعد آجایئے گا۔ میں نے عرض کیا حضرت ساتھ ایک قافلہ ہے، فرمایا جتنے ہوں، سب کی دعوت ہے، میں منتظر رہا کہ تعداد پوچھیں گے، مگر انھوں نے کچھ نہیں پوچھا بس یہی فرماتے رہے کہ سب لوگ تشریف لائیں، بڑا کرم ہوگا۔ بڑی عنایت ہوگی۔ میں دل میں سوچتا رہ گیا کہ گنتی تو پوچھی نہیں، کیا حوصلہ ہے؟ کیا ہمت ہے!

دوسرے دن صبح کو ہمارے امیر قافلہ حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب امام نور مسجد بمبئ تفصیلی طور پر مسجد نبوی کے خاص خاص مقامات دکھانے اور ان کا تعارف کرانے لگے، اس میں کافی دیر ہوگئی، اور میں ان سے حضرت مولانا عبداللہ صاحب بستوی کی دعوت کا تذکرہ کرنا بھول گیا۔ مسجد کی تفصیلی زیارت کے بعد یہ دعوت یاد آئی، میں نے قاری صاحب سے ذکر کیا۔ اب ہم اس جگہ پہونچے جہاں کا وعدہ تھا، دیر ہوگئی تھی۔ مولانا انتظار کرکے جاچکے تھے، شام کو پھر وہیں ملاقات ہوئی، میں نے شرمندگی کے ساتھ معذرت کی، نہایت مہربانی کے ساتھ فرمایا کوئی حرج نہیں، کل یہیں ملئے۔ دوسرے دن ان کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر حاضری ہوئی، جو پانچویں منزل پر تھی۔ بہت پُر تکلف دسترخوان بچھا، بڑے اہتمام سے ضیافت فرمائی۔ اور بہت زیادہ ممنون کرم ہوئے اتنا شکریہ ادا کیا اوراس اس طرح شکریہ ادا کیا جیسے ہم لوگوں نے ان پر کوئی بڑا احسان کیا ہو۔

میں تو محبت وکرم کا گھائل ہوں۔ باربار حاضری دینے لگا۔ کبھی تنہا، کبھی قاری غریب نواز صاحب کے ساتھ اوراکثر اپنے رفیق سفر قاری نسیم الحق صاحب معروفی کے ساتھ! اور جب حاضری ہوئی دسترخوان کی تازگی اور شادابی کچھ بڑھی ہوئی معلوم ہوئی، انواع واقسام کے کھانے، مدینے کی خاص کھجوریں، انگور اور دوسرے فواکہ، اوران سب سے لذیذ تر مولانا کی باتیں، اوران کی دلآویز ادائیں اور بچھ جانے کے انداز!

جب مدینہ شریف سے رُخصت ہونے لگے تو خاصی مقدار میں خاص مدینہ کی کھجوریں عنایت فرمائیں، کچھ تازہ رَس بھری ہوئی جنھیں ''رُطَب'' کہتے ہیں

، اور فرمایا کہ یہ بمبئی تک کام دیں گی، اور بہت سی باغ کی پکی ہوئی وہ کھجوریں، جو عرصہ تک باقی رہ سکتی ہیں، مدینہ شریف سے جو تحفے ہم لے کر چلے ان میں ایک قیمتی تحفہ مولانا کی عنایت وشفقت اور بزرگانہ محبت کی سوغات تھی۔

ایک سال کے وقفہ سے پھر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، ہم چار افراد تھے، دیکھتے ہی فرمایا، آپ لوگ یہاں مدینہ طیبہ میں قیام کا نظم ایسا بنائیں کہ زیادہ سے زیادہ مسجد نبوی میں حاضری کی سعادت حاصل ہو۔ پھر خود ہی نظام بنایا کہ ۸/ بجے صبح کو آپ لوگ میرے یہاں آکر کھانا کھالیں، پھر دن بھر کھانے کی فکر سے آزاد رہیں، اور مسجد شریف حاضر رہیں، بعد نماز مغرب فوراً آکر رات کا کھانا کھالیں، اور پھر اطمینان سے بعد نماز عشاء مسجد بند ہونے کے وقت صلوٰۃ وسلام پڑھ کر نکلیں، اس نظام کو اتنے خلوص اور محبت کے ساتھ بنایا کہ ہم لوگ معذرت بھی نہ کر سکے۔ اور پھر اسی پر عمل رہا، اس کی برکتیں خوب مشاہدے میں آئیں۔

چند سالوں کے بعد والدین کی معیت میں سفر حرمین کا ارداہ ہوا، یہ چھ آدمیوں کا قافلہ تھا، سفر سے کئی ماہ پہلے بمبئی میں حضرت مولانا سے ملاقات ہوئی۔ بہت محبت سے ملے۔ فرمایا کہ اب وہ عمارت ٹوٹ کر حرم کی توسیع میں آگئی ہے، اور میں قبا میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ اس سال سفر کا ارادہ ہے، بہت خوش ہوئے۔ اور بہت محبت بلکہ لجاجت سے فرمایا کہ مدینہ شریف میں آپ اپنے قافلے کے ساتھ میرے گھر قیام کریں۔ میرے بیٹے فجر کی نماز میں اپنی گاڑی سے مسجد نبوی پہنچائیں گے، پھر وقت وقت سے لاتے اور لیجاتے رہیں گے، آپ لوگوں کو زحمت نہ ہوگی، میں نے بہت معذرت کی، مگر مولانا اپنے بزرگانہ انداز میں بار بار تاکید کرتے رہے۔

دو سال قبل مدینہ طیبہ حاضری ہوئی۔ مولانا کو اطلاع نہیں کی تھی، اپنے ایک

بہت ہی مخلص بزرگ مولانا حافظ محمد مسعود صاحب امام مسجد رحمت مدینہ منورہ کی معیت میں بغیر سابقہ اطلاع کے قباء میں ان کی خدمت میں جا پہونچا، مولانا اپنے چاہنے والوں کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے، محبت وعنایت کی بارش برسا رہے تھے، دیکھا تو بہت نحیف ونزار نظر آئے، بینائی برائے نام ہی تھی، لیکن جوش قلبی اپنے پورے عروج پر تھا، محبت ہی محبت، عنایت ہی عنایت! سلام کیا، مصافحہ کیا اور قریب ہی بیٹھ گیا، حافظ مسعود صاحب سے خیریت پوچھنے لگے۔ پھر اچانک ان سے دریافت فرمایا کہ مولانا اعجاز احمد صاحب حج کے لئے آنے والے تھے، آپ کو کچھ معلوم ہے، مدینہ آئے ہیں یا نہیں؟ آج میں رات بھر ان کے ساتھ رہا ہوں۔ حافظ صاحب مسکرائے، اور عرض کیا، وہ آپ کے پہلو میں بیٹھے ہیں۔ بہت خوش ہوئے، اور کھڑے ہونے لگے، میں نے روکا تو فرمایا نہیں معانقہ کروں گا، چنانچہ کافی تکلف اور تکلیف سے اُٹھے، نقاہت کا تسلط تھا۔ مگر ہمت میں ضعف نہ تھا۔ اُٹھے اور معانقہ کیا اور فرمایا کہ رات میں صبح تک آپ کے ساتھ رہا۔ پھر اس معمہ کو اس طرح حل کیا کہ، میں ''المآثر'' کے پرانے شمارے نکال نکال کر آپ کے مضامین پڑھوا کر سنتا رہا۔ اسی میں رات بسر ہوگئی۔ میری آنکھیں خوشی سے چھلک پڑیں۔ ان اللہ والوں کا دل کیا ہے؟ محبت وشفقت کا خزانۂ عامرہ! محبت کی سوغات بانٹتے رہتے ہیں، اور کم ہونے کے بجائے، یہ خزانہ بڑھتا ہی رہتا ہے، اس ملاقات میں بھی عنایت ودلداری کا وہی کیف تھا، جس کا میں پہلے سے ذوق آشنا تھا۔ بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر! اپنے صاحبزادے مولوی عبد الرحمٰن صاحب کو متعین کر دیا تھا، وہ سورج طلوع ہونے کے بعد تلاش کرتے تھے، ان کا حکم تھا کہ اشراق کے بعد مسجد نبوی کے باہر گنبدِ خضرا کے قریب رہا کرو، وہاں سے میرے ساتھ گھر چلو، ابا کے ساتھ ناشتہ کرو، پھر کچھ دیر بیٹھو، میں پھر پہونچا دیا کروں گا، بیٹے میں باپ والا انداز صاف دکھائی دیتا تھا۔ سعادت

سمجھ کران کے حکم کی اکثر تعمیل کرتا تھا۔

مولانا اس دور میں اسلاف کے نمونۂ صالح تھے، آنکھیں سرورِ عشق سے سرشار اور چہرہ یقین کے نور سے روشن تھا۔ دل اللہ پر توکل واعتماد سے لبریز تھا۔ زبان پر ہر حال میں شکر گزاری کے زمزمے جاری رہتے تھے، حق تعالیٰ کی جانب سے غیبی فیوض وبرکات کی لگاتار اور موسلا دھار بارش برستی رہتی تھی، دسترخوان ان کا بہت وسیع تھا، لوگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ دن بھر لگا ہی رہتا تھا۔ اور مولانا کے یہاں دسترخوان بچھا ہی رہتا تھا، خواہ جتنے آدمی ہوں، اور جب بھی آجائیں، دیکھا یہی کہ سب آسودہ ہوکر اُٹھتے تھے، اور مولانا ہر آنے والے کو اپنا محسن سمجھتے تھے اور بہت خوشی اور مسرت سے شکریہ ادا کرتے تھے۔

ان کی مہمان نوازی اور فیاضی دیکھ کر عقلیں حیران رہ جاتی تھیں، بچپن میں پرانے حاجیوں کی زبانی مکہ مکرمہ کے مولانا زمزمی علیہ الرحمہ کے اس طرح کے واقعات سنا کرتا تھا۔ مولانا سے ملاقات ہوئی، اور بار بار حاضری ہوئی تو وہی مولانا زمزمی یاد آتے تھے، مجھے اکثر گمان ہوا کہ مولانا زمزمی یہی تو نہیں ہیں؟ مگر ان کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا۔

عابدوں، زاہدوں کی اسی عمارت میں لاہور کے ایک بزرگ مولانا محمد عارف صاحب رہا کرتے تھے، استاذی حضرت مولانا قاری حماد الاعظمی مدظلہٗ کی ہدایت پر ایک روز ان کے یہاں حاضری ہوئی، کسی تقریب سے مولانا عبد اللہ صاحب کا ذکر چل پڑا، کسی نے ان کے دسترخوان کا ذکر کیا، فرمانے لگے ان پر غیبی برکتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا عبد اللہ صاحب نومسلم تھے، تعلیم کے سلسلے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی آغوشِ تربیت میں آگئے۔ حضرت کی نگاہِ کیمیا اثر نے کُندن بنادیا، دارالعلوم دیوبند سے حضرت شیخ کے درسِ بخاری سے اُٹھے، اور انھیں کے حکم سے تاؤلی ضلع مظفر نگر کے مدرسہ میں بیٹھ گئے۔

حضرت شیخ کے عاشقِ زار تھے، ان کا ذکر آتا، تو ان پر خاص کیفیت چھا جاتی، حضرت کے پورے خانوادے سے انھیں گہرا تعلق تھا۔ اس تعلق کی حلاوت ان کے پورے وجود سے محسوس ہوتی تھی، میں انھیں اور ان کی اس کیفیت کو دیکھتا تو اکثر سوچتا کہ اللہ والے جب کسی اللہ کے خاص بندے کی محبت میں ڈوبتے ہیں، تو کتنے روشن اور بیش قیمت موتی بن کر ابھرتے ہیں۔ اللہ والوں کی یہ محبت انھیں سیدھے خدا کے آستانے تک پہنچا دیتی ہے۔ میں یہ بھی سوچتا کہ حضرت شیخ الاسلام کی شخصیت بھی کیا عظیم تھی، جس کی آغوش میں نہ جانے کتنے خاک کے ذرے آفتاب وماہتاب سے ہم عناں ہوئے۔

مولانا اپنے زہد وعبادت اور سخاوت وریاضت کے ساتھ ایک بڑے عالم بھی تھے، علم کا شغف اخیر عمر تک برقرار رہا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علمی جوش فزوں تر ہوتا جارہا ہے، اسی کے ساتھ حق تعالیٰ نے ان کے پاکیزہ قلب میں دینی حمیت وغیرت کا مادہ بھی بحظ وافر رکھا تھا۔ بڑھاپے میں جبکہ تمام قُویٰ مضمحل اور کمزور ہوگئے علمی شغف قابل دید تھا۔ اسی ضعف وکبرسنی کے دور میں مولانا نے ’’**عقود الجمان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان**‘‘ جیسی مفصل اور مبسوط کتاب کا ترجمہ کیا۔ اور وہ شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند سے ’’تذکرۃ النعمان‘‘ کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے پیش لفظ میں حضرت مولانا عاشق الٰہی بلندشہری مہاجر مدنی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

> ’’ہمارے محترم حضرت مولانا عبد اللہ بن عبد الوہاب صاحب بستوی مہاجر مدنی دامت برکاتہم کو کتاب مذکور (عقود الجمان) کا نسخہ پہونچا تو

اس کا ترجمہ کئے بغیر ان سے صبر ہی نہ ہو سکا، پیرانہ سالی، ضعف وعلالت کے باوجود گرتے پڑتے، اُٹھتے بیٹھتے لگ لپٹ کر کتاب مذکور کا ترجمہ لکھ دیا ۔ اصل کتاب چار سو صفحات پر مشتمل ہے، امراضِ قلب وغیرہ میں مبتلا ہوتے ہوئے اتنا بڑا کام کر دینا محض اللہ جل شانہ کا فضل ہے، دونوں دردِ دل ایک ساتھ چلتے رہے، مرض والا درد بھی اور عشق ومحبت والا درد بھی، دونوں کا مقابلہ اور مصارعہ رہا، لیکن درد دل (بالمعنی المشہور) ہی غالب ہو کر رہا، اور الحمدللہ ترجمہ پورا ہو گیا۔

خود مولانا نے ترجمے کے مقدمے میں ابتداءً جو چند سطریں لکھی ہیں، ان سے ان کی دینی حمیت وغیرت اور ان کے مزاج وطبیعت کا اندازہ ہوگا۔ آج اس رنگ ومزاج کا فقدان ہے، اس کی وجہ سے دینی جذبہ کمزور اور مجروح ہے، اقتباس تو طویل ہے مگر میں اس کی افادیت کے پیش نظر اسے نقل کرتا ہوں، شاید قلب ونگاہ میں جگہ بنائے۔ فرماتے ہیں:

''اس مالک حقیقی کا بے حساب شکر اور اس کے لئے بے پایاں حمد ہے، جس نے عدم سے وجود بخشا، ظلمات کفر سے نکال کر نور ایمان سے منور کیا۔

ے

اے خدا! قربان شوم احسان بر احساں کردۂ
آدمیت دادۂ بازم مسلمان کردۂ

پھر کئی اساتذہ اور جلیل القدر علماء کے نام لکھ کر فرمایا:

''ان بزرگوں کی خدمت میں رہ کر میرا دل اسلام اور اس کے عظیم دُعاۃ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کی محبت سے خوب لبریز ہو گیا۔

ان کانوں نے ائمہ اربعہ میں سے کسی کی شان میں بے ادبی کے الفاظ

اساتذۂ کرام سے نہیں سنے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تکمیل دینیات کے لئے داخلہ لیا، وہاں ائمہ اربعہ، قاضی شوکانی، داؤد ظاہری، اور دوسرے ائمہ کے اسمائے گرامی اور مسائل دینیہ میں ان کی آراء ادب واحترام کے ساتھ زینت قلب وذہن بنیں۔ تقریباً ۳۵؍سالہ تدریسی خدمات بھی یونہی گزر گئیں کہ اختلافِ ائمہ کو خطا وصواب کی حد تک سمجھتا رہا، حق وباطل کا اختلاف تصور میں نہیں آیا، اسی طرح سلف صالحین میں سے کسی کی تنقیص نہ سنی، نہ وہم وگمان ہوا۔

ایک زمانے میں جب حرمین شریفین کا قیام نصیب ہوا، تو بہت سے مدعیان علم ایسے دیکھے گئے، جن کا سطحی علم بظاہر ائمہ حضرات، خاص کر امام الائمہ امام ابوحنیفہ **رحمہم اللہ** کی تنقیص اور ان کے فقہی مسائل کی تغلیط ہی کے لئے مخصوص ہے، مسائل کو مکروہ صورت میں بیان کرتے، اور استہزاء کرتے ہوئے دیکھا، میں اب تک جن کو فرقۂ ناجیہ، اور **ماانا علیہ واصحابی** تصور کئے ہوئے تھا ان کی جانب ایسے مکروہ افعال واقوال کی نسبت پریشان کرنے لگی، رحمت خداوندی نے نصرت کی، امام ذھبی، امام ابن عبدالبر، حافظ احمد بن حجر عسقلانی، حافظ جلال الدین سیوطی، علامہ عبد الوہاب شعرانی اور علامہ عبدالحلیم ابن تیمیہ **رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃً** کی تصریحات اور ان کی آراء سامنے آئیں۔ زیر نظر کتاب **عقود الجمان** کو حرفاً حرفاً پڑھا، بڑی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ ان اساطین دین مبین کے مراتب اعلیٰ علیین میں بلند فرمائے، حق وانصاف کا حق ادا کر دیا ہے۔

مولانا نے جو کچھ ان سطروں میں لکھا ہے، واقعہ ہے کہ وہ ادب واحترام،

انسانیت وآدمیت اور تواضع ومروت کے ایک پیکر جمیل تھے، ان کی صحبت میں بیٹھنے سے علم ودانش کے ساتھ ادب ووقار کا بہترین درس ملتا تھا۔

مولانا کی دیرینہ آرزو کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے فرمائی، ایک عاشق رسول کی تمنا اور آرزو کیا ہوسکتی ہے؟ یہی کہ جوارِ رسول ﷺ میں، جان جاں آفریں کے حضور پہونچے۔

مدینہ ہو مرا مدفن الٰہی   بسوں میں زیرِ دیوارِ محمد

چنانچہ ۳۰/رجب ۱۴۲۵ھ کو مدینہ طیبہ کی پاک سرزمین پر طائر روح، جسد عنصری کے قفس سے آزاد ہوا، مسجد نبوی علیٰ صاحبها التحية والصلوٰة میں نماز جنازہ پڑھی گئی، اور عبادت وریاضت کے خمیر سے گندھا ہوا جسم جنۃ البقیع میں زمین کی امانت بنا، اور روحِ مقدس؟ اللہ ہی جانتا ہے کہ کن بلندیوں میں پرواز کررہی ہوگی۔

اتنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہوا   اور اس سے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہوا

☆☆☆☆☆☆☆

حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم (بلریا گنج)

المتوفی ۳/رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

شیخوپور کے پڑوسی قصبہ بلریا گنج کے رہنے والے، ملک گیر شہرت کے حامل طبیب، جن کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی تھی، جن کا علاج غریبوں کے لئے بھی اتنا ہی آسان تھا، جتنا کسی صاحب ثروت کیلئے ہوتا، جن کی انسانیت اور جن کی خوبیوں کا کلمہ ان کا ہر مریض پڑھتا، وقت کا یہ مسیحا عرصہ سے بیمار تھا، لیکن اس حالت میں بھی مریضوں کے علاج کا سلسلہ جاری تھا۔ علالت کا یہ سلسلہ دراز ہوا۔ بالآخر موت کا فرشتہ دربارِ خداوندی میں حاضری کا پروانہ لے کر ...... رمضان المبارک بروز..........شام کے وقت آگیا، اور حکیم صاحب کی روح بدن کی سواری سے اُتر کر فرشتوں کی معیت میں حاضری کے لئے روانہ ہوگئی۔ **رحمه الله وغفر له الرحمن ولقيه مع روح ورضوان، آمين يارب العٰلمين**

حکیم صاحب سے میرے تعلقات بہت بعد میں ہوئے، مگر ان سے ملاقات اور ان سے تاثر بہت پہلے سے تھا، اس وقت سے، جبکہ میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں عربی درجہ چہارم کا طالب علم تھا، اور یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے، میری بہن بہت بیمار تھی، بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ بلریا گنج حکیم محمد ایوب صاحب کا علاج کیا جائے، میری عمر اس وقت پندرہ سال تھی، حکیم صاحب کی شہرت خاصی ہوچکی تھی، بہت صبح سے نمبر لگانا ہوتا تھا۔ میں نے اول وقت مدرسہ میں فجر کی نماز پڑھی، اور پیدل مبارک پور سے بلریا گنج کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ دس میل کا یہ فاصلہ

طے کر کے ۷/ بجے کے قریب مطب میں پہونچا، تو نمبر والوں کی قطار بہت لمبی تھی۔ میں بھی اسی لائن میں لگ گیا۔ ۱۰/ بجے میرا نمبر آیا۔ حکیم صاحب نہایت مہربانی سے ملے، بہت توجہ سے پوری بات سنی، اور پرچہ لکھ دیا، کہ ۲۸/ دن کی دوا لے لو۔ اسکے بعد پھر حال بتانا۔ ۱۱/ بجے مجھے دوا ملی۔

معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کے یہاں ۱۶/ آدمیوں کا عملہ صرف دوا کوٹنے پیسنے، اور باندھنے پر مامور ہے۔ حکیم صاحب کا طریقۂ علاج منفرد تھا۔ انگریزی دعائیں پیس کر سفوف بنا کر پڑیوں میں دیتے تھے، اپنی دواؤں کے نام خود ہی وضع کئے تھے، نسخہ اردو رسم الخط میں لکھتے تھے، دوائیں بہت سستی ہوتی تھیں۔ اور بہت کم ایسے لوگ ملتے تھے، جو یہ کہتے ہوں کہ حکیم صاحب کی دوا سے فائدہ نہیں ہوا، خاص طور سے کنٹھ مالا کا علاج کرتے تھے، اس کے مریض ملک بھر سے ان کے پاس آتے تھے، اور شفایاب ہوتے تھے۔

پھر ہر مہینہ میری حاضری ہونے لگی۔ جب تک بہن کو صحت نہیں ہوئی، یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں دیکھتا تھا کہ مریضوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بڑا مشفقانہ اور محبانہ رہتا تھا۔ وہ مریض سے ڈاکٹر اور طبیب کی طرح نہیں گھر کے سرپرست کی طرح، ماں اور باپ کی طرح بات کرتے، اس کا دکھ درد معلوم کرتے، اور کوشش کرتے کہ علاج میں وہ کم سے کم زیر بار ہو، بکثرت سننے میں آتا کہ وہ مریضوں کی تنگدستی کا خاص لحاظ کرتے، کتنوں کو مفت دوا دیتے، بہتوں کی وہ پوشیدہ طور سے مدد بھی کرتے، انھوں نے شاید اپنے پیشے سے دولت کمانے کی کوشش نہیں کی، لیکن ان کی نیت کی برکت تھی، یا ان کا حسن اخلاق کہ اللہ تعالیٰ نے دولت دنیا سے بھی انھیں بہت بہت نوازا۔

بعض مریضوں کو وہ دوا بھی دیتے، آمدورفت کا کرایہ بھی دیتے، اور ضرورت محسوس کرتے تو اپنے گھر کا ایک فرد بنا کر رکھتے بھی۔ میں ایک ایسے غریب مریض کو جانتا ہوں کہ انھیں اپنے گھر رکھ کر علاج کیا۔ اور پھر ان کی زندگی بھر خبر گیری کرتے رہے، حتیٰ کہ عید بقرعید پر کپڑے وغیرہ بنوا کر بھیجتے۔

طالب علمی کے دور کے بعد مجھے اپنے وطن میں قیام کا موقع بہت کم ہوا۔ اسلئے پھر کبھی بلریا گنج حکیم صاحب کے پاس آنے کی نوبت نہیں آئی۔ ۱۹۹۰ء میں شیخوپور آیا...... بلریا گنج یہاں سے صرف ۵/ کلومیٹر ہے...... تو حکیم صاحب سے تعارف وتعلقات کی بنیاد پڑی۔ حکیم صاحب نظریاتی اعتبار سے جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے، جماعت اسلامی کے ادارہ جامعۃ الفلاح کے رکن رکین تھے، اور مجھے اس جماعت سے کوئی مناسبت نہیں ہے، اسلئے کبھی اس کا ارادہ نہیں ہوا کہ حکیم صاحب یا جامعۃ الفلاح یا اسکے ارکان واساتذہ سے تعارف اور تعلق کی سلسلہ جنبانی کروں۔

ایک روز عصر کی نماز پڑھ کر مدرسہ کے صحن میں بیٹھا تھا کہ حکیم صاحب کو تشریف لاتے دیکھا، میں نے بڑھ کر استقبال کیا، ان کی عظمت تو بچپن سے قلب میں جاگزیں تھی، مغرب تک تشریف فرما رہے، دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اُٹھے تو محبت وعظمت کا ایک نیا نقش جما کر اُٹھے، گفتگو کے دوران بعض اختلافی باتیں بھی آئیں، مگر ان کے توازن اور اعتدال فکر کی جلوہ گری اس میں بھی رہی۔

پھر تو ان سے متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں، اور تفصیلی باتیں ہوئیں، حکیم صاحب میں محبت وانسانیت کی وہ خوشبو اور حلاوت تھی کہ ان سے ملنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ حکیم صاحب میں دینی صلابت خوب تھی، جماعت اسلامی کے لوگوں میں عموماً یہ صلابت نہیں ہوتی بجز چند پختہ حضرات کے عام طور سے ان میں ہر جدید کے پیچھے دوڑنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ کوئی بھی نئی خوشنما چیز سامنے آئی ہے،

تو اسے قبول کرنے کیلئے بیتاب ہوجاتے ہیں، مگر حکیم صاحب میں اس مسئلے میں بہت پختگی دیکھی، جامعۃ الفلاح پر جماعت اسلامی کے فکر کا تسلط ہے، اس لئے وہاں کے اساتذہ اور اربابِ بست وکشاد میں فکر ونظر کی رنگا رنگی کا مشاہدہ اکثر ہوتا ہے۔ ایک صاحب پر انکارِ حدیث کے جذبے کا غلبہ ہوا، تو وہ اپنی مجلسوں میں، اپنے درسوں میں، اپنی عام گفتگوؤں میں حدیث کی بے وقعتی کا اظہار کرتے رہے، پھر ان سب کی غلاظت اکٹھی کرکے ''حقیقت رجم'' نامی کتاب لکھ کر اپنی رُسوائی کا سامان کیا۔ فتنہ تو سخت اُٹھانے کا ان کا ارادہ تھا مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ خود جامعۃ الفلاح ہی میں ان کی تردید کرنے والے اُٹھے۔ اس باب میں، میں نے حکیم صاحب کو بہت فکر مند پایا۔ وہ بہت مضطرب تھے کہ جامعۃ الفلاح سے انکارِ حدیث کا فتنہ اُٹھ رہا ہے، انھوں نے بڑی قوت سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا، ایک کتابچہ بھی انھوں نے اس کے رد میں ''فکری فساد'' کے نام سے لکھا۔

ایک طویل مضمون اس خاکسار نے بھی ''نقد بر حقیقت رجم'' کے عنوان سے لکھا تھا، جو ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ حکیم صاحب اس سے بہت خوش ہوئے، اس کے مطالعہ کی ترغیب انھوں نے بعض لوگوں کو دی تھی۔

دینی مسائل میں مجموعی اعتبار سے جماعت اسلامی کا جو رُخ بنا ہوا ہے، اس سے حکیم صاحب خاصے مضطرب رہا کرتے تھے، اس موضوع پر ان سے بارہا گفتگو ہوئی، اور ہر بار یہ اندازہ ہوا کہ ان کا جذبہ ورُجحان دینی مسائل ومعاملات میں جماعت اسلامی کے موجودہ افراد سے مختلف ہے۔

حکیم صاحب کے خلوص اور ان کے جذبۂ ہمدردی کی شاید برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا کی خاصیت رکھ دی تھی، انھوں نے اپنے معالجاتی تجربات کے کچھ حصے قلم بند کئے ہیں، ان کے صاحبزادوں نے ''معالجاتی مشاہدات

'' کے نام سے انھیں حکیم صاحب کے مرض کے زمانے میں شائع کیا، اس میں اپنے علاج کے عجیب وغریب تجربے تحریر فرمائے ہیں، انھیں پڑھ کر حکیم صاحب کی عظمت دوبالا ہوتی ہے۔

ایک تجربہ خود مجھے اپنے سلسلے میں ہوا۔ غالباً ۱۹۹۵ء میں، میں نے منہ کے تالو میں ایک پھوڑے کا آپریشن کرایا، اس کے نتیجے میں ڈاکٹر نے اوپر سامنے کے تین دانت نکال دیئے، آپریشن کامیاب ہوا۔ لیکن دو ہفتے کے بعد میرے سر میں تکلیف شروع ہوئی۔ ایسی تکلیف کہ ادنیٰ حرکت اور تھوڑی دیر کیلئے تکلم ناقابل برداشت ہوجاتی اور پھر دوا بھی کارگر نہ ہوتی، بہت سا علاج کرایا، مگر بے سود، یہ تکلیف ایک ماہ سے زائد رہی۔ تعلیم وتدریس اس کی وجہ سے بہت متاثر ہوئی اک روز نہایت شدت کا درد ہو رہا تھا۔ حکیم صاحب یاد آئے، اب تک ان سے رجوع نہیں کیا تھا انھیں پیغام بھیجا کہ درد کی وہ شدت ہے کہ میں آنہیں سکتا، آپ خود ہی تکلیف کریں، اور مدرسہ پر تشریف لاکر دیکھ لیں، وہاں سے جواب آیا کہ میں شدت علالت کی وجہ سے ہل بھی نہیں سکتا، کروٹ بھی نہیں لے سکتا، اگر ذرا بھی مہلت ہوتی تو میں آتا۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ حکیم صاحب اس درجہ بیمار ہیں اور مجھے خبر بھی نہیں۔

میں اسی درد کی حالت میں حکیم صاحب کی خدمت میں کسی طرح پہونچا، تو واقعی وہ سخت بیمار تھے، کروٹ بدلنی بھی ممکن نہ تھی۔ میں تو اپنی غرض سے گیا تھا۔ اسی حال میں اپنا حال کہہ سنایا، آپریشن کا قصہ بھی بتایا، انھوں نے دوا لکھی، میں تو درد سے بے قرار تھا۔ فوراً لوٹ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوا ان کے دواخانہ سے آئی، حسب معمول پسی ہوئی دوا چار دن کی تھی۔ اور ہر روز دو خوراک کھانی تھی، پہلی خوراک کھانے کے دس منٹ بعد درد رُخصت ہونے لگا۔ آدھ گھنٹے میں مکمل آرام

ہوگیا۔ دوا تو چار دن کھائی، بحمد اللہ پھر ذرا بھی درد نہیں ہوا، جیسے سر شکنجے سے آزاد ہوگیا۔ چار دن کے بعد حاضری دی اور عرض کیا حکیم صاحب آپ نے دوا کیا دی "کرامت کی پڑیا" دی۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ درد کا نام ونشان نہیں ہے، انھوں نے مزید چودہ دن دوا کھانے کی ہدایت کہ۔ اللہ کا احسان ہے کہ اب تک اس طرح کا درد نہیں ہوا۔

اخیر عمر میں حکیم صاحب کی بینائی بہت کمزور بلکہ معدوم ہوگئی تھی، مگر اس حالت میں بھی مریضوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ ایک معاون رکھ رکھا تھا، اس سے کہتے کہ سطر پر میری انگلی اور قلم رکھ دو، وہ رکھ دیتا پھر حکیم صاحب پورا نسخہ لکھ دیتے، ان کے کمپونڈر بھی ایسے ماہر تھے کہ ان کا نسخہ پڑھ لیتے تھے۔

حکیم صاحب نے بیماری اور معذوری کی تکلیف بہت جھیلی، مگر ہمیشہ صابر وشاکر رہے، کبھی کوئی بے صبری یا ناشکری کا کلمہ نہیں سنا گیا۔ خدمت خلق حکیم صاحب کا شعار رہا۔

حکیم صاحب کا انتقال ہوا تو پورا علاقہ سوگوار ہوگیا۔ جنازے میں بڑا مجمع ہوا۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائیں۔ انکے درجات کو بلند فرمائیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے مریضوں کی دعاؤں کے جھرمٹ میں دربارِ الٰہی میں حاضری ہوئی ہوگی۔ اس رحیم وکریم پروردگار سے بہت امیدیں ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گلشن تھانویؒ کا آخری عندلیب خاموش ہوا

(حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب علیہ الرحمہ)

وفات: ۸؍ربیع الآخر ۱۴۲۶ھ (۱۷؍مئی ۲۰۰۵ء)

قادر مطلق جل شانہ کا حسن انتظام ہے کہ ہر سو سال پر دین اسلام کی تجدید کے لئے ایک طاقت ور شخصیت کو اُٹھایا جاتا ہے، جس کے علم وعمل، جس کی ہمت وعزیمت، جس کے اخلاص وللٰہیت اور جس کے جوش وجذبہ کے فیضان برکت سے دین ومذہب کو نئی تب وتاب ملتی ہے، مردہ قلوب زندگی پاتے ہیں، اللہ ورسول سے برگشتہ افراد، ایمان واطاعت کی نئی حلاوت پاتے ہیں۔ اس دورِ اخیر میں اللہ تعالیٰ نے تجدید دین وملت کا کام جن صاحب عزیمت شخصیتوں سے لیا ہے، ان میں ایک نمایاں صاحب توفیق اور کامیاب ترین شخصیت حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ہے۔

حضرت حکیم الامت نے قدیم بزرگوں کے طرز پر ہنگامہ ہائے دنیا سے یکسو ہوکر تھانہ بھون کی خانقاہِ امدادیہ میں رہ کر دین وملت کے ہر شعبے کی تجدید فرمائی۔ بالخصوص افراد سازی اور مردانِ کار کی تربیت کا تو وہ نظام قائم فرمایا تھا کہ حضرت خواجہ نظام الدین محبوبِ الٰہی، حضرت شاہ غلام علی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی علیہم الرحمہ کی یاد تازہ کردی تھی۔

خانقاہ تھانہ بھون میں علم ومعرفت کے ایک سے بڑھ کر ایک آفتاب

وماہتاب پرورش پاتے رہے، اوران کی روشنی سے ایک دنیا کی دنیا منوراور تابناک ہوتی رہی۔ حضرت تھانوی کے تربیت کردہ خلفاء ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور عرب کے بعض خطوں میں سرگرم عمل رہے، ان کے ذریعے چراغ سے چراغ جلتے رہے، روشنی پھیلتی رہی، لیکن جوں جوں وقت گزرتا رہا اس مقدس قافلہ کے بزرگ سالکین اپنی اپنی منزل پر کمر کھولتے رہے، ہندوستان میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب، حضرت مولانا شاہ اسعد اللہ صاحب، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ صاحب، پاکستان میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاملپوری، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا خیر محمد صاحب، حضرت مولانا فقیر محمد صاحب، حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب، بنگلہ دیش میں حضرت مولانا اطہر علی صاحب، حضرت مولانا حافظ عبد الوہاب صاحب، حضرت مولانا محمد اللہ صاحب اور مدینہ شریف میں حضرت مولانا محمد موسیٰ صاحب، اوران کے علاوہ دوسرے علماء مصلحین یکے بعد دیگرے جوارِ رحمت میں پہونچتے رہے، ایک چراغ بجھتا، تو دوسرے چراغ پر نگاہیں جمتیں، پھر آہستہ آہستہ جگہیں خالی ہوتی چلی گئیں تا آنکہ ادھر چند برسوں سے جب حضرت تھانویؒ کے خلفاء کا تذکرہ آتا، تو سوالات کا تسلسل بندھ جاتا کہ اب کون کون صاحب موجود ہیں، پھر نگاہیں تلاش کرکے تھک جاتیں، اور ایک ہی بزرگ پر رک جاتیں۔ وہ تھے حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی، نور اللہ مرقدہ

بالآخر یہ چراغ بھی نور پھیلاتے پھیلاتے ۸؍ربیع الآخر مطابق ۱۷؍مئی ۲۰۰۵ء بروز منگل کو مرکز نور کی جانب منتقل ہوگیا۔ چراغ تو اب بھی بہت سے جل رہے ہیں، لیکن جو چراغ براہ راست تھانہ بھون سے کسب نور کرکے روشن ہوئے تھے

، ان کا آخری فرد بھی اپنی جگہ خالی کرگیا۔ **إنا لله وإنا إليه راجعون**

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب، حضرت حکیم الامت کے آخری خلیفہ تھے، حضرت کے انتقال سے بزم اشرف سونی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلۂ قدس کو قائم ودائم رکھیں۔

حضرت شاہ صاحب موصوف نے طویل عمر پائی، اور اس عمر کو دین کی خدمت میں صرف کیا، ہندوپاک اور بنگلہ دیش تینوں ملکوں میں آپ کی خدمات کا دائرہ پھیلا ہوا تھا۔

حضرت مولانا کے قلب میں دینی خدمات اور مسلمانوں کی اصلاح کی ایک خاص تڑپ تھی، منکرات کی اصلاح اور ان پر نکیر میں آپ کی ایک خاص شان تھی، لہجہ نہایت نرم ہوتا، گفتگو شیریں ہوتی، طرزِ ادا میں بڑی حلاوت ہوتی، مگر یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی غیر شرعی چیز ان کے سامنے آئے، اور اس کی اصلاح نہ کریں، خواہ ان کا تعلق اعمال سے ہو، عبادات سے ہو، معاملات سے ہو، معاشرات سے ہو، ان تمام امور میں وہ سنن ومستحبات کا خصوصی اہتمام فرماتے، اور اپنے لوگوں کو اس کی ہدایت کرتے۔

قرآن کریم کی صحیح قرأت کا حضرت مولانا کے یہاں بہت اہتمام تھا، اس کے لئے نورانی قاعدہ کی تعلیم کا باقاعدہ نظام بنایا تھا، ان کی خدمت میں حاضری دینے والے تصحیح قرأت قرآن سے غافل نہیں ہوسکتے تھے۔ مولانا کی نگرانی میں برصغیر ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں صدہا مدارس ومکاتب چلتے تھے، اور ہر ایک میں قرآن کریم کی صحیح قرأت کا بڑا اہتمام ہے، چھوٹے چھوٹے بچے اس قدر عمدہ ادائیگی کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، علماء بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، تو سوال ہوتا کہ قرآن کریم کی تصحیح ہوئی ہے یا نہیں؟ مولانا نے اس ذوق کو اتنا

عام کردیا تھا کہ آج بیشتر مدارس ومکاتب میں اس کا خصوصی اہتمام ہے۔ قرأت کی تصحیح کے ساتھ مولانا کو اذان اور نماز کی تصحیح کا بہت اہتمام تھا۔ نماز کے سنن، آداب ومستحبات ہر ایک کی رعایت وہ خود بھی کرتے اور اپنے زیر تربیت افراد کو بھی اس کا پابند بناتے۔

آپ کی نگرانی میں مدارس ومکاتب کی ایک بڑی تعداد ہے، مدارس کے چندوں میں بے اعتدالیاں ہوتی ہیں، مولانا کی نظر اس پر بھی بہت تھی، چندے کا کوئی ایسا طریقہ مولانا اختیار کرنے نہ دیتے جس کے جواز میں شبہ ہو، بالخصوص اصرار اور جبر کی مولانا کے یہاں کوئی گنجائش نہ تھی، مولانا کا حکم تھا کہ مدرسہ کا تعارف کرادو، ضرورت بتادو، پھر اگر دینے والا خوشی سے دیدے تو قبول کرلو، ورنہ خوش اُسلوبی سے رُخصت ہوجاؤ۔

مولانا کے یہاں نظم وترتیب کا بڑا اہتمام تھا، مولانا کا یہی مزاج تھا۔ بے ترتیبی اور بدنظمی کی ان کے یہاں کوئی گنجائش نہ تھی، اس نظم وترتیب کا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا سے کام بہت ہوا، اور ہر شخص کے لئے ان سے استفادہ سہل تھا۔ کثرت کار کے باوجود ان کی خدمت میں آنے جانے والا ان کی توجہ، تعلیم، تربیت، تنبیہ وہدایت سے مستفید ہوتا۔ مہمانوں کی خدمت بنفس نفیس کرتے، صفائی ستھرائی، سلیقہ، ترتیب، حسن انتظام یہ سب مولانا کی جلو میں ہوتے۔

حضرت مولانا ایک صاحب نسبت شیخ تھے، لوگوں کو بیعت کرتے، بیعت ہونے والوں کی نگرانی فرماتے، ان کے احوال کی خبر گیری کرتے، ایک خاص معیار کی تربیت فرما کر مطمئن ہوجاتے تو اجازت وخلافت سے نوازتے، اور خلافت واجازت کے بعد بھی ان کی نگرانی فرماتے رہتے، اور ضرورت پر تنبیہ ومواخذہ فرماتے۔

حضرت مولانا کی تربیت اور نگرانی میں کئی اصحاب کمال اور اربابِ طریقت تیار ہوئے، ان کے ذریعے سے مولانا کا فیض عام ہورہا ہے۔

پچھلے دنوں مولانا پر برین ہیمریج کا حملہ ہوا تھا، بہت علاج ہوا، بہت دعائیں ہوئیں، حق تعالیٰ نے شفا بخشی اور آپ کے فیضان کا سلسلہ جاری رہا۔

۸؍ربیع الآخر کو پھر حملہ ہوا، اور مولانا رحمت حق کے سائے میں جاپہونچے، ہردوئی میں تدفین ہوئی، حق تعالیٰ مغفرت اور روح ورضوان سے نوازیں، جس کے لئے ساری زندگی بے قرار رہے تھے، اللہ کی مہربانی سے امید غالب ہے کہ قرار ہی قرار ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی نور اللہ مرقدہٗ

وفات: ۶؍فروری ۲۰۰۶ء مطابق ۷؍محرم ۱۴۲۷ھ

وہ جو ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے تشخص اور اس کی عظمت کا ایک بلند نشان تھا! وہ جو آزادی کے قافلہ سالاروں کا وارث وجانشین تھا، وہ جس نے امت مسلمہ کے خلاف اٹھنے والے ہر طوفان کا مقابلہ کیا، وہ جس کے دلیرانہ آوازۂ حق سے حکومت کا ایوان گونجتا رہا! وہ جس نے ہر نازک موڑ پر ملک وملت کی رہنمائی کی، وہ جو دن کے ہنگاموں میں جانباز مجاہد اور رات کے سناٹے میں بارگاہِ رب العزت میں ایک خاشع وخاضع عابد وزاہد تھا! وہ جو اپنے سینے میں امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے درد کو لئے ملک میں پھرتا رہا! وہ جس کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا راستہ نہ موسم کی حرارت وتمازت روک سکی نہ اس کی ٹھنڈک اور طوفانی ہوائیں اس کی راہ میں حائل ہوسکیں! وہ جس کی عزیمت کی چٹان سے مخالفتیں ٹکراتیں اور پاش پاش ہوجاتیں! وہ جس کے حوصلے کبھی شکست سے آشنا نہ ہوئے! وہ جو حلقۂ دوستاں میں ریشم سے زیادہ نرم تھا، اور دشمنوں کے مقابلے میں فولاد سے بھی زیادہ سخت تھا، وہ جو ایک طویل عرصہ تک ملک وملت کے ہر مسئلے کے لئے مرکز نگاہ تھا!

آہ! کہ جب میں نے پہلی بار ۱۹۶۴ء میں دیکھا تھا، تو ان کے عزم وحوصلہ کی طرح ان کا جسم بھی جوان تھا، لیکن چالیس سال کے بعد دیکھا تو بدن بوڑھا، ضعیف

اور مجموعۂ امراض ہوگیا تھا، مگر ہمت وحوصلہ! اللہ اکبر، اس کی شان اب بھی وہی تھی، جو پہلے دیکھی تھی، اور جسے دیکھتے رہنے کی آنکھیں عادی تھیں۔

بڑھاپے اور کمزوری کا رمضان تھا، مگر معمولات وعبادات اور روزہ وتراویح کی عزیمت اللہ کے خزانۂ خاص سے بخشی گئی تھے، جسم نحیف ونزار ایک مشت استخوان بن کر رہ گیا تھا، مگر سالکین و ذاکرین کا ہجوم، عبادات کی سرگرمیاں، رحمتوں اور برکتوں کا نزول، ماحول کی نورانیت سب حسب معمول! کہ اچانک ایک روز طبیعت زیادہ بگڑی، لوگ کہتے ہیں کہ دل کا دورہ پڑا، تدبیر وعلاج کے لئے دلی تشریف لے گئے، ڈاکٹروں نے روکا، صحت کو خطرے میں بتایا، روزہ رکھنے سے منع کیا، مگر جس نے کسی کی راہ میں اپنا پورا وجود جھونک رکھا ہو، اسے صحت کی کب پروا تھی، بالخصوص ایسے وقت میں جبکہ ”وقت لقاء“ قریب ہو، روزے رکھتے رہے تھے، رمضان المبارک کا عشرۂ اخیرہ ایک ایک دن قریب آتا جارہا ہے، وہ مبارک ایام اور مقدس راتیں، جو اللہ والوں کی باطنی جولانیوں اور قلبی شادابیوں کیلئے موسم بہار بلکہ موسم بہار کے شباب کا زمانہ ہے، یہ برگزیدہ بندہ دیکھ رہا ہے کہ بدن شفا خانے میں مقید ہے، اور روحانیت کی بہار آیا چاہتی ہے، اصرار کر کے، خوشامد کر کے، ڈاکٹروں سے، تیمارداروں سے، آخر اللہ کے گھر میں آکر پڑ جانے کی چھٹی لے ہی لی۔ دیوبند آئے، روحانیوں کا قافلہ میر کارواں کا منتظر تھا، بہار تو آ ہی رہی تھی، جانِ بہار کیا آئی کہ قلوب میں کیف ایمانی کی روح پرور ہوائیں چلنے لگیں، رمضان کا یہ اعتکاف کبھی نہ چھوٹا تھا، زندگی کے آخری رمضان میں کیونکر چھوٹتا، اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کی مرادیں ان کی آرزو کے مطابق پوری کرتے ہیں۔ ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   می دہد یزداں مرادِ متقیں

جو کچھ تم چاہتے خدا بھی وہی چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ متقیوں کی مرادیں عطا فرماتے ہیں۔

عشرہ اخیرہ بعافیت گذر گیا۔ ایمانی حلاوت، روحانی کیفیات، دن کے روزوں اور رات کی عبادات کے ساتھ!

اسی دوران ایک دن، ایک دن کیا رمضان المبارک کے آخری دن یعنی ۲۹ر رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ کو اس شیخ طریقت، مجاہد فی سبیل اللہ، عابد شب بیدار، غازی شہ سوار نے حلقہ ذاکرین اور مجمع عابدین میں فرمایا، کانوں نے سنا اور آنکھیں برسنے لگیں۔ وہ فرمارہے تھے:

محترم بزرگو! دوستو! اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے ہمیں رمضان المبارک جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی.......... یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم میں کون کون ایسا ہوگا، جس کو اگلا رمضان المبارک نصیب ہوگا۔

مجھ کو اپنی زندگی کی زیادہ توقع نہیں ہے، میں زندگی سے دور اور موت سے قریب ہوتا جارہا ہوں، آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایمان پر موت نصیب فرمائے، بلکہ ہر ایک کو ایمان پر موت نصیب فرمائے۔

یہ باتیں کہنے والا کہہ رہا تھا، اور خود بھی رو رہا تھا اور حاضرین وسامعین کی بھی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

پھر وہی ہوا، جس کو دور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں، ۲ر شوال کو مرض الوفات کی ابتدا ہوئی۔ تین ماہ سے کچھ زائد زیر علاج رہے، اہل تعلق اور معتقدین دعائیں کرتے رہے، مگر وہ جو ساری دنیا کے درد وغم پر تڑپ تڑپ جایا کرتا، اب دنیا سے بے نیاز آخرت کی راہ پر تیزی سے گامزن تھا، اطباء اپنی دواؤں سے، محبین ومعتقدین اپنی دعاؤں سے انھیں دنیا کی طرف لوٹانے کی سعی کر رہے تھے، مگر وہ پلٹ کر نہیں دیکھ رہے تھے، انھیں دنیا کا ہوش نہ تھا، کیونکہ آخرت کی طرف ان کی نگاہ لگ چکی تھی، انھیں پکارنے والے پکارتے تھے، مگر وہ کوئی اور ہی آواز سن رہے تھے، نہ کچھ سن رہے ہیں، نہ بول رہے ہیں۔

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا اور سننے والوں نے سنا کہ اچانک زبان رواں ہوئی، زبان رواں ہوئی، اور آواز آنے لگی، اللہ، اللہ، اللہ، اللہ،

اس محبوب حقیقی کا نام زبان پر بے ساختہ چلنے لگا، سانس کے ساتھ چلنے لگا، وہی محبوب جس کی یاد میں زندگی بھر بے قراری رہی ہے، جس کی خوشنودی کے لئے زندگی کے ہر میدان میں مشکل ترین مجاہدے کئے، اب اسی کا شیریں نام روح وقلب میں حلاوت گھول رہا تھا، شاید غیبی ندا کانوں میں آرہی تھی: **یاأیتھا النفس المطمئنة إرجعي إلیٰ ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی** (اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی جانب اس حال میں لوٹ چل کہ تو بھی خوش اور رب بھی تجھ سے خوش، چل میرے نیک بندوں کے زمرے میں، اور میری جنت میں چل داخل ہوجا)

شاید یہ غیبی ندا کانوں میں آرہی تھی، جواب میں اللہ اللہ اللہ اللہ کی صدا نکل رہی تھی، پھر زبان تھم گئی، آنکھیں بند ہوگئیں، اور روح، اپنے دنیاوی لبادے یعنی جسم کو چھوڑ کر ملأ اعلیٰ میں پہونچ گئی، **إنا للہ وإنا إلیہ راجعون**، اور دنیا میں ماتم بپا ہوگیا، لیکن کیا ہوسکتا تھا، اللہ کی امانت تھی، اللہ نے اسے واپس لے لیا۔

بہت دنوں پہلے کی بات ہے، کوئی صحافی انٹرویو لے رہا تھا، بہت سے سوالات کئے، آخر میں اس نے پوچھا کہ آپ کی آخری آرزو کیا ہے؟ بے ساختہ فرمایا ایمان پر خاتمہ!

آج وہ آرزو صد شکر کہ پوری ہوئی۔

ان حروف کا لکھنے والا اس وقت مکہ مکرمہ میں حرم شریف میں کعبۂ مطہرہ کے

سامنے بیٹھا ہوا تھا، تھوڑی دیر پہلے عصر کی نماز سے فراغت ہوئی تھی، موبائل کی گھنٹی بجی، دوسری طرف سے مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کے ناظم مولانا انتخاب عالم قاسمی بول رہے تھے کہ کچھ دیر پہلے پونے چھ بجے حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی کا انتقال ہوگیا۔ **إنا لله وإنا إليه راجعون**

دیر تک سکتہ سی، ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری رہی، دعائیں کرتا رہا، ابھی کل میں نے دیوبند فون کر کے حضرت مولانا کی خیریت دریافت کی تھی، عزیز محترم مولانا مفتی محمد راشد صاحب سلّمہٗ نے بتایا کہ سابق حال پر ہیں، اب جو یہ خبر ملی، تو گو کہ غیر متوقع نہ تھی مگر جاں گداز تھی، طبیعت پگھل گئی، حرم میں بیٹھ کر ربِ حرم سے دعائیں کرتا رہا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے خلیفہ اور حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد صاحب مدنی علیہ الرحمہ کے سچے مخلص عاشق حضرت مولانا محمد ازہر رانچوی مدظلہ حج میں تشریف لائے تھے، جی بیقرار ہوا کہ ان سے ملاقات ہو، تو غم کی آگ کچھ ٹھنڈی ہو، پھر وہ مل گئے، میں نے انھیں خبر دی، انھوں نے مجھے خبر دی، اور کوئی بات نہ ہوسکی، بس وہ حال تھا کہ

خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

وہ بھی نڈھال تھے، میں بھی بے حال تھا۔

اللہ تعالیٰ حضرت **رحمة الله عليه** کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں، اور پسماندگان کو...... پسماندگان میں اہل بیت کے علاوہ پوری ملت اسلامیہ ہند ہے ......صبر جمیل اور حضرت کا واقعی جانشین عطا فرمائیں۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆

(ضمیمہ)

تم سلامت رہو ہزار برس

گزشتہ صفحات میں آپ نے ان شخصیات کا تذکرہ ملاحظہ کیا، جو دنیا سے گزر کر جوارِ رحمت میں جا چکی ہیں۔ اس ضمیمہ میں تین ایسی شخصیات کا ذکر خیر ہے جو ابھی بقید حیات ہیں، باری تعالیٰ تادیر ان کا سایہ ہمارے سروں پر باقی رکھیں۔

میرے شیخ ومرشد

(حضرت مولانا عبدالواحد صاحب مدظلہ)

اس مضمون میں میرے شیخ ومرشد حضرت اقدس مولانا عبدالواحد صاحب دامت برکاتہم کا ذکر خیر ہے، اگرچہ ان کے احوال ماضیہ سے مجھے زیادہ واقفیت نہیں تاہم کافی عرصہ ان کی صحبت میں گزارا ہے، اس لئے تاریخی واقعات تونہیں البتہ مزاج ومذاق کی کچھ ناتمام جھلکیاں ان شاء اللہ پیش کرسکوں گا۔

طالب علمی سے رسمی فراغت میری شعبان ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء میں ہوئی، ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۳ء میں مدرسہ دینیہ غازیپور میں مدرس مقرر ہوا، مدرسہ دینیہ کے مہتمم جناب عزیزالحسن صاحب صدیقی کی زبانی ایک صاحب کا تذکرہ کبھی کبھی سنتا تھا، وہ بتاتے تھے کہ اس مدرسہ میں کبھی مشکوٰۃ شریف تک تعلیم ہوئی ہے، اسی ضلع غازیپور کے ایک گاؤں شیخ پور پلیا کے رہنے والے ایک طالب علم حافظ عبدالواحد صاحب نے اسی مدرسہ میں مشکوٰۃ شریف تک قاری عبیداللہ صاحب الہ آبادی سے تعلیم حاصل کی تھی، وہ بہت سنجیدہ، نیک وصالح اور بہترین حافظ قرآن تھے، نہایت ذہین وذکی تھے۔ لیکن دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں کسی سندھی پیر کی خدمت میں پہونچ کر مجذوب سے ہوگئے ہیں، اونچی بہت اونچی لنگی باندھتے ہیں، خوب نیچا کرتا پہنتے ہیں، صرف تسبیح ومصلیٰ کے ہوکر رہ گئے ہیں، دنیا سے بیزار، آدمیوں سے متوحش! ان کے پیر صاحب چھپروں کی خانقاہ اور مدرسہ بنائے

ہوئے ہیں، پیر اور مرید اور طلبہ واساتذہ سب چھپروں میں رہتے ہیں، خیال یہ ہوتا تھا کہ تارک الدنیا قسم کے کوئی پیر ہوں گے، معلوم نہیں اہل حق میں ہیں یا راہ حق سے کچھ منحرف ہوں گے، سندھی پیروں کے بارے میں کچھ اچھا تاثر ذہن میں نہ تھا، کچھ رسمی پیروں کا، کچھ بدعتی پیروں کا تصور تھا، یہ ذکر کبھی کبھی ہوتا، اور ذہن میں کوئی نقش نہیں بن پاتا تھا۔

۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں بعض ناخوشگوار تجربوں کے بعد جن سے میرے دل کی دنیا ہل کر رہ گئی تھی، مجھے جستجو ہوئی کہ کوئی بزرگ اللہ والا ایسا ملے، جس کے قدموں پر جبین عقیدت خم کرکے اسی کے آستان کا ہو رہوں، میرے ارد گرد دور ونزدیک متعدد بزرگ تھے، جن سے مجھے عقیدت بھی بہت تھی، ان حضرات کی خدمت میں کبھی کبھی پہونچتا بھی رہتا تھا، وہ حضرات اپنی کریمانہ طبیعت اور بزرگانہ مزاج کی وجہ سے بہت شفقت وعنایت بھی فرماتے تھے، مگر اللہ جانے کیا بات تھی، میں اب بھی سوچتا ہوں تو کوئی جواب اس کا سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے ان حضرات سے باوجود ان کے کمال کے اور باوجودیکہ مجھے ان سے عقیدت بھی بہت تھی کبھی ان سے بیعت وارادت کی درخواست تو کجا کبھی ارادہ بھی نہیں کیا کہ ان سے بیعت ہوجاؤں۔ بس ایک نامعلوم سی جستجو تھی کس کو ڈھونڈھتا تھا۔ میں نہیں سمجھ پا رہا تھا جس بزرگ کی خبر ملتی دوڑ کر ان کی خدمت میں پہونچتا مگر اپنی طرف سے محبت وعقیدت لے کر جاتا، ادھر سے شفقت وعنایت لے کر لوٹتا مگر یہ خیال دل سے محو سا رہتا کہ بیعت ہوکر اسی آستانہ پر جم جاؤں۔

میں اسے محسوس کرتا تھا اپنی حرماں نصیبی پر رونا آتا تھا، اپنی ماضی کی خطاؤں اور حال کے گناہوں کو یاد کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اللہ کی جانب سے مجھے میرے گناہوں کی شاید سزا ہے کہ کسی آستانے سے ایسی مناسبت نہیں ہوتی کہ وہیں خیمہ

گاڑ دوں، اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کرتا تھا، مدتوں استخارہ کرتا رہا، ہمت ہار چکا تھا، کہیں تلاش کا حوصلہ باقی نہیں رہ گیا تھا، دعا کرتا تھا کہ اے اللہ! جس طرح جسمانی روزی آپ بغیر میری کسی کلفت کے مسلسل بھیج رہے ہیں، مجھے روزی کیلئے دوڑنا نہیں پڑتا، روزی کو تلاش نہیں کرنا پڑتا، وہ خود ہی وقت وقت پر آپ کی طرف سے آتی رہتی ہے، ایسے ہی روحانی غذا کا سامان بھی یہیں بیٹھے بٹھائے کر دیجئے، تقریباً برس دن اس دعا اور اس استخارہ پر گزر گئے۔ پھر ایسا ہوا کہ دہلی کے ایک بہت با برکت اور مشہور بزرگ، حضرت شاہ غلام علی صاحب نور اللہ مرقدہ خلیقفہ و جانشین حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہید قدس سرہ کے ملفوظات کا مجموعہ ''در المعارف'' (بزبان فارسی) دستیاب ہوا، بہت دلآویز، بہت پرسوز، درد محبت سے لبریز، شریعت وطریقت کی دلنشیں تشریحات کا مرقع، دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو بیدار کرنے والا، شریعت کی عظمت کا آئینہ دار، طریقت کا بہترین رہنما، اس مجموعہ ملفوظات کو میں نے پڑھا، بار بار پڑھا، دل بہت تڑپا، آنکھیں جھل جھل برسیں، ایمان کی حرارت تیز ہوئی، اسی وقت اپنی محرومی کا احساس تیز تر ہوا کہ کاش کوئی مرد خدا ملتا، اور اس کی قدموں کی دھول بن کر میں رہتا۔

اس کتاب میں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے ایک جگہ ہم جیسے تہی دستان قسمت کی اشک شوئی اور چارہ جوئی کا ایک نسخہ تحریر فرمایا ہے، بات تو ذرا لمبی ہو جائے گی، مگر کیا کروں۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

مرتب ملفوظات حضرت شاہ رووف احمد صاحب لکھتے ہیں، ترجمہ و تلخیص پر اکتفا کرتا ہوں۔

اور اس کے بعد ''نسبت اویسیت'' کا ذکر چل پڑا، حضرت والا نے

فرمایا کہ جو شخص پیغمبر خدا ﷺ یا کسی اور بزرگ سے ''نسبت اویست'' کا خواہاں ہے، اسے چاہئے کہ ہر روز تنہائی میں دو رکعت نماز ادا کرے، اور اس بزرگ کے واسطے فاتحہ پڑھ کر (یعنی ایصال ثواب کر کے) اس بزرگ کی روح کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے، چند روز میں یہ نسبت شریف ظہور کرے گی۔''

یا بعد نماز عشاء اپنے تصور میں رسول اللہ ﷺ کے دستہائے مبارک اپنے ہاتھ میں تھام کر بیعت کرے اور کہے اے اللہ کے رسول! میں نے پانچ باتوں پر آپ کے دست مبارک پر بیعت کی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت پر، نماز قائم کرنے پر، زکوٰۃ ادا کرنے پر، رمضان کے روزے پر اور حج بیت اللہ پر اگر اس کی استطاعت نصیب ہوگی، یہی عمل ہر شب کرے۔ (در المعارف ص ۸۷)

نسبت اویسیت کا مطلب یہ ہے کہ بغیر ظاہری وسائط کے کسی بزرگ کی روحانیت سے سالک کو فیض حاصل ہو، یہ نسبت حضرت اویس قرنی علیہ الرحمہ کے نام سے وابستہ ہے، حضرت اویس قرنی علیہ الرحمہ کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غائبانہ روحانی نسبت قائم تھی، ایسے ہی کسی کو کسی بزرگ سے غائبانہ نسبت بغیر ظاہری واسطوں کے حاصل ہوتی ہے تو اسے ''اویسیت'' کہتے ہیں۔

کسی بزرگ کی روح کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیض ان کے بزرگ کی روحانیت کے واسطے سے آ رہا ہے۔ اس تصور میں نہ ان بزرگ کو حاضر و ناظر ماننا ہے، نہ انہیں معبود و مقصود جاننا ہے، جس طرح استاذ اور شیخ کے واسطے سے فیضان الٰہی شاگرد اور سالک کے قلب پر اترتا ہے، وہی صورت یہاں بھی ہے، فیضان الٰہی انہیں واسطوں سے اترا کرتا ہے۔

اگر آدمی انہیں واسطوں کو مقصود و معبود بنالے تو شرک ہے، اور اگر ان کو ان کی حد پر رکھے تو بیحد فوائد ان سے متعلق ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے اویسیت کا پہلا طریقہ جو بتایا ہے، اس سے میں نے اپنی طبیعت میں مناسبت نہیں پائی تو میں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا لیکن اپنے قلب و باطن بلکہ ظاہر کی بھی گندگی کی وجہ سے اس کی ہمت تو نہ کرسکا کہ غائبانہ رسول اقدس ﷺ کے دست مبارک پر بیعت ہوں، قلب تھراجاتا تھا کہ ان ظاہری و باطنی نجاستوں کے ساتھ تصور میں ہی سہی، کس طرح آپ کے دست اقدس کو تھاموں، مجھے یہ آسان معلوم ہوا کہ ان کے کسی امتی کے ہاتھ پر غائبانہ بیعت ہوں۔ چاروں مشائخ سلسلہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی اور حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی علیہ الرحمہ والرضوان میں قلب کا رجحان اور عقیدت کا والہانہ پن سب سے زیادہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے پاتا تھا، ان کی تصانیف میں فتوح الغیب اور مواعظ الفتح الربانی کا ابتداء میں بکثرت مطالعہ کیا تھا، ان سے خاص تعلق دل کو ہمیشہ محسوس ہوتا رہا، میں روزانہ عشاء کی نماز کے بعد تصور میں انہیں کے دست اقدس پر بیعت ہوتا رہا، مجھے کچھ ادراک نہیں ہوتا تھا کہ اس کا کیا اثر مرتب ہورہا ہے، یہ سلسلہ تقریباً چھ ماہ تک مسلسل جاری رہا۔

ایک روز اچانک بغیر کسی وہم و گمان کے مدرسہ دینیہ غازیپور کے مہتمم جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی نے نہایت مسرت کے لہجے میں خوش خبری سنائی کہ وہ حافظ عبدالواحد صاحب جنھوں نے یہاں مشکوٰۃ تک تعلیم حاصل کی تھی اور پاکستان پہونچ کر ایک سندھی پیر سے مرید ہوگئے تھے، تشریف لائے ہیں، ابھی وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ ایک بزرگ پستہ قد، ہلکے بدن کے، ادھیڑ عمر کے، سر پر سیاہ صافہ

باندھے لمبا گھیردار کرتا پہنے، نصف ساق تک لنگی باندھے، چہرہ نور سے معمور، نگاہیں جھکی ہوئی، مسکینوں جیسی رفتار سے چلتے ہوئے کمرے میں سلام کرکے داخل ہوئے، میں مصافحہ کیلئے کھڑا ہوا، عزیز صاحب نے اشاروں میں بتایا کہ یہی ہیں، اور انہیں بھی اشاروں ہی میں میرے متعلق کچھ بتایا، ان بزرگ نے مجھے سینے سے لپٹایا، ان کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو برس پڑے۔

دل نے گواہی دی کہ یہ بزرگ صاحب نسبت ہیں، ان کا سینہ و قلب معرفت کی آگ سے دہک رہا تھا، باتیں شروع ہوئیں تو لفظ لفظ سے تواضع اور بے نفسی کا ظہور ہورہا تھا۔ فنائیت، خودشکنی ہر ہر ادا سے ظاہر ہورہی تھی، میں نے اسی مجلس میں پوچھ لیا کہ حضرت آپ کا سلسلۂ طریقت کیا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ میرا تعلق سلسلۂ قادریہ سے ہے، پھر اپنے شیخ حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجوی کے احوال سنائے، ان کے آگے کا سلسلہ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔

حضرت سے دل کو بڑا انس محسوس ہوا، دو ماہ کا قیام غازیپور میں رہا، غازیپور شہر سے کچھ فاصلے پر ان کا آبائی گاؤں شیخ پور ہے، زیادہ تر قیام وہیں رہا، اس مدت میں زیادہ تر ان کے ساتھ رہا۔ ان کی جلوت و خلوت دیکھتا رہا، ان سے بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتا رہا، ان کے احوال دریافت کرتا رہا، مجھے اس وقت رہ رہ کر خیال آتا رہا کہ میں چھ ماہ سے مسلسل سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے عالم تصور میں بیعت کررہا ہوں، کہیں اللہ کی طرف سے اسی قبولیت کا اظہار تو نہیں ہے؟ بعض تجربات کی وجہ طبیعت عجلت پر مائل نہ تھی۔ دو ماہ خوب دیکھا بھالا، بہت مناسبت محسوس ہوئی۔ اس سفر میں میں نے بیعت نہیں کی، مگر دل کا مرکز مناسبت متعین ہوگیا۔ دوسرے سال حضرت کا دوسرا سفر ہوا اور میں دامن شیخ سے وابستہ ہوگیا۔

از برائے سجدہ کردن آستانے یافتم　　　سرزمینے بود منظور آسمانے یافتم

جائے ولادت: ۔حضرت مولانا کا آبائی وطن ضلع غازیپور میں ایک گاؤں ہے جس کا نام شیخ پور ہے، غازی پور کی تحصیل سید پور سے بجانب مشرق، غازی پور شہر جانے کیلئے دو سڑکیں ہیں۔ ایک شاہراہ عام ہے، جو سید پور کے بعد نند گنج ہوتی ہوئی غازیپور تک پہونچتی، یہ بنارس غازیپور کا معروف روڈ ہے، دوسری سڑک جو نسبتاً خستہ اور کمزور ہے، سید پور سے دو کلو میٹر پورب آکر دائیں جانب مڑ جاتی ہے، یہ راستہ بھی غازیپور تک آتا ہے، یہ غازی پور کچہری کے پاس نکلتا ہے، اسی سڑک کے کنارے سید پور سے پندرہ سولہ کیلو میٹر کے فاصلے پر شیخ پور گاؤں ہے۔ اس گاؤں میں مسلمانوں کی آبادی ہے، حضرت کا وطن اور جائے پیدائش یہی ہے، سنہ پیدائش متعین طور سے معلوم نہیں مگر اندازہ ہے کہ ۱۹۲۹ء (دارالعلوم دیوبند کی سند فراغت پر سن ولادت ۱۳۴۶ھ درج ہے۔ مرتب) کے لگ بھگ آپ کی ولادت ہوئی ہوگی۔ والد اس زمانے میں ریلوے میں ملازم تھے، ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی، قرآن کریم کہاں حفظ کیا، اس کا علم نہیں ہو سکا۔ ہندوستان پاکستان میں باوجود پڑوس ہونے کے اتنی دوری ہے کہ معلومات کے ذرائع مفقود ہیں۔ اس وقت غازیپور میں مدرسہ دینیہ علمائے فن کا مرکز تھا۔ عربی تعلیم اسی مدرسہ میں حاصل کی، وہاں ان کے خاص استاذ الہ آباد کے رہنے والے ایک بزرگ حضرت مولانا قاری عبید اللہ صاحب تھے۔

بعد میں حضرت قاری صاحب مدرسہ دینیہ سے یوسف پور چلے گئے تھے، تو حضرت مولانا بھی ان کے ساتھ یوسف پور چلے گئے، اور ان سے پڑھتے رہے۔ حضرت فرماتے تھے کہ عربی پڑھنے والا اکیلا شاگرد اور قاری صاحب اکیلے استاذ، وقت کی کوئی قید نہ تھی، جب بھی موقع ملتا، تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا، بے تکلفی بھی بہت تھی، کبھی استاذ کھانا پکاتے، طالب علم ہاتھ بٹاتے اور دونوں مل کر روکھا پھیکا کھا لیا کرتے، اکثر یہ سعادت طالب علم کے حصے میں آتی، اس طرح ایک طالب علم نے

ایک استاذ کا ہو کر دورۂ حدیث کے پہلے کی سب کتابیں محنت سے پڑھ ڈالیں، پھر استاذ کے حکم سے مولانا دیوبند چلے گئے، یہ ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا، ایک سال دارالعلوم دیوبند میں رہ کر حدیث کی تعلیم مکمل کی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ شیخ الحدیث تھے، مولانا کا شمار دیوبند میں ممتاز طالب علموں میں تھا، چنانچہ سالانہ امتحانات میں حضرت اقدس کو امتیازی نمبر حاصل ہوئے۔

حضرت کا سن فراغت ۱۹۵۰ء ہے، ۱۹۵۴ء میں پاکستان تشریف لے گئے، وہاں ان کے بڑے بھائی جناب عاشق علی صاحب مرحوم پہلے سے موجود تھے، کراچی میں ان کی سکونت تھی، مولانا نے بھی وہیں سکونت اختیار کی، پھر تلاش مرشد میں ہالیجی شریف نکل گئے، حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجوی قدس سرہ کے حالات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان کے یہاں زندگی بہت سادہ، کھانا سادہ، اتنا سادہ کہ ہمارے دور کے متوسط گھرانوں میں اس کا تصور بھی مشکل ہے، آج کل کے لوگوں کیلئے اور کوئی مجاہدہ نہ ہو تو یہی مجاہدہ سخت ترین مجاہدہ ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ ہم لوگ شہر کے رہنے والے، چٹپٹے، مسالے والے کھانوں کے عادی، ہالیجی شریف میں خانقاہ کا کھانا چند روز کھاتے تو منہ سے پانی چھوٹنے لگتا، لیکن یہ خانقاہ کی محبت تھی، ان کے جذبات باطن کی کشش تھی کہ ہفتوں بلکہ مہینوں اسی سادگی میں مست رہتے تھے، نام خدا کی حلاوت وہ تھی کہ ہر حلاوت ولذت سے بے نیاز کر رکھا تھا، وہاں کا کھانا کیا تھا، آپ حضرت ہالیجوی قدس سرہ کے حالات میں پڑھ آئے ہیں، پھر سن لیجئے کہ آج دور تعیش میں یہ ایک نامانوس سی حکایت معلوم ہوتی ہے۔

حضرت کے یہاں بازار کی بنی ہوئی چیز ''شجر ممنوعہ'' تھی نہ مٹھائی اور نہ کوئی اور چیز! خانقاہ میں اگر کوئی شخص بازار کی پکی اور بنی چیز لاتا تو آپ اسے قبول نہ کرتے اور نہ فقراء خانقاہ میں کسی کو کھانے کی اجازت دیتے، جو کچھ نان نمک ہوتا،

وہیں حضرت کے گھر تیار ہوتا، پکانے والے بھی سب ذاکر وشاغل، صاحب تقویٰ وطہارت، اور کھانے والے بھی پاک صاف قلب وزبان والے باطنی احوال میں خود بخود ترقی ہوتی چلی جاتی، اوہام وخیالات اور ہجوم وساوس کا تو شاید وہاں گزر بھی نہ تھا۔ پیر خانقاہ کی شخصیت اتنی طاقت ور تھی، کہ غبی اور بے استعداد سالک بھی، نور معرفت سے منور ہوجاتا تھا۔

حضرت نے جب مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دیا، تو اپنا سب کچھ دیدیا، ایک عالم خود فراموشی کا آپ پر طاری ہوگیا، کھانے کپڑے مکان اور سامان معیشت کا ہوش نہ رہا، دن رات ذکر الٰہی کی محویت رہتی تھی، اعزہ واقرباء کو افسوس ہوتا تھا کہ اتنا پڑھا لکھا عالم وفاضل نہ جانے کیا ہوگیا ہے، کہ دیوانہ سا ہورہا ہے، لیکن کسی کو کیا خبر کہ یہ دیوانگی کتنی مبارک تھی، ہزاروں فرزانگیاں اس پر قربان!

سالک جب اللہ کی محبت واطاعت کی یہ راہ طے کرتا ہے، اور مردانہ وار دنیا اور حب دنیا سے منہ موڑتا ہے، تو اس پر عجیب عجیب حالات کا ورود ہوتا ہے، یہ راہ غیب کی راہ ہے، شہود سے برکنار ہوکر گزرتی ہے، محبّ، محبوب حقیقی کی جستجو میں نکلتا ہے، مگر وہ ایسا غیب بلکہ غیب الغیب ہے کہ اس کے آثار ومظاہر گو ہر جگہ اور ہر وقت نمایاں ہیں، مگر وہ خود اللہ کی پناہ! جتنا اسکی جستجو میں آگے بڑھئے غیب اور گہرا ہوتا جاتا ہے، اور غیب جتنا گہرا ہوتا جاتا، ایمان بالغیب کی شان بلند ہوتی جاتی ہے، اس وقت حیرت مسلسل میں پڑجاتا ہے۔ پھر اتنا ہی احساس باقی رہتا ہے جس کو کسی عارف نے بیان کیا ہے۔

دور بینان بارگاہ الست غیراز یں پے نہ بردہ اند کہ ہست

جو لوگ دربار الٰہی میں بہت دور تک نظر رکھتے ہیں، ان کے علم وادراک کی حد بس یہیں تک ہے کہ، وہ موجود ہے، اس کے آگے وہ بھی سرنگوں ہیں، اور اس منزل

حیرت تک پہونچنے میں بھی ایک طویل مسافت طے کرنی پڑتی، شیخ کامل ہوتا ہے، تو راستے کی تمام گھاٹیوں کو پار کرادیتا ہے۔

حضرت نے ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت والا سے تعلق ہونے کے بعد ان کی برکت سے عرصہ تک ذوق وشوق کی عجیب وغریب کیفیات رہیں، ہر وقت ایک سرشاری اور سرور کی کیفیت رہا کرتی تھی۔ لیکن اچانک جو کیفیت بدلی ہے تو سارا ذوق وشوق کافور، عجیب سی مھجوری کی کیفیت پیدا ہوگئی، ذکر وشغل کا سارا لطف جاتا رہا، طبیعت پریشان ہوگئی، اسی پریشانی میں خانقاہ شریف میں حاضری ہوئی، خدمت اقدس میں پہونچ کر بھی وہی افسردگی اور بے کیفی چھائی رہی۔ دل اپنے آپ میں نہ تھا، اسی بے قراری میں میں نے حضرت کے پاؤں پر ہاتھ مار کر کہا کہ آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں، نہ آپ میرے پیر نہ میں آپ کا مرید! حضرت نے نہایت سکون اور وقار سے جواب دیا۔ بیٹا! حال راز وال، مقام رادوام

یعنی یہ تو حال ہے، حال چلا جاتا ہے، لیکن جب وہ راسخ ہوکر مقام بن جاتا ہے، تو دائم رہتا ہے، ابھی تلوین ہے، بعد میں تمکین حاصل ہوگی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مجھے اس جواب سے تسلی نہیں ہوئی، وہی بے چینی رہی، کچھ دنوں کے بعد میں نے اسی گستاخانہ انداز میں ہاتھ مار کر کہا کہ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں، نہ آپ میرے پیر، نہ میں آپ کا مرید، یہ سن کر حضرت پر ایک کیفیت طاری ہوئی، حضرت ہمیشہ مجھ سے اردو میں بات کرتے تھے، مگر آج سندھی زبان میں ارشاد فرمایا:

پُٹۂ مخلوق ساں تعلق چھٹ، خالق ساں تعلق کر

بیٹا! مخلوق سے تعلق توڑ، خالق سے تعلق جوڑ، بس اتنا سننا تھا کہ ساری بے قراری کافور ہوگئی، اور طبیعت ٹھہر گئی۔

ایک مقام سخت آیا تھا، مگر شیخ کی توجہ وکرم سے یہ گھاٹی پار ہوگئی۔

شیخ نے تکمیل سلوک کے بعد بیعت کی اجازت عطا فرمائی۔ حضرت اقدس ۱۹۵۴ء میں کراچی تشریف لے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں شیخ کا انتقال ہوا۔ اس چھ سات سال کے عرصہ میں حضرت اقدس بکثرت شیخ کی صحبت میں رہے، اور اجازت سے سرفراز ہوئے۔

حضرت اقدس سے اس حقیر کو غالباً ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء میں شرف ملاقات حاصل ہوا، غازی پور میں دو ماہ قیام رہا۔ سفر حضر، جلوت خلوت میں بکثرت ساتھ رہا۔ سب سے پہلی جو بات دل میں بیٹھی وہ حضرت کی رقت قلب اور بات بات پر آنسوؤں کا چھلک پڑنا تھا۔ اللہ کا ذکر آیا اور آنکھیں برس پڑیں، رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ آیا اور دل بیتاب ہوا، اور یہ بے تابی آنکھوں کی راہ سے بہنے لگی۔ قرآن کریم کی تلاوت میں، نماز کے اندر رونے، اور گریہ وزاری کے تذکرے بزرگوں کے حالات میں پڑھے تو بہت تھے لیکن مشاہدہ بہت کم ہوا تھا، یہ حسرت، حضرت کو دیکھنے کے بعد پوری ہوئی، میں نے کراچی کے معمولات میں دیکھا کہ حضرت بعد نماز فجر بیٹھ جاتے تھے، اور قرآن کی تلاوت زبانی حفظ سے شروع فرماتے، ایک دو صاحب قرآن شریف کھول کر سنتے، قرآن کی تلاوت جاری ہے، اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، آواز قدرے متاثر ہو رہی ہے، کبھی اچھی خاصی گھٹ جاتی ہے، مگر نہ تلاوت کا تسلسل ٹوٹتا ہے، نہ آنکھوں کی روانی میں فرق آتا ہے۔ سننے والے بھی رونے لگتے دو دو تین تین پارے سناتے اور روتے رہتے، مجھے رہ رہ کر قرآن کریم کی آیت یاد آتی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ **واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا آمنا فاکتبنا من الشاهدین** (سورہ مائدہ) جب وہ لوگ اس کلام کو جو رسول پر اتارا گیا ہے، سنتے ہیں تو تم ان کی آنکھوں کو دیکھتے ہو کہ آنسوؤں سے بہہ پڑتی ہیں

، کیونکہ انھوں نے حق کو پہچان لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے ہم کو گواہوں میں لکھ لیجئے۔

رسول اللہ ﷺ کے احوال مبارکہ میں بار بار یہ بات پڑھنے میں آتی ہے کہ قرآن پڑھتے وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے، ایک امتی کی آنکھوں کو اس طرح بہتے دیکھ کر رسول اکرم ﷺ کی یاد بے ساختہ دل کو تڑپا جاتی تھی۔

ایک بار میں اور میرے مرحوم دوست حضرت حاجی عبدالرحمٰن صاحب خیر آبادی علیہ الرحمہ شیخ کی خدمت میں ان کے گاؤں شیخ پور میں حاضر تھے، حاجی صاحب مرحوم بھی بڑے صاحب دل انسان تھے، حضرت کی ایک ایک کیفیت سے متاثر ہوتے تھے، رات کا قیام وہیں تھا، صبح کو حضرت فجر کی نماز ہم لوگوں کے شدید اصرار پر پڑھانے کیلئے تیار ہوئے۔ غالباً دوسری رکعت میں سورہ قیامہ کی تلاوت فرمائی، پہلی رکعت میں آواز بھرانی شروع ہوگئی، اور مقتدیوں کے دل سینے میں دھڑکنے لگے تھے، دوسری رکعت میں سورہ قیامہ کی تلاوت شروع کی تو تھوڑی دیر میں ہچکی بندھنے لگی اور جب **کلا بل تحبون العاجلة** پر پہونچے آواز بے قابو ہوگئی، اور سارے مقتدی رو پڑے، اس نماز میں ایسی حلاوت اور یکسوئی حاصل ہوئی کہ مدتوں اس کی یاد، دل میں لطف پیدا کرتی رہی، حاجی صاحب مرحوم اخیر اخیر تک اس دن کے کیف وحلاوت کا ذکر کرتے رہے۔

۱۹۹۷ء میں میری حاضری حضرت اقدس کی خدمت میں کراچی میں ہوئی، اس وقت یکسوئی کے ساتھ معیت وصحبت کی سعادت نصیب ہوئی، وہاں یہ رنگ اور نمایاں دیکھا، نماز فجر کی تلاوت میں بار بار آواز بھراتی، اور مقتدیوں کی حالت دگرگوں ہوتی۔

دوسری بات جو حضرت اقدس کے معمولات زندگی میں بہت نمایاں ہے، وہ

تواضع وفروتنی ہے، یہ صفت حضرت کی ذات میں اس درجہ نمایاں ہے کہ ہر شخص بیک ملاقات ہی اسے محسوس کر لیتا ہے، فنائیت، کسر نفسی اپنے کو مٹائے رکھنے کا وہ جذبہ ہے کہ بس! میں نے دیکھا ہیکہ ہر ایک کی خدمت اس بے تکلفی سے کر دیتے ہیں جیسے یہی ان کا کام ہے، اور یہی انہیں کرنا چاہئے، میں نے بار بار دیکھا ہے کہ کسی کو پانی کی حاجت ہوئی، اور حضرت بے تکلف خادموں کی طرح پانی لے کر پیش کر رہے ہیں، مہمانوں کیلئے بستر بچھا رہے ہیں، چارپائی اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں، میں جن دنوں حضرت کی خدمت میں کراچی میں تھا، جامعہ حمادیہ کے مہمان خانہ میں قیام تھا، میرے ساتھ اس وقت کے طالب علم اور اس وقت کے مدیر ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخو پور عزیزم مولوی حافظ ضیاء الحق سلمہ تھے، حضرت نے بڑا اہتمام ہم دونوں کا کیا تھا، ہم لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوتے۔ حضرت تشریف لاتے اور بے تکلف بستر سے نیچے طالب علموں کی طرح دوزانو بیٹھ جاتے، ہم لوگوں کی درخواست اور اصرار کے باوجود اس جگہ نہ بیٹھتے جو کسی بڑے کے شایان شان ہوتی ہے۔

ان دنوں میں ان کے شیخ و مرشد حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجوی قدس سرہ کے حالات لکھ رہا تھا۔ میں حضرت کے صاحبزادے مولانا مفتی عاصم عبد اللہ کی درس گاہ میں تپائیوں کے درمیان بیٹھا لکھتا ہوتا، حضرت تشریف لاتے تو تپائیوں کے اندر نہ تشریف لاتے باہر ہی طالب علموں کی ہیئت میں بیٹھ جاتے، اور مجھے اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیتے۔

شیخ پور کے دوران قیام کچھ لوگوں نے ایک گاؤں چلنے کی دعوت دی، وہ گاؤں شیخ پور سے قدرے فاصلے پر ہے، میں موجود تھا، داعی میرے طالب علموں میں تھے، میں نے ان کو ہدایت کی کہ موٹر سائیکل لیتے آئیں۔ اس پر حضرت بآسانی وہاں پہونچ جائیں، انھوں نے بات مان لی اور وعدہ کیا کہ موٹر سائیکل لے کر آؤں گا، مگر جانے کا وقت آیا تو دیکھا کہ ایک سائیکل ٹھیلہ لے کر آئے جو سواریاں نہیں بلکہ سامان ڈھونے کیلئے استعمال ہوتا ہے، میں نے ان سے مواخذہ کیا، تو وہ کچھ بے تکے عذر کرنے لگے، مجھے بہت رنج ہوا کہ ان لوگوں کو بزرگوں کی ذرا بھی قدر نہیں، اگر ذرا فکر کئے ہوئے تو موٹر سائیکل نہ سہی رکشہ مل جاتا، میں نے انہیں ڈانٹا اور کہدیا کہ حضرت ٹھیلہ پر نہیں بیٹھیں گے، میں نے کچھ لوگوں سے کہا کہ موٹر سائیکل لاؤ اس وقت موٹر سائیکلیں اتنی عام نہیں تھیں۔ جتنی اب ہیں، تھوڑی محنت کے بعد ایک موٹر سائیکل مل گئی۔ میرے زجر و توبیخ سے داعی متاثر تھے، حضرت بہت لجاجت اور عاجزی سے مجھ سے کہنے لگے کہ میں اسی ٹھیلے پر جاؤں گا، وہ اس بے تکلفی سے اس پر بیٹھنے کیلئے تیار تھے، جیسے یہ کوئی بہت عمدہ سواری ہو، بات سن کر میں سناٹے میں آگیا، میں نے کوشش کی موٹر سائیکل جلد آجائے، میں کسی طرح انہیں ٹھیلے پر بیٹھنے سے روکتا رہا، بارے موٹر سائیکل آئی، اب حضرت مصر ہیں کہ آپ اس پر بیٹھئے میں ٹھیلے سے جاتا ہوں، میں نے بضد ہو کر حضرت کو موٹر سائیکل پر بٹھایا، حضرت تشریف لے گئے، ٹھیلے پر دوسرے احباب بیٹھے۔

یہی حال کراچی میں تھا۔ حضرت جس محلے میں پہلے رہتے تھے، اور وہاں کی مسجد میں ابتداء سے امامت فرماتے ہیں، وہ مدرسے سے خاصے فاصلے پر ہے جب تک طاقت رہی، مدرسہ سے پیدل ہی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اب بڑھاپے میں گاڑی پر تشریف لے جاتے ہیں تو اپنے لئے انھوں نے ایسی گاڑی کا انتخاب کیا ہے جو سب گاڑیوں میں کمتر ہے۔ یہ خاکسار بھی حضرت کے ہمراہ اسی گاڑی سے آتا جاتا تھا، حضرت نے ہمیشہ باصرار اپنے اس حقیر مرید کو گاڑی میں ممتاز جگہ پر بیٹھایا۔ اور خود کسی طرف بیٹھ جاتے، اس میں میری تدبیر اور کسی اصرار کو کامیابی نہ ملی۔

حضرت جامعہ حمادیہ کراچی کے بانی ومہتمم ہیں، لیکن دفتر اہتمام میں کارکنان اہتمام اور نائب کی نشستگاہیں تو متعین ہیں مگر خود حضرت کیلئے کوئی متعین جگہ نہیں ہے، لوگوں نے ایک نشستگاہ حضرت کیلئے بنائی ضرور ہے، مگر وہاں جب تک میں رہا، حضرت کبھی بیٹھے نہیں، مدرسے کے کاغذات اور کچھ کتابیں منتشر رکھی ہوئی تھیں۔ خود حضرت کا حال یہ تھا کہ کسی عام جگہ پر بیٹھ جاتے اور دفتر بھی کراچی کے عام مدرسوں کے برخلاف نہایت سادہ اور بغیر کسی آرائش وزیبائش کے ہے۔

حضرت کی خدمت میں رہ کر ایک بات کا احساس بڑی شدت سے ہوتا رہا، وہ یہ کہ حضرت کے قلب مبارک میں ذات خداوندی کا ہمہ وقت استحضار رہتا ہے، عام طور سے لوگ بزرگوں سے دعاؤں کی درخواست کرتے ہیں، حضرت سے جب کوئی درخواست کرتا تو فوراً نہایت خشوع اور خضوع سے ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں، ایسا ایک ہی مجلس میں بار بار ہوتا ہے، مگر حضرت کے چہرے پر کسی طرح کا ملال نہیں محسوس ہوتا۔ جتنی مرتبہ بھی دعا کیلئے ہاتھ اٹھاتے، ایسا محسوس ہوتا، جیسے سراپا دربار الٰہی میں حاضر ہوں۔

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ کے ایک بزرگ خلیفہ حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی (نابینا) علیہ الرحمہ کا حضرت مولانا اکثر تذکرہ فرماتے، حضرت قاری صاحب فن تجوید وقرأت کے امام ومجتہد تھے ''عنایات رحمانی'' ان کی مشہور ومفید تالیف ہے، حضرت مولانا نے ان کا ایک حال بیان فرمایا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قلب میں ذات الٰہی کا کس قدر استحضار تھا، اور اس دربار سے ان کا کیسا والہانہ لگاؤ تھا، فرمایا کہ ایک روز دیکھا کہ فجر کی نماز کے بعد دعا کیلئے حضرت قاری صاحب نے ہاتھ اٹھایا، اور مسلسل حضور الٰہی میں مناجات کرتے رہے، اور یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ جب ظہر کی اذان شروع ہوئی تب منہ پر ہاتھ پھیرا۔

اتنی دیر تک دعا میں ہاتھ اٹھا کر مشغول رہنا دلیل ہے اس بات کی کہ قلب کلیۃً اسی دربار میں حاضر تھا، یہ کیفیت حضرت اقدس نے حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہ کے بارے میں بیان کی، اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ حضرت مولانا ''حدیث دیگراں'' کے ضمن میں اپنا حال بیان فرما رہے ہیں۔

اس خاص انابت واستحضار کے ساتھ موقع موقع پر حضرت کی ذہانت وظرافت بھی جلوہ گر ہوتی رہتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا انداز اس ذہانت و ظرافت کے امتزاج سے اس قدر پیارا ہوتا ہے کہ آدمی قربان ہو کر رہ جائے۔

ایک صاحب بوڑھے داڑھی مونچھ صاف حضرت کی خدمت میں اپنے پوتے کو گود میں لئے ہوئے حاضر ہوئے کہ حضرت اسے دم کر دیجئے، حضرت دم کرنے لگے بے زبان بچہ اپنے دادا کے منہ پر ہاتھ مارتے ہوئے کچھ غوں غاں کر رہا تھا، حضرت نے فرمایا کہ آپ جانتے ہیں یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کہہ رہا ہے اب ہم آگئے ہیں سیٹ خالی کیجئے اور جانے کی تیاری کیجئے، داڑھی رکھ لیجئے۔ اب وہاں آخرت کے لحاظ سے رہیئے، وہ صاحب بہت متاثر ہوئے اور وعدہ کیا کہ اپنے اندر تبدیلی لاؤں گا۔

ایک صاحب نے حضرت سے سوال کیا کہ مجھے تلاوت قرآن سے بہت شغف ہے، اگر میں سارے ذکر واذکار کو چھوڑ کر تلاوت قرآن پر ہی اکتفا کروں تو کیا حرج ہے؟ حضرت نے بے ساختہ فرمایا کہ اگر آپ کہیں کہ میں تمام غذاؤں کو چھوڑ کر صرف گھی کھایا کروں تو کیا حرج ہے؟ اس پر حکیم اور ڈاکٹر کا جواب کیا ہوگا۔ بس وہ خاموش ہو گئے۔

حضرت کا جواب بڑا حکیمانہ تھا، قرآن کی تلاوت کا مرتبہ بے شک بہت عظیم ہے۔ لیکن انسانی احوال کے اعتبار سے دوسرے اذکار واوراد کی بھی بڑی اہمیت ہے،

قرآن کریم کے حق تلاوت کی ادائیگی کا راستہ بھی انہیں اورادواذکار سے ہموار ہوتا ہے، اس لئے محض تلاوت کی بات ہے تو بظاہر بہت خوشنما، مگر افادیت مکمل نہ ہوگی، جب تک دوسرے اورادواذکار معمول میں نہ ہوں، حضرت کے جواب میں قرآن کی عظمت بھی پورے طور پر نمایاں اور دوسرے اذکار کی اہمیت بھی واضح ہے۔

حضرت اقدس پر رسول کریم ﷺ کی صفت رحمۃ اللعالمینیت کا پرتو معلوم ہوتا ہے، مہربانی وشفقت کا برتاؤ ہر شخص کے ساتھ اس درجہ ہے، کہ کسی کی ادنیٰ تکلیف سے بے چین ہوجاتے ہیں، اسی کا اثر ہے کہ ہر شخص کے لئے بڑے اہتمام سے دعا کرتے رہتے ہیں۔ جس نے دعا کی درخواست کی ہے اس کیلئے تو خیر کرتے ہی ہیں، عامۃ الناس کیلئے بھی ہمیشہ دعا فرماتے ہیں

ایک روز حضرت نے ایک بہت طویل دعا پڑھی جسے وہ سونے سے پہلے پڑھا کرتے ہیں، مجھے وہ دعا محفوظ نہ رہی، اس میں وہ کائنات میں ہر ایک کے لئے خواہ وہ آسمانی مخلوق ہو یا زمینی مخلوق سب کیلئے بالتفصیل دعا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو مجھ گنہگار کے حق میں بھی قبول فرمائیں۔

غرض حضرت اقدس اسلام وایمان اور معرفت واحسان کے ایک پیکر جمیل
ہیں اور مروت وانسانیت کے ایک دلآویز مرقع!

☆☆☆☆☆☆☆

ایک دل آویز شخصیت، ایک مثالی انسان!

(مولانا حافظ قمر الدین صاحب مدظلہ)

یہ تحریر مولانا قمر الدین صاحب کے مجموعۂ کلام کے لئے لکھی گئی۔

یہ سطریں میں ۲۷؍رجب ۱۴۲۳ھ مطابق ۵؍اکتوبر ۲۰۰۲ء کو لکھ رہا ہوں۔ اب سے غالباً ۱۸؍سال پہلے کی بات ہے، میں مدرسہ دینیہ، شوکت منزل، غازی پور، میں مدرس تھا، میرے اہل وعیال بھی مدرسہ کے احاطے میں مقیم تھے، صبح کا وقت تھا، میں گھر میں تھا، شوکت منزل کے بالائی حصہ میں میری درس گاہ تھی۔ میرا بچہ محمد عارف سلّمہٗ، جس کی عمر چار سال کے قریب تھی، میری درس گاہ میں موجود تھا، بھاگا ہوا آیا، اور اپنی توتلی زبان میں کہنے لگا ابا! ایک مولانا صاحب آئے ہیں، آپ کو بلا رہے ہیں، مجھ کو ڈانٹ رہے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی ایسے بے تکلف کون صاحب آگئے، خیر بہت سے علماء سے میری بے تکلفی ہے، ان میں بزرگ بھی ہیں، ساتھی بھی ہیں، میں ناشتہ سے فارغ ہوکر بچے کے تقاضے کے باوجود اطمینان سے گیا، اوپر پہونچا، تو ایک باوجاہت شخص لپکتے ہوئے دکھائی دئے، متوسط قد، چہرے پر قدرے چیچک کے آثار، ڈاڑھی خوب بھری ہوئی، گھنی اور لمبی، کچھ کچھ پکی، آنکھوں میں خاص طرح کی چمک، عربی رومال سر پر، لمبا کرتا، شرعی پاجامہ، ہنستے مسکراتے بے ساختہ

سلام کرتے ہوئے لپٹ گئے، ’’بہت دن سے آنا چاہتا تھا، مولانا محمد مسلم صاحب سے آپ کا تذکرہ بہت سنا ہے، وہ آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کل فلاں جگہ آیا تھا، معلوم ہوا کہ غازی پور قریب ہے، سوچا آج ہی مل لوں، بہت محبت ہے، بہت جی چاہتا تھا کہ مل لوں‘‘۔ یہ اور اس طرح کے جملے مسلسل ان کے منہ سے پھول کی طرح جھڑ رہے تھے، اور محبت کی طراوت سے دل سرشار ہوا جارہا تھا، انداز وہ تھا جیسے مدتوں کی شناسائی ہو، اور میں حیران ہو رہا تھا کہ اس چہرۂ زیبا کی جلوہ گری اور اس مدھ بھری آواز کی سحر طرازی پہلی مرتبہ نگاہوں کے سامنے اور کانوں میں آئی ہے۔ میں اپنے حافظے کا خزانہ الٹ پلٹ رہا ہوں کہ شاید یہ صورت اور یہ آواز کسی گوشے میں دبی ہوئی مل جائے، مگر نہیں ملی، اور ان کی مسلسل گفتگو مہلت نہیں دے رہی تھی، میں نوجوان، وہ ادھیڑ! میں ادب سے گڑا جارہا تھا اور استفہامیہ نظروں سے دیکھے بھی جارہا تھا، وجاہت وہ تھی کہ صراحۃً سوال کرنے کا یارا نہ تھا۔ کافی دیر تک پریشان کرنے کے بعد کھلے کہ میں

> ’’قمرالدین ہوں، نوناری، ضلع جونپور کا رہنے والا ہوں۔ مولانا مسلم صاحب کا بے تکلف دوست ہوں، مولانا جامعہ حسینیہ جونپور سے سبکدوش ہوئے ہیں، تو زبردستی ان کی جگہ مجھے بیٹھا دیا گیا ہے‘‘۔

اتنا سننا تھا کہ میری پیشانی پر ناگواری کی لکیریں بننے لگیں۔ میرے استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامعہ حسینیہ جونپور کے بانی اور معمارِ اول تھے، بہت مشکل اور صبر آزما حالات میں اس مدرسہ کو انھوں نے قائم کیا تھا، اور اس کی تعمیر وترقی کے لئے انھوں نے غالباً اپنی طاقت کا ہر قطرہ نچوڑ دیا تھا۔ دن رات مسلسل کام میں لگے رہتے تھے، اسباق بھی پڑھاتے، طلبہ کی تربیت بھی کرتے، روزانہ چندہ بھی کرتے، تعمیر کی نگرانی بھی فرماتے۔ گویا تعلیم وتربیت اور فراہمیٔ مال

اور تعمیرات کا سب کام تن تنہا کرتے۔ بے مثال محنت انھوں نے کی، خیر یہ ایک لمبی داستان ہے، میں نے حضرت مولانا کے وصال کے بعد مجلّہ ’’المآثر‘‘ مئو میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں ان کی کاوشوں کا قدرے تذکرہ ہے۔ (اس کتاب میں وہ مضمون شامل ہے۔ دیکھئے ص: ۲۰۵)

لیکن ہوا یہ کہ جب مدرسہ چل پڑا، اور اس کو راستہ مل گیا، تو مولانا کی محنت کو نظر لگ گئی، کچھ لوگوں نے مولانا کی مخالفت شروع کردی، اور یہ مخالفت اتنی بڑھی کہ یہ کوہِ استقامت اپنی جگہ سے ہل گیا، مولانا وہاں سے اپنے آباد وشاداب چمن کو چھوڑ کر ہٹ گئے، مجھے یاد ہے کہ مولانا کو اس کا صدمہ شدید تھا، میں ان کا ایک معمولی شاگرد ہوں، وہ وہاں سے ہٹے تو بے چین رہے، اسی بے چینی میں مدرسہ دینیہ تشریف لائے، اور اپنے اس بے مایہ شاگرد کو ایک ہفتہ قیام سے نوازا، ایک ہفتہ مسلسل میں مولانا کی خدمت میں رہا، وہ بھی خوب کھلے، اپنے دل کا ہر ورق پلٹ کر دکھایا، مجھ سے جس قدر ادب واحترام اور استاذانہ ہیبت کے سائے میں ہوسکا، مولانا کی تسلی کی کوشش کی، مولانا نے یہ تو بالکل نہیں بتایا کہ کن لوگوں نے ان کی مخالفت کی، لیکن میرے دل میں ایک پیہم سا رنج وملال بیٹھ گیا۔ اب پانچ سات ماہ کے بعد یا سال بھر کے بعد ان صاحب نے بتایا کہ مجھے مولانا محمد مسلم صاحب کی جگہ پر بیٹھایا گیا ہے، تو رنج وملال کی لہریں، پیشانی پر لکیر بن کر ابھرنے لگیں، مجھے خیال ہوا کہ شاید یہ صاحب بھی جرگے کے ہوں، جنھوں نے مولانا کے ساتھ بدسلوکی کی تھی، لیکن وہ میرے مخفی تاثرات سے بے نیاز ایک دھن میں بولے چلے جارہے تھے، ان کی گفتگو اور ان کے لب ولہجہ سے اندازہ ہوا کہ اس شخص کے دل میں خلوص ومحبت کی خوشبو بسی ہوئی ہے، اور باتوں میں سچائی کا رچاؤ ہے، اس کا ظاہر وباطن ایک ہے، اس میں تصنع نہیں ہے، محبت صرف زبان پر نہیں دل بھی اس سے لبریز ہے، اس شخص

کا دامن مولانا کے خلاف کسی بھی عمل سے بالکل پاک ہے، مولانا ہی کی مرضی تھی، جس کی وجہ سے اس شخص نے اس جگہ بیٹھنا قبول کیا ہے، جب مجھے اطمینان ہو گیا تو پیشانی سے ناگواری کی سب سلوٹیں غائب ہو گئیں، اور بشاشت لوٹ آئی۔ میں نے اپنی اس ناگواری کا ذکر کبھی کسی سے نہیں کیا، آج پہلی مرتبہ اسے کاغذ کے حوالہ کر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ جس شخصیت کے سامنے میں بعد میں پگھلتا چلا گیا، اسے بھی میری اس ناگواری کی خبر ہے یا نہیں؟ اگر تھی تو اس کا کمال ہے کہ کبھی بھولے سے اس کا تذکرہ نہیں کیا، اور اگر نہیں ہوئی ...... جیسا کہ میرا یہی خیال ہے...... تو اب مجھے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اب ہمارے تعلقات اس سطح پر آ گئے ہیں کہ معافی مانگنا گستاخی ہے، بلکہ اپنے آپ کو اجنبی بنانا ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ محبت و یگانگت کی اس منزل کے بعد کوئی اجنبیت کا شوشہ پیدا کروں۔

تو یہ ہیں! مولانا قمر الدین صاحب جونپوری، جن کے کلام کا شاعرانہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ ہے میری ان سے پہلی ملاقات! کچھ دیر وہ بیٹھے، گفتگو کی جوئے رواں چلتی رہی، میں اس میں بہتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نہیں دو ندیاں بہہ چلیں، پھر کتنا وقت گزرا، اب کسے ہوش ہے، محبت جب زمزمہ پرواز اور نغمہ ریز ہوتی ہے، تو کائنات بھی گوش برآواز ہو جاتی ہے، وقت بھی ٹھہر کر سننے لگتا ہے کہ یہ دلآویز نغمہ اسے کبھی کبھی سننے کو ملتا ہے۔

مولانا واپس ہوئے، تو محبت کا ایک گہرا اثر دل پر چھوڑ گئے، مسافر تو چلا گیا، مگر اس کا نقش قدم دل کے سینے پر محفوظ رہ گیا، تعلقات کی بنیاد پڑ گئی۔ نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کی کشش مجھے جامعہ حسینیہ جونپور بار بار لے گئی۔ بار بار کی ملاقاتوں میں ان کے جوہر باطن کھلنے لگے اور محبت گہری ہوتی گئی۔

مولانا قمر الدین صاحب اپنے حلقے میں ''حافظ قمر الدین صاحب'' کے نام

سے معروف ہیں، وہ ایک جید حافظ ہیں، ان کے ماموں حافظ رحمت اللہ صاحب علیہ الرحمہ استاذ الحفاظ تھے، میں نے انھیں حفظ کی تعلیم دیتے ہوئے دیکھا ہے، وہ اس کے لئے بالکل یکسو تھے، ہمہ وقت طلبہ ان کو گھیرے رہتے تھے، نہیں بلکہ وہ طلبہ کو گھیرے رہتے، ان سے قرآن سنتے، قرآن کریم ان کے قلب و روح میں رچا بسا تھا۔ حافظ قمر الدین صاحب پر بھی ماموں کا اثر ہے، پڑھتے ہیں تو پڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ آواز بھی ماشاء اللہ اچھی ہے، قرآن پڑھتے ہیں تو سماں باندھ دیتے ہیں۔ ایک روز ان کے پیچھے جمعہ کے روز فجر کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ سورہ **الم سجدہ** اور سورہ **دھر** کی قرأت کی، صبح کا سہانا وقت، رقت و سوز سے بھری ہوئی آواز، قرأت کا لب و لہجہ، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فرشتے بھی گوش برآواز ہیں، طبیعت وجد میں آ گئی، بے جان دل امنڈنے لگا، خشک آنکھیں جھلا جھل ہو گئیں، دل کی کھیتی ہری ہو گئی۔ دورد و غم کی اس سرزمین پر محبت الٰہی کا مینہ برس گیا۔ مدتوں اس کی حلاوت یاد رہے گی۔

میں مولانا قمر الدین صاحب کو شاعر نہیں جانتا تھا، واقعہ یہ ہے کہ وہ شاعر نہیں ہیں۔ شاعری ان کے ساتھ لگ گئی ہے، وہ '' کچھ اور شئے ہیں''۔ میں اسی '' کچھ اور شئے'' کا تعارف کرنا چاہتا ہوں، مگر قابو نہیں پا رہا ہوں، فارسی کا ایک شعر لوحِ ذہن پر بار بار چمک جا رہا ہے۔ اسے لکھ دوں، شاید کچھ کہنے کا راستہ کھلے۔ کسی شاعر نے اپنے محبوب کی تعریف کرنی چاہی، مگر کیا تعریف کرے، اس کے کن کن اوصاف کو بیان کرے۔ حیران ہے، اسے یہ بھی نہیں سمجھ میں آتا کہ شروع کہاں سے کرے، اسے الفاظ نہیں مل رہے ہیں، کہ انھیں ترتیب دے کر حسن و جمال کا پیکر نگاہوں کے سامنے لائے، تنگ آ گیا تو اس نے کہا، بہت مختصر کہا، مگر سب کچھ کہہ دیا، کہتا ہے۔

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگر

میں ملکوں ملکوں پھرا ہوں، معشوقوں کی محبت اختیار کی ہے، بہت سے حسینوں کو دیکھا ہے، ”لیکن تم تو کچھ اور ہی چیز ہو۔“

”کچھ اور ہی چیز“ کے ابہام پر ہزاروں وضاحتیں نثار! جلیل مانک پوری یاد آگئے، کس قدر سادہ شعر ہے اور کتنا صحیح نقشہ ہے، بعض اشعار الہامی ہوتے ہیں، جی چاہتا ہے کہ یہ شعر بھی الہامی قرار دیا جائے۔ کہتے ہیں ؎

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے، مگر دیکھنے کی تاب نہیں

تو مولانا قمر الدین صاحب ”چیزے دیگر“ ہیں، وہ آدمی ہیں، مگر میں اپنے اندر دیکھنے کی تاب نہیں پاتا۔ پڑھنے والے اسے مبالغہ سمجھیں گے مگر میں تو حقیقت بھی نہیں بیان کر پا رہا ہوں، مبالغہ تک کیا پہونچوں گا۔

مولانا قمر الدین صاحب کا وطن ضلع جون پور کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، ”نوناری“ مانی کلاں کے قریب ہے۔ شاہ گنج سے جو سڑک جون پور جاتی ہے، اس پر شاہ گنج سے ۱۴؍ کلومیٹر جنوب اور جون پور سے ۲۰؍ کلومیٹر شمال میں مشہور بزرگ حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب نور اللہ مرقدہ کا قائم کردہ ادارہ مدرسہ ریاض العلوم گورینی ہے، مدرسہ کے پاس ہی سے ایک سڑک مشرق میں جاتی ہے، ۶/۵؍ کلومیٹر کے فاصلے پر سڑک کے دائیں جانب ”نوناری“ آباد ہے۔ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہے، لیکن علماء وطلبہ کی ایک بھیڑ کی بھیڑ ہے، جو ”شد رحـــال“ کر کے وہاں پہونچتی ہے، اللہ جانتا ہے کہ ان سطور کا راقم کتنی مرتبہ قافلہ لے کر اسی چھوٹے سے گاؤں میں پہونچا ہے۔ مولانا قمر الدین صاحب کا دروازہ اور صحن خاصا بڑا ہے، پلنگوں کی قطار بچھی ہے، بستر اور تکیے سے مزین ہے۔ مہمان فروکش ہیں، مہمان نوازی ہو رہی ہے، ساقئ مستانہ کی آواز بار بار گونج رہی ہے، ہر شخص خوش اور مطمئن ہے، ایک چہل پہل ہے، رونق ہے۔ مولانا قمر الدین صاحب گھر پر ہیں تو اہل محبت ٹوٹے پڑ رہے ہیں، اور اگر نہیں ہیں، اور ایسا بھی بہت ہوتا ہے کہ نہیں ہوتے، اور ایک دو دن نہیں، ایک دو ہفتے نہیں، ایک دو ماہ نہیں، ایک ایک برس نہیں ہوتے، تو دروازہ وصحن سراپا انتظار ہوتا ہے۔ بقول ان کے چھوٹے بھائی کہ ”بھیا جب ہوتے ہیں، تو کیسے کیسے لوگ دکھائی دیتے ہیں، اور نہیں ہوتے تو کتا بھی نہیں آتا“ بس بات یہ ہے کہ ؎

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں؟
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

گھر نہیں ہیں، تو جہاں ہیں وہیں چاہنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے، وہ خود بڑے اہل دل، بڑے اہل محبت ہیں، سارے اہل محبت کو سمیٹے ہوئے ہیں۔

عربی تعلیم انھوں نے مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج میں حاصل کی ہے، پھر وہاں سے دار العلوم دیوبند گئے، تکمیل دیوبند میں ہوئی۔ بدر الاسلام میں حضرت مولانا جمیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی شاگردی اور خدمت گزاری نصیب ہوئی۔

مولانا جمیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہ بڑی دلآویز شخصیت کے مالک تھے، تعلیم وتربیت میں انھیں کمال حاصل تھا، مولانا قمر الدین صاحب پر ان کی خاص توجہ تھی، اخلاق وانسانیت کی استعداد فراواں تو تھی ہی، انھوں نے رگڑ مانجھ کر کُندن بنا دیا۔

مدرسہ دینیہ کی پہلی ملاقات کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہو گیا، جامعہ حسینیہ جون پور سے ربط تو تھا ہی، حضرت مولانا محمد مسلم صاحب کی علیٰحدگی کے بعد اس پر افسردگی چھا گئی تھی، مولانا قمر الدین صاحب نے اسے پھر تازہ کر دیا، کچھ دنوں کے

بعد میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں مدرس ہو کر آ گیا۔ مولانا کا حکم ہوا کہ ”نوناری“ آؤ۔ میں نے تعمیل حکم کی، لیکن کس انداز سے؟ عصر کے بعد مدرسہ سے نکلا، جیپ پر بیٹھ رہا تھا تو ایک صاحب نے ایک تازہ مطبوعہ کتاب میرے ہاتھ میں تھما دی، میں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا، کتاب بڑی دلچسپ تھی، غالباً بزرگ شخصیات کے تذکروں پر مشتمل تھی، میں اس کے مطالعہ میں محو ہو گیا، اسی محویت میں مولانا کے گھر پہونچ گیا، مولانا کی خوشی دیدنی تھی، دوڑ دوڑ کر ”اکرام ضیف“ کا حق مہمان کی حیثیت سے بہت زائد ادا کر رہے تھے، مگر مہمان تھا کہ ان کی ہر خوشی سے بے نیاز، ان کے ہر اکرام سے صرفِ نظر کئے ہوئے مطالعہ کی محویت میں بے خبر! یہ سلسلہ سوتے وقت تک چلتا رہا۔ صبح ہوئی تو پھر وہی حماقت! مولانا نے کچھ کہا نہیں، صبح میں مدرسہ چلا آیا۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک ”نوناری“ بلانے کا نام نہیں لیا، ایک دن میں نے چھیڑ دیا، تو فرمانے لگے، مطالعہ کرنے کے لئے مدرسہ بہت ہے، آپ نوناری کیوں جائیں؟

اب مجھے احساس ہوا کہ مولانا تو مہمان کا پورا حق ادا کر رہے تھے، اور مہمان پر بھی کچھ حق ہوتا ہے، اس سے میں غافل رہا، اور مولانا نے کبھی ظاہر تو نہیں کیا، لیکن یہ بات کچھ اچھی نہ تھی، میں نے معافی مانگی، توبہ کیا، مولانا کا مہمان نہ بننا میرے لئے زندگی کی ایک کمی تھی، بحمد اللہ اب اجازت ملی، پھر تو بار بار حاضری ہوئی، لیکن وہ بھی کس شان سے؟ مولانا کا حکم ہو جاتا، بھائی حسام سے کہہ دیتے کہ فلاں صاحب آ رہے ہیں، سب کتابیں، سب پرچے ہٹا دو، چھپا دو، الماری میں بند کر دو، کہیں ان کی نظر نہ پڑ جائے، چنانچہ کچھ تخفیف کے ساتھ اب تک یہ التزام باقی ہے۔

مولانا کو مہمان نوازی کا بڑا ذوق ہے، مہمان کے بغیر شاید کوئی لقمہ ان کے منہ میں نہ جاتا ہو، کھیت ان کے پاس کافی مقدار میں ہیں، اور گھر پر رہتے ہیں تو

بڑے اہتمام سے کھیتی کرتے ہیں، اور غلہ بھی خوب پیدا ہوتا ہے، ان کے علاقہ میں ایک صاحب نے اپنے کھیتوں پر بڑی محنت کی، اور ماشاء اللہ بہت عمدہ فصل ہوئی، ایک دن انھوں نے برسبیل تذکرہ مولانا سے اپنی فصل کی عمدگی کا ذکر کیا، مولانا خاموش رہے، دوسرے کسی وقت مولانا انھیں اپنے کھیتوں کی طرف لے گئے، ان صاحب کی آنکھیں کھلی رہ گئیں، کہنے لگے یہ فصل تو میری فصل سے بدرجہا بہتر ہے، مولانا نے فرمایا کہ یہ کھیتی علماء وطلبہ اور مہمانوں کی نیت سے کی گئی ہے۔

مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے صدر دروازے کے قریب چائے کے ایک ہوٹل پر طلبہ کا ایک ہجوم تھا، سب کے ہاتھوں میں چائے کی پیالی تھی، پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ معلوم ہوا کہ ایک صاحب ابھی بس سے اترے ہیں، اور وہاں موجود تمام طلبہ کو بلا کر چائے پلا رہے ہیں، بغیر کسی تفریق کے سب کو بلا رہے ہیں، طلبہ تو ہیں ہی، عام لوگوں کو بھی بلا رہے ہیں، پلا رہے ہیں، کوئی معذرت کرتا ہے تو ناراض ہونے لگتے ہیں۔ میں نے جی میں کہا ہو نہ ہو، مولانا قمر الدین صاحب ہوں، آگے بڑھ کے دیکھا تو مولانا عجب اندازِ محبوبیت سے کھڑے تھے، اور چائے پینے والوں کو محبت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، اور خوش ہو رہے تھے، میں قبل اس کے کہ ان کی نگاہ میرے اوپر پڑے، وہاں سے کھسک گیا۔

یہی حال ان کا جون پور میں ہوتا ہے، کھانے کا ہوٹل ہے، جو مولوی یا طالب علم مل گیا، اسے بیٹھا رہے ہیں، کھلا رہے ہیں، جیب میں رقم ہے یا نہیں، اس سے مطلب نہیں، ہے تو دے دیا، نہیں ہے تو ادھار کر دیا، دکان دار انھیں جانتا ہو، یا نہ جانتا ہو، بخوشی ادھار دے دیتا ہے، پھر اسے یہ منہ مانگا دام ادا کرتے ہیں۔

سواری پر ہیں تو اپنے تمام رفقاء کا کرایہ دینے پر مصر ہیں، کوئی نہ مانے تو خفا ہو رہے ہیں، عجب انداز کے ہیں، ایک روز میں ان گھر حاضر ہوا۔ میرا کرتا غالباً کچھ

پھٹا ہوا تھا، مجھے کپڑوں کی طرف التفات کم ہوتا ہے، دیکھ لیا، خفا ہونے لگے، پھر اپنے ملبوسات لانے لگے، چھ جوڑے سلے ہوئے مرحمت فرمائے، میں ہاں ہاں، نہیں نہیں کہتا ہی رہ گیا، مگر وہ کب سننے والے تھے، ہاہ! خواجہ مجذوب صاحب نے کیا بات کہی ہے۔

زبردستی لگادی آج بوتل منہ سے ساقی نے
میں کہتا ہی رہا ہاں ہاں، نہیں ساقی نہیں ساقی

مولانا جن دنوں جامعہ حسینیہ میں تشریف فرما تھے، تو چندے کی مہم پر نکلتے تھے، مولانا کی عجب شان ہے، وہ جدھر نکلتے ہیں، ان کا انداز نرالا ہوتا ہے، وہ کھیتی کرنے پر آئے، تو اس میں بھی سکہ بیٹھا دیا، چودہ بیگھہ میں پیاز کی کاشت کی، اور دھوم مچادی، اتنی بابرکت کھیتی ہوئی کہ بس انھیں کا حصہ ہے، باغ لگایا تو چودہ بیگھے میں کیلے کے درخت لگاڈالے، چندہ کرنے نکلے تو اپنے کرایہ اور خرچ سے گیارہ مہینے ایک رفیق سفر کو لے کر چندہ کرتے رہے، اور بہت کیا۔ ایک بار نکلے تو برس دن سے زیادہ دورہ کرتے رہے، فتح پور ہنسوہ میں ایک مدرسہ قائم کیا یا کرایا، تو اپنے کو وقف ہی کردیا۔ جس کوچے میں نکلے رنگ جمادیا۔

مولانا شاعر بھی ہیں، عرصے تک مجھے معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ ہاں کبھی کبھی اشعار گنگناتے سنتا تھا، آواز اچھی ہے، کبھی فرمائش پر کچھ اشعار ترنم سے سناتے بھی تھے، مگر یہ کہ شاعر بھی ہیں، اور شعر کہتے بھی ہیں، مجھے معلوم نہ تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس کے بھی جوہر کھلے ۔ ان کے مربی اور استاذ حضرت مولانا جمیل احمد صاحب نوراللہ مرقدہٗ اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد عثمان صاحب علیہ الرحمہ بہت اچھے شاعر تھے، مولانا قمرالدین صاحب نے کب شاعری شروع کی، اس کا مجھے علم نہیں، مگر یہ معلوم ہے کہ شاعری کے کوچے میں قدم رکھا تو یہاں بھی کچھ عجب ہی نقش جمایا

عموماً حمد ونعت کے اشعار کہتے ہیں، یا اپنے تعلق والوں کی محبت میں غرق ہوتے ہیں، تو اشعار کے موتی نکالتے ہیں اور نکالتے ہی چلے جاتے ہیں۔ لمبی لمبی نظمیں بہت مختصر وقت میں کہتے ہیں، طبیعت کا رُخ جب ادھر گھوم گیا تو لمبی مسافت تھوڑی مدت میں طے کرتے ہیں۔ شاعری کو بطور فن کے انھوں نے نہیں برتا ہے، شاعری ان کیلئے مخدوم نہیں خادم ہے، جس طرح چاہتے ہیں، اس کا کان پکڑتے ہیں، اور بے تکلف جدھر چاہتے ہیں اسے پھراتے ہیں۔

انھوں نے کہا، اور بہت کچھ کہا، اور جو کچھ کہا، اس میں انتخاب نہیں کیا، اور شاید محبت میں انتخاب کی دردسری نہیں ہوتی، جو کچھ کہا ہے، اس ایک حصہ اس کا مجموعہ میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس میں وہ تینوں چیزیں ہیں جن کا اوپر میں نے ذکر کیا ہے

باقی حصہ انشاء اللہ دوسرے مجموعے میں آئے گا، اور ابھی تک دریا جاری ہے۔ اللہ جانے ابھی کیسے کیسے آبدار موتی نکلیں گے، مجھے شاعری سے دلچسپی نہیں ہے، انسانیت سے دلچسپی ہے، اخلاق ومروت سے دل بستگی ہے، محبت ووالہیت سے آشنائی ہے، یہ جوہر جہاں ملتا ہے، دل دے بیٹھتا ہوں، مولانا قمرالدین صاحب کی شاعری کس مرتبہ ومقام کی ہے؟ یہ نقادوں اور پڑھنے والوں کے حوالہ کرتا ہوں۔ میں کوئی حرف زنی نہیں کرتا، مجھے جس چیز نے گرفتار کر رکھا ہے اسے میں لکھ رہا ہوں، اور خوش ہوں کہ انسانیت اور محبت کی خوشبو پھیلا رہا ہوں۔

اب سے پانچ چھ سال پہلے مولانا پر دل کا شدید دورہ پڑا، زندگی کی آس ٹوٹتی نظر آئی، مگر فضل الٰہی شامل حال رہا، صحت ہوگئی۔ حلقۂ احباب جو اس خبر سے اَدھ موا ہو رہا تھا، پھر سے نہال ہوا۔ صحت یابی کے بعد ایک خط میں نے لکھا تھا، جس میں ان کی خصوصیات کی طرف اشارے ہیں۔ یہاں مناسب ہوگا کہ اس کے کچھ اجزاء نقل

کر دیئے جائیں۔ اس دورۂ قلب سے کچھ پہلے میں مدرسہ شیخ الاسلام، شیخو پور کے اساتذہ پر مشتمل ایک قافلہ کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور ان سے وعدہ لیا تھا کہ ۱۵/ جون ۱۹۹۷ء کے بعد وہ شیخو پور تشریف لائیں گے، اس وعدہ کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ:

ہم لوگ تو اپنی کہی ہوئی بات کے مطابق ۱۵/ جون کے بعد سے آپ کا انتظار کر رہے تھے، جب دیر ہوئی، تو دل کو یہ کہہ کر بہلا لیا کہ مہمان کثرت سے آ رہے اور جا رہے ہیں، شاید اس وجہ سے موقع نہیں ملا، لیکن کیا معلوم تھا کہ آپ کی مہمان نوازی کی صلائے عام عالم امراض وعلل تک جا پہونچے گی۔ لوگ تو آپ کے سفرۂ طعام سے استفادہ کر رہے تھے، ان صاحب کو کیا سوجھی کہ مائدہ قلب وجگر پر دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ دردِ دل (عشق ومحبت) کی آپ کے یہاں کیا کون سی کمی تھی کہ تمام دنیاداروں، سرمایہ داروں، بے کیف وبے حلاوت اور خودغرض ونفس پرور لوگوں کو چھوڑ کر آپ کے خانۂ جسم میں گھس آیا، اور دل کے دروازے پر دستک دے ڈالی، اسے تو وہاں جانا چاہئے تھا جہاں اصلی وحقیقی دردِ دل کی کمی تھی، وہاں جاتا، جگہ خالی ملتی بیٹھتا، اور ان خالی خولی جسموں کو لے کر اٹھتا۔ آپ کا دل تو معمور تھا، آباد تھا، یہاں تو مستی تھی، خدامستی تھی، دل کا گوشہ گوشہ بھرا پڑا تھا۔

کیا صرف زیارت کرنے آیا تھا، شاید اسے خیال آیا ہو کہ یہ کون سا گھر ہے جہاں دنیا کی دنیا چلی آ رہی ہے، جہاں برات ہی برات ہے، عاشقوں کا جمگھٹا ہے، محبوبوں کا مجمع ہے، اہل دل کا ہجوم ہے، سوچا کہ میں بھی دیکھ آؤں!

اچھا! آیا تھا تو دیکھ کر فوراً چلا جاتا! مگر آپ کو کب گوارا تھا کہ کوئی مہمان آئے اور یوں ہی دیکھ کر چلا جائے، اس کی ضیافت کرنی ہے۔ مہمان آیا ہے تو اب مولوی ظفر (صاحبزادے) بھی مشغول ہوں، حسام (بھائی) بھی انتظام میں لگ جائیں، سب لگ گئے۔ مہمان دم بھر ٹھہر گیا، مگر اس کا دم بھر ٹھہرنا قیامت تھا، خیر اب اس کا قصور معاف! پھر نہ آئے، ایسے مہمان سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میزبان کو لے جانے پر اصرار نہ کرے۔

جا...... اے درد...... اب نہ آنا، بہت سے دروازے ہیں کہیں بھی چلا جا۔ دنیاداروں کے یہاں تیری دعوت عام ہے، دینداروں کے یہاں تیرا کام نہیں ہے۔

خیر تو خود سے آتا نہیں کسی کے بھیجنے سے آتا اور اسی کے واپس بلانے سے جاتا ہے، تو تو کسی کا قاصد ہے، کبھی لے جانے کیلئے آتا ہے اور لے کر چلا جاتا ہے، دنیا دیکھتی رہ جاتی ہے، اور کبھی تنبیہ کے لئے آتا ہے کہ دیکھ انسان تیری مستی آنِ واحد میں ختم ہو سکتی ہے، اس لئے اب خبردار ہو جا، اب سے غفلت دور کر لے، دل غفلت کا محل نہیں ہے، یہ ذکر ومحبت کا مقام ہے، اگر اس میں غفلت رہے گی تو دیکھ جیسے اس وقت آ کر میں نے صرف چونکایا ہے، آئندہ چونکاؤں گا نہیں، دوسری ہی دنیا میں آنکھ کھلے گی۔

اور کبھی اس لئے آتا ہے کہ اہل محبت اور اہل تعلق کو چونکائے کہ اے لوگو! جس کو تم اپنے درمیان پاتے ہو، اسے برتتے اور اس سے استفادہ کرتے ہو، اس کے کرم اور فیاضیوں سے بہرہ مند ہوتے ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہ ہمارے پاس ہے، ہماری دسترس میں ہے، جب چاہیں گے حوض سے پانی بھر لیں گے، یاد رکھو کہ یہ دولت مستعجل ہے، بے فکر نہ رہو، جو استفادہ کر سکتے ہو، ظاہری نہیں باطنی، مادی نہیں روحانی، جسمانی نہیں قلبی، استفادہ کر لو، اس ایک چراغ سے اپنے چراغوں میں روشنی حاصل کر لو ورنہ یہ قندیل اٹھ جائے گی، تو تمہارے دئے کہاں سے روشنی پائیں گے؟

مولانا اچھے ہو کر گھر آ گئے۔ طبیبوں نے پرہیز کی زنجیروں میں جکڑ دیا، مگر

مولانا زنجیر کی ہر کڑی کو توڑتے رہے، زندگی مسکراتی رہی، درد پسپا ہوتا رہا، لیکن معذرت کے بہانے وہ مولانا کے پاؤں آلگا ہے، اس نے گھٹنوں کو تھام رکھا ہے، ہاتھ میں چھڑی پکڑا دی ہے اور خود گھٹنوں کو پکڑے ہوئے ہے۔ بڑھاپا ہے، نہ وہ چھوڑنا چاہتا ہے، نہ مولانا چھڑانا چاہتے ہیں، ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

زندگی کا سفر جاری ہے، یہ داستان ناتمام چھوڑتا ہوں، دیکھئے کس کی داستان پہلے تمام ہوتی ہے، لکھنے والے کی، یا زیر تذکرہ بزرگ شخصیت کی؟

میں تو غالب کا شعر دہراتا ہوں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

☆☆☆☆☆☆☆

شہادت: ۱۸ر مئی ۲۰۰۰ء مطابق ۱۳ر صفر ۱۴۲۱ھ 616

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب انیس احمد صاحب انیسؔ الہ آبادی

یہ تحریر انیس بھائی کے مجموعۂ کلام ”اشک ندامت“ کے لئے لکھی گئی۔

۱۹۷۷ء میں الہ آباد ہمارے علاقے کے مشہور بزرگ مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری نور اللہ مرقدہٗ کی خانقاہ اور ان کے قائم کردہ مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد میں میری حاضری ہوئی۔ یہاں حضرت شاہ صاحب کے تربیت کردہ علماء وصلحاء کے ایک اچھے خاصے مجمع سے تعارف ہوا، چہروں پر ذکرِ الٰہی کا نور، طبیعتوں میں تواضع ومسکنت، لباس ووضع قطع میں سادگی اور دینداری، سلام اور مصافحوں میں خلوص، اور گفتگو اور لہجے میں نرمی اور ملائمت! ایک ایسی دلکش اور دلآویز فضا اور ماحول میں پہونچا کہ طبیعت شاداب وسرشار ہوگئی، ان نورانی صورتوں کو دیکھ کر بار بار حضرت مولانا کی یاد دلوں میں تازہ ہوتی تھی، میں نے مولانا کی زیارت نہیں کی تھی، مگر ان حضرات کے سراپا میں مجھے حضرت اقدس کی پُرنور صورت جھلکتی تھی۔

ان میں کئی حضرات ایسے تھے، جن کی طرف دل کھنچتا تھا۔ ان سے مل کر، ان سے بات کرکے، دل میں قوت اور ایمان میں اضافہ ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ چند ایک بزرگوں پر میری تحریریں آچکی ہیں، جمیل بھائی مرحوم، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامی علیہ الرحمہ، ندوہ سرائے کے انیس بھائی رحمۃ اللہ علیہ، یہ حضرات تو

مرحوم ہوگئے، زندہ بزرگوں میں داروغہ مشتاق احمد صاحب جواب الحاج ہوچکے ہیں، ان حضرات پر کچھ کچھ لکھ چکا ہوں، شیخ خانقاہ حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہٗ پر بھی ایک مفصل مضمون لکھا تھا، مگر انھوں نے شائع کرنے سے حکماً روک دیا، اس لئے وہ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔

ان حضرات اکابر کے درمیان ایک شخصیت اور ملی، جو محبّ بھی ہے اور محبوب بھی، جس سے دل کو بہت گہرا تعلق ہوا، اتنا گہرا تعلق کہ وہ شخصیت دل میں اتر گئی، اس کی خوشبو سے دماغ معطر ہوگیا، جس طرح گوشت کی سطح سے ناخن کو اکھاڑا نہیں جاسکتا، اسی طرح دل کی تہوں سے اس شخصیت کی محبت کو جدا نہیں کیا جاسکتا، الہ آباد چھوڑے ہوئے چوتھائی صدی کا عرصہ بیت گیا، مگر محبت کا نقش بجائے مدھم ہونے کے اور تابناک ہوتا جارہا ہے۔ لمبا قد تواضع کی وجہ سے قدرے جھکا ہوا، چھریرا بدن، سر میں اور داڑھی میں اس وقت سیاہی غالب تھی، اور اب سفید برق ہیں، دل کا نور چہرے اور بالوں سے پھوٹا پڑتا ہے، لمبا کرتہ، ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ، پنج گوشیہ ٹوپی، بہت باغ و بہار، دلچسپ، ہنس مکھ، ظریف الطبع، ساتھ ہی نہایت رقیق القلب، خوف وخشیت سے لبریز دل، اللہ ورسول کی محبت میں سرشار، بات بات میں آنکھوں سے آنسو چھلک جاتا ہے۔

عشق الٰہی کا زور ہوتا ہے، اور محبت رسول غلبہ کرتی ہے تو طبیعت جھومتی ہے اور اشعار ڈھلنے لگتے ہیں، حمد ونعت کے بہت اچھے اچھے اشعار وارد ہوتے ہیں، پھر جب وہ اپنے خاص ترنم سے پڑھتے ہیں تو سننے والے جھوم جاتے ہیں، محبت میں بے تاب ہوجاتے ہیں، صاحب دل آدمی اپنی آنکھوں پر قابو نہیں پاتا، اشعار کی حلاوت، لہجہ کی گھلاوٹ اور ترنم کا سوز، سب مل کر وہ حالت پیدا ہوتی کہ ؎

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

یہ دل آویز شخصیت انیسؔ بھائی الہ آبادی کی ہے، ضلع الہ آباد کے مشہور خطہ چائل کے ایک مردم خیز گاؤں ''پورخاص'' کے رہنے والے ہیں، جن کا مجموعۂ کلام آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

الہ آباد کے دینی وروحانی تحفوں میں ایک بیش قیمت تحفہ انیس بھائی کے پیکر میں ملا، یہ مجھ سے عمر میں دس گیارہ سال بڑے ہیں۔ میری پیدائش ۱۹۵۱ء کی ہے، اوران کی ولادت اواخر ۱۹۴۰ء کی ہے، لیکن جب ان سے ملاقات ہوئی، تو مجھ سے بہت بڑے محسوس ہوئے، اور میں ان کے سامنے بچہ نظر آیا، مگر انھوں نے اپنے حسن اخلاق، بے تکلفی، اخلاص اور یگانگت کے برتاؤ سے اس فرق کو بہت دھندلا کردیا تھا۔ انیس بھائی انگریزی داں ہیں، الہ آباد یونیورسٹی میں انھوں نے بی، اے تک تعلیم حاصل کی، ہائی اسکول اور انٹر کے درجات سرائے عاقل کے اسکول میں کامیابی کے ساتھ عبور کئے، اس وقت اسکول میں اردو کے جو صاحب ٹیچر تھے، وہ تعلیم کے لحاظ سے وکالت پاس کئے ہوئے تھے، انھوں نے ٹیچری سے استعفا دیا، اور وکالت کرنے لگے، اسکول کے منتظمین کو ایک بہانہ ہاتھ آیا، انھوں نے فیصلہ کیا کہ اردو کا درجہ ہی اسکول سے ناپید کردیا جائے، انیس بھائی اس وقت انٹر کے طالب علم تھے، انھیں اس خطرناک فیصلے کا علم ہوگیا، انھوں نے بہت سے طلبہ کو تیار کرلیا کہ وہ درس کے مضامین میں اردو کا مضمون لیں، پھر انھوں نے تحریک چلائی کہ اردو کا ٹیچر رکھا جائے، منیجر نے انھیں پیش کش کی کہ فارغ اوقات میں تمہیں اردو پڑھا دو، اس کا معقول معاوضہ تمہیں دیا جائے گا، انیس بھائی نے شدت سے انکار کیا، اور اپنی تحریک جاری رکھی، بالآخر اہل انتظام مجبور ہوئے، اور اردو کے استاذ رکھے گئے، وہ سلسلہ بحمد اللہ اب بھی جاری ہے۔

بی، اے میں کامیابی کے بعد تعلیم کا سلسلہ آگے نہیں بڑھا، لکھنؤ میں ان کا

نکاح ہوا، وہاں آنے جانے کا سلسلہ ہوا، تو مدرسہ فرقانیہ میں قاری الطاف حسین صاحب مرحوم سے قرأت وتجوید کی تعلیم حاصل کی، آواز تو ماشاء اللہ بہت اچھی تھی ہی، بہترین قرآن پڑھنے لگے۔

انیس بھائی جس گاؤں کے رہنے والے ہیں وہاں مزار کے بدعات، عرس اور قوالی کا غلبہ تھا۔ انیس بھائی خوش گلو تو تھے ہی، اور قلوب پر سحر کرتے، خود بھی موزوں طبیعت تھے، اشعار بھی کہنے لگے۔

انیس بھائی خوش حال زمیندار گھرانے کے ایک معزز فرد تھے، انھیں کسی ملازمت کی ضرورت نہ تھی، گھر میں سب کچھ بافراط تھا، لیکن انگریزی تعلیم نے ملازمت کی راہ ہموار کی، بجلی کے محکمہ میں ملازم ہوگئے۔ اس وقت مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ الہ آباد میں تشریف فرما تھے، انیس بھائی صاحب سماع تھے، حضرت مولانا سے مسلکی بُعد تھا، مگر طبیعت میں دینداری اور اللہ ورسول کی محبت موجود تھی، اور حضرت مولانا کی بزرگی، زہد وتقویٰ، دعاؤں کی قبولیت اور فتوحات غیبی کا شہرہ ہوا کے پروں پر اُڑ رہا تھا، جو سنتا بے اختیار اس کا دل کھنچتا، ہر روز دور دور کے قافلے الہ آباد کی سرزمین پر اترتے اور فرشتوں جیسی معصوم صورتیں روشن باغ کی گلیوں میں چلتی پھرتی نظر آتیں، شاہ صاحب کے قلب کا نور آنے والوں کے چہروں پر دمکتا، اور دیکھنے والے متحیر ہوتے، الہ آباد شہر متعدد بزرگوں کا مرکز رہا ہے، قلوب میں ذکرِ الٰہی کی تاثیر موجود تھی، شہر کے لوگ بھی یکے بعد دیگرے مولانا کے دائرۂ قرب میں آتے چلے گئے، انیس بھائی جیسا صاحب دل آدمی کیونکر دور رہ سکتا تھا، بالآخر حضرت کی کشش نے انھیں کھینچ لیا، اس بارگاہ میں آکر قوالی ہٹ گئی، اور ان کی زبان ودل پر قرآن کریم نے اور مناجات مقبول نے قبضہ جمالیا۔ زبان ذکرِ الٰہی سے تر ہوئی، دل نے محبت الٰہی کی نئی حلاوت

پائی، نمازیں پہلے بھی پڑھتے تھے، مگر اب رنگ بدل گیا۔

انیس بھائی نے اپنی تبدیلی کی داستان خود ایک مضمون میں تحریر فرمائی ہے، جو ماہنامہ وصیۃ العرفان میں ”قوالی سے قرآن تک“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس میں انھوں نے تفصیل سے اپنی داستان لکھی ہے، انیس بھائی کا یہ مضمون حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی علیہ الرحمہ کی مرتب کردہ سوانح حالات مصلح الامت کی جلد دوم ص: ۳۱۴ پر ”بھائی انیس احمد پُر خاصوی کی کہانی خود ان کی زبانی“ کے عنوان سے شامل کتاب ہے، ان کی طبیعت اور مزاج کے مطابق بہت پُرسوز اور مؤثر تحریر ہے، قابل مطالعہ ہے۔

میری ملاقات انیس بھائی سے ۱۹۷۷ء میں ہوئی، جب میں حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب کی سرپرستی میں مدرسہ وصیۃ العلوم میں مدرس تھا، انیس بھائی بجلی کے محکمے میں دفتر میں ملازم تھے، عہدہ معقول تھا، دفتر سے فارغ ہوکر مدرسہ میں تشریف لاتے، ان کے آتے ہی مجلس کا کیف بڑھ جاتا، ان کی طبیعت میں ذہانت کے ساتھ لطیف ظرافت ہے، ان کی مجلس کبھی بوجھل نہیں ہوتی، آتے تو مجلس کی گفتگو میں شریک ہوجاتے، مجلس کا موضوع دینی معلومات اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا تذکرہ ہوتا، دفتر سے فارغ وقت، کوئی اور ضروری کام نہ ہوتا، تو مدرسہ اور خانقاہ میں گزارتے، ہم لوگ فرمائش کرتے تو اپنی کہی ہوئی نعتیں سناتے، اور قلوب کو گرماتے۔

ہر روز ان کا انتظار رہتا، اگر کسی دن نہ آتے تو خلا محسوس ہوتا، دوسرے دن آتے تو سوالات کی بوچھار ہوتی اور وہ اپنے دلچسپ جواب سے مطمئن کردیتے، ان کے ساتھ ایک صاحب سے اور ملاقات ہوا کرتی، وہ نمازِ باجماعت بلکہ تکبیر اولیٰ کے بہت پابند تھے، اے۔ جی آفس میں ملازم تھے، انھیں ہم لوگ جمیل بھائی کہتے،

انیس بھائی میں لطیف ظرافت تھی، اوران میں متین سنجیدگی! اکثر دونوں سے ساتھ ملاقات ہوتی، ان پر مفصل مضمون لکھ چکا ہوں، جو اسی کتاب میں شامل ہے۔ (دیکھئے صفحہ:۹۴)

ملاقاتوں، مجلسوں اور انیس بھائی کے خاص ترنم کی دل آویزیوں کا یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ اچانک انیس بھائی غائب رہنے لگے، کئی کئی دن کے بعد ملاقات کی نوبت آتی، پھر صرف اتوار ہی کو ملاقات تک بات پہونچی، معلوم ہوا کہ انھوں نے الہ آباد چوک میں ایک دکان کھول لی ہے، اب دفتر سے بچا ہوا وقت دکان کی نذر ہو رہا ہے، ملاقات گراں ہوگئی ہے، مجھے نہ بازار سے مناسبت ہے، نہ دکان سے کوئی تعلق، کبھی نوبت نہیں آئی کہ دکان دیکھتا۔ ایک ملاقات میں انیس بھائی نے کہا کہ میں نے ایک دکان کھولی ہے، بزرگوں نے اس کی ترقی اور اس میں برکت کے لئے دعا کی ہے، آپ بھی چل کر اس دعا میں شامل ہوجایئے، یعنی دعا کردیجئے، میں نے عرض کیا کہ میں نہ بزرگ ہوں، نہ بزرگ ہونے کی صلاحیت رکھتا، اس لئے میرے جانے کا کوئی معنی نہیں، رہی آپ کی دکان اور اس کی ترقی، تو انیس بھائی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوش حال بنایا ہے، اچھی خاصی زمینداری ہے، غلہ اناج تو گھر ہی پر کافی ہے، خرچ بھی آپ کا کم ہے، ’’فقط ہم دو ہمارے دو‘‘ کا معاملہ ہے۔ ملازمت کی تنخواہ بھی معقول ہے، کوئی کمی نہیں ہے، دفتر سے جو وقت بچتا تھا، خانقاہ میں آپ آجاتے تھے، اللہ ورسول کی باتیں ہوتی تھیں، ایمان تازہ ہوجاتا تھا، ایک دوسرے کے دکھ درد سے واقف ہوجاتے تھے، کمزوروں اور ٹوٹے دلوں کی تسلی کا سامان ہوتا تھا، اب آپ دنیا کی ایک مصروفیت سے خالی ہوں گے، تو دوسری مصروفیت میں گھر جائیں گے، دل پر ہر وقت دنیا، مال ودولت اور اس کے حساب وکتاب کا غلبہ ہوگا، دین کا اثر کم ہوتا جائے گا، مجھے تو آپ کی یہ دوکان پسند نہیں ہے، میں تو چاہتا ہوں کہ دکان کا یہ قصہ تمام ہوجائے۔

انیس بھائی متاثر ہوئے، پھر سنبھل گئے، نہیں بزرگوں کی نظر عنایت ہے، ان کی توجہ ہے، ان کی دعائیں ہیں، ان شاء اللہ وہ بات نہ ہوگی جس کا آپ کو خطرہ ہے، دکان چلے گی، اور دینداری بھی ان شاء اللہ باقی رہے گی۔

لیکن ہوا یہ کہ چھ سات ماہ میں دکان ختم ہوگئی، بچا کھچا سامان اُٹھا پٹھا کر گھر لائے، جو بہت دنوں تک سامانِ عبرت بنا رہا، پھر دینداری باقی رہی، بلکہ ترقی کرتی رہی، یہاں تک کہ ملازمت سے بھی ریٹائرڈ ہوگئے، اور اب بزرگوں کی صحبتیں ہیں، محبت کا دریا جو ہمہ دم سینہ میں موجزن ہے، زیادہ جوش کرتا اور امنڈتا ہے، تو وہی محبت اشعار کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے، دو بار دیارِ حبیب کی حاضری سے بہرہ ور ہوچکے ہیں، اور اب تو ماشاء اللہ باقاعدہ مجاز بیعت ہوکر رہبر راہِ طریقت ہوچکے ہیں۔ **بارک اللہ فی علمہ وعملہ وقلبہ وشعرہ**

انیس بھائی کے ہی علاقہ کے رہنے والے ایک بزرگ جو حیرت انگیز حد تک زود گو شاعر ہیں، چائل کے رہنے والے، حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی قدس سرہٗ کی بارگاہ کے امیر خسرو، جناب کامؔل چائلی کا ایک مصرعہ ہے، ع

ہم اپنی شاعری کو عرش کا زینہ سمجھتے ہیں

کامؔل صاحب کے اشعار انھیں بکثرت بزرگوں کی مجلس میں باریاب کراتے ہیں، یہی رنگ انیس بھائی کا بھی ہے، دورِ حاضر کے اکثر بزرگوں کی خدمت میں انیس بھائی کی اور ان کے اشعار کی پذیرائی ہے، ہندوستان میں بھی، پاکستان میں بھی، بنگلہ دیش میں بھی، اور اب تو ماشاء اللہ دیارِ پاک حرمین شریفین (زادھما اللہ شرفاً واجلالاً) میں بھی ان کی آواز گونجتی ہے۔

انیس بھائی کی دینداری اور ان کے مزاج وطبیعت کے عارفانہ اور والہانہ

ذوق کے ساتھ، دوایک یادیں اور دوایک شخصیتیں ایسی وابستہ ہیں، جن کا تذکرہ ضروری اور مفید ہے، اور ان کی روشنی میں ’’ اَلْـوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ ‘‘ (بیٹا اپنے باپ کے باطن کا عکس ہوتا ہے) کا راز کھلتا ہے۔

ایک شخصیت ان کی محترم نانی کی ہے، یہ بزرگ خاتون، اس وقت حیات تھیں، جب میں الہ آباد میں مدرس تھا، ۱۹۷۹ء کے قریب ان کا وصال ہوا، بہت اللہ والی اور برگزیدہ خاتون تھیں، ابتداءً ایک بدعتی پیر سے مرید تھیں، مگر عبادت کا ذوق انھیں ابتداء ہی سے تھا، انیس بھائی بچپن میں زیادہ تر انھیں کی آغوش میں رہے، وہ انھیں گود میں لئے ہوئے تلاوت کرتی رہتیں، انیس بھائی جب حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ سے بیعت ہوئے، اور انھوں نے حضرت کے حالات وملفوظات انھیں سنائے، تو وہ بہت متاثر ہوئیں، اور کہا کہ مجھے بھی ان سے بیعت کرادو، چنانچہ انیس بھائی اپنے ساتھ الہ آباد لے کر آئے اور حضرت سے بیعت کرادیا، حضرت سے بیعت ہونے کے بعد ان کا ذوقِ عبادت اور نکھر گیا، ڈھائی بجے رات کو بیدار ہوجاتیں، اور اسی وقت سے تہجد، ذکر، تلاوت میں منہمک ہوجاتیں، اور اشراق پڑھ کر مصلیٰ سے اٹھتیں، اشراق کے بعد چاشت، اوابین اور دیگر نوافل کی بھی بہت پابند تھیں، قرآن کریم کی تلاوت اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم فرمودہ دعاؤں سے انھیں عشق تھا، اصل عربی عبارت بھی پڑھتیں، اس کا ترجمہ بھی پڑھتیں، مناجاتِ مقبول منظوم بھی پڑھتیں اور کسی طرح انھیں سیری نہ ہوتی۔

تدین وتقویٰ میں انھیں بڑی پختگی حاصل تھی، میں نے جیسا کہ اوپر عرض کیا ہے کہ پور خاص میں بدعت کا غلبہ تھا، عرس وقوالی کا بڑا اہتمام تھا، تعزیہ داری بھی خوب ہوتی تھی، محرم میں ڈھول بجائے جاتے، ایک عالم مولانا عبدالستار صاحب سہسرامی وہاں تشریف لایا کرتے، وہ صحیح العقیدہ عالم تھے، لیکن چونکہ پورا گاؤں اہل

بدعت پر مشتمل تھا، اس لئے مولانا حکمت عملی سے اصلاح کی باتیں کرتے تھے، محرم کے ڈھولوں کی بھی لطیف طریقے سے تردید کیا کرتے، بعد میں جب انیس بھائی کا رنگ بدلا، تو انھیں بہت خوشی ہوئی، اور انھوں نے کھل کر رسوم بدعت کی مخالفت اور اصلاح شروع کردی، ایک بار ڈھولوں کے خلاف واضح اور دوٹوک انداز میں بولے، تو کچھ لوگوں کو ناگوار ہوا، مولانا سیدھے سادے بزرگ تھے، ان کو تنگ کرنے اور ستانے کے لئے کچھ بے پروا نوجوان کئی ایک ڈھول اُٹھا کر ان کی قیام گاہ تک لے گئے، اور زور زور سے بجانے لگے، تکلیف تو بہت ہوئی، مگر صبر کیا، کچھ سنجیدہ اور شریف لوگ آئے، انھوں نے ملامت کی، تب یہ سلسلہ بند ہوا، انیس بھائی کی نانی کو خبر ملی، انھیں بہت جلال آیا، بہت ضعیف ہوگئی تھیں، کمر جھک گئی تھی، عصا کے سہارے چلتی تھیں، انھوں نے ڈنڈا سنبھالا، اور ایک چاقو لیا اور آہستہ آہستہ چل کر وہاں پہونچیں، جہاں ڈھول رکھے ہوئے تھے، دو تین نوجوان وہاں موجود تھے، انھوں نے دادی کو آتے دیکھا تو جھک کے سلام کیا، اور پوچھنے لگے کیسے آئیں؟ کہا میں نے سنا ہے، تم لوگوں نے ایک عالم دین کی توہین کی ہے، وہ بھی ایک ناجائز اور خلاف شرع چیز کی خاطر! آج میں اس کا قصہ ہی تمام کردیتی ہوں، یہ کہہ کر انھوں نے چاقو سے ان کے ڈھولوں کو پھاڑنا شروع کردیا، نوجوان چلائے اور دوڑے، مگر انھوں نے ڈانٹا کہ خبردار میرے قریب مت آنا۔

یہ تھی ان کی دینی پختگی اور شجاعت!

وہ اشراق کے بعد چھوٹے بچوں کو قرآن کریم پڑھایا کرتی تھیں، ان کا یہ مدرسہ مستقل چلتا تھا، اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے لوگوں اور عورتوں کو انھوں نے قرآن پڑھایا ہوگا۔

آخر میں بینائی بہت کمزور ہوگئی، موٹا چشمہ لگاتی تھیں، قرآن کریم سے انھیں

عشق تھا، وہ تلاوت میں کبھی کمی نہ کرتیں، مناجاتِ مقبول پڑھتیں، دلائل الخیرات پڑھتیں، آہستہ آہستہ بینائی بالکل جاتی رہی، اور تلاوت کا تسلسل موقوف ہوگیا، اس کا انھیں بہت صدمہ تھا، بار بار ڈاکٹروں کے پاس جاتیں، انیس بھائی کو مجبور کرتیں کہ اتنی روشنی ہوجائے کہ میں تلاوت کرسکوں، مناجات پڑھ سکوں، انیس بھائی نے بہت دوڑ دھوپ کی، مگر ڈاکٹروں نے فیصلہ کردیا کہ اب روشنی نہیں آئے گی، انیس بھائی اور دوسرے خاندان کے لوگوں نے تسلی دی، اللہ کی رحمتیں یاد دلائیں، انھیں صبر وشکر کی دولت حاصل تھی، مگر تلاوت قرآن کے عشق کو کیا کرتیں۔

ایک رات بہت روئیں، حق تعالیٰ کی بارگاہ میں فریاد کی کہ بارِ الٰہا! مجھے ہاتھ پاؤں نہیں چاہئے، لیکن آنکھیں مل جائیں کہ آپ کی کتاب کی تلاوت کرسکوں، ساری رات اسی دعا میں بسر کی، اور صبح ہوئی تو دعا قبول ہوچکی تھی، باطمینان قرآن کریم کی تلاوت کررہی تھیں، اب موٹے چشمے کی بھی ضرورت نہیں تھی، مناجات مقبول بھی پڑھنے لگیں، اس میں باریک باریک عبارتیں بھی بے تکلف پڑھ لیتیں، انتقال کے وقت تک کئی سال یہی حالت رہی۔ **فسبحان من يجيب المضطر إذا دعاه ويكشف السوء**

یہ ان محترم خاتون کی کرامت اور عنداللہ مقبولیت کی علامت تھی، انیس بھائی نے اس بزرگ نانی کی آغوش میں تربیت پائی تھی، ان کی آغوش شفقت تو نواسے کو اپنے بڑھاپے کے آغاز تک ملی، یہاں ایک اور بزرگ شخصیت کا ذکر ضروری ہے، جن کی خدمت انیس بھائی کو بچپن میں میسر آئی، مگر یقین ہے کہ ان کی دعائیں انیس بھائی کے وجود میں رچی بسی ہیں۔

یہ بزرگ ہیں، انیس بھائی کے دادا شیخ ذوالفقار حسین صاحب مرحوم! مرحوم کے والد شیخ تجمل حسین صاحب زمیندار تھے، اور اس زمانے میں زمینداری کے جو

لوازم واوصاف تھے، ان کے ساتھ متصف اور ان میں مبتلا تھے، ان کے بڑے بیٹے بھی انھیں کے رنگ میں تھے، مگر چھوٹے بیٹے درویشانہ مزاج رکھتے تھے، ہمیشہ ایک جوڑا کپڑا رکھتے اور اسی کو دھو دھو کر پہنا کرتے، عبادت وریاضت میں انھیں بڑا انہماک تھا، زمینداری کے کاروبار سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا، البتہ غرباء ومساکین کی سرپرستی خوب فرماتے، راتوں کو بندوق لے کر نکل جاتے، اور گاؤں کا پہرہ دیتے، اگر کوئی چور ملتا، یا کوئی شخص مشتبہ حالت میں ملتا، تو اسے بلاتے، چوری اور شرارت سے اسے منع کرتے، لوگوں پر ان کے زُہد وتقویٰ کا بہت اثر تھا۔ ان کی نصیحتوں سے لوگ بہت متاثر ہوتے، ان کے انتقال پر گاؤں والوں کو بہت صدمہ ہوا۔

بزرگوں کی نگاہیں تاثیر سے خالی نہیں ہوتیں۔ ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اکبر مرحوم نے فرمایا ہے۔

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

تو انیس بھائی پر اس وقت جبکہ دل کی تختی ہر قسم کے نقش ونگار سے بالکل پاک تھی، بزرگوں کی، اور گھر کے بزرگوں کی نگاہ پڑی، یہ محبت الٰہی، عشق نبوی، اور دینداری وتقویٰ کی نظر تھی، جس نے ابتداء میں ہی جگہ بنالی،

أتاني هواها قبل أن أعرف الهوىٰ
فصادف قلباً خالياً فتمكنا

محبت اس وقت آئی، جب میں محبت کو جانتا بھی نہ تھا، دیکھا کہ دل بالکل خالی ہے، بس وہ دل میں رچ بس گئی۔

انیس بھائی پہلے بھی دین ہی کے تھے، اور اب بھی دین ہی کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، الہ آباد میں انجمن اصلاح المسلمین ایک ایسا ادارہ ہے جو نصف صدی سے زیادہ ہوا کہ ہر سال چار روز کا دینی جلسہ منعقد کرتی ہے، جس میں منتخب

اور بڑے بڑے علماء دین تشریف لاتے ہیں، ۱۹۹۰ء سے اس کے منتظم انیس بھائی ہیں، اورانہی کی صدارت میں جلسہ ہوتا ہے۔ دین کی خدمت کا یہ سلسلہ پیہم جاری ہے، اس سے زیادہ اہم خدمت یہ ہے کہ ان کے گاؤں پور خاص میں بہت پہلے ایک مکتب قائم ہوا تھا، جو دو چار سال چل کر ٹوٹ گیا تھا، اس کی زمین کھنڈر کی شکل میں پڑی تھی، گاؤں والوں کے مشورے سے انیس بھائی نے اس پر دوبارہ مدرسہ کا اجرا کیا، اور مکتب اور درجۂ حفظ کی تعلیم شروع کی، ان کی نگرانی اور اہتمام میں ماشاء اللہ مدرسہ ترقی کر رہا ہے، خدا تعالیٰ مزید ترقیات سے نوازے۔

انیس بھائی شاعر ہیں، لیکن غزل کی روایتی شاعری سے انھیں کوئی مناسبت نہیں ہے، زلف وگیسو، گل وبلبل، عارض وشانہ کا ذکر ان کے یہاں آپ کو نہیں ملے گا، دل چونکہ محبت الٰہی کی جلوہ گاہ ہے، رسول اللہ ﷺ سے سچی محبت انھیں بحمد اللہ حاصل ہے، اس لئے اشعار میں وہی چیز جلوہ نما ہوتی ہے، جو قلب وجگر میں سمائی ہوئی ہے، غزل کے طور پر بھی نعت وحمد اور شریعت وسنت کی تعلیمات ہی پیش کرتے ہیں، حمد ونعت تو ان کا خاص موضوع ہے، علماء ومشائخ کی مجالس میں اپنا کلام سناتے ہیں، پڑھنے کا انداز بھی خوب ہے، ترنم نہایت پُر سوز اور پُر کشش ہے، ان کے اشعار بزرگوں کے ترجمان ہوتے ہیں، اس لئے مشائخ کے یہاں بہت محبوب ومقبول ہیں۔

بزرگوں کی طبیعتوں اور ذوق ومزاج کے رنگ الگ الگ ہوتے ہیں، بعض اکابر اپنی مجالس میں اشعار، خوش گلو اور صاحب دل نعت خواں سے سنتے ہیں، اس سے ان کے جذبۂ عشق ومحبت کو کبھی تسکین ہوتی ہے، کبھی مزید اشتعال پیدا ہوتا ہے، اور بعض اکابر کے یہاں شعر وترنم کا گزر نہیں ہوتا، یا کم ہوتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ انھیں ذوق نہیں ہوتا، محبت کی گرمی بہر حال کبھی کبھی نغمہ وترنم کا تقاضا کرتی ہے۔

انیس بھائی وقت کے بیشتر بزرگوں کے یہاں پہونچے، اور اپنا کلام انھوں نے سنایا، داد بھی پائی، دعا بھی پائی۔

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں جہاں تک میں جانتا ہوں نغمہ سرائی کا گزر نہیں تھا، انیس بھائی کہتے ہیں کہ حضرت کو میں نے کبھی کوئی شعر نہیں سنایا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار کو اور اشعار کے پڑھنے کو عالم بالا میں پسندیدگی کا شرف حاصل ہو رہا ہے، اس کا اشارہ مشہور شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ کے ایک خواب سے ملتا ہے، خواب تو لمبا ہے، حضرت باندوی علیہ الرحمہ خواب میں خود کو حضرت مصلح الامت کی خدمت میں پاتے ہیں، وہیں انیس بھائی بھی آجاتے ہیں، حضرت مصلح الامتؒ فرما رہے ہیں کہ فلاں تاریخ کو فتح پور (حضرت کا وطن) چلنا ہے، وہاں نعتیں تم سے سننی ہیں۔

حضرت باندوی نور اللہ مرقدہٗ جیسے بلند پایہ اور مخلص بزرگ کا یہ خواب انیس بھائی کے لئے ماشاء اللہ فتح مندی کا اشارہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے اشعار کو اور ان کے اندازِ نغمہ سرائی کو قبول فرمائیں۔

جی چاہ رہا تھا کہ انیس بھائی کے چند اشعار بھی پیش کروں، لیکن یہ خیال مانع ہے کہ مجموعۂ کلام آپ کے ہاتھوں میں ہے ہی، پڑھئے اور شعر کا لطف لیجئے، اور نصیحتوں کی سوغات دامن میں سمیٹئے، تاہم چند اشعار کے نقل کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

جھوم اٹھے گی عطا کرنے کو رحمت اس کی
خوب رو رو کے تم اللہ سے جنت مانگو

بندگی عاجزی ہی سب سے بڑی دولت ہے
کشف مانگو نہ بزرگی نہ کرامت مانگو

گالیاں سن کے بھی دیتے تھے دعائیں جو انیسؔ
اسی اللہ کے محبوب کی سیرت مانگو

☆☆☆☆☆☆☆

وہ لوگ مبارک ہیں جو اہل مدینہ ہیں
ہو جائے کرم آقاؐ ہم دور سے آئے ہیں

☆☆☆☆☆☆☆

حسرت بھری آنکھوں سے کوئی دیکھ رہا ہے
اک امتی سرکارؐ کی چوکھٹ پہ کھڑا ہے

لعنت نہ ملامت نہ خوشامد کی ہے پرواہ
کیا فکر زمانے کی جو خوش اپنا خدا ہے

دو عالم کی مستی اسی کو ملے گی
جو پی لے مئے حق بجامِ محمد

☆☆☆☆☆☆

قافلہ ہے نبیؐ کے یہ اصحاب کا اس کی تسخیر و تاثیر کیا پوچھنا
عشقِ احمدؐ میں بیخود وہ ہو جائیگا جس پہ پڑ جائیں اونٹوں کی پرچھائیاں

☆☆☆☆☆☆☆

تھوڑی سی زندگی جو بچی ہے تو کیا کریں
مکہ چلیں ، طواف کریں ، حج ادا کریں

کچھ عرضِ مدعا نہ کریں ہم زبان سے
اظہار حال کے لئے آنسو بہا کریں

پڑھ کر درود گنبد خضرا کے ارد گرد
اے کاش ہم بھی مثلِ کبوتر اڑا کریں

☆☆☆☆☆☆☆

الفت دریا ، کشتی یہ دل   نامِ محمد زینت ِ ساحل
اس کو ملے کیوں جامِ کوثر   جو بھی رہا ہو آپ سے غافل
آپ کی آمد میں وہ طاقت   جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ
قلب کی قوت عشق محمد   کفر نہ ٹھہرا مد مقابل
جاری رہے یہ تیرا تڑپنا   ان کی نظر ہے جانبِ بسمل
جب سے انیسؔ نے دیکھا خضراء
رقص میں ہر دم آنکھ کا ہے تل

انیس بھائی ایک نصیبہ ور خوش قسمت انسان ہیں ، اللہ نے انھیں جہاں قلب سلیم دیا ہے، فہم مستقیم عطا فرمائی ہے، وہیں جیسا کہ گزر چکا ہے علماء دین اور مشائخ وصوفیہ کی صحبت ومعیت اوران کی بارگاہ میں قبولیت و پذیرائی بھی بخشی ہے ، اوراس کے ساتھ ساتھ دنیوی خوش حالی ، خاندانی وجاہت بھی ارزانی فرمائی ، دادا محترم اور مقدس خاتون نانی کا ذکر آچکا ہے ، والد محترم الحاج حبیب احمد صاحب مدظلہٗ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ قائم رکھے ، ایک بہت ہی بااصول صاحب ایمان وعزیمت بزرگ ہیں ، جن کی امانت ودیانت جاننے والوں میں معروف ہے، مشہور شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتا بگڈھی قدس سرہٗ سے

بیعت ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں سلامت باکرامت رکھیں۔

انیس بھائی کی والدہ محترمہ بھی نہایت دیندار خاتون تھیں، ان کا نظم وضبط، فراست وتدبر، رعب داب مثالی تھا، پورے گھرانے میں ان کی انتظامی شان مسلم تھی، کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے حکم سے سرتابی کو سوچ بھی سکے، ان کی اولاد کو ان سے محبت بھی بہت تھی، اور ان کا دبدبہ بھی بہت تھا، ان کے انتقال کے بعد انیس بھائی نے جو مرثیہ لکھا ہے، وہ بھی بے نظیر ہے، اس سے ان کے مزاج وطبیعت کی جھلک ملتی ہے، اسی مجموعۂ کلام میں ملاحظہ فرمایئے۔

انیس بھائی اولاد کے لحاظ سے بھی خوش قسمت ہیں، ان کے دو صاحبزادے ہیں، مولانا قاری نفیس الرحمٰن صاحب جو ماشاء اللہ حافظ قرآن بھی ہیں، **دار العلوم دیوبند** کے فاضل ہیں، الہ آباد میں انھوں نے اس خاکسار سے بھی تعلیم حاصل کی ہے، نہایت خاشع وخاضع ہیں، عبادت گزار، تہجد گزار بزرگوں کے شیدائی، اللہ ورسول کے دیوانے، ہمہ وقت مصروف ذکر وعبادت، کراچی میں رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں باطنی وروحانی ترقیات سے نوازیں۔

دوسرے صاحبزادے رئیس الرحمٰن سلّمہٗ ہیں، یہ انگریزی داں ہیں، بہت سلیم الطبع، نہایت فرمانبردار، ماں باپ کے خدمت گزار ہیں، بیٹے کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ والدین اس سے خوش اور رضامند ہوں، اور وہ بھی والدین کی خدمت گزاری کو سعادت سمجھتا ہو، ماشاء اللہ رئیس سلّمہٗ کو یہ خوش قسمتی حاصل ہے، اللہ تعالیٰ انھیں دنیا وآخرت کی عافیت اور خوش حالی نصیب فرمائیں۔

اہلیہ محترمہ بھی ایک صاحب سعادت خاتون ہیں، عرصہ سے بیمار رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت وعافیت عطا فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمٹیڈ) دہلی کے زیر اہتمام
شائع ہونے والا
ایک منفرد اور مکمل فیملی میگزین
ماہنامہ **جہانِ کتب** دہلی
(اردو، ہندی، انگریزی......تینوں زبانوں کا زندہ رسالہ)
الحمد للہ! جولائی ۲۰۰۴ء سے مسلسل شائع ہو رہا ہے
قیمت: فی شمارہ ۱۵؍روپیہ۔ سالانہ زرتعاون (عام) ۱۵۰؍روپیہ
طلباء کیلئے ۱۰۰؍روپیہ
آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال/ نیوز اسٹینڈ سے رابطہ قائم کریں۔
رابطہ: ماہنامہ جہان کتب دہلی، ۲۱۵۸، ایم، پی، اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس
دریا گنج، نئی دہلی۔۲
فون: 23289786,23289159,FAX:23279998